دلچسپ اور تحیر خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماھنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ

کراچی

جنوری 2016

جلد 46 • شمارہ 01 • جنوری 2016 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

پبلشر و پرنٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

مدیر اعلیٰ

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

دنیا کے ہر مہذب معاشرے اور مذہب میں دستور، آئین اور قانون بنی نوع انسان کی فلاح اور بہتری کے لیے بنائے جاتے ہیں... یہی ان سب کی روح ہوتی ہے لیکن جب انسانوں کو آئین و قانون کا ایندھن بنایا جانے لگے تو ایسے معاشرے اپنی تمام تر خوبیوں اور آزادیوں کے باوجود تہذیب و شرافت کے دائرے سے یکسر باہر پھینک دیے جاتے ہیں... تین برس کا ایک بچہ جب جائداد پر قبضہ کرنے میں ملوث کر دیا جائے تو سمجھ لیں کہ معاشرت و شرافت کی عمارت زمین بوس ہونے میں کچھ ہی کسر رہ گئی ہے... ہم نے قانون کی لاٹھی کیسے اندھے، بہرے اور سفاک لوگوں کے ہاتھ میں تھما دی ہے... ایسے لوگوں کے لیے صرف معطلی کافی نہیں، ان کو عبرت ناک سزا دی جانی چاہیے... ایک عادی مقدمے باز کسی بھی شریف آدمی کو چار مختلف شہروں میں ایف آئی آر درج کرا کے اس بُری طرح مقدمے بازی میں الجھا سکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی سے عاجز آجائے... ایسے معاملات میں عدالتوں کا قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے... پیشیاں چلتی ہیں، قانونی نکات پر وکلا کے معرکہ آرا ہونے کے بعد آخر کار مدعی اپنا جھوٹا مقدمہ ہار جاتا ہے... مقدمے کے نامزد ملزم کو وقت، سرمایہ، وکیلوں کی فیس اور ذہنی سکون لٹانے کے بعد عدالت سے صرف بریت کا ایک باعزت پروانہ مل جاتا ہے... حوالات کے خوف آور در و دیوار میں کھوئے ہوئے تفتیشی شب و روز کا کوئی ازالہ ہوتا ہے نہ مدعی کو اس کی جسارت کی کوئی سزا ملتی ہے... کیا ہمیں ایسی ٹھوس قانون سازی کی ضرورت نہیں ہے جس کے ذریعے بدفطرت مقدمے بازوں اور ایف آئی آر سازوں کو عدالتی کارروائی کے نتیجے میں بعینہٖ وہی سزا دی جائے جو الزام ثابت ہو جانے پر ان کے شریف حریف کو بھگتنا پڑتی۔ یہ ہمارے قانون سازوں کے لیے ایک اہم سوال ہونا چاہیے کہ جھوٹا مقدمہ قائم کرنے والے کو کتنی سزا دی جائے۔ اس سے غیر ضروری مقدمے بازی کا مکمل سدباب ہوگا اور عدالتوں کے وقت کا زیاں نہیں ہوگا... جھوٹے مقدمات ختم ہوں گے تو فاضل عدالتیں دستیاب وقت میں زیادہ سے زیادہ مقدمات نمٹا سکیں گی اور عدالتی نظام پر آئے ہوئے بوجھ میں نمایاں کمی ہوگی... اپنی ان معروضات کے بعد اب چلتے ہیں آپ کی عدالت میں جہاں ہمارے شریف قارئین... اپنے اپنے مقدمات کے ساتھ اپنی باری کے منتظر ہیں...

علی پور سے ہارٹ کیچر کی کیفیات ”قرطاسِ دل پر کندہ احساسات مرکزِ جاسوسی پہنچنے تک اکیسویں صدی 16 برس کی بالی عمر کی پہلی بھرپور انگڑائی لے چکی ہوگی۔ اندھا دھند پڑتی سفید دھند میں لپٹے الوداعی ماہ دسمبر کے سرورق پر سجی مرد و زن کی صورتیں تو چشم خوش ہی تھیں لیکن ان کے کرتوت کیسے ہیں... یہ آخری کہانیاں پڑھ کر لگ پتا جائے گا۔ ابتدائیہ پڑھا۔ تبصروں کی میراتھن ریس میں صنفِ معصوم سے تعلق رکھنے والے ایم عمران جونانی کا تبصرہ پہلے نمبر پر آیا۔ بزم جاسوسی میں صنفِ نازک کی تعداد صنفِ نازک کے قد کی طرح روز بروز گھٹتی ہی چلی جا رہی ہے۔ غلام یٰسین، قاسم رحمٰن، رضوان تنولی اور طاہرہ گلزار ان سب افراد نے ایسے لگتا ہے کہ ایک دوسرے کی بس تعریفیں ہی لکھنے کے لیے خالی پیٹ قسمیں کھا رکھی ہیں۔ شکیل میاں اگر آپ کی آج تک کسی کے ساتھ تو تو میں میں نہیں ہوئی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ٹھس پرفیکٹ مین ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا تعلق ہر کسی کے ساتھ بناوٹی ہے۔ بھائی میرے دوسروں کا بلا معاوضہ قاصد نہ بنیں اور یا ہر کے تنازعوں کے تذکرے سے ڈائجسٹ کو معاف رکھیں اور ہاں صنفِ مخالف میں مرد ہو یا عورت ہر کوئی کسی نہ کسی حد تک شفقت رکھتا ہے۔ بس انداز اپنا اپنا مگر رنگ و سوچ تقریباً یکساں ہوتی ہے۔ رضوان تنولی کریزی، پتا نہیں اور کیا کیا طاہرہ گلزار کو نصیحتوں سے نوازنے کے چکر میں چکر در چکر چکرا رہے تھے ویسے موصوف پر خود کو فضیحت اور دوسروں کو نصیحت والی مثال صادق بیٹھتی ہے۔ عبادت کاظمی کے خط میں ایک فرد کی دو دو بار تعریف... تو پھر کہہ نہ دوں بیگانوں کی شادی میں کاظمی یار بار دیوانہ۔ مرحا گل ہو سکتا ہے طاہر جاوید مغل صاحب کسی شادی شدہ عورت کی محبت میں مبتلا ہوں ویسے وہ شادی شدہ خاتون ان کی زوجہ محترمہ بھی ہو سکتی ہیں۔ فلک شیر کی عوام الناس کے بارے میں رائے رائٹ اور انداز فکر ٹھیک لگا۔ فلک بھائی سے ادبی التماس ہے کہ اپنی کہی ہوئی باتوں پر خود بھی عمل ضرور کیجیے گا کیونکہ بقول ہمارے بغیر عمل کے علم ایسے ہے جیسے بغیر روح کے جسم۔ آنکھوں کے پروانوں نے پہلے آوارہ گردی کی جانب پرواز کی۔ مذکورہ کاوش پر بھٹی صاحب کے دستِ تخیل کی گرفت مکمل مضبوط ہے۔ دلوں میں نقب لگانے کے فن سے آشنا طاہر جاوید مغل کے سلگتے انگارے کا وقتی اختتام پر حرارت رہا۔ احمد اقبال نے ہوش و مدہوش میں مغرب کے... بظاہر روشن پہلوؤں پر ملک میں بے تحاشا لوڈشیڈنگ کے باوجود خوب خوب روشنی ڈالی لیکن ان روشن پہلوؤں کے عقب میں جو گہرے اندھیرے ہیں وہ بھی کسی صاحبِ خرد کی نگاہ سے اوجھل نہیں۔ سلیم انور کی ٹھنڈا انتقام میں ایک عدد غیرت مند بیوی نے بے وفا شوہر کو ٹھنڈا کر کے اپنا کلیجا ٹھنڈا کر لیا اور شوہر کے لاکھوں ڈالر کی بلاشرکت ایرے غیرے نتھو خیرے کی مالک و مختار بن گئی گویا زندہ شوہر لاکھ کا تھا تو مرا ہوا کئی لاکھ کا ثابت ہوا۔ ویسے کسی نامعلوم نے کیا خوب کہا ہے اگر عورت غیرت کے نام پر قتل کرنا شروع کر دے تو ایک بھی مرد زندہ نہ بچے۔ ہاں مگر ماسوائے ہمارے ماشاء اللہ، ہمیں اللہ حسینوں کی نظر بد سے بچائے رکھے ہم پاک دامن ہیں۔ سلیم فاروقی کی چھنکار نے حیران کر دیا۔ ہوس زن کی ہو زر کی ہو یا زمین کی بالآخر ہوس زادوں کا انجام قعرِ مذلت میں گر کر فنا ہو جانا مقدر ٹھہرتا ہے۔ کاشف زبیر کی حرص دوراں بڑی حد تک انگلش مووی میکناز گولڈ کے غالباً اتفاقاً مشابہ تھی۔ پرفیکٹ مرڈر کے اختتام پر واقعی حیرت ناکی ہوئی۔ خام گواہی نگاہوں سے فی الفور اتفاقی چوک گئی۔ تنویر ریاض کی ناکام فاتح، فاتحِ دل رہی۔ آغاز بساط تھکے ہوئے چشم و ذہن سے کیا مگر جب تک محمد فاروق انجم کی الوداعی صفحات پر پھیلی ہوئی بساط کو آنکھوں سے سمیٹ نہ لیا دل کی قسم ہماری بے چینی کو چین نہ آیا۔“

ڈیرہ اسماعیل خان سے مرحا گل کی گفتار ”حسبِ معمول اس شمارے کا بھی گیٹ اَپ بہت دلکش ہے۔ دوستوں کی محفل شرکت کی۔ ایم عمران جونانی

اپنے 2015ء کے سب سے بہترین اینڈ ٹاپ آف دی لسٹ تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ سپر ہٹ تبصرہ تھا۔ عبدالجبار رومی صاحب کا تبصرہ شاندار تھا۔ نادر سیال کے والد کے بارے میں پڑھا بہت افسوس ہوا، اللہ رب العزت مرحوم کو جنت الفردوس عطا فرمائے، آمین۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جیل کی چار دیواری سے باہر نکالے۔ خود کو بے بس محسوس نہ کریں تکلیف دہ لمحات میں سب سے بڑی ہستی نیلی چھت والے کو پکاریں، وہ ہر مشکل آسان کرنے والا ہے۔ میری دعائیں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہیں۔ محبوب عباسی صاحب آپ کی ورنہ والی بات سمجھ نہیں آئی، اگر ہم سب فیملی ہیں تو اس کا سربراہ یقیناً رضوان تنولی کریزوی صاحب ہیں میری نظر میں۔ افتخار حسین اعوان کو شادی کی مبارک باد۔ چوہدری محمد سرفراز کا تبصرہ پسند آیا۔ چنگاوڑا تبصرہ تھا باقی دو نئے لکھنے والے ریحام، ثمر خان اینڈ علی محمد، اسد عباس، محمد ادریس، سید شکیل کاظمی، بہار حسین، غلام یٰسین، رضوان تنولی کے موجودہ سال کے آخری مہینے کے تبصرے عمدہ رہے اور محفل کی رونق بڑھاتے رہے۔ سب سے پہلے انگارے سے خود کو گرمائش دی۔ دسمبر بارش کا مہینا انگاروں کی تپش وانگارے کہانی وہ بھی مغل انکل کی، بڑھیا بھی بڑھیا۔ شاہ زیب کا گو نگا رہنا پسند نہیں۔ گاؤں والے شاہ زیب کو اصل روپ میں پہچان لیں۔ مریم کے خان کا رنگ نہ پا کر تشنگی بڑھ گئی۔ چھنکارا میری توقع کے عین مطابق تحریر تھی، سلیم فاروقی ویلڈن۔ آوارہ گرد طوفانی انداز میں آگے بڑھ رہی ہیں، کہیں محبت کہیں نفرت۔ ہوش و مدہوش میں سیما کی خاموشی اچھی لگی۔ دونوں رنگ ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ کاشف زبیر نے جس خوب صورتی سے قلم چلایا وہاں فاروق انجم کے قلم کے اسیر ہوئے۔ عمر کا کردار پسند آیا، تو مائرہ کے دھوکے پر جی بھر کے غصہ آیا۔ بہرحال مکمل شاہکار تھی۔ گل خان اینڈ سومت کی معصومیت پسند آئی۔ کترنیں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ آخر میں ہم کو ٹھنڈے انتقام نے ٹھنڈا کر دیا۔ گئے سال کے بارے میں کیا کہیں بس یہی کہنا چاہیں گے۔

چھوڑ جاتا ہے حادثات کے ناگ
وقت کتنا بڑا سپیرا ہے۔''

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی رائے ''بلدیاتی انتخابات کی وجہ سے جاسوسی اس بار 8 تاریخ کو مل سکا۔ سرورق مناسب تھا۔ عمران جونانی کو خطوط کی محفل میں سرفہرست آنے پر مبارک باد۔ میرے ہم شہری شکیل صاحب کا شکوہ بجا ہے۔ امید ہے تبصرہ نگار آئندہ محتاط رہیں گے۔ مستقل لکھنے والی بی بی طاہرہ گلزار اس بار غائب تھیں۔ قسط وار کہانی انگارے کی چھٹی قسط اس دفعہ کافی مار دھاڑ سے بھرپور رہی۔ ایک بات عجیب سی لگی کہ شاہ زیب کو روایتی فلمی ہیرو کی طرح کوئی چوٹ نہیں آئی جبکہ وہ کافی لوگوں کو ہلاک اور زخمی کر چکا تھا۔ تاجور کے دل میں اب اس کے لیے کچھ جگہ بنتی جا رہی ہے۔ شمارہ کی اولین کہانی احمد اقبال کی ہوش و مدہوش رخصت ہوتے سال کی ایک شاندار پیشکش تھی۔ سیما کا کردار عین ایک مشرقی لڑکی اور بیوی کا تھا۔ جس نے انتہائی ذمے داری اور سمجھ داری سے نبھایا۔ سرورق کی دونوں کہانیاں بس گزارے لائق تھیں۔ شمارے کی واحد دیسی کہانی سلیم فاروقی کی چھنکارا ایک دلچسپ تحریر تھی۔ جاوید نے شائلہ کی خاطر اور اس سے مل کر اپنی بیوی کو ٹھکانے لگا دیا۔''

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کی تفصیلات ''سال کا آخری شمارہ 2 دسمبر کو سرور بیس میں ملا۔ خوب صورت سی آنکھوں والی ماڈل اور اس کی گردن میں پیوست ایک خوب صورت سے مردے سے سجایا گیا۔ سرورق بہت اچھا لگا ہے، اداریہ میں آپ حکومت کو دیگر ممالک کی مثال دیتے نظر آئے، پرانے سال کے دکھ گنوائے۔ نئے سال کے لیے بھی پرامید ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی امید کو پورا کرے، آمین زندگی کا ایک اور سال کم ہو گیا۔ سال کے ختم ہونے کا پتا نہیں چلتا پھر ہم افراتفری میں گم ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ بزرگ لوگ بیٹھے ہوتے تھے تو میں بھی بیٹھ جاتا، دو تین گھنٹے محفل جمتی وقت ہی وقت تھا۔ اب نہ بزرگ نظر آتے ہیں نہ محفل جمتی ہے نہ وقت ہے، زیادہ کمانے کی حرص نے بھائی کو بھائی سے دور کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نئے سال کو ملک خداداد کے لیے امن و سلامتی کا گہوارہ بنا دے اور اپنوں کو اپنوں سے قریب ہونے کی توفیق دے، آمین۔ اپنی محفل میں آئے تو ایم عمران جونانی کو سال کی آخری محفل میں عمدہ تبصرہ کے ساتھ دیکھا، مبارک ہو۔ برادر غلام یٰسین نوناری کا بھی عمدہ تبصرہ، رومی انصاری بھائی کی بھی بہت عمدہ تبصرہ نگاری، سید شکیل حسین کی مختصر حاضری، چوہدری محمد سرفراز اور ادریس احمد خان کے بہت عمدہ تبصرہ کے ساتھ شریک محفل تھے۔ لو جی سرور بیس کراچی پر بادل آئے اور برس گئے موسم بڑا پیارا ہو گیا بڑے عرصے کے بعد بارش دیکھنے کو ملی۔ سید عبادت کاظمی، نادر سیال، معراج محبوب عباسی، افتخار حسین اعوان بہت ہی عمدہ تبصرہ کے ساتھ محفل کی جان بنے۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے بھی عمدہ رہے، نئے آنے والے دوستوں کو محفل میں بہت بہت خوش آمدید! ڈھیر ڈھیر ویلکم۔ کہانیوں میں ہوش و مدہوش سے شروعات کی۔ احمد اقبال نے بہت عمدہ تحریر لکھی۔ حامد کے کردار پر حیرت ہوئی، وہ تو بہت بڑا لالچی نکلا، شیما کے مقدر نے اسے انڈیا کے بجائے لندن پہنچایا، احسن کی وائف بنایا اور اب وہ اپنی سمجھ داری کے ساتھ پُرسکون زندگی گزار رہی ہے۔ (اس کو گزارنا کہتے ہیں پُرسکون زندگی......) سلیم انور کی ٹھنڈا انتقام میں لیڈی نے کیا خوب بدلہ لیا اپنے شوہر سے۔ منظر امام کی خاموش جنت میں کیا خوب طریقہ استعمال کرتا ہے گروشن جیراللہ دولت حاصل کرنے کے لیے، بہت عمدہ۔ طاہر جاوید مغل کی انگارے کی چھٹی قسط بہت ہی عمدہ رہی۔ شاہ زیب کے دلیرانہ ایکشن کی وجہ سے۔ تنویر ریاض ناکام فاتح لے کر آئے، یونگ نے نرس کروڈی سمیت کئی لوگوں کو آزاد کرایا سفید ریچھ سے، پر اس کو پیار نہ مل سکا۔ سلیم فاروقی کے قلم سے چھنکارا جہاں جشید کو رضوانہ سے جان چھڑانی تھی وہیں قدرت نے ایک موقع دیا اور اس نے اس سے فائدہ اٹھا لیا۔ آوارہ گرد کی قسط بہت ہی دھماکا خیز رہی جہاں شہزی نے عبید کے ساتھ مل کر کھیل کھیلا۔ حمیرا اقبال کی جوکر میں اچھا کیس حل کیا، منٹگمری نے عمدہ تحریر لکھی۔ کاشف زبیر کی حرص دوران بہت پرفیکٹ تحریر تھی۔ محمد فاروق انجم کی بساط جو سردشار، ماریہ راشد اور انجم کے کرداروں پر محیط تھی۔''

ضلع خوشاب سے محمد یوسف ساتول کی درخواست ''کافی عرصہ پہلے ایک دفعہ جاسوسی میں تنقیدی خط لکھا تھا اور شائع بھی ہوا۔ جاسوسی سے

رشتہ بہت پرانا ہے مگر حاضری کا یہ دوسرا موقع ہے، میرے کیوٹ بھائی رضوان تنولی کی یادآوری پر اس بار پھر محفل میں حاضری ہے۔ دسمبر کا شمارہ جب ہاتھوں میں آیا تو ایسا لگا کہ ہفت اقلیم کی شاہی مل گئی ہو۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح زبردست اور لاجواب تھا۔ کیونکہ اس کا تخلیق کار جو اپنے فن میں لاجواب ہے۔ اداریہ ملکی حالات کی عکاسی کررہا تھا اور 2015ء کے گزر جانے کی خبر سنا رہا تھا۔ دسمبر میرے لیے کئی حوالوں سے معتبر ہے کیونکہ دسمبر میں عظیم لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے تاریخ میں اپنا نام روشن کیا، دسمبر کی 24 کو بندہ ناچیز بھی اس دنیا میں آیا۔ ابتدا میں ایم عمران جونانی روانی سے لفظوں کی کشیدہ کاری کررہے تھے، ونڈرفل۔ لاہور سے میرے بھائی عبدالجبار رومی انصاری، ضلع بھکر سے ثمر خان، چوہدری محمد سرفراز، ملک شیر ملک کے تبصرے اچھے لگے۔ کندیاں سے نادر سیال صاحب کا تبصرہ مجھے رُلا گیا۔ اللہ آپ کو بے بس زندگی سے نجات دلائے اور آپ کے والد محترم کو جنت میں اعلیٰ مقام دے۔ معراج محبوب عباسی اور افتخار حسین اعوان کو شادی خانہ..... مبارک، سید شکیل حسین کاظمی آپ کا کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ مغل صاحب نے بہت عمدہ کہانی شروع کی ہے دیہاتی پس منظر اور ایکشن تھرل مگر ہم دیہاتیوں کو شاہ زیب کا کردار ہضم نہیں ہو رہا کیونکہ دیہات میں اتنا کچھ نہیں ہوتا جو کہانی میں ہو رہا ہے معذرت کے ساتھ۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی جو آوارہ گرد کو اپنے انجام کی طرف سمیٹ رہے ہیں، اچھی قسط تھی مزہ آیا پڑھ کر۔ حرص دوراں، کاشف زبیر صاحب ویلڈن، فطرت کے حسین مناظر کی اتنی خوب صورت دلکشی مگر انسانی بھیڑیے کی چالاکیاں، عمدہ پلاٹ، عمدہ کہانی۔ اگر مائرہ اچھی لڑکی ہوتی تو عمر سے اس کی شادی یقینی تھی۔ فاروق انجم کا دوسرا رنگ بساط بہت اچھی کہانی، راشد کا کردار نہایت گھناؤنا تھا، بڑی نفرت محسوس ہوئی۔ ہوش و مدہوش، احمد اقبال کے قلم سے نکلے ہوئے لفظ جادوگری کر دیتے ہیں، اس تحریر کو میں بیسٹ آف شمارہ کہوں گا۔ کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ یہ کہانی ہے ایسا لگا کہ حقیقی تحریر پڑھ رہا ہوں۔ تمام شارٹ کہانیوں میں خاموش جنت اچھی کہانی تھی اور پرفیکٹ مرڈر جاسوسی کے قیمتی اوراق کا زیاں تھا۔ آخر میں میری والدہ محترمہ کے لیے دعا کی اپیل ہے کہ اللہ ان کو صحت دے، آمین۔"

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی تنقید نگاری "دسمبر کے دن اور شامیں اداسی کی لپیٹ میں آجاتے ہیں، نہ جانے کیوں اداسی چھا جاتی ہے۔ ہمیشہ کی طرح حسینہ کی آنکھیں زبردست تھیں۔ سارا شہر دسمبر کی کہر آلودہ شاموں میں اداس ہے مگر یہ محترمہ دھیمی مسکراہٹ سے مسکرا رہی تھی۔ خیر سردی بہت ہے دوپٹا اوڑھا دیتے بے چاری کو۔ بلے او بلے اس دفعہ ہم زاد بھائی سرورق بھی مسکرا رہے تھے۔ ایم عمران جونانی صاحب بھرپور تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ بہت بہت مبارکاں۔ تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ سید شکیل حسین کاظمی اتنے عرصے کے بعد خط لکھا مگر مزہ نہ آیا، بھئی آپ کی پڑوسن کا کیا حال ہے۔ اپنے پیارے سے دوست عاصم سعید کو محفل میں خوش آمدید..... محمد صفدر معاویہ تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ رضوان تنولی کا محبت بھرا تبصرہ پسند آیا۔ نادر سیال آپ کے والد کی وفات کا افسوس ہوا، اللہ ان کی مغفرت کرے آمین۔ نادر سیال بھائی آپ نے مجھے دوست کہا، انشاء اللہ اب آپ کو شکوہ نہیں ہوگا۔ معراج محبوب عباسی، افتخار حسین اعوان، محمد ادریس خان کے تبصرے بہترین تھے۔ پرانے دوست جلد انٹری دیں۔ تفسیر عباس بابر، ماہا ایمان، عائشہ رانی، تصویر العین، سید محی الدین اشفاق، زویا اعجاز پلیز کم بیک۔ انگارے زبردست جارہی ہے۔ تاجاں کا گریز سمجھ میں نہ آیا۔ شاہ زیب کا کریڈٹ یاسر کے سر جارہا ہے، مزہ نہیں آیا۔ انیق کا کردار اہم لگ رہا ہے۔ جاناں کو شاہ زیب نے بچایا بہت اچھا لگا مگر کہانی مزہ نہیں دے رہی بس روٹین وائز پڑھ رہے ہیں۔ آوارہ گرد جھٹکے پر جھٹکے لگا رہی ہے۔ شہزی اور میڈم کی خلش کیا رنگ لاتی ہے اب۔ ممتاز خان بالآخر انجام کو پہنچ گیا۔ رشتوں کے تقدس کا احترام نہ کرنے والوں کا یہ انجام ہوتا ہے۔ کیپٹن داوا اور میڈم کی جوڑی ٹھیک رہے گی۔ شہزی اور عابدہ کو الگ نہ کیا جائے۔ احمد اقبال کی کہانی جمود کا شکار رہی مگر اینڈ اچھا ہوا۔ حامد کو اس کے کیے کی سزا ملنی چاہیے تھی۔ شمائلہ سمجھوتے کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئی۔ انسان وقت کے ہاتھوں مجبور ہو کر فیصلے کرلیتا ہے۔ بہرحال وقت کے ساتھ چلنا عقلمندی ہے۔ پہلا رنگ حرص دوراں کاشف زبیر کے جادوئی قلم کا کمال تھا۔ زبردست کہانی تھی۔ مائرہ کا کردار اچھا لگا۔ دوسرا رنگ بساط پڑھی۔ محمد فاروق انجم بہت اچھا لکھتے ہیں۔ پچھلے ماہ ان کی کہانی زخم خوردہ اچھی تھی، یہ کہانی متاثر کرنے میں ناکام رہی۔"

کراچی سے ادریس احمد خان کی تعریف و توصیف "ہمیشہ کی طرح ٹائٹل لاجواب جس میں ذاکر صاحب کی مناہی شاہکار کی طرح آشکار ہوئی ہے۔ اداریہ میں حالات و واقعات جو ملک و قوم کو پیش ہیں، اس سے بخوبی آگاہی ہوتی ہے۔ ناموں کی فہرست میں سرفہرست ایم عمران جونانی نمایاں تھے۔ ہماری طرف سے مبارکباد۔ آخر خدا خدا کر کے بلدیاتی الیکشن کا مرحلہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ امید ہے کہ عوام کا ایک طویل عرصے سے شکایات کا ازالہ بہتر طریقے سے ہو سکے گا۔ چیں بہ جبیں میں شرکا اپنی آراء سے مستفیض کرتے نظر آئے۔ سب سے پہلے احمد اقبال کی ہوش و مدہوش پڑھی۔ جوان کا خاصہ ہے اس کے مطابق حسبِ حال تھی۔ اس کے بعد ٹھنڈا انتقام پڑھی، اچھی لگی۔ خاموش جنت نے بھی اچھا تاثر دیا۔ گلوریا بھی بہتر کہانی تھی۔ ایک عورت نے کس طرح اپنی فطرت کے عین مطابق اپنے بے پناہ دولت کے مالک شوہر سے چھٹکارا حاصل کرلیا اور اس کے بیٹے کو بھی راستے سے ہٹا دیا کیونکہ وہ دولت کا وارث تھا۔ اس طرح اس نے ایک تیر سے دو شکار کرلیے۔ رہی بات انگارے کی جو طاہر جاوید مغل صاحب کے قلم کا شاہکار ہے تو واقعی اس کے دل سے معترف ہیں کہ بہترین انداز میں جاری ہے اور دلچسپی کا عنصر بدستور برقرار ہے۔ تنویر ریاض کی ناکام فاتح اچھی تحریر تھی۔ چھٹکارا میں ایک شوہر نے اپنی شکی بیوی سے چھٹکارا حاصل کیا۔ مگر اس اکیلے کے بس کا روگ نہیں تھا اس لیے ایک عورت کو ہی استعمال کیا نتیجتاً اس کو من پسند ساتھی مل گیا جس نے جمشید کو بھی اپنے حسن کے جال میں پھانس لیا اور اپنے راستے کی سب سے بڑی دیوار بھی گرادی۔ اپنی شاطر چالوں کے باعث خام گواہی میں شوہر نے اپنی بیوی کو ایک منصوبے کے تحت قتل کردیا مگر ایک چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے آہنی زنجیروں میں جکڑا گیا۔ آوارہ گرد، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی کامیاب تحریر اچھے انداز میں چل رہی ہے۔ ہتھکڑی اور جوکر بھی دلچسپی سے پڑھی گئیں۔ پرفیکٹ مرڈر بھی بہتر تھی۔ کاشف زبیر کی حرص دوراں اور بساط

فاروق انجم کی آخری صفحات کی اچھی تحریریں تھیں جس میں کاشف زبیر کی تحریر بہترین تھی۔''

بہاولپور سے سعید عباسی کی آمد''سب سے پہلے ادارے کے تمام اراکین کو سالِ نو کی مبارک باد پیش کرتے ہیں جن کی دن ورات کی محنت اور کوشش کی وجہ سے ہمیں اتنا پیارا رسالہ پڑھنے کو ملتا ہے۔ ہماری خداوند کریم سے دعا ہے کہ رسالہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کی راہ پر گامزن رہے اور ملک کے ہر کونے بلکہ دنیا کے ہر کونے کونے میں جگمگائے، بہتر سے بہتر بنتا جائے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے پڑھی احمد اقبال کی ہوش و مدہوش۔ کہانی اچھی تھی پر اولین صفحات کا حق ادا نہ کرسکی۔ شائلہ مشکلات میں گھری رہی، احسن کے پاس دولت کی فراوانی تھی اس کے لیے جرمن محاورے سے اتفاق کرنا ہوگا کہ ہر دولت کے پیچھے کوئی جرم موجود ہوتا ہے۔ اس کے بعد کاشف زبیر کی حرص دوراں پڑھی۔ ضیا کا کردار کچھ شروع سے ہی مشکوک لگا۔ پر آخر میں جا کر تو اس نے دنگ ہی کر دیا۔ پوری ماسٹر پلاننگ کے ساتھ مائرہ بھی اس کی برابر کی شریک تھی۔ عمر بھی چھپا رستم نکلا۔ آخر کار ان کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ گل خان کی اردو بھی اچھی لگی۔ کہانی اچھی تھی۔ اس بار منظر امام بھی کیا خوب کہانی لے کر آئے۔ خاموش جنت۔ گردن لائل کو بہلا پھسلا کر اس کی جائداد کو لینے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے بعد محمد فاروق انجم کی بساط شروع کی تو ختم ہونے کا پتا بھی نہ چلا، بڑی خوب صورتی سے لکھی گئی کہانی تھی۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔''

فتح پور لیہ سے سید محی الدین اشفاق کے حوصلہ افزا خیالات''ایک طویل عرصے کے بعد جاسوسی کا وہ رنگ نظر آیا ہے جو اس کی پہچان ہے۔ اولین کہانی احمد اقبال کی ہوش و مدہوش میں کمال دین کی بے بسی، شیما اور حامد کا خطرناک ڈراپ سین اور آخر کار رشتوں کی محبت کا جاگنا اور احسن جیسا شوہر ملنا اور اس کی بے وفائی سب کچھ واضح کرگئی۔ آوارہ گرد میں اس بار شہزی کا خطرناک ایکٹ پسند آیا۔ زہرہ بانو کے ساتھ شادی عجیب بات ہوگی۔ عابدہ کا کردار بہت دھیما ہے اس کو سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ انگارے ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے پڑھی۔ شاہ زیب کا کردار بہترین انداز میں سامنے آرہا ہے۔ اس کے ساتھ انیق کا گٹھ جوڑ مزہ دے رہا ہے اور حشمت کے غلط محاورے کمال ہیں۔ عالمگیر اور سجاول سیالکوٹی کا تال میل آگے بڑا خطرہ بن کر آئے گا مگر طاہر جاوید مغل کا قلم اور شاہ زیب کا حوصلہ سب پر بھاری ثابت ہوگا۔ حرص دوراں میں کاشف زبیر صاحب نے کمال کر دیا۔ پہاڑی علاقے میں ہونے والی یہ خونی لڑائی دولت ہی کے حصول کے لیے تھی...... ضیا اور مائرہ کے ایک ساتھ ہونے کا خیال تک نہیں تھا مگر ایسا قلمی جادو کاشف زبیر ہی چلا سکتے ہیں۔ ٹائٹل گرل ناراض دکھائی دے رہی تھی کیونکہ سید شکیل اس کو تنگ کر رہے تھے اور ہمیں ایک اچھا تبصرہ پڑھنے کو مل گیا۔ ایم عمران جونانی آئے اور چھا گئے۔ لبنیٰ تلوکر ویلکم۔ رضوان تنولی اپنی مخصوص لفاظی کے ذریعے چھا گئے۔ عبادت کاظمی یاد کرتے رہتے ہیں بہت شکریہ۔ افتخار حسین اعوان مبارک باد۔ ایک نئے عیسوی سال کا آغاز ہو رہا ہے۔ ہمیں تمام باہمی لسانی مذہبی اختلافات بھلا کر پاکستانی مسلمان بننا ہوگا۔ تاکہ ہمارا ملک ترقی کی منازل طے کرسکے۔''

میانوالی سے لبنیٰ ریحام تلوکر کا نپا تلا انداز''تمام مسلمانوں کو ربیع الاول مبارک ہو۔ جاسوسی ملا، اپنا خط دیکھ کر سینہ خوشی سے پھول گیا۔ شکریہ کہ آپ نے میرا خط محفل میں شامل کیا۔ افتخار حسین کو شادی مبارک۔ ایم عمران نے بہت دل آویز خط لکھا۔ نادر بھائی کی مشکلات جان کر بہت غم لگا۔ ڈیئر پریشان نہ ہوں۔ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ ہمت رکھیں۔ ساگر بھائی کو دعا و سلام۔ سرورق کی دونوں کہانیاں بہت اچھی اور لاجواب تھیں۔ انگارے بہت پیاری اور لازوال کہانی ہے۔ پڑھیں تو دل کے تار چھیڑ ڈالتی ہے۔ شاہ زیب کے گونگے پن کا بھانڈا لگتا ہے کہ جلد پھوٹ جائے گا۔ سردیوں کی آمد ہے۔ کچھ ایسی کہانیاں شامل کریں جو لحاف میں پڑھتے ہوئے مزہ آجائے۔ سانحہ پشاور اور تقسیم بنگلہ دیش کے پس منظر میں کچھ کہانیاں ضرور شائع کریں۔ لطیفوں کی تعداد زیادہ رکھا کریں، خط شائع کریں گے تو آپ مہربانی ہوگی اور خط لکھنے کی ہمت اور لگن بھی ہوگی۔''

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کی جادوگری''ایک دوسرے میں مدغم، خوب صورت دوشیزہ اور کسی حد تک قبول صورت چالاک مرد ایک دوسرے کے مدِمقابل بھی ہیں۔ ٹائٹل بے حد اچھا تھا۔ اداریے کی کھری کھری باتیں دل کو لگیں۔ چین کی قدرتی آفات سے نمٹنے کی صلاحیت کی اچھی مثال دی ہے لیکن ہمارے وطن میں ایسا ہونا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ اول تو ہمارے مقتدر طبقے کے اپنے جھگڑے ہی ختم نہیں ہوتے تو یہ ترقی کی جانب کیا توجہ دیں؟ (بالکل بجا فرمایا) جونانی کی محنت بھی رنگ لائی۔ واہ کیا لفظوں کی شرارت ہے ساری، بہت اچھا لگا تبصرہ۔ غلام یٰسین تو ناری اور اسد عباس کا مختصر کر انداز بیاں ابھار رہا۔ لبنیٰ ریحام اللہ آپ کے والدین کو صحت دے، آپ کا تبصرہ بھی خوب رہا، ویلکم۔ سید شکیل حسین یہ کیا تھا، تھے، تھی، یہ تو اب بھی پوری آب و تاب کے ساتھ معیاری ہے۔ در ابن کلا سے مرحاگل کے گلے بھی مناسب تھے، البتہ سعید عباسی کے انداز ے حسب سابق تھے۔ ثمر خان اور عاصم سعید کی آمد اچھی لگی اور صفدر معاویہ کی الفاظ گری بھی عمدہ رہی، محمد سرفراز کی عرق ریزی بھی شاندار تھی، رضوان تنولی کی تبصرہ نگاری بھی جاندار تھی۔ بہار حسین آپ سدا خوش رہیں۔ علی محمد آپ کی رفاقت تو لبی ہے لیکن تبصرہ چند لفظوں میں؟ ادریس احمد خان نے بھی زبردست لکھا ہے اور فلک شیر کی لفاظی بھی سب سے جدا ہے، سید عبادت کاظمی، حسینہ کی خاموشی بھی ''ہاں'' ہوتی ہے پھر کیوں منتظر ابھی آپ کی جاں ہوتی ہے؟ ہاہاہا، نادر سیال جو آنکھیں آپ کے لیے بے وفا ہیں، ذرا سوچو کسی اور کے لیے ان میں کتنی وفا ہوگی، آپ کے لیے نہ سہی کسی کے لیے تو خوب صورت ہوں گی نا۔ افتخار حسین آپ کو شادی کی بہت بہت مبارک...... انگارے میں شاہ زیب کا تاجور کے بھائی کو بچانا اس سے دونوں کی محبت کو شہ مل گئی اور ڈاکوؤں سے یاسر کی بہن کو بچالانا اور ان سب کو تہ تیغ کرنا، اس دفعہ تو انگارے کو خوب ہوا ملی اور بھرپور ایکشن مار دھاڑ دیکھنے کو ملی۔ انگارے زبردست رہی۔ آوارہ گرد میں شہزی نے بھی کمال کر

دیا۔ دشمنوں کا اہم ہیڈ کوارٹر نیست و نابود کر دیا۔ ماں جی کے نرم و نازک خیالات پر زہرہ بانو کے لیے دل میں انکار اور اقرار کی کشمکش میں وکھو شہزی کیا فیصلہ کرتا ہے، بہت اچھی رہی آوارہ گردبھی۔ ہوش و مدہوش بھی بہت پسند آئی۔ بچوں کو جنوں نے مارا ہے، چند ماہ پہلے ایسا ہی واقعہ ایک نیوز چینل پر بھی دیکھا۔ قیمتی پتھروں کے لالچ میں معصوم بچوں کا قتل انتہائی گھناؤنی حرکت ہے۔ عمر نے ساتھ رہ کر بچوں کے قاتلوں کا پتا چلایا اور انہیں کیفرِ کردار تک پہنچایا، لائقِ تحسین بات ہے۔ سرورق کی پہلی کہانی حرص دوراں ٹھیک رہی۔ سرورق کی دوسری کہانی بساط ایک دم سے زبردست رہی۔ لوگ بڑے عقلمند ہوتے ہیں۔ بڑی دور تک نگاہ رکھتے ہیں جیسے گروشن جیر اللہ نے ایک عرصہ خاموش جنت میں گزار کر ایک بوڑھے کا دل جیت کر اس سے جائداد اپنے نام کروالی۔ لوگ بھی بڑے فنکار ہوتے ہیں۔ خاموش جنت سے بھی مال بنا لیتے ہیں۔ حیرت انگیز کہانی تھی یہ۔''

بہاولپور سے بشیر احمد بھٹی کی دلی رُوداد ''چینی نکتہ چینی کے ذریعے میری ایک چھوٹی سی کہانی سن لیجیے۔ یہ کہانی ہے اکتوبر 2015ء کے شمارے کی۔ جو بالکل سچی اور حقیقت پر مبنی ہے۔ اکتوبر کا شمارہ میں نے ملتان شہر سے خریدا تھا۔ ایک چھوٹے سے کام کے سلسلے میں، میں ملتان گیا ہوا تھا۔ بک اسٹال پر جاسوسی میاں نظر آئے تو میں نے بے چینی میں فافٹ خرید لیا کہ اپنے شہر پہنچ کے بک اسٹال پر نہیں جانا پڑے گا۔ سیدھا گھر پہنچوں گا اور سب سے پہلے طاہر جاوید مغل صاحب کی انگارے پڑھوں گا۔ کہاوت ہے جس چیز کی شدید طلب ہو وہ پوری نہیں ہوتی۔ میرے ساتھ بالکل یہی معاملہ پیش آیا۔ ملاحظہ فرمایئے! جونہی سفر کر کے میں گھر پہنچا، لائٹ غائب تھی۔ انتظار کی کوفت سے دوچار ہوا۔ لائٹ آئی تو دو تکیے ترتیب سے لگائے تاکہ لیٹ کر آرام سے سب سے پہلے انگارے کی چوتھی قسط کا بھرپور مزہ لوں۔ صفحہ نمبر 94 پر انگارے کا تعارف اور تصویر دیکھی۔ صفحہ 95 پر بھی خاتون کی تصویر، ریوالور اور دو آدمیوں کی دھینگا مشتی کا اسکیچ نظر آیا۔ صفحہ 96 سے چوتھی قسط کا آغاز ہوا۔ اس فقرے سے، وہ مجھے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی عجوبہ دیکھا ہو، مطالعہ کرتے ہوئے جب میں صفحہ 98 پر پہنچا تو طبیعت گڑبڑا گئی۔ صفحہ 98 کے بعد صفحہ نمبر 131 نظر آیا۔ ایک دم 16 ورق اور 32 صفحے غائب۔ سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔'' (آپ سے معذرت چاہتے ہیں کہ آپ کو ذہنی کوفت اٹھانا پڑی۔ بس یہ بائنڈنگ کی غلطی کا نتیجہ ہے)

پشاور سے طاہرہ گلزار کی الف لیلہ ''جاسوسی کا سرورق گزارے حال رہا، انکل ذاکر کو آخر تھوڑا رحم آ گیا۔ اپنے صنف کرخت پر تھوڑا میک اپ شیک اپ کروا دیا۔ کہانیوں کی فہرست میں مغل اعظم اور ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے ساتھ اپنے پسندیدہ رائٹرز کاشف زبیر، جمال دستی، منظر امام اور سکندر علیم حاضر تھے۔ مریم کے خان، آصف ملک اور ناصر ملک کو بہت مس کیا، امید ہے اگلے مہینے ان سے ملاقات ضرور ہوگی۔ چینی نکتہ چینی میں پہنچے اور ایم عمران جونانی کو دیکھ کے دل باغ باغ ہو گیا۔ وزیر کے عہدے پر بھائی غلام یٰسین اپنے منفرد انداز کے ساتھ تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ یٰسین بھائی میک اپ تو بے عورتوں کے لیے اب تو جی مرد حضرات بھی خوب فراوانی کے ساتھ میک اپ کر کے گھر سے نکلتے ہیں۔ مجھے یاد کرنے کا شکریہ بھائی۔ میں مغل اعظم اور احمد اقبال بابا جی اور نواب انکل کے کہنے پر بہت جلد کہانیاں لے کر حاضر ہوں گی۔ اتنے بڑے بڑے رائٹرز نے میرے موضوع کو بہت پسند کیا ہے۔ اسعد عباس دو دو خوشیاں لے کر حاضر تھے لیکن بے چارے کو محبوبہ نے پہچان کر ساتھ چھوڑ دیا۔ اتنے دکھی دل کے ساتھ مختصر تبصرہ لکھا اور ادارے والوں نے بھی آنسو پونچھ کے شائع کر دیا۔ عبدالجبار رومی انصاری بھی اپنی بہت ہی دلچسپ طرزِ تحریر کے ساتھ حاضر تھے۔ اس بار تو رومی نے حکمرانوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ رومی میں 100 فیصد آپ کے ساتھ متفق ہوں۔ یاد رکھنے کا شکریہ۔ سید شکیل کاظمی تو ادارے کو ان کا کام سکھانے لگے تھے۔ بھائی آپ ادارے کو نہ سکھائیں بلکہ اپنے فیس بک کے گروپ کے ممبروں کو تھوڑی تمیز سکھائیں تو بھلا ہوگا۔ خاص کر اپنے کبیر بھائی جان اور قسا دن صاحبہ کو..... ثمر خان بھی اچھے تبصرہ نگار نکلے، آتے رہیے۔ آپ کا جو دوست خفا ہے ان سے التجا ہے کہ بھائی آپ ثمر خان کو معاف کر دیں۔ اچھے دوست بہت کم ملتے ہیں۔ ہائے عاصم سعید، پونے چار لکیروں کا تبصرہ لکھ کر تو بہت تھک گئے ہوں گے، ہاہاہا۔ صفدر معاویہ بھی اپنے منفرد تبصرہ کے ساتھ حاضر تھے۔ میرے استاد چاچا کستوری رضوان تنولی بھی اپنے منفرد طرزِ تحریر کے ساتھ حاضر تھے، ہاہاہا۔ مسز بلقیس کو بلو اور مجھے گلو کہہ کر بہت اچھے لگے۔ پُرخلوص دوست ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مظفر گڑھ سے بھائی بہار حسین ایک بار پھر حاضر، بہار حسین سرورق کی حسینہ کی تعریف میں لفظوں کے پل باندھ رہے تھے، شکریہ بھائی کہ میری باتوں پہ پیار آیا۔ محمد ادریس احمد خان بھائی انسان بہت ڈھیٹ اور ظالم شے ہے۔ ایک بار پھر احمد بھائی اتنا شاندار تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ فلک شیر ملک نے عبدالجبار رومی اور بلقیس خان جیسے بڑے تبصرہ نگاروں کے ساتھ مجھے بھی شامل کیا، شکریہ۔ آپ کا سبق آموز اور دلچسپ تبصرہ بھی بہت شاندار ہے۔ عبادت کاظمی خیر مناؤ حسینہ کی اتنی تعریف نہ کرو ورنہ بھابی کے ہاتھوں تیری خیر نہیں ہوگی۔ ہمیشہ کی طرح ہم سب کو یاد کرنے کے بعد کہانیوں پہ منفرد انداز سے تبصرہ کرتے نظر آتے ہو، بھائی کسی کی نظر نہ لگے۔ نادر سیال بھی اس بار موجود تھے۔ بھائی اللہ آپ کے والد کی مغفرت کرے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے۔ محبوب عباسی میں آپ کی اس بات سے متفق ہوں کہ ہم سب جاسوسی والے ایک فیملی کی طرح ہیں لیکن ہر فیملی کی طرح یہاں بھی چند حاسد، منافق اور گندی ذہنیت والے دشمن موجود ہیں لیکن اللہ ان کا منہ کالا ہی کرے گا انشاء اللہ۔ طاہر جاوید مغل بہت ہی رومانوی اور نفیس محبت بلکہ روحانی محبت کرنے والے انسان ہیں۔ واہ کیا بھرپور تبصرہ ہے۔ افتخار حسین اعوان بھائی شادی مبارک ہو کس بے چاری کی قسمت پھوٹی۔ بھائی تم لوگ یعنی شوہر حضرات اتنے منافق ہوتے ہو، کیوں شادی کرتے ہو جب بیوی کی ذات اتنی بری ہے۔ انگارے اور آوارہ گرد کی تعریف میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ بابر نعیم مختصر تحریر پرفیکٹ مرڈر لے کر حاضر تھے۔ جس میں رابرٹسن اپنے پارٹنر ایلس سے زیادہ عقلمند نکلا۔ مختصر لیکن مغربی معاشرے کی عکاس تحریر تھی۔ سیر بنا راض کی مغربی تحریر جھگڑی بہت زبردست تھی۔ سرورق کی پہلی کہانی حرص دوراں مہم جوئی پر زبردست تحریر۔ کاشف زبیر کی تحریر کا ایک ایک لفظ جادو جگاتا ہے۔ پہاڑوں پر سفر کی ایسی منظر کشی کہ بندہ خود کو ان کے ساتھ پائے۔ مجھے پہلے سے ہی ضیا اور مائرہ پر شک تھا۔ عمر نے واقعی ایف آئی اے کے آفیسر ہونے کا حق ادا کیا لیکن یہ کہانی مجھے لگا کہ 2012ء یا 2013ء کے دسمبر میں بھی پڑھ چکی ہوں۔ پھر بھی ایسی تحریر پر کاشف کو بہت

بہت مبارک باد، ویلڈن کاشی۔ دوسری کہانی بساط محمد فاروق انجم کی زبردست تحریر۔ شوبز کی دنیا کے رنگ لیے راشد کتنا کینہ، حسد کرنے والا ظالم اور قاتل نکلا۔ کہتے ہیں جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ سرمد نے راشد کو قتل کر کے بہت اچھا کیا۔ اس بار تو دونوں سرورق کی کہانیاں لاجواب تھیں۔ فیورٹ رائٹر احمد اقبال کی ایک لازوال تحریر ہوش و مدہوش جاسوسی کے پہلے صفحات کا حق ادا کرنے والی کہانی تھی۔ عورت کچھ بھی کر لے، مرد ذات کے ظلم کے ہاتھوں سے کسی طرح بچ نہیں سکتی چاہے وہ کتنی بھی چالاک ہو۔''

ڈیرہ اسماعیل خان سے عدنان کا اختصاریہ' جاسوسی دو ماہ سے پڑھنا شروع کیا ہے، وہ بھی اپنے پیارے دوست عبادت کی وجہ سے تو پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ عبادت کا تبصرہ بہت اچھا تھا۔ رضوان تنولی کا تبصرہ بھی زبردست تھا۔ انگارے بہت اچھی کہانی ہے، کاشف زبیر نے بہت اچھا لکھا۔''

مانگی سے عابد حسین لغاری کی جسارت'' خطوط میں عبدالجبار رومی انصاری، محمد صفدر معاویہ، طاہرہ گلزار صاحبہ ان کے تبصرے بہترین ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایم عمران جونانی، اسد عباس، مرحا گل ان کے تبصرے بھی بیسٹ تھے۔ آوارہ گرد سب سے پہلے پڑھی، ہر جگہ میر جعفر اور میر صادق جیسے غدار پڑے ہیں اور ان سے شہزاد عرف شہزی جیسے جواں مرد آج بھی لڑ رہے ہیں، انگارے اب رفتار پکڑ رہی ہے۔ ہوش و مدہوش احمد اقبال کے قلم سے لکھی گئی بہترین تحریر تھی اور ان کے علاوہ سرورق کی پہلی کہانی حرص دوراں، کاشف زبیر اور دوسری کہانی بساط، محمد فاروق انجم بہت اچھی تحریریں تھیں۔ کاشف زبیر بھائی کو لکھنے کا فن ہے، اللہ ان کو اور ترقی دے، میرا زندگی میں کسی بھی ڈائجسٹ کو پہلا خط ہے کیونکہ جاسوسی نے اتنا مجبور کیا کہ میں قلم اٹھانے پر مجبور ہو گیا، انشاء اللہ مایوس نہیں کریں گے۔''

شاہ گڑھ سے فلک شیر ملک کی مبارک باد'' 6 دسمبر کا جاسوسی اچھی تحریروں سے مزین تھا۔ ٹائٹل آخری دونوں تحریروں کے مطابق تھا۔ مرحلہ وار بلدیاتی انتخابات ہو رہے ہیں۔ اس دوران بھی لڑائی جھگڑا اور قتل کے کچھ واقعات ہو چکے ہیں، جو ہر انتخاب پر ہوتے ہیں۔ مرتے عوام ہیں اور مزے لیڈر لوٹتے ہیں۔ محفلِ یاراں میں عمران جونانی کا تبصرہ زبردست رہا بس شکوہ یہ ہے کہ جونانی نے اچھے تبصرہ نگاروں میں میرا نام شامل نہیں کیا۔ کوئی بات نہیں بھول گئے ہوں گے یا پھر واقعی ہم اس قابل ہی نہیں تھے۔ غلام یٰسین نوناری، عبدالجبار رومی اور رضوان تنولی کا تہِ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے میرے تبصروں کو محفل کی جان کہا، دوستو، آپ بھی بہت خوب لکھتے ہو۔ نادر سیال کنڈیاں کے والد کی مغفرت کے لیے اور ان کی رہائی کے لیے دعا گو ہوں۔ وہی جانتا ہے جسے چوٹ لگے۔ ہم آپ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں، اللہ پاک آپ کو صبر عطا فرمائے۔ اب ذرا تحریروں پر تبصرہ ہو جائے۔ پہلی تحریر ہوش و مدہوش، بڑی اچھی اور دلفریب کہانی تھی۔ خونی رشتے جیسے بھی ہوں اچھے ہوتے ہیں۔ احسن بذات خود اچھا انسان تھا مگر مغربی ماحول نے اسے بھٹکایا، شیما کا اعتماد اور حوصلہ قابلِ داد ہے جو اس کے شوہر کو راہ راست پر لے آئے گا۔ ٹھنڈا انتقام بھی ہلکے پھلکے انداز میں لکھی گئی اچھی کاوش تھی۔ انتقام لینے کے لیے بیوی نے شوہر کو جہاز لینڈنگ کے دوران قتل کرنے کے لیے ایک گول پتھر کا استعمال کیا۔ یہ ایک انوکھا طریقہ واردات تھا۔ منظر امام نے خاموش جنت، کمال کی لکھی، ڈکلیئر اور گرونن کا منصوبہ کامیاب رہا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم لوگ اپنے بزرگوں کو اولڈ ہوم جیسی قید میں نہیں بھیجتے۔ بس اک خلش اور دکھ ہے کہ ہمارے ملک کے اسپتالوں میں سائیکاٹری وارڈز کے مریضوں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے یا دارالامان میں لاوارث، یتیم بچے بچیوں پر جو ظلم ہو رہا ہے۔ افسوس صد افسوس۔ کبھی کسی نے چیک نہیں کیا۔ یہ بردہ فروشی جیسے مکروہ دھندوں کو بند کرانا حکومت کی ذمے داری ہے۔ گلوریا، سسپنس بھری کتھا تھی۔ وہ عجیب عورت تھی جو اپنے سوتیلے بیٹے سے ناجائز تعلق استوار کیے ہوئے تھی۔ پھر اپنے عاشق نامراد کو پکڑوا بھی دیا یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ انگارے کی چھٹی قسط بھی شاندار رہی۔ شاہ زیب تاجور کے بوسے کے نشے میں ہے۔ لگتا ہے جس یاسر نامی شخص سے اس کی ملاقات ہونے والی ہے وہ بھی شاہ زیب کے گروپ میں شامل ہو جائے گا۔ ناکام فتح، شمالی کوریا اور چین کی دشمنی کے متعلق اچھی اسٹوری تھی مگر اینڈ پسند نہیں آیا۔ حالانکہ یونگ نے امریکی نرس کروڈی کو قید سے رہائی دلوا کر چینی کیمپ تک پہنچایا، مگر کروڈی سے محبت ہو جانے کے بعد بھی اکیلا رہا کیونکہ وہ امریکن تھی ایک چینی سے کیسے شادی رچاتی۔ قوم پرست قومیں ہمیشہ ترقی یافتہ ہو جاتی ہیں۔ چھٹکارا میں شائلہ اور جمشید نے رضوانہ سے چھٹکارا حاصل کر لیا مگر ایک بے گناہ شخص سلمان کو قربانی کا بکرا بنا دیا۔ کبھی کبھی ایسا کرنا پڑ جاتا ہے۔ خوب صورت تحریر تھی۔ خام گواہی، لگتا ہے جمال دتی آج کل گواہی کے موضوع پر دل کھول کر لکھ رہے ہیں۔ کبھی موتیگ چپلی کی گواہی تو کبھی خام گواہی، مختصر اور اچھے انداز میں لکھی گئی قتل کی داستان تھی۔ شیرف کا بیٹا بڑا ذہین نکلا جس نے قاتل کا منصوبہ خاک میں ملا دیا اور مقتولہ ڈورس کے قتل کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ آوارہ گرد صحیح سمت رواں دواں ہے، وزیر جان غائب ہو چکا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ وہ قابو آتا ہے یا نہیں۔ ہتھکڑی، قتل کی زبردست پلاننگ کی گئی تھی مگر قانون کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں۔ ایک بریسلیٹ کی وجہ سے کوننگ گرفتار ہوا۔ پیسے کی ہوس نے انسان کو برباد کر دیا ہے، اچھی تحریر تھی۔ پرفیکٹ مرڈر چھوٹی سی کہانی بڑی دلچسپ تھی۔ ایک ایسی ٹائم مشن کے بارے میں بتایا گیا ہے جسے ایس نے غلط آپریٹ کیا اور رابرٹسن کی ڈیڈ باڈی کو ماضی کے بجائے حال میں بھیج دیا اور خود اپنی جان گنوا بیٹھا۔ سرورق کی پہلی کہانی حرص دوراں لکھنے کا انداز زبردست تھا مگر جس موضوع پر یہ تحریر لکھی گئی، اس سے پہلے بھی کئی دفعہ اس سے ملتی جلتی کہانیاں پڑھ چکا ہوں۔ مثلاً کالے نایاب بچھوؤں اور قیمتی پتھروں کے متعلق پہلے بھی بہت لکھا جا چکا ہے اور جو چیز ایک دفعہ پڑھ لی جائے، وہ دوبارہ مزہ نہیں دیتی۔ بساط سرورق کا دوسرا رنگ بہت خوب صورت تھا۔ محمد فاروق انجم نے ہر ہر سطر دلکش انداز میں لکھی۔ فاریہ نے مار تو بہت کھائی مگر سرمد کی شریکِ حیات بن گئی۔ راشد جونی اپنے انجام کو پہنچا۔ انسپکٹر جلیس احمد بری طرح فیل ہو گیا اور اپنے بیٹے کی پٹائی کا بدلہ بھی ادھورا رہ گیا۔ تجسس اور سسپنس سے بھرپور داستان تھی بلکہ نمبر ون تھی۔ کترنوں میں خیام

پیرزادہ نے خوب ہنسایا۔ رحیم النسا بیگم کے دونوں مراسلے خوب تھے۔ ایک اچھا رسالہ پیش کرنے پر تمام اہلِ ادارہ کو مبارک باد۔“

پشاور سے ناصر علی کا اندازِ تحریر ”اس بار چھ چکر لگانے کے بعد 5 تاریخ کو جاسوسی ڈائجسٹ مل گیا۔ سرورق اتنا خاص نہیں تھا۔ سید حاد دوستوں کی محفل میں پہنچا۔ محفل میں سرفہرست تبصرہ ایم عمران جونانی کا تھا۔ اس کے بعد میرا پیارا دوست غلام یٰسین موجود تھا۔ موصوف نے اس بار جاسوسی اور سسپنس دونوں میں حاضری لگائی۔ فلک شیر ملک کا تبصرہ کافی اچھا اور بڑا جاندار تھا۔ چوہدری محمد سرفراز صاحب آپ واقعی جینئس ہیں۔ نادر سیال صاحب اللہ تعالیٰ آپ کے والدِ محترم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے اور آپ کو آزادی نصیب ہو جائے اس کے علاوہ عبدالجبار رومی، مرحا گل، محمد صفدر معاویہ، رضوان تنولی، سید عبادت کاظمی، معراج محبوب عباسی اور افتخار حسین اعوان کے تبصرے اچھے تھے۔ ان کے علاوہ پشاور کے کچھ دوست غائب ہیں جیسا کہ عثمان غنی، انجینئر عمیر شہزاد بنگش اور حدیثہ کرن آپ سب کہاں غائب ہیں۔ سب حاضری لگاؤ۔ کترنوں میں سید ممتاز علی، مرحا گل اور مائدہ گل کے انتخاب اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ شاہ زیب نے اس بار کمال کر دیا۔ سجاول سیالکوٹی اور عالمگیر کی تصویریں کھینچ لیں اور ان کو نائب تحصیل دار صولت کے گھر تک پہنچا دیں، اس بار انتہائی سسپنس سے بھرپور قسط تھی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ اس کے بعد آوارہ گرد پڑھی۔ ایکشن ہی ایکشن تھا۔ مجھے لگا تھا اسپیکٹرم کا کھیل ختم ہو گیا ہے۔ حرص دوراں بہت اچھی اسٹوری ہے، عمر کا کردار مجھے بہت پسند آیا۔ کتنی خوب صورتی سے قاتلوں کو پکڑا۔ بساط میں راشد کے ساتھ نفسیاتی مسائل تھے۔ اس نے پہلے بیوی کے ساتھ برا سلوک کیا تھا۔ سرمد صحیح وقت پر پہنچ کر ماریہ کو بچانا۔ ہوش و مدہوش اچھی کہانی تھی۔“

جتوئی سے چوہدری محمد سرفراز کی قلم نگاری ”ماہ دسمبر کے جاسوسی ڈائجسٹ کے انتظار میں وہی حال تھا جو آج کل دسمبر میں بے چارے عاشقوں کا ہوتا ہے۔ انتظار، انتظار اور بس انتظار۔ محبوب کا وہ وعدہ ہی کیا جو وقت پر پورا ہو۔ سرورق کا جائزہ لیا تو عرصہ دراز کے بعد قابلِ ذکر چیز صنفِ کرخت کا ذرا بہتر حالت میں ہونا تھا۔ وگرنہ ایسے ایسے تجریدی آرٹ بنائے جاتے ہیں اس صنف کے کہ الامان الحفیظ۔ ایک اور قابلِ ذکر چیز ٹائٹل گرل کی گردن تھی جسے زرافے سے تشبیہ دینا غلط نہ ہوگا۔ خیر چیتی نکتہ چینی کا رخ کیا تو محفل میں ایم عمران جونانی کو براجمان پایا۔ بہت اچھا تبصرہ تھا اور ان کی اس رائے سے پورا اتفاق کروں گا کہ اگر کلاسیکی ادب سے کچھ تحریریں شامل کر لی جائیں تو مزید بہتری آئے گی۔ غلام حسین نوناری دوسرے نمبر پر تھے۔ آپ کے چار لفظ خوب صورت تھے۔ عبدالجبار رومی انصاری نے کہانیوں کے ساتھ دوستوں کے خطوط پر بھی خوب تبصرہ کیا۔ یاد کرنے کا شکریہ۔ مرحا گل صاحبہ، ہماری کیا مجال جو صنفِ نازک کی شان میں گستاخی کرنے کا سوچیں بھی۔ وہ تو بس ایک معصوم سی حقیقت بیان کر رہا تھا۔ سعید عباسی نے اہالیانِ چیتی نکتہ چینی کے لیے ایک لائن میں خوب پیغام دیا۔ آزمائش شرط ہے۔ محمد صفدر معاویہ صاحب، اگر وفا اور بے وفائی آنکھوں سے جھلکتی تو پھر شاید ہی کوئی شخص دھوکا کھاتا۔ جنہیں دھوکا دینا ہو وہ آنکھوں سے تو کیا کہیں سے بھی محسوس نہیں ہونے دیتے۔ اپنے رضوان تنولی کریزوی کی لفاظی کے تو کیا کہنے۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بیان کرنا کوئی ان سے سیکھے۔ سید شکیل کاظمی کے شکوے اس لیے سر پر سے گزر گئے کہ گلے شکوؤں کے بعد کاظمی صاحب نے آخری لائن کچھ اس انداز میں لکھی کہ ان گلے شکوؤں کو بھی مشکوک بنا ڈالا۔ نادر سیال! آپ کے والدِ محترم کی وفات کا پڑھ کر نہایت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ طاہرہ گلزار صاحبہ محفل سے غیر حاضر رہیں۔ ان کی طویل بیانی کو بہت زیادہ مس کیا۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی انگارے کے تانے بانے ایک مرتبہ پھر دراب فیملی سے جا کر ملنے لگے ہیں۔ یہ چیز معاملات کو سلجھانے کے بجائے اور الجھائے گی اور شاہ زیب کو کھل کر سامنے آنا ہی ہوگا۔ رہی بات تاجور کی تو اس کا کردار ایک پہیلی کے مانند سامنے آ رہا ہے۔ کبھی شاہ زیب کو لفٹ دینا اور کبھی بالکل ہی سائیڈ لائن کر دینا اور تیسری طرف ایک نئے کردار یاسر بھائی کی نیو انٹری ہو رہی ہے۔ یہ ساری چیزیں مل کر اس تحریر کو مزید چار چاند لگائیں گی۔ ابتدائی صفحات پر احمد اقبال کی ہوش و مدہوش کا اگر ایک سطر میں خلاصہ کیا جائے تو وہ کچھ یوں ہوگا۔ زندگی کمپرومائز کا دوسرا نام ہے۔ زندگی اتنی تیز ہو گئی ہے کہ یہاں قدم قدم پر کمپرومائز اور ایڈجسٹمنٹ کرنی ہی پڑتی ہے۔ دوسری صورت کتابی باتوں اور اصولوں کی رہ جاتی ہے جن پر عمل کر کے مشکلات میں اضافے کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ نت نئے موضوعات پر لکھنا اور وہ بھی اس انداز میں کہ قلم کا پورا پورا حق ادا کیا جائے۔ اس معاملے میں کاشف زبیر صاحب کا کوئی ثانی نہیں۔ پہلا رنگ حرص دوراں میں انہوں نے اپنے اس ٹریک ریکارڈ کو برقرار رکھا۔ پچھلے دنوں شمالی علاقہ جات میں جنوں کے ہاتھوں بچوں کے مارے جانے والے واقعات کی میڈیا نے خوب کوریج کی۔ یہاں تک کہ وہاں کے ایک حکومتی وزیر نے اس فرسودہ کہانی کی بہانگِ دہل تائید بھی کی۔ کاشف زبیر صاحب نے یقیناً اسی موضوع پر ریسرچ کی اور اسے کہانی کی شکل میں حقائق کے ساتھ پیش کیا۔ دوسرا رنگ بساط اگرچہ پہلے رنگ کے مقابلے میں کچھ سلو رہا مگر پھر بھی انٹرسٹنگ تحریر تھی۔ اس قسم کی تحریروں میں عموماً بہت ساری جگہوں پر جھول رہ جاتا ہے مگر رائٹر نے اس چیز کا پورا پورا خیال رکھتے ہوئے ہر سچویشن کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔ ٹھنڈا انتقام کسی انتقام سے زیادہ خودکشی پر مبنی تحریر لگی۔ جس میں خوش قسمتی سے خودکشی انتقام میں بدل گئی۔ منظر امام کی خاموش جنت میں اچھا خاصا سسپنس تھا اور اختتام تک اندازہ نہ ہو سکا کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ سلیم فاروقی کی چھنکار کی ابتدا تو اچھی تھی مگر اختتام اتنا مصنوعی اور غیر فطری سا تھا کہ سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔ ایک دم سے ایک نئے کردار کو ڈال کر اختتام کرانا تحریر سے جیسے جان ہی نکل گئی ہو۔ جمال دستی کی خام گواہی مختصر مگر اچھی تحریر ثابت ہوئی۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔
محمد اقبال، کراچی۔ میمونہ عزیز، لاہور۔ کاشف رفیق، کوٹری۔ انصار احمد، کراچی۔ وقار الحسن، میرپور خاص، سونیا جنید، حیدرآباد۔

امجد رئیس

پگھلتے لمحے

تین افراد کے کنبے پر گزرنے والے قیامت کے وہ پگھلتے لمحے جب سفاک اور خون آشام درندوں نے ان کو ایک دوسرے سے جدا کر کے ہولناک مصائب کی بھٹی میں جھونک دیا تھا... آغوشِ اجل میں گھٹتے سانسوں کے ساتھ زندگی کے لیے جدوجہد کرنے والوں کی ہوش رُبا کہانی جو پل پل سنسنی کے رنگ بدلتی ہوئی ایک تحیر خیز انجام سے دوچار ہوئی... گریگ آئلز کے جادو اثر قلم سے نکلنے والی ناقابلِ فراموش تحریر جس میں جرم و سزا کی ازل سے جاری کشمکش کے کئی بہروپ کارفرما ہیں... ایک طرف گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے گھاگ مجرموں کا ہولناک ٹولہ اور دوسری طرف محبت کے مضبوط بندھنوں میں سمٹا ہوا ایک خاندان... جو اپنی بقا کے لیے ہر لہو رنگ معرکے سے نمٹنے کے لیے کمربستہ تھا... خون ریز اور رونگٹے کھڑے کردینے والی ہولناک پیکار کی یادگار داستان جو بھلائے نہ بھولے گی...

مغربی ادب سے قارئین کے لیے امجد رئیس کا انتخاب...

ایک سنسنی خیز اور اعصاب شکن شاہکار...

کل تک مارگریٹ نے اس آدمی کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور آج وہ پوری طرح اس کے قبضے میں تھی۔ اس نے اپنا نام جو بتایا تھا۔ مارگریٹ کو یقین نہیں تھا کہ اس نے اپنا اصل نام بتایا ہے۔ جو کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی، جلد کی رنگت زردی مائل اور بال گہرے سیاہ رنگ کے تھے۔ چمکدار آنکھیں، خیرہ کن شعاع کے مانند دماغ میں اُترنے لگتی تھیں۔ مارگریٹ اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے اجتناب برت رہی تھی۔ جو کو مارگریٹ کی فیملی کے بارے میں تمام معلومات تھیں۔ وہ اس کا مظاہرہ بھی کررہا تھا۔

”مجھے یقین نہیں آتا۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”کیا میں نے کوئی بات غلط بتائی؟“ جو نے سوال کیا۔

”نہیں۔ لیکن تمام رات آنکھوں میں بیت گئی۔ تم نے میری جان نہیں چھوڑی۔ مجھے جانے دو۔“

”یہ تمہارے بیٹے پر منحصر ہے۔“ جو نے مارگریٹ کو گھورا۔

”تم مجھے ماردو، میرے بیٹے کو جانے دو۔“

”تم کیا سمجھتی ہو کہ دن دیہاڑے اور میکڈونلڈ کے سامنے میں تمہیں مارنے کی غلطی کروں گا؟“

اس وقت وہ جو نامی آدمی کے ساتھ اپنی بی ایم ڈبلیو میں بیٹھی تھی۔ بی ایم ڈبلیو ایک

شاپنگ سینٹر کے پارکنگ ایریا میں کھڑی تھی۔ جو میکڈونلڈ ریسٹورنٹ سے پچاس گز کے فاصلے پر تھا... مارگریٹ کا شوہر ایک کامیاب سرجن تھا۔ دیگر باتوں کے علاوہ جو اور اس کے ساتھیوں کو معلوم تھا کہ سرجن گھر پر نہیں ہے۔ مارگریٹ کو اپنے بیٹے پیٹر کی فکر تھی۔ سرجن میڈیکل ایسوسی ایشن کی سالانہ میٹنگ میں شرکت کے لیے گیا تھا۔

''مجھے پروا نہیں ہے کہ میرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ تم پیٹر کو چھوڑ دو، وہ ابھی صرف دس برس کا ہے۔'' مارگریٹ نے پھر کہا۔ وہ گھنٹوں روتی رہی تھی۔ اس کے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔

''اپنا منہ بند رکھو۔'' جو نے بے پروائی سے کہا۔ اس نے بی ایم ڈبلیو کا انجن اسٹارٹ کیا اور اے سی آن کر کے ہائی پر کر دیا پھر اس نے سگریٹ سلگالی۔

''پیٹر کہاں ہے؟'' مارگریٹ کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

جو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سیل فون پر نمبر پنچ کرتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ ''یہ زندگی کے سب سے خراب چوبیس گھنٹے تھے۔''

''جگہ پر ہو؟ او کے۔ ایک منٹ انتظار کرنے کے بعد شروع ہو جانا۔'' جو نے سیل فون بند کر دیا۔

مارگریٹ کو جھٹکا لگا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ ہراساں نظروں سے اطراف میں گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ ''اوہ، تو... اوہ گاڈ، پیٹر! پیٹر!''

جو نے نشست پر سے گن اٹھا کر مارگریٹ کی گردن پر رکھ دی۔

''تم اب تک سب کچھ ٹھیک کرتی آئی ہو۔ اب آخری مرحلے میں سب کچھ تباہ نہ کرو... میری گفتگو کو یاد کرو۔''

مارگریٹ نے آنکھیں بند کر کے سر ہلایا۔ آنسو ایک بار پھر اس کے رخساروں پر پھسلنے لگے تھے۔

بی ایم ڈبلیو سے سو گز دور وسیع و عریض پارکنگ میں ان گنت گاڑیوں کے درمیان سبز رنگ کا ایک پرانا پک اپ ٹرک کھڑا تھا۔ پیٹر پک اپ میں موجود تھا۔ اس کی دونوں آنکھیں بند تھیں۔ اس کے ساتھ اسٹیئرنگ وہیل کے ساتھ ایک آدمی براجمان تھا۔

معاً پیٹر نے آنکھیں کھولیں۔ پہلی چیز جو اسے نظر آئی، وہ میکڈونلڈ ریسٹورنٹ تھا۔ رات سے اس نے ماں کی شکل نہیں دیکھی تھی۔

ریسٹورنٹ پہچان کر اسے کچھ تسلی ہوئی۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ اپنے گھر سے صرف چند میل کے فاصلے پر ہے۔ پیٹر نے آنکھیں مسل کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ خیال آیا کہ گاڑی سے کود کر بھاگ جائے لیکن وہیل تھامے برابر میں جو آدمی بیٹھا تھا وہ پیٹر سے زیادہ تیز تھا۔ اس کا نام باسل تھا۔ پیٹر نے اپنی کلائیاں دیکھیں جو ٹیپ سے باندھ دی گئی تھیں۔

''مسٹر باسل، کیا اب اس کی ضرورت ہے؟'' پیٹر نے بندھے ہوئے ہاتھ اوپر کیے۔ پیٹر نے گزشتہ چوبیس گھنٹوں سے باسل کے سوا کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ باسل اس کے باپ سے بھی چھ انچ لمبا تھا۔ وزن تین سو پاؤنڈ کے قریب تھا۔ اس نے گندہ سا مستریوں والا اوورآل پہنا ہوا تھا۔ آنکھیں چشمے کے پیچھے تھیں۔ موٹے پلاسٹک شیشوں والا عام سا چشمہ تھا۔ پیٹر کے سوال پر باسل نامی شخص متوجہ ہوا۔ اس کی آنکھیں بھی بڑی بڑی تھیں۔ کہا جا سکتا تھا کہ غیر معمولی بڑی آنکھیں تھیں جو حلقوں سے ابل پڑ رہی تھیں۔

''آئی ایم سوری، مجھے تم کو باندھنا پڑا۔ تم بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔'' باسل کی آنکھوں میں معذرت تھی۔

پیٹر کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ ''مام کہاں ہیں؟ تم نے کہا تھا کہ وہ یہاں آجائیں گی۔''

''میں نے ٹھیک کہا تھا، بچے۔ غالباً وہ یہاں پہنچ چکی ہوں گی۔''

پیٹر نے گاڑیوں کی متعدد قطاروں میں بی ایم ڈبلیو کو کھوجنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ''مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔'' پیٹر نے شکوہ کیا۔

باسل نے اپنے ہاتھ کا بڑا سا پنجہ اوورآل کی جیب میں ڈالا۔ ''دیکھو لڑکے۔'' اس نے اپنی پچکانا باریک آواز میں کہا۔ اس کی آواز بھاری بھرکم جسم کے برعکس ننھی سی تھی۔ اس کا رویہ بھی بچکانا معصومیت کا حامل تھا۔

پیٹر نے اس کی موٹی آنکھوں میں جھانکا۔

''میں نے تمہارے لیے ایک چیز بنائی ہے۔'' اس نے جیب سے ہاتھ باہر نکال کر بڑی سی مٹھی کھولی۔ اس کی ہتھیلی پر ایک چھوٹی سی ٹرین رکھی ہوئی تھی۔ اس نے یہ کھلونا نما ٹرین پیٹر کے بندھے ہوئے ہاتھوں پر رکھ دی، پھر بولا۔ ''مجھے ٹرین اور اس کی سواری پسند ہے۔ جب میں تمہاری طرح چھوٹا سا تھا تو ماما فوت ہو گئیں اور جو ٹرین میں مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ جو بہت اسمارٹ تھا۔ وہ امیروں کی طرح رہنا چاہتا تھا جبکہ ہم امیر نہیں تھے لیکن جو نے ایک راستہ نکال لیا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ بالکل ٹھیک ہے اور وہ میری

بھی تعریف کرتا تھا۔'' اچانک باسل چپ ہو گیا۔

پیٹر دیوزاد باسل کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چپ ہونے پر اسے پھر مما کی یاد آئی۔ ''مام کہاں ہیں؟''

''مجھے تم سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔'' باسل پھر شروع ہو گیا۔ ''تم چلے جاؤ گے، میں سمجھا تھا کہ تم میرے دوست بن جاؤ گے۔'' باسل نے پھر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس مرتبہ اس نے جیب سے چھوٹا چاقو نکالا تھا۔ چاقو کی مدد سے اس نے پیٹر کے ہاتھ آزاد کیے، پھر ہاتھ بڑھا کر پسنجر ڈور کھول دیا۔

''میکڈونلڈ کے پلے گراؤنڈ میں تمہاری مما انتظار کر رہی ہیں۔ لڑکے، تم جا سکتے ہو۔''

پیٹر کی حیرت دوچند ہو گئی۔ تاہم وہ کچھ بولا نہیں۔ وہ گاڑی کے دروازے سے کودا اور سرپٹ دوڑ پڑا۔

جو نے بی ایم ڈبلیو کا پسنجر ڈور کھول دیا۔ ''تمہارا بیٹا میکڈونلڈ کے پلے لینڈ میں تمہیں ڈھونڈ رہا ہے۔''

مارگریٹ کا دل یکلخت بڑے زور سے دھڑکا۔ اس نے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا، پھر واپس جو کی طرف دیکھا۔ جو بے نیازی سے اسٹیئرنگ وہیل کے چرمی کور کو سہلا رہا تھا۔ وہ ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر اتر گیا اور چابیاں سیٹ پر ڈال کر چل پڑا۔

مارگریٹ کی سانس رکی ہوئی تھی۔ وہ زخمی ہرنی کے مانند تھی اور غیر یقینی نظروں سے اپنے شکاری کو جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ معاً اس کا سکتہ ٹوٹ گیا۔ وہ گاڑی سے اُتر کر میکڈونلڈ کی جانب بھاگی۔

جو سبز پک اپ ٹرک میں سوار ہو رہا تھا۔ باسل نے اسے دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔

''تیئس گھنٹے اور دس منٹ۔'' جو نے گھڑی پر انگلی سے دستک دی۔ ''پہلی مرتبہ 23 گھنٹے گزر رہے تھے۔ آخری گھنٹا اعصاب شکن تھا۔ بہرحال شیرل کو رقم مل گئی۔ کوئی مرا نہ زخمی ہوا... کوئی پولیس، نہ ایف بی آئی... میں جینئس ہوں۔ ماسٹر آف دی یونیورس۔''

''مجھے خوشی ہے کہ معاملہ ہمیشہ کی طرح نمٹ گیا۔'' باسل نے گہری سانس لی۔ ''اس مرتبہ مجھے ڈر لگنے لگا تھا۔''

جو نے قہقہہ لگایا اور باسل کے بڑے سے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''باسو! ایک سال تک موج کرو۔''

دیوزاد باسل کے موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے پک اپ اسٹارٹ کی گیئر بدلا اور پارکنگ سے نکل کر ٹریفک کی روانی میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

ایک سال بعد

ول جیننگ نے اپنی فورڈ ایکسپیڈیشن ائرپورٹ روڈ پر ڈال دی۔ ائرپورٹ سے اڑنے والے جہاز درختوں کے اوپر نمودار ہو کر فضا میں بلند ہو رہے تھے۔ ول جیننگ بھی جہاز اڑانے کے لیے بے قرار تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی کیرین اور ساڑھے پانچ سال کی بیٹی ایمی بیٹھے تھے۔

''اپنی نگاہ سڑک پر رکھو۔'' اس کی بیوی نے ٹوکا۔

''ڈیڈی، اڑتے ہوئے جہاز دیکھ رہے ہیں۔'' ایمی کی آواز آئی۔

ول، عقبی شیشے میں بیٹی کو دیکھ کر مسکرایا۔ وہ، کیرین کی نقل تھی۔ کیرین کا منی ورژن... بھورے بال، سبز آنکھیں، رخسار پر تل...

ائرپورٹ کے قریب پہنچ کر ول نے ایکسپیڈیشن، جنرل ایوی ایشن ایریا کی طرف موڑ دی۔ کنکریٹ کے فرش پر ایک انجن اور جڑواں انجن والے چھوٹے جہاز کھڑے تھے۔ ول کا دل مچل اٹھا۔

''میں جونیئر لیگ میں نہیں جاؤں گی۔ میں بڑے ہو کر پائلٹ بنوں گی۔'' ایمی کی آواز آئی۔

''میں نے سوچا تھا کہ تم ڈاکٹر بننا چاہتی ہو۔'' ول نے کہا۔

''فلائنگ ڈاکٹر۔'' ایمی نے برجستہ جواب دیا۔ میاں بیوی ہنسنے لگے۔ ول نے کیرین کا ہاتھ دبایا اور گاڑی ''بیچ کرافٹ بیرن 58'' کے قریب روک دی۔ وہ سیٹ بیلٹ کھول کر فورڈ سے باہر آ گیا۔ ول نے ایمی کو بھی باہر نکال لیا۔ ''بیرن'' دس سال پرانا ہونے کے باوجود ایک اچھا جہاز تھا۔

ول نے گاڑی کے عقب سے سوٹ کیس کے ساتھ ایک لیدر کیس اٹھایا۔ کیرین دونوں چیزیں لے کر ''بیرن 58'' کی طرف چل پڑی۔ ول نے لیپ ٹاپ اٹھا لیا۔

''کیا تمہیں صبح درد محسوس نہیں ہو رہا تھا؟'' کیرین نے شوہر کی آنکھوں میں دیکھا۔

''نہیں۔'' ول جیننگ نے جھوٹ بولا۔ عام حالات میں وہ ہوائی سفر ملتوی کر دیتا اور ایکسپیڈیشن پر انحصار کرتا لیکن تاخیر ہو گئی تھی۔ ہوائی سفر کے بغیر ''گلف کوسٹ'' پہنچنا ممکن نہ تھا۔ کیرین اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی، وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ تاہم اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔

''بیرن 58 کتنا وقت لے گا؟'' کیرین نے سوال

کیا۔

''پچاس منٹ۔ اگر میں نے زور لگایا تو پینتیس منٹ۔'' بلوکسی میں ''بوریج کیسینو'' میں ول کی آمد شام سات بجے متوقع تھی۔ مسی سپی میڈیکل ایسوسی ایشن کی سالانہ میٹنگ کا آغاز ول جیننگ کے لیکچر سے ہونا تھا۔

''میں لیکچر کے فوراً بعد تمہیں کال کروں گا۔'' پھر اس نے بیلٹ کے ساتھ منسلک پیجر کے بیپر کی طرف اشارہ کیا۔ ''اگر فلائٹ کے دوران تمہیں ضرورت پڑے تو ''اسکائی ٹیل'' استعمال کرنا۔ یہ نیا ڈیجیٹل ہے، بہترین اور ڈیڈ اسپاٹ سے عاری۔''

''میں پیغام ٹائپ کر کے ای میل کی طرح بھیج دوں گی۔''

''رائٹ۔ تم آنسرنگ مشین کو بھی کال کرسکتی ہو۔ وہ پیغام ریکارڈ کر کے مجھے روانہ کر دیں گے۔'' ول نے بتایا۔

ابی نے باپ کا ہاتھ کھینچا۔ ''آپ ہوا میں جا کر پروں کو ہلائیں گے نا؟''

''کیوں نہیں، تمہارے لیے میں ضرور ایسا کروں گا۔''

''ول، تمہارے ہاتھ کیسے ہیں؟ ٹھیک بتاؤ۔'' کیرین نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں، کچھ اکڑن ہے۔'' ول نے تسلیم کیا۔

''تم کیا لے رہے ہو؟''

''درد کش ادویات۔''

''یہ گٹھیا کا علاج نہیں ہے۔'' کیرین نے اعتراض کیا۔

''ہاں، ٹھیک ہے لیکن یہ عارضی ہے۔ میں پرانی دوائی تبدیل کرنے والا ہوں۔ اور ہاں... گھر پہنچ کر الارم سسٹم آن کرنا مت بھولنا۔'' ول نے تاکید کی۔

''ہاں، ابی، ڈیڈی کو گڈ بائے کہو، ان کو دیر ہوگئی ہے۔''

ول نے بیٹی کو گود میں اٹھا کر پیار کیا۔ ''مام کا خیال رکھنا، ان کو تنگ مت کرنا۔'' ول نے کہا۔ ''میں تم دونوں سے اتوار کے دن ملوں گا۔'' اس نے بیٹی کو نیچے اتارا اور ہاتھ ہلا کر جڑواں انجن والے بیرن 58 میں داخل ہوگیا۔

گراؤنڈ کنٹرول سے رابطہ کرنے کے بعد اس نے ائرکرافٹ کو ٹیکسی کرنا شروع کیا۔ جنوب کی طرف جانے کے بجائے وہ گھوم کر فورڈ ایکسپیڈیشن کے اوپر آگیا۔ بلندی 600 فٹ ہوگئی تھی۔ اس نے بیرن 58 کے بازوؤں کو اوپر نیچے کی۔ نیچے ابی دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے اچھل رہی تھی۔

☆☆☆

ائرپورٹ سے پندرہ میل دور شمال کی سمت میں کروک مائل روڈ پر سبز رنگ کا پرانا پک اپ ٹرک موجود تھا۔ ٹرک درختوں سے بھری پہاڑی کے دامن میں آہنی میل باکس کے پاس رک گیا۔ باکس کے سر پر ایک چھوٹا سا جہاز نصب تھا۔ جہاز کے نیچے سنہری الفاظ میں لکھا تھا: JENNINGS۔

یہاں سے ٹرک نے بایاں موڑ کاٹا۔ سامنے ایک طویل اور ترچھا ڈرائیووے تھا۔ ٹرک دھیمی رفتار سے ڈرائیووے میں اوپر جانے لگا۔ چوٹی پر وکٹورین اسٹائل کا بے حد خوب صورت وشاندار گھر بنا ہوا تھا۔ گھر کے چاروں طرف لان کی سبزی مسحور کن تھی۔ خاصی بڑی جائداد تھی جس کی قیمت کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔ پائن اور شاہ بلوط کے درختوں نے وسیع لان کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ گھر کے عقب میں نیلے رنگ کا سوئمنگ پول، نیلے آسمان کے نیچے جھلملا رہا تھا۔

پک اپ نما ٹرک یا ٹرک نما پک اپ، منزل پر پہنچ کر رک گیا۔ اس میں سے دو آدمی اترے۔ ایک جو تھا اور دوسرا باسل۔ لحیم شحیم باسل فرطِ حیرت سے گنگ تھا۔ اس سے پیشتر اس نے ایسا عالیشان گھر نہیں دیکھا تھا۔ وہاں چار عدد گیراج تھے۔ اس نے باری باری دو میں جھانکا۔ ایک میں ٹویوٹا ایولان کھڑی تھی۔ دوسرے میں ایک پاور بوٹ اسٹینڈ پر رکھی تھی۔

ڈرائیووے، گھاس کے اندر پچاس گز تک جا کر ختم ہوگیا تھا۔ جو نے ٹرک سے ٹول بکس نکالا۔ ''چلو، پہلے الارم سسٹم کی خبر لیتے ہیں۔''

بیس منٹ بعد دونوں مکان کے پچھلے دروازے سے باہر آئے۔

''ٹول بکس واپس ٹرک میں رکھ دو۔ ٹرک، ڈرائیووے سے نکال کر درختوں میں لے جاؤ۔'' جو نے باسل کو ہدایات دیں۔ ''ٹرک چھوڑ کر خود واپس آجاؤ۔ مکان کے پیچھے کھڑکی کے پاس خاموشی سے انتظار کرو، سمجھ گئے؟'' جو نے ایک کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں۔'' باسل نے بڑا سا سر ہلایا۔

جو عقبی دروازے سے واپس اندر چلا گیا۔

☆☆☆

کیرین اور ابی واپسی پر پسندیدہ گیت دی ساؤنڈ آف میوزک سن رہے تھے... جیننگ فیملی کی رہائش گاہ

میڈیسن کاؤنٹی میں تھی۔

گیت ختم ہوا تو کیرین نے سیل فون پر نمبر پنچ کر کے پیغام ریکارڈ کرایا۔ ''ہم تمہیں ابھی سے مس کر رہے ہیں۔ جلد آنا... بہت سارا پیار۔''

ایمی کی فرمائش پر کیرین نے وہی گیت دوبارہ لگا دیا۔

☆☆☆

ول، جیکسن کے جنوب میں پچاس میل کے فاصلے پر تھا۔ جیکسن مسی سپی کا کیپٹل سٹی تھا۔ میڈیسن کاؤنٹی، جیکسن کے شمال میں بارہ میل کے فاصلے پر تھی۔ وہ آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر بادلوں کے اوپر پرواز کر رہا تھا۔

GPS یونٹ چیک کرنے کے لیے اس نے کلائی موڑی تو دائیں بازو میں جلتی ہوئی ٹیس اٹھی۔ درد کی نوعیت اس سے زیادہ تھی۔ جتنی اس نے کیرین کو بتائی تھی۔ کیرین اس کی بیماری سے آگاہ تھی۔ ایک ماہ قبل کیرین نے شوہر کو تنبیہ کی تھی کہ وہ ایوی ایشن اتھارٹی کو بتا دے گی کہ ول جینگ ہوابازی کا شوق پورا کرنے کے لیے چیٹنگ کر رہا ہے۔ وہ پوری طرح فٹ نہیں ہے۔ وہ سمجھتی تھی کہ گٹھیا جیسے مرض کے ساتھ ہوابازی کرنے کا مطلب خود کو اور فیملی کو خطرے میں ڈالنے والی بات تھی۔ ول بھی اس کی تشویش کو سمجھتا تھا۔ وہ احتیاط کر رہا تھا اور دوائیں بھی تبدیل کر رہا تھا۔ وہ خود ڈاکٹر تھا لیکن ہوابازی اس کے شوق سے بڑھ کر تھی۔ آج تو بات ہی دیگر تھی۔ میڈیکل ایسوسی ایشن کی سالانہ میٹنگ کا آغاز ہی اس کے لیکچر سے تھا.... تاخیر کے باعث وہ ''بیرن 58'' استعمال کرنے کے لیے مجبور تھا۔ اس کی خیالی رو کیرین کی طرف چلی گئی...

ول نے 1986ء میں میڈیکل اسکول سے گریجویشن کی تھی۔ وہ جیکسن کے یونیورسٹی اسپتال میں ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ جب اس کی ملاقات سبز آنکھوں والی ایک نرس سے ہوئی۔ نرس کی شہرت تھی کہ وہ ڈیٹ پر نہیں جاتی۔ تین ماہ کے صبر و تحمل اور مستقل مزاجی کے بعد ول، نرس کو لنچ پر لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر دونوں نے مڑ کے نہیں دیکھا۔ کیرین کے ساتھ ملاقاتیں دو سال تک جاری رہیں۔ پھر منگنی ہوئی اور ایک سال بعد دونوں نے شادی کر لی۔ ہنی مون کے بعد ول نے پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی۔

دو سال بعد گٹھیا کی علامات نے سر اٹھایا۔ تکلیف بڑھتی گئی۔ وہ آرام طلب شخص نہیں تھا کہ باپ کی دولت پر تکیہ کر کے بیٹھ جاتا۔ دوست سے مشورے کے بعد ول نے اپنا شعبہ تبدیل کر لیا۔ 1993ء کے دوران وہ یونیورسٹی اسپتال جیکسن کے اینستھیسیالوجی ڈپارٹمنٹ میں شفٹ ہو چکا تھا۔ اسی سال کیرین نے نرس کی جاب چھوڑ کر میڈیکل کورس جوائن کر لیا۔ وہ محنت اور کامیابی سے آگے بڑھ رہی تھی...

ول نئے شعبے میں مہارت حاصل کر چکا تھا اور اپنے مرض کو بھی بہتر طریقے سے ہینڈل کر رہا تھا... کیرین امید سے تھی، جب اسے ڈاکٹر بننے کا خواب بکھرتا محسوس ہوا۔ تین ہفتے اس نے سخت کشمکش میں گزارے۔ وہ اپنی منزل سے زیادہ دور نہیں تھی۔ حتیٰ کہ اسقاطِ حمل کے امکان پر بھی غور کیا۔ وہ 33 برس کی ہو چکی تھی۔ بالآخر اس کے ذہن نے بے بی کے حق میں فیصلہ صادر کیا جس کے نتیجے میں ایمی نے جنم لیا۔ کیرین نے بخوشی خاتونِ خانہ کے فرائض نبھانے شروع کر دیے۔

ایمی نے دونوں کی زندگی میں نئے رنگ بھر دیے تھے۔ ول اپنے نئے شعبے میں غیر معمولی کامیابیاں حاصل کر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ اپنے مرض کو بھی اسٹڈی کر رہا تھا جو دھیرے دھیرے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے مرض کے بارے میں اتنا زیادہ جان چکا تھا کہ بہت سے ماہرین کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

معصوم ایمی، بچوں کی ذیابیطس کا شکار تھی۔ ول اب ایمی کے مرض کو اسٹڈی کر رہا تھا... بیپر کی تیز آواز اسے خیالات کی دنیا سے باہر لے آئی۔ ول نے نیا ''اسکائی ٹیل'' بیلٹ سے الگ کیا۔ ریسیونگ بٹن دبا کر پیغام دیکھا۔ ''ہم ابھی سے تمہیں مس کر رہے ہیں۔ جلد آنا... بہت سا پیار۔''

ول مسکرا کر نیچے بادلوں کو دیکھنے لگا۔

☆☆☆

کیرین نے ایکسپیڈیشن، میل باکس کے پاس روکی۔ باکس میں سے چند لفافے اور میگزین نکال کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ گھر کے قریب تھی۔ گاڑی بے آواز روانی سے اوپر جا رہی تھی۔ گھر نظر آنے لگا تھا۔ اسے فخر کا احساس ہوا۔ اس کا نقشہ اس نے ول کے ساتھ مل کر تیار کیا تھا۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ تین افراد کے لیے یہ مکان بہت بڑا ہے۔

ایکسپیڈیشن، طویل ڈرائیو وے میں آگے جا رہی تھی۔ کیرین گاڑی سیدھی گیراج پر لے آئی۔ ریموٹ کنٹرول سے دروازہ کھولا اور گاڑی گیراج میں داخل ہو گئی۔ ایمی نے سیفٹی بیلٹ کھول دی۔ دونوں آگے پیچھے

گاڑی سے اُترے۔
''پہلے چائے پیوگی؟'' کیرین نے استفسار کیا۔
''ہاں،ٹھیک ہے۔''
''نہیں، پہلے میں تمہاری شوگر چیک کروں گی۔''
کیرین نے بیٹی کا ہاتھ پکڑا۔ گھر میں داخل ہوکر وہ ہال وے میں رک گئی۔ دیوار پر ڈیجیٹل الارم پینل میں سیکیورٹی کوڈ پنچ کرنے کے بعد اس نے ریفریجریٹر کا رخ کیا۔
امبی نے اپنے بیڈ روم کے پاس سے گزرتے ہوئے ادھ کھلے دروازے میں سے اندر نگاہ ماری۔ اس کی گڑیاں بیڈ کے سرہانے اسی طرح سجی ہوئی تھیں جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ باتھ روم کی طرف چلی گئی۔ باتھ روم سے نکل کر امبی نے کچن کا رخ کیا۔ ایک بار پھر وہ بیڈ روم کے سامنے سے گزری تو نامانوس سی بُو اس کے نتھنوں میں گھسی۔ امبی نے رک کر بیڈ روم میں جانا چاہا لیکن ماں کی آواز سن کر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ کیرین اسے چائے کے لیے بلا رہی تھی۔
امبی نے بیڈ روم کی طرف سے رخ موڑ لیا۔ رخ بدلتے ہی کوئی گہرے رنگ کی چیز اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔ اس نے اضطراری طور پر ہاتھ اٹھایا، ہاتھ گہرے رنگ کے پیچھے کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا۔ وہ گہرے رنگ کا تولیا تھا، تولیے کے اندر ایک ہاتھ...
امبی نے چیخنے کے لیے منہ کھولا لیکن تولیے والا ہاتھ مضبوطی سے اس کی ناک اور منہ پر جم چکا تھا۔ نامانوس بو میں اضافہ ہوگیا جو تولیے میں سے آرہی تھی۔ بو اس کی ناک کے راستے پھیپھڑوں میں داخل ہوگئی۔

☆☆☆

باسل نروس تھا۔ وہ امبی کے بیڈ روم کی کھڑکی سے جھانک رہا تھا... اس نے اپنے کزن کو دیکھا، جو بازوؤں میں کسی بچی کو اٹھائے بیڈ روم میں داخل ہو رہا تھا۔ بچی لاتیں چلا رہی تھی، لیکن اس کی مزاحمت سرعت سے معدوم ہوتی چلی گئی۔
جو نے کھڑکی کی راہ بچی کو باسل کے حوالے کیا۔ باسل نے زخمی پرندے کے مانند بچی پر نظر ڈالی اور اسے اپنے چوڑے سینے سے لگا لیا۔
''ویری گڈ، باسو۔'' جو کے چہرے پر مکار مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ ''معذرت خواہ ہوں۔ او کے؟ یہ دو سے چار گھنٹوں کے لیے آؤٹ ہوگئی ہے۔ کافی ٹائم ہے۔ تم ہر تیس منٹ بعد کال کرو گے۔ ''ہیلو'' کے سوا کچھ نہیں بولو گے، اب میں خود کوئی سوال نہ کروں اور بیک اپ پلان کو یاد رکھنا۔ سمجھ گئے؟'' جو نے آخر میں سوال کیا۔
''ہاں، مجھے سب خوب یاد ہے۔'' باسل نے جواب دیا۔
''گڈ، اب نکل چلو۔''
قوی ہیکل باسل چلتے چلتے رک گیا۔
''کیا ہوا؟'' جو نے سوال کیا۔
''کیا وہ ایک گڑیا ساتھ لے جاسکتی ہے؟''
جو کھڑکی سے ہٹا اور بیڈ کے سرہانے سے ایک باربی اٹھا کر باسل کو پکڑا دی۔ باسل نے بچی کو احتیاط سے اس طرح سینے سے لگایا ہوا تھا جیسے وہی بچی کی ماں ہو۔ وہ درختوں میں پوشیدہ ٹرک کی طرف جا رہا تھا۔

☆☆☆

کیرین کچن کاؤنٹر پر ''نیوانگلینڈ جنرل آف میڈیسن'' کے اوراق پلٹ رہی تھی۔ دو گلاس آئس ٹی کے کاؤنٹر پر رکھے تھے۔ گلاس کے ساتھ، شوگر چیک کرنے والا پلاسٹک ڈیوائس رکھا تھا۔ اس نے میگزین سے نگاہ ہٹائے بغیر پھر آواز لگائی۔ ''امبی؟ تم ٹھیک ہو، سویٹی؟''
کوئی جواب نہیں آیا۔
کیرین نے مطالعہ کرتے ہوئے گلاس سے ایک سپ لیا۔

☆☆☆

جو کی ہدایت کے مطابق باسل نے انجن اسٹارٹ نہیں کیا تھا۔ بچی کو احتیاط سے لٹانے کے بعد اس نے پک اپ ٹرک کو دھکیلنا شروع کیا۔ وہ اسے اس طرح پش کررہا تھا جیسے عام آدمی بائیک کو لے کر پیدل چلتا ہے۔ پائن کے درختوں کے پیچھے سے ٹرک نکال کر وہ ڈرائیو وے پر لے آیا۔ ڈرائیو وے، پہاڑی پر اوپر سے نیچے جا رہی تھی لہٰذا ڈھلوان پر ٹرک نے خود ہی رینگنا شروع کر دیا۔ اس کی رفتار بڑھنے سے پہلے وہ ٹرک میں بیٹھ چکا تھا۔ سڑک پر پہنچ کر اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور کروک مائل روڈ پر آگیا۔ یہاں سے اس کو ہائی وے 463 پر پہنچنا تھا، پھر وہاں سے انٹراسٹیٹ ...55
ایک لمبی رات آگے تھی۔ اس نے بچی پر پُرشفقت نظر ڈالی اور سفر شروع کیا۔

☆☆☆

کیرین کی سماعت نے گاڑی کے انجن کی مدھم آواز اٹھائی تھی۔ دن کے اس وقت یہ آواز غیر متوقع تھی۔ اس نے کچن کی کھڑکی سے جھانکا لیکن کچھ دکھائی نہیں دیا۔ شاید

ڈیلیوری ٹرک تھا، اس نے سوچا۔

"ایبی؟ کیا تمہیں مدد چاہیے، ہنی۔" اس نے بلند آواز میں کہا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ اچانک خوف نے اس کے ذہن میں سر اٹھایا۔ ایبی کے شوگر لیول سے وہ ہمہ وقت محتاط رہتی تھی۔ وہ کچن سے نکل کر ہال میں آ گئی۔ دفعتاً اس کے قدم زمین میں گڑ کے رہ گئے، وہ حیرت اور ہراس کے عالم میں وہ سیاہ بالوں والے اجنبی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کے ہال میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہو گی۔ اس نے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے ہوئے تھے۔ یکلخت سر سے پاؤں تک کیرین کے مسامات نے پسینہ اگل دیا۔

"ایزی، مسز جیننگ۔" اس شخص نے اطمینان سے کہا۔ "ایبی از فائن۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔ میری بات غور سے سنو۔"

بیٹی کا نام سن کر کیرین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خوف اور دہشت نے اسے مفلوج کر دیا۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی مگر حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ اس کا منہ کھلا لیکن کوئی آواز برآمد نہ ہوئی۔

اجنبی کی آواز آئی۔ "میرا نام جو ہکنی ہے۔ مسز جیننگ! میں تمہاری مدد کروں گا۔ پہلی بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ ایبی خیریت سے ہے۔"

کیرین ابتدائی شاک سے باہر آئی تو جسم نے جھٹکا لیا اور چیخ اٹھی۔ "ایبی... ی..."

"پلیز، سکون سے رہو۔" جو نے نرمی سے کہا۔ "میں جو ہکنی ہوں۔ میں اپنا اصل نام بتا رہا ہوں، کیونکہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تمہیں ایبی کی سلامتی مطلوب ہے اس لیے تم کبھی رپورٹ نہیں کرو گی۔ اس طرح تم، میں اور ایبی تینوں بخیریت رہیں گے۔ یہ میرا غیر لچک دار اصول ہے کہ بچوں کو نقصان نہ پہنچے اور میں اس اصول پر سمجھوتا نہیں کرتا۔"

کیرین نے تڑپ کر اسے راستے سے ہٹایا اور ایبی کے کمرے کی طرف بھاگی۔ کمرے کے بعد باتھ روم کو دیکھا، پھر تمام گراؤنڈ فلور چھان مارا۔ وہ ایبی کو آوازیں دیتی جا رہی تھی۔ بعد ازاں وہ پہلی منزل پر آ گئی۔ تاہم ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ ایبی غائب تھی۔ کیرین نے فون اٹھا کر 911 ملایا۔ آپریٹر کے بجائے دوسری طرف سے مناجات کی آوازیں آنے لگیں۔ یقیناً جو نے کچن فون سے [illegible] ملا کر ریسیور واپس نہیں رکھا تھا۔ اس نے فون پٹخا اور بیڈروم میں آ کر پرائیویٹ لائن کو آزمایا۔ اس لائن پر موسم کا حال بتایا جا رہا تھا۔

کیرین نے بددلی سے فون رکھا اور آئینے میں اپنے عکس کو گھورنے لگی۔ اس نے سوچا بدحواس ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس کا واسطہ ایک مکار آدمی سے پڑا ہے، جو پوری تیاری کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ وہ واپس گراؤنڈ فلور پر آئی اور دبے قدموں ہال وے سے گزر کر ماسٹر بیڈروم میں گھس گئی۔ دروازہ اس نے اندر سے بند کر لیا۔ دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ کرسی پر کھڑے ہو کر اس نے الماری کے سب سے اوپر والے شیلف پر ہاتھ گھمایا۔ ول کا ریوالور اس کے ہاتھ آ گیا۔ کیرین نے سلنڈر کھول کے چیک کیا۔ چھ راؤنڈ موجود تھے۔ سلنڈر واپس جگہ پر کر کے وہ کرسی سے نیچے اتر آئی۔ پسٹل ہاتھ میں آتے ہی اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ بیڈروم کا دروازہ کھول کر اس نے کچن کا رخ کیا۔ کچن کے باہر وہ رک گئی اور اندر جھانکا۔ جو نامی شخص کچن ٹیبل کے ساتھ اطمینان سے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کیرین کا نکالا ہوا آئس ٹی کا گلاس تھا۔

غصے کی لہر آئی اور کیرین نے اندر گھس کر گن تان لی۔

"کہاں ہے میری بیٹی؟"

جو نے گلاس نیچے رکھ کر۔ 38 کی گن کو پھر کیرین کی جانب دیکھا۔

"کیرین، تم مجھے شوٹ کرو گی؟ کیا میں تمہیں کیرین کہہ سکتا ہوں؟"

کیرین نے گن کو جنبش دی اور سوال دہرایا۔ "ایبی کہاں ہے؟"

"ایبی محفوظ جگہ پر ہے لیکن اگر تم نے مجھے گولی مارنے کی غلطی کی تو تیس منٹ کے اندر وہ ختم ہو جائے گی اور میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔" مسلح کیرین کو دیکھ کر جو کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

کیرین کو لگا جیسے کسی نے اسے بلند پہاڑی سے کھائی میں پھینک دیا ہو۔ اس کے پیٹ میں اینٹھن سی ہونے لگی۔ "مجھے بتاؤ کیا ہو رہا ہے؟ تم کیا چاہتے ہو؟"

"دھیان سے سنو کیرین۔ یہ اغوا برائے تاوان کا کیس ہے اور کچھ نہیں۔ اوکے؟ پیسوں کا معاملہ ہے۔ ایبی اس وقت میرے کزن باسل کے پاس ہے۔ باسل کے پاس سیل فون ہے۔ اگر میں نے تیس منٹ کے وقفوں سے اسے کال نہیں کی یا اس کی کال کا جواب نہیں دیا تو وہ ایبی کو مار دے گا۔ اگرچہ وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا لیکن مجبوری کی

حالت میں اسے کرنا پڑے گا۔ یہ میرا بے لچک دوسرا اصول ہے۔ اس لیے تمہارے پاس کسی قسم کی حماقت کی گنجائش نہیں ہے۔ نہ تم پولیس سے رابطہ کرسکتی ہو۔ تیس منٹ میں پولیس کچھ نہیں کرسکتی۔'' جو مسکرانے لگا۔

''تم اسمارٹ عورت ہو اور باسل اچھا بندہ ہے۔ وہ بچوں سے پیار کرتا ہے، کیونکہ وہ خود بھی بچوں جیسا ہے۔ شروع سے میں ہی واحد شخص رہا ہوں جس نے اس کا خیال رکھا ہے اس لیے وہ میری ہر بات مانتا ہے۔ لہٰذا تم یہ گن استعمال کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔''

کیرین نے گن کو دیکھا۔ اس کا ہاتھ بوجھل ہونے لگا۔ جو کے اعتماد نے اسے نڈھال کردیا تھا۔

''تم خاصی سمجھ دار ہو۔ میری باتوں پر دھیان دو۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا، یہ اغوا برائے تاوان کا معاملہ ہے لیکن یہ ایسا نہیں ہے، جیسا تم نے ٹی وی یا فلموں میں دیکھا ہوگا۔ یہ ایک آرٹ ورک ہے۔ پرفیکٹ کرائم۔ میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں۔ کیونکہ یہ کام میں پہلے بھی پانچ مرتبہ کامیابی سے سرانجام دے چکا ہوں اور کبھی پکڑا نہیں گیا۔''

کیرین لرز اٹھی۔ اس کا گن والا ہاتھ غیر متوازن ہوتا جارہا تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہی ہو۔'' وہ پھر گویا ہوا۔ ''یہی کہ پانچ مرتبہ بچوں کا کیا بنا؟ آج کے دن اس وقت تک پانچوں بچے آزاد نہ خطرے سے عاری زندگی گزار رہے ہیں۔ تمہیں پتا ہے کیوں؟ اس لیے کہ ان کی ماؤں نے مجھے شوٹ کرنے کی حماقت نہیں کی تھی اور ان کے باپ... انہوں نے دماغ ٹھنڈا رکھتے ہوئے تاوان کی رقم ادا کردی تھی۔ ایسا ہی تم لوگ بھی کروگے۔''

کیرین گن چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ تاہم اسے شدید بے بسی کا احساس ہوا۔ اس نے گن کچن ٹیبل پر رکھ دی۔

''ویری گڈ۔'' جو نے تعریف کی۔ ''تم ایک اچھی اور محبت کرنے والی ماں ہو۔ تم وہی کررہی ہو جو کوئی بھی سمجھ دار ماں ایسی صورت حال میں کرسکتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ تمہارا شوہر بھی تمہاری طرح ایک معقول شخص ثابت ہوگا۔''

خوف نے کیرین کے اعصاب کو کچل ڈالا۔ ''کہاں ہے ول؟ کیا، کیا ہے تم نے اس کے ساتھ؟''

جو نے گھڑی دیکھی۔ ''تمہارا شوہر اس وقت فضا میں ہوگا، بلوکسی کے قریب... وہ ''بیوریج کیسینو ریسورٹ'' میں افتتاحی تقریر کرے گا۔ تقریر کے بعد اس کی ملاقات میرے پارٹنر سے ہوگی اور اسے پتا چل جائے گا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے، نیز اسے کیا کرنا ہے

جو کی معلومات نے کیرین کو مایوسی کے اندھیرے میں پھینک دیا۔ جو اور اس کے ساتھی سب کچھ جانتے ہیں۔ وہ مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ وارد ہوئے تھے۔ وہ کیا کرسکتی ہے۔ خوف اور اندیشے اسے سوچنے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔

''ہم رات ایک ساتھ گزارتے ہوئے انتظار کریں گے۔'' جو نے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' کیرین لرز اٹھی۔

''یہ آپریشن چوبیس گھنٹے کا ہے۔ ٹھیک چوبیس گھنٹے۔ بیس گھنٹے باقی ہیں۔''

''لیکن ہم انتظار کیوں کریں گے؟ تمہیں رقم سے غرض ہے، وہ میں ادا کردوں گی۔ تم ایبی کو واپس لے آؤ۔''

جو نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کیرین میں جانتا ہوں کہ تم ادائیگی کرسکتی ہو لیکن یہ ہمارا طریقۂ کار نہیں ہے۔ ہر کام ٹائم ٹیبل کے مطابق ہوگا۔ کتنی خوب صورت جگہ ہے۔ ہم کھانا کھائیں گے... ایک دوسرے کو جاننے کی کوشش کریں گے۔ سب اچھا ہوگا۔ مجھے پیسے مل جائیں گے اور تمہیں ایبی۔''

غصے کی لہر نے خوف کو پسپا کیا۔ کیرین کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''میری بھی سنو، یو سن آف بچ۔''

چند ثانیے کے لیے جو کے چہرے کا رنگ بدلا، پھر وہ سنبھل گیا۔

''موجودہ حالات میں تمہارا ردِعمل ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے کتا بننے پر مجبور مت کرو۔''

کیرین نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ''اگر ہم بیس گھنٹے یعنی کل تک انتظار کرتے ہیں تو ایبی ویسے ہی مر جائے گی۔''

''بکواس۔''

''بکواس نہیں ہے۔ ایبی کو بچکانا ذیابیطس کا مرض لاحق ہے۔ انسولین کے بغیر وہ مرجائے گی۔''

''ڈراما نہیں کرو۔''

''مائی گاڈ... کیا تم نہیں جانتے؟''

''کوئی ثبوت؟''

کیرین نے بڑھ کر ایک دراز کھولی اور ایک پلاسٹک بیگ باہر نکالا۔ بیگ میں سرنج اور سوئیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس نے بیگ میز پر الٹ دیا۔ بعدازاں ریفریجریٹر کھول کر

ایک درجن کے قریب شیشے کی وائلز نکالیں۔ جو نے ایک وائل اٹھا کر لیبل پڑھا اور اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔
''لعنت ہے، ناقابلِ یقین۔'' پہلی بار اس کے اعتماد میں تفکر کا عنصر دکھائی دیا۔ یہ انکشاف اس کے منصوبے سے متصادم تھا۔
''کچھ کرو۔ ایک گھنٹے کے اندر اسے کوڈوز دینا ہے۔ وہ یہاں سے کتنی دور ہے؟'' کیرین کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔
''نہیں ہم نہیں جاسکتے۔'' جو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
کیرین نے لپک کر پسٹل 38. دوبارہ اٹھالیا۔ نشانہ جو کا سینہ تھا۔
''میں نے بتایا نہیں تھا، گن استعمال کرنے کا نتیجہ؟''
''کیا فرق پڑتا ہے؟ ابھی نہیں تو تم بھی نہیں۔'' کیرین نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
جو نے دونوں ہاتھ بلند کیے۔ ''آرام سے، آرام سے... بیٹھ جاؤ۔ میرا مطلب تھا کہ ہم فوری طور پر نہیں جا سکتے۔ ابھی محفوظ جگہ پر ہے۔ ہم بعد میں جاسکتے ہیں۔ اسے انسولین دینے میں کتنا وقت ہے؟''
کیرین نے دماغ میں حساب کتاب جوڑا۔ اگر ابھی مٹھاس کم مقدار میں استعمال کرتی ہے تو رات نکال لے گی۔ لیکن کیرین رسک نہیں لے سکتی تھی اگر جو کے کزن نے اسے کوئی میٹھی چیز کھلادی... چاکلیٹ کینڈی وغیرہ...
''بچکانا ذیابیطس بڑی غیر یقینی ہوتی ہے۔'' وہ بولی۔ ''اگر ابھی نے زیادہ میٹھی خوراک لی تو وہ کومے میں جاسکتی ہے۔ اس کے بعد موت کا سفر بہت تیزی سے مکمل ہوگا۔''
جو نے نچلا ہونٹ چبایا۔ وہ دماغ میں اپنا حساب جوڑ رہا تھا۔ پھر وہ میز سے ہٹ کر رکھی ڈیسک پر گیا جہاں بل اور رسالے پڑے تھے۔ وہاں سے کورڈلیس فون اٹھا کر اس نے نمبر پنچ کیے۔ کیرین نے قدم بڑھا کر اسپیکر کے بٹن پر ہاتھ مارا۔ جو نے نیچے دیکھا۔ وہ اسپیکر کا سوئچ آف کرنا چاہ رہا تھا... اسی اثنا میں دوسری جانب سے مردانہ آواز آئی۔
''جو، تیس منٹ ہوگئے کیا؟''
''نہیں۔ آئی ایم سوری... لیکن تم کو صرف ہیلو بولنا تھا۔''
''اوہ ہاں، معاف کرنا۔'' جو کے کزن کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی بڑا بچہ بول رہا ہو۔
''بچی کا کیا حال ہے؟'' جو نے سوال کیا۔
''ٹھیک ہے۔ وہ سو رہی ہے۔''
''مجھے بات کرنے دو۔'' کیرین نے گن کو حرکت دی۔ وہ مضطرب ہوگئی۔
جو نے ہاتھ اٹھا کر اسے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ ''ابھی بات نہیں کر سکتی۔ وہ بے ہوش ہے۔''
''کیا... ا... ا... ؟'' کیرین چلا اٹھی۔ ''تم نے کیا دیا ہے، اسے؟ یُو باسٹرڈ...''
جو، تھوڑا سا اٹھا اور کیرین کے پیٹ میں گھونسا مارا۔ ضرب کی شدت نے کیرین کے پھیپھڑوں سے ساری ہوا نکال دی۔ وہ دہری ہو کر فرش پر گری۔ گن اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔
''باسو، غور سے سنو۔ بچی کو کوئی میٹھی چیز مت کھلانا۔''
''اسے سیال اشیا کی ضرورت ہے۔'' کیرین نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''پانی... زیادہ پانی۔''
''باسو، لڑکی کو پانی زیادہ پلاؤ۔ اوکے؟''
''ٹھیک ہے۔'' دوسری طرف سے بچوں جیسی الجھن زدہ آواز آئی۔
''شاید مجھے رات میں وہاں آنا پڑے۔'' جو نے عندیہ دیا۔
کیرین کو امید کی کرن دکھائی دی۔
''گاڑی کی رفتار کم کردو۔'' جو نے ہدایت جاری کی۔
''اوکے۔''
''گڈبوائے۔'' جو نے رابطہ منقطع کر دیا۔
جو، کیرین کے قریب بیٹھ گیا۔ ''میرا پارٹنر تمہارے شوہر سے رابطہ کرے گا۔ آگے چلنے سے پہلے ہمیں تمہارے شوہر کا ردِعمل دیکھنا ہے۔ آیا وہ ہمارے ساتھ ایک پیج پر ہے یا نہیں۔ ممکن ہے ذیابیطس والا معاملہ اسے بھڑکا دے۔ تاہم میں امید کرتا ہوں کہ وہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھائے گا۔ اگر مسٹرول نے کوئی غلط حرکت کی تو پھر ساری دنیا کی انسولین بھی ابھی کو نہ بچا سکے گی۔'' جو دھمکی دے کر کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

جیکسن کے جنوب میں چالیس میل دور جنگل کا ایک چھوٹا سا قطعہ درختوں سے صاف تھا۔ اس صاف شدہ قطعہ اراضی میں ایک اے ایم سی ریمبلر کھڑی تھی۔ ریمبلر سطح زمین کے بجائے بلاکس کے اوپر کھڑی تھی۔ ریمبلر کے قریب ایک چھوٹا سا کیبن نما گھر تھا۔ اطراف میں درخت اور درختوں کے درمیان سے ایک تنگ کچا راستہ، صاف شدہ

قطعے میں آرہا تھا۔ سورج کی روشنی کم اور پرندوں کی آوازیں زیادہ تھیں۔

جنگل میں ایک نئی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ گاڑی کے انجن کی آواز تھی۔ درختوں میں کچے راستے پر ایک گاڑی نمودار ہوئی جس کا رنگ سبز تھا۔ یہ پرانا پک اپ ٹرک تھا، جو کیبن کے پاس آکر رک گیا۔ انجن بند ہوگیا اور گاڑی میں سے بھاری بھرکم باسل عرف باسو باہر نکلا۔ باربی ڈول اس کی جیب میں سے جھانک رہی تھی۔ اس نے احتیاط سے ابھی کا بے حس و حرکت جسم بازوؤں میں سنبھالا اور کیبن نما گھر میں لے گیا۔

☆☆☆

بیرن 58 نے گلف پورٹ۔ بلوکسی کے ائرپورٹ پر لینڈ کیا۔ گراؤنڈ کریو کے اشارے پر بیرن 58 جنرل ایوی ایشن ایریا میں خالی جگہ پر رک گیا۔ پنکھوں کی گردش تھمی تو ول باہر نکلا۔ اس کا مختصر سامان اس کے ساتھ تھا۔ کچھ دیر بعد وہ کرائے پر حاصل کردہ فورڈ ٹیمپو میں محوِ سفر تھا۔

دوا کی خوراک لینے کے باوجود اس کے جوڑوں میں دکھن تھی۔ کیسینو کے میٹنگ روم میں پہنچنے کے لیے ایک گھنٹے سے بھی کم وقت بچا تھا۔ 90SU ہائی وے پر آکر اس نے خطرہ مول لیا اور حدِ رفتار توڑ دی۔ وقت پر پہنچنے کے لیے وہ ٹریفک پولیس کا ٹکٹ لینے کے لیے تیار تھا۔ تاہم اس کی نوبت نہیں آئی۔ بیوریج کیسینو ریسورٹ پہنچتے ہی لیپ ٹاپ کے سوا، دوسرے بیگ اس نے بیل بوائے کو پکڑائے...

چیک اِن ڈیسک پر ول نے اپنا نام بتایا۔ فوراً ہی منیجر آن دھمکا اور گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ اس کا نام گیوٹریو تھا۔

''ڈاکٹر جیننگ، آپ کے ساتھی کچھ پریشان ہو چلے تھے۔'' گیوٹریو نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''شاور لینے کے بعد میں تیار ہوں۔'' ول نے جواب دیا۔

''ڈاکٹر، آپ کا سوئٹ اٹھائیسویں منزل پر ہے اور ہمارا آڈیو ویڈیو کنسلٹنٹ، میگنولیا بال روم میں آپ کا منتظر ہے۔ وی آئی پی ایلیویٹر، جیولری کے ساتھ ہے۔ کسی بھی ضرورت کے لیے مجھے یاد کرتے وقت ہچکچانے کی ضرورت نہیں۔ آپ مجھے میرے نام سے بلا سکتے ہیں۔''

''اوکے، شکریہ۔'' ول مسکرایا۔

☆☆☆

جو اور کیرین، کچن ٹیبل کی کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

''میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کل تک انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' کیرین بولی۔ ''تم اپنی رقم لو اور قصہ ختم کرو۔''

''پہلی وجہ یہ ہے کہ بینک بند ہوچکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تاوان کی رقم وصول کرنے کا ہمارا طریقۂ کار مختلف ہے۔''

''کیا منصوبہ ہے تمہارا؟''

''تمہارا شوہر اپنے مالی مشیر... گرے ڈیوڈسن... کو کال کر کے ایک چھوٹی سی کہانی سنائے گا... تم لوگ، والٹر اینڈرسن کے عاشق ہو۔ تمہارے گھر میں جگہ جگہ اینڈرسن کی قیمتی پینٹنگز آویزاں ہیں۔ تمہارا شوہر، گرے ڈیوڈسن کو بتائے گا کہ اس نے حال ہی میں والٹر اینڈرسن کا بنایا ہوا ایک نادر مجسمہ دریافت کیا ہے۔ بہت سے لوگوں کی رائے میں یہ مجسمہ اینڈرسن کے گھر سے چرایا گیا تھا اور اس کی مارکیٹ ویلیو...''

''اس کی مالیت، گراں قدر پینٹنگز کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔'' کیرین نے جو کی بات کاٹ دی۔

''کیونکہ والٹر اینڈرسن نے گنتی کے مجسمے تراشے تھے اور نوادرات کی قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔''

''گڈ، تم بہت سمجھ دار ہو۔'' جو نے دانت نکالے۔

''میرا ہوم ورک مکمل ہے۔ تمہارے شوہر جیسے ڈاکٹروں کو کچھ نہ کچھ جمع کرنے کا خبط ہوتا ہے۔ کسی کو کتابیں، کسی کو گاڑیاں، آرٹ ورک وغیرہ وغیرہ...''

'مسٹر جو، تمہارا ہوم ورک مکمل نہیں ہے۔' کیرین نے دل میں کہا۔ 'اگر مکمل ہوتا تو تمہیں ابھی کے مرض کا علم ہوتا... تم اور کہاں کہاں غلطی کر گئے ہو، جلد پتا چل جائے گا۔'

''تمہارا شوہر کل صبح ڈیوڈسن سے کہے گا کہ وہ پانچ لاکھ ڈالرز بلوکسی میں اسے وائر کردے۔ کیونکہ مجسمے کا موجودہ مالک کیش طلب کر رہا ہے اور وہ یعنی تمہارا شوہر اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتا۔ اس طرح ڈیوڈسن کو شک بھی نہیں ہوگا۔ مزید برآں، ڈاکٹر ول کی پیاری بیوی کیرین، تصدیق کے لیے ڈیوڈسن کے آفس آسکتی ہے۔ اگرچہ اس کی ضرورت نہیں تھی مگر یہ ایک موثر ٹرک ثابت ہوگی۔ پھر ہم دونوں ڈیوڈسن کے آفس جائیں گے۔ میں باہر رکوں گا اور تم اندر جاکر دستخط کروگی۔ فوراً پانچ لاکھ ڈالرز روشنی کی رفتار سے تیز، بلوکسی پہنچ جائیں گے۔ میرا پارٹنر بلوکسی میں، ول کو لے کر

بینک پہنچے گا۔ ول اندر جائے گا اور کیش لا کر میرے پارٹنر کے حوالے کر دے گا۔"

"تم نے یہ انوکھا منصوبہ 6 لاکھ ڈالرز کے لیے بنایا ہے۔ کیا ضرورت تھی اتنا کھڑاگ کرنے کی؟" کیرین نے اظہارِ حیرت کیا۔

جو نے قہقہہ لگایا۔ "یہی میری انفرادیت ہے۔ عام کڈنیپرز/اغوا کنندگان کی کھوپڑیوں میں بھس بھرا ہوتا ہے۔ اسی لیے مارے جاتے ہیں یا پکڑ لیے جاتے ہیں۔ ایف بی آئی کے نزدیک تاوان کی رقم اٹھانے کا کوئی بھی طریقہ محفوظ نہیں ہے۔ ٹیکنالوجی نے بہت ترقی کر لی ہے۔ تمہارا شوہر خود میرے لیے تاوان کی رقم وصول کرے گا۔ تم بھجواؤ گی اور وہ نکالے گا۔ میرا کہیں ذکر نہیں ہے۔ کتنی خوب صورت بات ہے؟ دوسروں سے بالکل مختلف۔ کوئی کسی کو کال نہیں کر سکتا۔ کال صرف میں اور میرے ساتھی کریں گے۔ ہر تیس منٹ بعد۔ جب تک ہم یہ کرتے رہیں گے، سب ٹھیک رہے گا۔ کوئی زخمی ہوگا نہ کوئی مارا جائے گا اور نہ ہی کوئی سلاخوں کے پیچھے جائے گا۔ تاوان بھی میرا فکس ہوتا ہے۔ مجھے قناعت پسند سمجھ لو... میں واردات بھی سال میں ایک بار کرتا ہوں۔ تاوان ادا کرنے والوں کو رقم دینے میں کوئی تکلیف نہیں اور بچہ بھی بخیریت انہیں واپس مل جاتا ہے۔"

"تم شیخی خورے معلوم ہوتے ہو۔" کیرین نے طنز کیا۔

جو نے کندھے اچکائے۔ "ممکن ہے ایسا ہو لیکن میرا کلین ریکارڈ میری باتوں کا گواہ ہے۔ اوپر تلے پانچ مرتبہ میں بے عیب وارداتیں کر چکا ہوں۔ کچھ نہ کچھ فخر تو میرا حق بنتا ہے یا نہیں؟"

"یہ کوئی دکانداری یا کاروبار نہیں ہے۔ کیا تمہیں بچوں کے احساسات کا خیال نہیں آتا، ان پر کیا گزرتی ہو گی؟"

"بچے چوبیس گھنٹے کے لیے کچھ بھی فیس کر سکتے ہیں جب میں بچہ تھا تو میں نے کئی سال اس سے زیادہ خراب حالات کا سامنا کیا تھا۔"

"لیکن جلد یا بدیر تو غلطی کرو گے۔ ہمیشہ ہی ایسا نہیں ہوتا رہے گا۔"

"میں غلطی نہیں کروں گا۔ ہو سکتا ہے، میرا کوئی ساتھی کر جائے۔ جیسے باسو، باسو ایک بڑا بچہ ہے۔ بہت بڑا بچہ۔ دیکھنے میں گوریلا لگتا ہے لیکن اندر سے بچہ ہے۔"

کیرین نے آنکھیں بند کر لیں۔

"ڈرو مت۔ وہ بچوں سے زیادتی نہیں کرتا۔ وہ تو بچوں سے محبت کرتا ہے۔ ان کا خیال رکھتا ہے۔ جب ہم بچے کو واپس کر دیتے ہیں تو وہ خوش ہوتا ہے۔ ہاں اگر بچہ بھاگنے کی کوشش کرے تو وہ ناراض ہو جاتا ہے۔"

"کیا ہم رات میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتے؟ ابی کو انسولین کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ شام کے کھانے کے لیے کچھ کرو۔"

"سنو..."

"کچھ نہیں، کھانا۔" جو نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

☆☆☆

ول کا لیکچر اور وڈیو ڈیمو، نہایت کامیاب رہا۔ سامعین کی تعداد ہزار سے اوپر تھی۔ تقریباً سب پروفیشنل تھے۔ اس کی ملاقات چند پرانے ساتھیوں سے بھی ہوئی ان میں اس کا عزیز دوست جیکسن ایورٹ بھی تھا... ول کی تین سالہ تحقیق اور نئی دوا کے وڈیو مظاہرے نے سامعین و ناظرین کو خوب متاثر کیا۔

وہ نازنین و ناز آفریں مختصر سے سیاہ لباس میں جلوہ افروز تھی۔ اس کے گلے میں ڈائمنڈ نیکلس چمک رہا تھا۔ وہ خاموش اور بظاہر تنہا تھی۔ جہاں ول کھڑا تھا، وہاں سے نازنین کی ٹیبل قریب تھی۔ سامعین میں موجود خواتین میں وہ سب سے کم عمر تھی... نسوانی حسن کے تمام لوازمات سے مسلح۔ اس کی سیاہ آنکھیں لیزر کے مانند مستقل ول کے اوپر مرکوز تھیں۔

ول کی نظریں حاضرین پر سے گھومتی ہوئی جب بھی نازنین پر آتیں، وہ اسے اپنی جانب نگراں پاتا۔ وہ سیاہ بالوں والی حسینہ کا نوٹس لینے پر مجبور ہو گیا۔ تاہم اس کی توجہ اپنے اصل ٹاسک کی جانب رہی...

جب وہ تقریر ختم کر کے اپنے کاغذات اور دیگر اشیا سمیٹ رہا تھا، اس وقت نازنین کے لبوں پر پُراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

ول، ہاتھ ملاتا اور تہنیتی کلمات وصول کرتا ہوا ایلیویٹر کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں دو ڈاکٹر سمیت تین افراد اور تھے۔ ایلیویٹر کا دروازہ بند ہونے جا رہا تھا، تب ایک نسوانی آواز بلند ہوئی۔

"رکو... ذرا۔"

ول کا ہاتھ اضطراری طور پر ڈور کو بند ہونے سے روکنے کے لیے اٹھا۔ اچانک حرکت سے ہاتھ کے جوڑ میں

نیس اٹھی۔

''شکریہ۔'' سیاہ ملبوس والی نازنین نے ایلیویٹر میں قدم رکھا۔ ول نے ایلیویٹر کے آئینے میں اس کا جائزہ لیا۔ وہ ہینڈ بیگ تھامے فلور کو تک رہی تھی۔ آٹھویں منزل پر دونوں ڈاکٹر نکل گئے۔ بارہویں پر تیسرا فرد بھی ایلیویٹر چھوڑ گیا۔ ول نے کچھ بے چینی محسوس کی۔

''آپ کا لیکچر متاثر کن تھا۔'' حسینہ نے خاموشی کا قفل توڑا۔

''شکریہ۔''

''آپ کا فلور کون سا ہے؟'' وہ مسکرائی۔

''اٹھائیس۔'' ول کو احساس ہوا کہ وہ بٹن دبانا بھول گیا تھا۔ لڑکی نے بٹن دبایا۔ ''میں بھی اٹھائیس پر ہوں۔''

''تم ڈاکٹر ہو؟'' ول نے سوال کیا۔

''نہیں، میں تو سیکھ رہی ہوں۔'' اس نے مبہم جواب دیا۔

ول نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

اٹھائیسویں منزل پر دونوں ایلیویٹر سے باہر آگئے۔

''بائے۔'' لڑکی مسکرا کر دائیں جانب چل پڑی۔

ول اس کی مست خرامی کو دیکھتا رہ گیا۔ پھر اس نے سر جھٹکا اور بائیں طرف مڑ گیا۔ وہ سوئٹ نمبر 28021 کے سامنے رکا اور کریڈٹ کارڈ 'کی' نکالی۔ لڑکی کی جلوہ افروزیوں کے علاوہ کوئی اور ہی چیز تھی جو ول کے دماغ میں اٹک رہی تھی۔ 'کارڈ کی' استعمال کرتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھنا چاہا اور دنگ رہ گیا۔ لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ول کے دماغ میں گھنٹی بجی، یہ کیا اسرار ہے؟ وہ کارپٹڈ فلور پر دبے قدموں اس کے پیچھے آگئی تھی۔

''میرا نام شیرل ہے، ڈاکٹر۔'' لڑکی دلربا انداز میں مسکرائی۔

''میں سمجھا نہیں۔ کیا چاہتی ہو؟'' ول کی آواز میں الجھن تھی۔

''اندر چل کر بتاتی ہوں۔''

''تم ہوش میں ہو؟'' ول کو غصہ آگیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر غیر یقینی چھا گئی۔ لڑکی کے ہاتھ میں آٹومیٹک پسٹل تھا جس کا رخ ول کے سینے کی طرف تھا۔

''یہ کیا ہے؟ میرے پاس کیش زیادہ نہیں ہے۔''

''مجھے کیش نہیں چاہیے، مجھے اندر جانا ہے۔'' لڑکی نے ایلیویٹر کی طرف نگاہ مارتے ہوئے تیزی سے کہا۔

''مگر کس لیے؟''

''تمہیں معلوم ہو جائے گا، جلدی کرو۔''

''میں اندر نہیں جا رہا، مجھے پتا چلنا چاہیے کہ مسئلہ کیا ہے۔'' ول دیوار پر فون کی طرف بڑھا۔ ''میں فرنٹ ڈیسک کو فون کر رہا ہوں کہ پولیس کو کال کریں۔''

''فون کو ہاتھ مت لگانا۔'' لڑکی کا انداز بدل چکا تھا۔

''شیرل، تم مجھے شوٹ نہیں کر سکتیں۔'' ول نے مضبوطی سے کہا اور فون اٹھالیا۔

''تم نے کوئی کال کی تو پھر میں بھی ایمی کو مرنے سے نہیں روک سکتی۔''

ول کے دماغ میں دھماکا ہوا اور ہاتھ منجمد ہو گیا۔ ''کیا کہا تم نے؟''

''ڈاکٹر، تمہاری بیٹی دو گھنٹے پہلے اغوا ہو چکی ہے۔ تم اسے زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو مجھے اندر لے چلو۔ جلدی کرو۔'' اس کی آواز میں سنجیدگی اور تاثرات میں بے چینی تھی۔

ول کے سینے میں دھواں سا بھر گیا۔ کان شائیں شائیں کر رہے تھے۔

''ڈاکٹر، اگر کوئی آ گیا اور مجھے گن کے ساتھ دیکھ لیا تو کہانی ختم ہو جائے گی۔ میں تمہاری بیٹی کو زندہ رکھنا چاہتی ہوں۔ وقت ضائع نہ کرو، اندر چلو۔'' شیرل نامی حسینہ کے اضطراب میں اضافہ ہو گیا۔

ول نے چند سیکنڈ اس کی آنکھوں میں دیکھا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ شیرل بھی اس کے پیچھے آئی اور دروازہ بند کر دیا۔ پسٹل اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ نشست گاہ سے گزر کر بیڈروم میں چلی گئی۔

''میری بیٹی کے بارے میں بتاؤ؟''

''تاوان کے لیے تمہاری بیٹی کو اغوا کیا گیا ہے۔ میرا ساتھی، میڈیسن کاؤنٹی میں، اس وقت تمہاری بیوی کے ساتھ ہے۔ یہ دوسری لوکیشن ہے جبکہ ایک لوکیشن یہاں ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہمارا تیسرا ساتھی، تمہاری بیٹی کے ساتھ تیسری لوکیشن پر ہے...'' شیرل نے ول کو مقصد اور پلان مختصر الفاظ میں سمجھایا۔

ول کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ جو سچویشن تخلیق کی گئی ہے، اس میں وہ شیرل کے خلاف کوئی جارحانہ قدم نہیں اٹھا سکتا۔ شیرل کی گن صرف اس کی ابتدائی بدحواسی کو قابو میں کرنے کے لیے تھی۔ اصل پریشانی ایمی کی نامعلوم تیسری لوکیشن تھی۔ تینوں کا رابطہ تیس منٹ کے وقفوں کے ساتھ تھا... اگر وہ پولیس کو فون کر دیتا اور پولیس شیرل کو گرفتار کر بھی لیتی تو تیس منٹ میں ایمی کا خاتمہ یقینی تھا۔

پولیس تیس منٹ میں دوسری لوکیشن پر نہیں پہنچ سکتی تھی مزید یہ کہ تیسری لوکیشن دریافت کرنا تو محال تھا۔ قسمت یاوری کرتی تو تیس منٹ میں زیادہ سے زیادہ وہ شیرل کو گرفتار کرا سکتا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔

''کیا ضمانت ہے کہ اگر میں تمہارے کہنے پر چلوں تو ایمی ہمیں واپس مل جائے گی؟''

''کوئی ضمانت نہیں ہے۔ تمہیں بھروسا کرنا پڑے گا۔'' شیرل نے کہا۔

''یہ کافی نہیں ہے، کچھ اور بتاؤ۔''

''تمہاری بیوی اور بیٹی کو پبلک پلیس پر اتنے فاصلے پر چھوڑ دیا جائے گا، جہاں سے وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہوں۔'' شیرل نے اضافہ کرتے ہوئے گزشتہ پانچ ''کارناموں'' کے بارے میں بھی بتایا۔

ول اپنی حیرت اور ہراس کو سطح پر آنے سے روکنے میں کامیاب رہا اور بولا۔ ''ایمی کی واپسی کے بعد کون سی چیز ہمیں پولیس کے پاس جانے سے روکے گی؟'' ول سمجھ رہا تھا کہ وہ اور اس کی بیوی اور بیٹی، پیشہ ور تاوان خوروں کے ہاتھوں بے بس ہو چکے ہیں۔ یہ پیشہ ور منفرد انداز کے مجرم تھے۔ وہ اس بات پر بھی الجھ رہا تھا کہ ہر مرتبہ ان لوگوں نے ڈاکٹرز کو ہی نشانہ کیوں بنایا تھا؟

''اس صورت میں ہمیں پتا چل جائے گا کہ پولیس ہمارے پیچھے ہے۔ ہم میں سے ایک واپس آ کر ایمی کو ختم کر دے گا اور وہ ایسا کر سکتا ہے۔ میرا یقین کرو۔ پہلے بھی کسی نے رپورٹ نہیں کی۔ سادہ سی بات ہے، تم پانچ لاکھ ڈالرز کے لیے کیوں اتنا بڑا رسک لو گے جبکہ اتنی رقم تمہارے لیے بڑا مسئلہ نہیں ہے۔'' شیرل نے جواب دیا۔

اپنی مایوسی چھپانے کے لیے ول کو دوسری طرف مڑنا پڑا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ زندگی میں اس نے کبھی ایسی بے بسی محسوس نہیں کی تھی، اس حقیقت نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔

''لیڈی، تم سمجھتی ہو کہ میں تمام رات گن کے سامنے آرام سے بیٹھا رہوں گا جبکہ میری بیٹی اغوا ہو چکی ہے۔ پیشتر اس کے کہ ایمی کو کوئی نقصان پہنچے، میں تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔''

''آرام سے رہو، ڈاکٹر۔ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' شیرل نے پسٹل کو جنبش دی۔

''کیا تم ابھی تک ماں نہیں بنیں؟ بچوں کے معاملے میں اتنی [illegible] سی؟''

''میرے احساسات کی بات نہ کرو۔'' شیرل نے کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

''تو تم بتا دو اپنے بارے میں۔'' ول کی آواز میں کڑواہٹ تھی۔

''میں خبردار کرتی ہوں، میری ذات کے بارے میں کوئی بات نہ کرو۔''

ول جواب دینے والا تھا کہ اس کے دماغ میں شرارہ لپکا۔ ''اوہ نو، ایمی کی انسولین کا کیا ہوگا؟''

''کیا مطلب؟''

''اسے بچوں کی ذیابیطس ہے۔ تم بے خبر ہو؟''

''سکون سے رہو۔'' شیرل کے چہرے پر الجھن نظر آئی۔

''اپنے پارٹنر سے فوراً میری بات کراؤ۔''

شیرل کے چہرے پر کشمکش کے آثار نظر آئے۔ عین اسی وقت بستر کے سرہانے رکھے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دونوں نے ایک ساتھ فون کو دیکھا۔ شیرل فون کے پاس آئی اور گھڑی دیکھی۔

''تم بات کرنا چاہتے ہو؟'' وہ بولی۔ ''تمہارا موقع ہے لیکن ڈاکٹر، ٹھنڈے رہنا۔ بالکل ٹھنڈے۔''

''فون تمہارے سیل پر کیوں نہیں آیا؟ یہ کال کوئی اور بھی سن سکتا ہے؟'' ول نے اعتراض کیا۔

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔'' شیرل نے جواب دیا۔

''ڈاکٹر ول جیننگ بات کر رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، ڈاکٹر۔'' دوسری جانب سے مردانہ آواز آئی۔ ''تم غیر متوقع طور پر اس وقت اپنے شاندار سوئٹ میں تنہا نہیں ہو؟''

ول نے شیرل کی جانب دیکھا۔ ''ہاں، ایسی ہی بات ہے۔''

''سیاہ لباس میں وہ کیسی لگ رہی ہے؟''

''سنو، مجھے تم کو کچھ سمجھانا ہے۔''

''نہیں، کچھ نہیں۔ تم صرف جواب دو، تمہارا جواب اگر میچ کر گیا تو بات آگے بڑھے گی۔ سوال یہ ہے کہ تمہاری بیٹی کے ساتھ کوئی سنجیدہ میڈیکل پرابلم ہے؟''

ول کو امید کی کرن نظر آئی۔ ''ہاں، اسے بچگانا ذیابیطس ہے۔''

''اوکے، گڈ۔''

''ایمی کو انسولین کی فوری ضرورت ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''ہاں، سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جب تمہارا کوئی مریض ٹیبل پر مر رہا ہوتا ہے تو تم کیسی کوشش کرتے ہو؟''

''مسٹر، میں اینستھیسیا لوجسٹ ہوں۔ میرے کام کے بعد معاملہ سرجن کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔'' ول کو غیر متعلق سوال پر حیرت ہوئی تھی۔

''تو تمہاری وجہ سے ٹیبل پر کوئی مریض نہیں مرا؟''

''یقیناً نہیں۔''

''جب تم دوسرے شعبے میں تھے؟''

''اس وقت بھی میری وجہ سے کوئی مریض نہیں مرا۔ بعض کیس بہت بگڑے ہوئے ہوتے تھے تو میں لواحقین کو مریض کے بچنے کے امکانات کے بارے میں بتا دیتا تھا۔'' ول کو شک ہوا کہ دوسری جانب بولنے والے کا کوئی نہ کوئی تعلق اس کے پرانے مریضوں سے ہو سکتا ہے۔

''تم مریض کو نہیں بتاتے تھے کہ وہ مرنے والا ہے؟''

''ڈاکٹرز ایسا نہیں کرتے۔ کیا تم اپنا نام بتاؤ گے؟''

''جو کئی۔''

''کیا تم میرے پرانے مریضوں میں شامل رہے ہو یا میرے مریضوں سے تمہارا کوئی رشتہ رہا ہے؟'' ول نے سوال کیا۔

''فی الحال اس موضوع کو ختم سمجھو۔ میں تمہیں دکھانا چاہتا ہوں کہ میں کتنا معقول بندہ ہوں۔ میں ایبی کے لیے انسولین کا بندوبست کر رہا ہوں۔ تم میرے پارٹنر سے بات کراؤ۔'' جو نے کہا۔

''کیا میں ایک منٹ کے لیے اپنی بیوی سے بات کر سکتا ہوں؟''

''شیرل کو فون دو، ڈاکٹر۔'' جو نے روکھا جواب دیا۔

ول نے گہری سانس لے کر شیرل کو اشارہ کیا۔

''میری گفتگو کے دوران میں تم باتھ روم میں رہو گے۔'' شیرل نے مطالبہ کیا۔ ول خاموشی سے باتھ روم کی طرف چل دیا۔ اندر جا کر اس نے دروازہ بند کیا اور ڈور ناب گھما کر پکڑے رکھی۔ تیس تک گنتی گن کر اس نے دروازے میں معمولی جھری پیدا کی۔ شیرل کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''ایبی کی میڈیکل پرابلم ہمارے ہوم ورک میں کیوں نہیں آئی؟'' وہ جو سے استفسار کر رہی تھی۔ ''او کے، ہاں... لیکن یہ ٹھیک نہیں ہوا... ہاں... ہاں... وہ تو ٹھیک ہے لیکن... او کے میں سمجھ رہی ہوں۔ دوسری بات مجھے جو غلط لگ رہی ہے وہ کیرین کا شوہر ہے... میرا مطلب... جو، یہ ڈاکٹر دوسروں سے مختلف ہے۔ یہ چالاک بھیڑیے کی طرح ہے جو اپنے موقع کا انتظار کرتا ہے... تیس منٹ... ہاں ٹھیک ہے... میں خیال رکھوں گی۔''

ول نے شیرل کو فون رکھتے دیکھا تو رخنہ بند کر دیا۔ پندرہ تک گنتی گن کر اس نے دروازہ تھوڑا سا کھول کر کہا۔ ''بات ختم ہو گئی؟''

''ہاں، باہر آجاؤ۔''

''کیا بات ہوئی؟''

''جو تمہاری بیوی کو ایبی کے پاس لے جا رہا ہے تاکہ اسے دوا دی جا سکے۔ ڈاکٹر یہ ہمارے پلان کے خلاف ہے۔ اس میں رسک ہے۔''

''نہیں، جو ٹھیک کر رہا ہے۔'' ول نے لہجہ متوازن رکھا۔ ''رسک اس میں ہے، کہیں ایبی رات میں کسی وقت کوما میں نہیں چلی جائے۔ اس صورت میں، تم لوگوں کو تاوان کی رقم ملنے کا امکان صفر ہو جائے گا۔ کیا میں غلط ہوں؟''

''ڈاکٹر تم ہوشیار آدمی ہو۔ ہم نے کسی واردات میں کسی بچے کی جان نہیں لی۔ لیکن تم نے اگر کوئی ہوشیاری دکھائی تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

ول نے بیوی اور بیٹی کے لیے اٹھنے والی خوف کی لہر کو دباتے ہوئے کہا۔ ''آخر یہ جو ہے کون؟''

شیرل نے ول کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''میرا شوہر!''

☆☆☆

ایبی کیبن کے اندر ایک پرانے صوفے پر محو خواب تھی۔ باسل اس کے قریب نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ نروس تھا۔ اسے علم تھا کہ چھوٹی بچی بیدار ہوتے ہی خوف زدہ ہو جائے گی۔ باسل اس صورتِ حال سے پریشان تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لڑکی کے بجائے لڑکا ہوتا تو بہت تھا۔ لڑکوں کے ساتھ نسبتاً سہولت رہتی ہے۔ ماضی میں پانچ میں سے تین لڑکے تھے۔ لڑکیوں کی صورت میں اسے بہت زیادہ سوچنا پڑتا تھا۔ زیادہ سوچنے سے وہ اداس ہو جاتا تھا۔ اسے اپنی بہن یاد آجاتی... اس کی بہن ایلن اس وقت محض چار برس کی تھی، جب وہ خناق کے مرض میں زندگی کی بازی ہار گئی تھی۔ اس نے جو کے ساتھ مل کر ایلن کو بچانے کی اپنی سی کوشش کی۔ حالات نا مساعد تھے۔ بالآخر انہیں ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑا لیکن وہ تاخیر کر بیٹھے تھے...

ایبی کے حلق سے آواز برآمد ہوئی۔ اس بار آواز پہلے

سے بلند تھی۔ وہ ہوش میں آرہی تھی۔ باسل نے جلدی سے باربی ڈول اٹھالی۔

''ماما؟'' ایمی کے حلق سے نیم خوابیدہ آواز برآمد ہوئی۔ اس کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں۔ ''ماما؟''

''ایمی، ماما ابھی یہاں نہیں ہیں۔ میں باسل ہوں۔''

اچانک ایمی نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ صوفے کے قریب نیچے بیٹھے ہوئے گھیم تھیم باسل کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''میری ماما کہاں ہیں؟'' اس نے کمزوری آواز میں پوچھا۔

''وہ، ڈیڈی کے ساتھ کہیں گئی ہیں۔ مجھے تمہاری دیکھ بھال کے لیے چھوڑا ہے۔''

ایمی نے نظریں گھما کے بوسیدہ کیبن کا جائزہ لیا۔ اس کے رخسار لال ہونے لگے۔ ''ہم کہاں ہیں؟ یہ کیسی جگہ ہے؟''

''ہم جنگل میں ہیں۔ تمہارے گھر کے قریب۔ ماما جلد واپس آجائیں گی۔''

ایمی نے سسکی بھری۔ وہ خوف زدہ ہو رہی تھی۔ باسل نے فی الفور باربی ڈول اسے پکڑا دی۔ ''تمہاری ماما یہ گڑیا تمہارے لیے چھوڑ گئی ہیں۔''

ایمی نے گڑیا لے کر سینے سے لگالی۔ ''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

باسل نے ہمدردی سے بڑا سا سر ہلایا۔ ''ڈر مجھے بھی لگ رہا ہے۔''

''تمہیں بھی؟'' ایمی کا منہ تھوڑا سا کھل گیا۔

باسل نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ایمی نے باسل کی سب سے چھوٹی انگلی دبا کر، گویا اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ''تم بہت بڑے ہو، تمہیں ڈرنا نہیں چاہیے۔''

''ہاں، شاید۔'' باسل نے مشکل سے کہا۔

☆☆☆

جیکسن کے قلب میں، اس کیبن سے چالیس میل دور شمال میں سفید رنگ کی ایک قلعہ نما عمارت اسپاٹ لائٹس کی روشنی میں دمک رہی تھی۔ اندر ڈنر ٹیبل کی کرسیوں پر ڈاکٹر جیمس مکڈیل اپنی بیوی مارگریٹ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر مکڈیل کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ مسی سپی میڈیکل ایسوسی ایشن کا سالانہ اجتماع جوں جوں قریب آرہا تھا، ڈاکٹر کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ ہفتوں کی ذہنی کشمکش کے بعد اس نے دل کی بات زبان پر لانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ڈاکٹر کے پاس کوئی چوائس نہیں تھی۔ سالانہ میٹنگ سر پر تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ ٹھیک سوچ رہا ہے۔

اس نے کانٹا پلیٹ میں رکھ دیا۔ ''مارگریٹ، ڈیئر میں جانتا ہوں کہ تم اس موضوع پر دوبارہ بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ لیکن میں بے بس ہو گیا ہوں۔''

مارگریٹ کے ہاتھ سے چمچ گر گیا۔ ''کیوں؟'' اس نے شوہر کو گھورا۔ ''کس چیز نے تمہیں بے بس کردیا ہے؟ کیا مجبوری ہے؟''

ڈاکٹر نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''شاید اس لیے کہ یہ حادثہ ٹھیک ایک سال پہلے وقوع پذیر ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ انہوں نے جو کچھ بتایا تھا، اس پر مجھے یقین تھا اور ہے۔ میں اس کو ذہن سے مٹانے میں ناکام رہا۔ اس حادثے نے ہماری گھریلو فضا کو مسموم کر کے رکھ دیا۔''

''ہماری نہیں، صرف تمہاری...''

''اوہ خدا کے لیے مارگریٹ... سالانہ میٹنگ، بلوکسی میں شروع ہو رہی ہے اور ہم شریک نہیں ہو رہے ہیں۔ وجہ تمہیں معلوم ہے۔ جو کچھ گزشتہ برس ہوا، اس کے اثرات ابھی تک ہمیں کنٹرول کر رہے ہیں۔ ہم نے پولیس کو نہ بتا کر غلطی کی۔ اس عورت نے جو کچھ بتایا تھا، مجھے اس پر یقین ہے۔ وہ پہلے بھی ڈاکٹروں کو نشانہ بناتے رہے تھے۔ سالانہ میٹنگ کے موقع پر انہوں نے ہماری علیحدگی کا فائدہ اٹھایا تھا۔ اب ایسی ہی ایک اور واردات پھر سے ہونے جارہی ہے، میں اس اندیشے سے کئی ہفتوں سے لڑ رہا ہوں لیکن یہ پختہ تر ہوتا جارہا ہے...''

''چپ ہو جاؤ، بس کرو۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ بعد میں پولیس سے رابطہ کرنے پر پیٹر کو مار دیں گے۔''

''لیکن تم سوچو، ایسا ہی حادثہ کسی اور فیملی کے ساتھ ہونے والا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ کسی طرح اسے روکیں۔''

''کیا تمہیں پیٹر کی کوئی پروا نہیں ہے۔ وہ کتنی مشکل سے اس حادثے کے مابعد اثرات سے باہر آیا ہے۔'' مارگریٹ کا غصہ کم ہوتے میں نہیں آرہا تھا۔

''مجھے پیٹر کی ہمیشہ فکر رہی ہے لیکن ہماری بزدلی کے باعث ایک اور بچہ شکار ہونے والا ہے۔ مارگریٹ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اچانک دونوں خاموش ہو گئے۔ ان کا گیارہ سالہ بیٹا ڈائننگ روم میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ کچھ مضطرب لگ رہا تھا۔

''کیا ہو گیا؟'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''آپ لوگ

زور زور سے باتیں کر رہے ہیں؟''

''اوہ مائی سن، کچھ نہیں... کوئی خاص بات نہیں ہے۔ تم پریشان مت ہو۔ یہ بتاؤ تم جمی کے گھر کب جا رہے ہو؟''

''اس کے ڈیڈی چند منٹ بعد مجھے پک کرنے آ رہے ہیں۔''

''اوکے... اپنا خیال رکھنا۔''

ڈاکٹر جیمس مکڈیل پلیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی بھوک اڑ چکی تھی۔

☆☆☆

فورڈ ایکسپڈیشن مناسب رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ اسٹیئرنگ وھیل جو کے ہاتھوں میں تھا۔ جو کے برابر میں اگلی نشست پر کیرین بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ نیچے فلور پر اس کی ٹانگوں کے درمیان آئس باکس رکھا تھا۔

آخری موڑ کاٹنے کے بعد جو نے اسے پٹی ہٹانے کی اجازت دے دی۔ کیرین نے آنکھیں جھپک کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ گاڑی درختوں میں داخل ہو چکی تھی۔

''اس راستے کے اختتام پر ہم ایبی اور باسل سے ملاقات کریں گے۔ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنی بیٹی کو پُرسکون رکھنے کے لیے اس سے گلے مل سکتی ہو پھر اسے انسولین لگانے کے بعد تم ایک بار اور گلے مل سکتی ہو، بس آخری بار۔ او کے؟''

''ٹھیک ہے، میں سمجھ گئی۔''

''باسل نے ایبی کو جو بتایا ہے، تم بھی اس کی تصدیق کرو گی اور اسے کہو گی کہ تم صبح میں اسے لینے آؤ گی۔ ایبی کو بتاؤ گی کہ ہم تینوں دوست ہیں، تم نے باسل کو اس کی دیکھ بھال کے لیے چھوڑا ہے اگر تم نے اس کے خلاف کیا تو پھر...'' جو نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''میں ایسا ہی کروں گی۔'' کیرین نے یقین دہانی کرائی۔

چند منٹ بعد ایکسپڈیشن درختوں سے نکل آئی۔ جو نے دو مرتبہ ہیڈ لائٹس بند کر کے کھولیں اور انہیں کھلا چھوڑ کے انجن بند کر دیا۔ پچیس، تیس گز دور کیرین نے سبز رنگ کی گاڑی اور کیبن دیکھا۔ کیبن کے قریب ایک اور گاڑی کا سایہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایکسپڈیشن کی تیز روشنی میں کیرین نے کیبن کے قریب ایک دراز قامت پہلوان نما آدمی کو دیکھا۔ کیرین تعجب میں تھی کہ دوسری سفید رنگ کی کار زمین کے بجائے بلاکس پر کھڑی تھی۔

جو، گاڑی سے اتر گیا۔ کیرین نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس کی رفتارِ قلب میں اضافہ ہو گیا۔ سناٹے میں معاً ایک بچکانا چیخ بلند ہوئی۔ ''ماما؟ ماما!''

ایبی، ضخیم شحیم آدمی کے عقب سے برآمد ہوئی تھی۔ کیرین آئس باکس چھوڑ کر آگے لپکی اور گھٹنوں کے بل کھڑی ہو کر ایبی کو دبوچ لیا۔

''میں یہاں ہوں، ہنی۔'' ایبی کو سینے سے لگا کر اس نے لرزیدہ آواز میں کہا اور آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ ایبی کانپ رہی تھی، رو رہی تھی... وہ کچھ بولنا چاہتی تھی لیکن ہر بار اس کے الفاظ ادھورے رہ جاتے تھے۔ کیرین اس کے چہرے کو جگہ جگہ سے چوم رہی تھی۔

''ماما آگئی ہے، تمہارے پاس ہے، بے بی۔ ایزی ناؤ، میں سن رہی ہوں۔'' کیرین نے خود کو پُرسکون رکھنے کی بھرپور سعی کی۔ ''میں مجبور تھی، ہنی۔ مجھے تمہارے ڈیڈی کے ساتھ ایک میٹنگ میں جانا تھا۔ ہم میٹنگ کو بھلا بیٹھے تھے۔ وہاں بچے نہیں جا سکتے... بس ایک رات کی بات ہے۔''

''کیا آپ پھر مجھے چھوڑ جائیں گی؟'' ایبی کی آنکھوں میں الجھن اور اذیت تھی۔ کیرین کی برداشت ختم ہونے لگی۔

''ابھی میں تمہارے پاس ہوں، بے بی۔ تمہاری شوگر چیک کرنی ہے۔''

''تو... و... و...'' ایبی کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ ''مجھے گھر جانا ہے۔''

جو سر پر کھڑا تھا۔ مطمئن ہونے کے بعد وہ پیچھے ہٹا اور آئس باکس لا کر کیرین کے قریب رکھ دیا۔ بعد ازاں وہ کچھ فاصلے پر باسل کے پاس چلا گیا۔

کیرین نے باکس کھول کر اسپرنگ لوڈڈ ڈیوائس نکالا، جس میں سوئی پہلے سے لگی تھی۔ یہ قلم کے مانند تھا۔ کیرین نے بیٹی کی درمیانی انگلی پکڑ کر آخری پور پر قلم کی نوک رکھ کر ٹریگر دبایا۔ ایبی نے سسکی بھری۔ اوپر تلے خون کے دو قطرے لے کر مخصوص کاغذی پٹی پر رکھے اور پٹی کو چھوٹی سی مشین میں رکھ دیا۔ مشین میں ایک مائیکرو چپ لگی ہوئی تھی... پندرہ سیکنڈ بعد مشین میں بپ کی آواز آئی۔

''دو سو چالیس۔'' کیرین نے ریڈنگ لی۔ ''سویٹی، تمہیں انسولین کا شاٹ چاہیے۔'' کیرین نے ایک وائل سے شارٹ ایکٹنگ انسولین کے تین یونٹ لیے، دوسری

وائل سے لانگ ایکٹنگ کے پانچ یونٹ لیے۔ یہ شاٹ معمول سے ہٹ کر تھا، لیکن کیرین کو شک تھا کہ ابی نے قدرتی نیند نہیں لی ہے اور کچھ کھایا بھی ہے۔

''تمہارے ساتھی باسل نے تمہیں کچھ کھلایا تھا؟''

''چند کریکرز، ماما۔''

''بس؟''

ابی نے زمین کی طرف دیکھا۔ ''اور ایک پیپر منٹ۔''

''ٹھیک ہے، ہنی۔'' کیرین نے انسولین شاٹ اس کے پیٹ میں کپڑں کے اوپر سے ہی لگا دیا۔ ابی نے پھر سسکی لی اور بانہیں ماں کے گلے کے گرد ڈال دیں۔ کیرین نے گھٹنوں پر کھڑے کھڑے اسے گود میں لے لیا۔ وہ ابی کا پسندیدہ گیت گنگناتے ہوئے اسے دائیں بائیں جھلا رہی تھی۔

''آئی لو یو، سوئٹی۔'' کیرین نے سرگوشی کی۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ماما، گاتی رہیں۔'' ابی نے کہا۔

کیرین کے کان جو اور باسل کی آوازوں پر لگے تھے۔ اس نے گاتے گاتے اپنے ہونٹ ابی کے کان سے لگا دیے۔

''بے بی، تمہیں یاد ہے، میں نے تمہیں پولیس کے بارے میں کیا سکھایا تھا؟ ضرورت کے وقت کون سا نمبر ڈائل کرتے ہیں؟''

''نائن۔'' ابی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''نائن، ون ون؟''

''گڈ، ہنی۔ دھیان سے سنو، مسٹر باسل کے پاس سیل فون ہے۔ اگر وہ واش روم کے لیے تمہارے پاس سے ہٹے تو وہ فون بھول سکتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو تم نائن ون ون پنچ کر کے کہنا کہ تمہیں مدد چاہیے۔ اگر تم نہ کہہ سکو تب بھی نمبر ملا کے سیل فون آف مت کرنا اور خود کہیں چھپ جانا۔ وہ لوگ آکے تمہیں ماما اور پاپا کے پاس لے آئیں گے... او کے؟'' کیرین پھر گنگنانے لگی۔

ابی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''کیا پولیس، باسل کو مارے گی؟''

''نہیں، بے بی۔ پولیس باسل کو کچھ نہیں کہے گی۔ لیکن تم اس سے چھپ کر نمبر ملانا۔ یہ ایک گیم کی طرح ہے۔ ٹھیک ہے؟''

''شہزادی کو بائے بائے کرو۔ واپس جانا ہے۔'' جو کی آواز آئی۔

کیرین اندر سے تڑپ اٹھی۔ اس نے اٹھنا چاہا تو ابی چیخ اٹھی۔

''ہنی، میں جلد آؤں گی۔'' کیرین نے کربناک آواز میں کہا۔ وہ دونوں ماں بیٹی کے پاس آگئے تھے۔

''اگر ابی کی طبیعت خراب ہو تو مجھے کال کر دینا۔'' کیرین نے باسل سے کہا۔

باسل کے چہرے پر حیران کن خوف تھا۔ ''یس میم... میں...''

''شٹ اپ۔'' جو کی غراہٹ بلند ہوئی۔ اس نے ابی کا بازو پکڑ لیا۔ ابی چیخ رہی تھی۔ کیرین کا ضبط جواب دینے لگا۔ وہ منہ پھیر کے کھڑی ہوگئی۔ آزمائش سی آزمائش ہے، وہ، ماہی بے آب ہے۔ زندگی عقوبت ہی سہی لیکن یہ سزائے ناروا کیسی ہے؟ کیرین کے حلق میں جیسے گولہ سا پھنس گیا۔ منہ پھیرتے ہی رکے ہوئے آنسو رخساروں پر پھسل گئے۔

☆☆☆

بلوکسی میں بیوریج ریسورٹ کے سوئٹ نمبر 28021 میں فون کی گھنٹی بجی۔ ول نے جھپٹ کر فون اٹھایا۔

''جو؟ تم جو بات کر رہے ہو؟''

''ول؟''

''کیرین!'' ول کے جبڑے بھنچ گئے۔ دوسری جانب سے کیرین کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

''تم نے ابی کو دیکھا؟'' ول نے بدقت تمام خود پر قابو پایا۔

''وہ خوف زدہ ہے، ول۔'' کیرین کی سوگواری آواز آئی۔ ''میں نے آٹھ یونٹ کا شاٹ لگایا ہے اسے... چند وائل اور سرنج وہیں چھوڑ دی ہیں۔''

ول کے کچھ کہنے سے پہلے کیرین کی چیخ سنائی دی اور جو کی آواز آئی۔ ''کاؤ بوائے، شکر کرو تمہاری بیٹی کو دوا مل گئی ہے۔''

''رکو! بات سنو...''

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ ول نے آہستہ آہستہ سانس خارج کی۔ سینے میں ابھرتے والا طیش کا لاوا اس کے سر کو چڑھنے لگا۔ فون رکھ کر وہ آہستہ سے مڑا۔

''ہے، ہے... ہوش میں رہو۔'' شیرل نے کہا۔

ول نے شعلہ بار نظروں سے اسے گھورا۔ اس کی دونوں مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔

شیرل نے گن سیدھی کر لی۔ ول اسے دبوچنے کے لیے تیار تھا۔ خود کو روکنے کے لیے ول نے قوتِ ارادی کا ایک ایک ذرہ خرچ کر دیا۔

''کوئی غلطی مت کرنا۔'' شیرل نے پھر تنبیہ کی۔ شیرل کے چہرے پر پریشانی تھی۔ ول نے گہری گہری سانسیں لے کر مٹھیاں کھول دیں۔ چند منٹ تک خاموشی چھائی رہی۔ دونوں ایک دوسرے کو نگاہوں میں تولتے رہے۔ ول خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔

''کیا تم دل سے اغوا کی وارداتوں میں شامل ہو؟ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔'' ول نے سوال کیا۔

شیرل کی خاموشی برقرار رہی۔

''میرا خیال ٹھیک ہے۔'' ول نے گہری سانس لی۔ ''جو تمہیں استعمال کر رہا ہے۔''

''وہ میرا شوہر ہے۔'' شیرل کے تاثرات میں مدھم سی الجھن تھی۔

''یہ تم سمجھتی ہو۔ کیا وہ تمہیں اپنی بیوی سمجھتا ہے؟ نہیں، وہ تمہیں محض ایک پارٹنر تصور کرتا ہے۔'' ول نے نپی تلی چوٹ لگائی۔ وہ پُراعتماد تھا کہ شیرل کو ساتھ ملا لے گا۔ جو نامی شخص نے جو پلان بنایا تھا۔ اس کے توڑ کے لیے شیرل ہی ترپ کا پتا تھی۔ شیرل کو ساتھ ملائے بغیر ول کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

''تم خاموش نہیں رہ سکتے؟'' شیرل کا گن والا ہاتھ جھکنے لگا۔

''میرے خاموش رہنے سے حقائق تبدیل نہیں ہوں گے۔ تم سوچو، میں دوبارہ بات کروں گا۔ فی الحال مجھے شاور لینا چاہیے۔'' ول ابتدائی مکالمہ نگاری سے مطمئن تھا۔

☆☆☆

مارگریٹ اپنے کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تھی۔ ٹیبل کے آئینے میں اسے شوہر کا عکس نظر آیا۔ ڈاکٹر جیمس مکڈیل کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہا تھا۔ مارگریٹ غم و غصے کی ملی جلی کیفیت میں مڑی۔

''کتنی مرتبہ کہوں کہ میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی۔''

ڈاکٹر نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''میں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟ تم کیوں نہیں چاہتیں؟''

ڈاکٹر مکڈیل بھی اڑ گیا تھا یا اس کے ذہن پہ یہ خدشہ سوار ہو [illegible] ہی ایک اور واردات ہونے والی ہے۔

''ایک سال بعد تمہارے دماغ پر کیا بھوت سوار ہو گیا ہے؟ لگتا ہے، تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔'' مارگریٹ زچ ہو گئی تھی۔

''پلیز مارگریٹ... کہیں اس آدمی نے تم پر تشدد تو نہیں کیا تھا؟'' ڈاکٹر نے فریادی انداز میں استفسار کیا۔

''تشدد؟'' مارگریٹ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ''کیا کہا تم نے؟''

''میں تمہارا شوہر ہوں۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

مارگریٹ کی آنکھوں میں وحشت اُتر آئی۔ ''ٹھیک ہے، تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ میں نے رپورٹ کرنے کی مخالفت کیوں کی تھی؟ تو سنو اچھی طرح سن لو... تشدد نہیں کیا تھا۔ اس نے تمہاری بیوی کی بے حرمتی کی تھی۔''

جیمس مکڈیل کا منہ کھلا رہ گیا۔

''جیمس، سمجھ میں آیا اور کھول کر بتاؤں۔ جو وہ کہتا گیا، میں کرتی گئی۔ میں مجبور تھی، پیٹر کی وجہ سے... جاؤ بتا دو، پولیس کو... مجھے وہ کرنا پڑا، جو میں نے زندگی میں نہیں سوچا تھا۔''

مارگریٹ کی آنکھوں سے آنسو پرنالے کی طرح بہہ نکلے۔ وہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ دونوں ہاتھ چہرے پر تھے۔ ڈاکٹر مکڈیل گنگ رہ گیا۔ معاً اس کا سکتہ ٹوٹا اور اس نے لپک کر مارگریٹ کو بانہوں میں بھر لیا۔ مکڈیل نے اسے بچوں کی طرح سینے سے لگا لیا۔

''مارگریٹ، ٹھیک ہے... سب ٹھیک ہے۔ تم نے کچھ غلط نہیں کیا۔ تمہارا کوئی قصور نہیں۔ آئی لو یو۔'' وہ خود بھی آبدیدہ ہو گیا۔

مارگریٹ نے سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا۔

''مارگریٹ، ایک اور عورت کی عزت خطرے میں ہے۔ ایک اور بچہ... ایک اور فیملی، کرب و اذیت کی چکی میں پسنے والی ہے۔'' اس نے بیوی کا آنسوؤں میں بھیگا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔ ''میں جانتا ہوں تم کبھی نہیں چاہو گی کہ ایسا ہو۔ بتاؤ مارگریٹ، کیا میں غلط ہوں؟''

مارگریٹ نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔

''میں ایف بی آئی کو کال کروں گا۔ مجھے ساری تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے ساتھ جو ہوا، وہ غیر متعلق ہے۔ مارگریٹ، آئی لو یو... ہمیشہ سے زیادہ...''

☆☆☆

جو کے کہنے پر کیرین نے آنکھوں پر سے پٹی ہٹا دی۔ واپسی کے سفر میں ابھی وہ راستے میں ہی تھے۔ کیرین نے شیشے سے باہر جھانکا، کیرین نے جو کا موڈ بہتر رکھنے کی غرض سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

''ابھی سے ملوانے اور دوائی پہنچانے کا شکریہ۔''

جو نے شیشہ نیچے کر کے سگریٹ کا ٹوٹا باہر اچھالا۔

''تشکر۔ ہاں میں اس کا منتظر تھا۔ آج کل اکثریت ادب و آداب بھول گئی ہے۔ تم نے بھی دیر کر دی، بہرحال مجھے خوشی ہوئی۔ ذرا سوچو، ابھی پوری رات پڑی ہے۔ ہمیں دوستوں کی طرح وقت گزارنا چاہیے۔'' جو کے انداز میں خفیف سی ذومعنویت تھی۔ کیرین چونک اٹھی، اس کے ذہن نے ''الرٹ'' کا اشارہ دیا۔

''تم ایک خوب صورت عورت ہو، میں بھی اتنا بدصورت نہیں ہوں... ایک خوب صورت رات ہماری منتظر ہے۔'' جو نے ایک ہاتھ اسٹیئرنگ سے ہٹا کر کیرین کے گھٹنے پر رکھ دیا۔

کیرین کی آنتیں پیٹ میں الجھنے لگیں۔ اعصاب تڑخنے لگے۔ جو کے ارادے کھل کر سامنے آگئے تھے۔ اس کے چوبیس گھنٹے کے منصوبے میں رات کی پارٹی شامل تھی۔ کیرین، ماؤف ذہن کے ساتھ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ پچھلی وارداتوں میں ماؤں نے اپنے بچوں کی خاطر جو کی ناپاک خواہشات کے سامنے جسم و جان کی پامالی منظور کر لی تھی۔ اب کیرین کی باری تھی۔ کیا ابھی کے لیے وہ یہ آگ کا دریا پار کر لے گی؟

☆☆☆

سوئٹ نمبر 28021 میں سناٹا تھا۔ فون بھی خاموش تھا۔ شیرل نامعلوم سوچ میں غلطاں تھی۔ ول کا ذہن برق رفتاری سے ممکنہ امکانات پر غور کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے شیرل کو ٹٹولنے کا فیصلہ کر لیا۔

''میں جب تمہاری ذات کے بارے میں بات کرتا ہوں تم بدمزہ ہونے لگتی ہو؟'' ول نے سوال کیا۔ آدھا ڈاکٹر آدھا نفسیات داں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ مریض کی رائے بھی مریضانہ ہوتی ہے اور مریض جھوٹ بھی بولتا ہے... ول نے محسوس کر لیا تھا کہ شیرل کے ماضی میں کوئی گرہ ہے۔ اسے دو کام کرنے تھے۔ کسی طرح شیرل کے ماضی کے بارے میں معلوم کرے اور تاوان کی رقم جو کے بجائے شیرل کو دے کر اپنے تحفظ کی یقین دہانی کرائے۔ شیرل اچھی اداکار نہیں تھی۔ ول کے سوال پر وہ خاموش رہی۔

''میرے ماضی کے بارے میں جان کر تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟'' بالآخر وہ بولی۔

''کم از کم وقت ہی کٹ جائے گا۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟ مجھ پر شک مت کرو، میں تمہارے لیے کچھ منگواتا ہوں۔'' ول کھڑا ہو گیا۔

شیرل کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیں لہرائی...

ول فون کی جانب گیا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' شیرل بھی کھڑی ہو گئی، اس کا ایک ہاتھ گن پر تھا۔

''ڈرنک منگوا رہا ہوں، کیا پسند کرو گی؟''

شیرل کے چہرے پر کشمکش کے آثار نمودار ہوئے۔

''رم اور کوک۔'' شیرل نے گہری سانس لی۔

ول نے روم سروس کو بار کیڈی، دو لیٹر کوک اور ایک ایک کپ چائے کا آرڈر دیا۔ وہ لگژری سوئٹ میں بظاہر اکیلا تھا۔ لہٰذا یہ آرڈر کچھ بے تکا معلوم ہوا۔ تاہم وہ ''سائپرس'' سوئٹ کی مراعات سے واقف تھا۔ وہ اپنے آرڈر کی بالٹیاں بھی منگوا لیتا تو کوئی اعتراض نہ کرتا۔

شیرل نے گن پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ ول نے نرمی کے ساتھ گفتگو کا آغاز کیا۔ ''شیرل، تمہاری عمر زیادہ نہیں ہے جبکہ جو کی آواز سن کر ہی میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کم از کم بھی 45-40 کا ہے؟ اگر تم برا نہ مانو تو...''

''وہ پچاس برس کا ہے۔'' شیرل کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''اور تم؟''

''26۔'' شیرل نے لاشعوری طور پر نظریں چرائیں۔

''چوبیس سال کا فرق؟'' ول کے لہجے میں ہلکی سی چبھن تھی۔

شیرل نے ڈاکٹر کو گھورا تاہم لب بستہ رہی۔

''تم کس علاقے سے تعلق رکھتی ہو؟''

''انٹرویو کا مقصد؟''

''پھر کیا کریں۔ خاموش بیٹھ کر ایک دوسرے کو گھورتے رہیں؟'' اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ شیرل چونک اٹھی۔

''کچھ نہیں... ڈرنک آئی ہے۔'' ول اٹھ کر دروازے کی طرف گیا۔ شیرل گن لے کر آڑ میں ہو گئی۔ حالانکہ وہ بیڈ روم میں تھی اور بیرونی دروازے سے اسے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔

دروازہ کھلا، پھر بند ہوا۔ ڈاکٹر باہر نہیں جا سکتا تھا۔ تیس منٹ کے اندر وہ کچھ نہیں کر پاتا۔ شیرل اس جانب

سے مطمئن تھی۔ دروازہ بند ہونے کی آواز پر اس نے جھانکا۔ ڈاکٹر، ڈرنکس لے کر بیڈ روم کی جانب آرہا تھا۔ شیرل واپس بیڈ پر آگئی۔

ول نے نرمی کے ساتھ شیرل کے جذباتی احساسات کو بیدار کرنا شروع کیا۔ شیرل رم کی چسکیاں لیتے ہوئے دھیرے دھیرے کھلنے لگی۔ اس نے جو کہانی بیان کی، اس کا لب لباب کچھ یوں تھا۔ شیرل کا باپ آرمی میں تھا، لہٰذا وہ لوگ ایک جگہ مستقل نہیں ٹکتے تھے۔ شیرل کو یاد نہیں کہ غلطی کس کی تھی۔ تاہم اس کی ماں نے باپ کو چھوڑ دیا۔ بعدازاں اس کا باپ کسی اور عورت کی زلفوں کے پھندوں کا اسیر ہو گیا۔ اس وقت شیرل دس برس کی تھی۔ سوتیلی ماں کی حرکتوں سے تنگ آکر پانچ چھ سال بعد وہ گھر سے بھاگ گئی تھی۔

وہ اپنی سہیلی کے گھر گئی۔ جس کے ساتھ اپارٹمنٹ میں دو اور لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے ایک کلب میں ڈانس کرتی تھی۔ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے لیے شیرل نے بھی کلب میں آنا جانا شروع کر دیا۔ بات بڑھتے بڑھتے، عریاں ڈانس سے ہوتی ہوئی جسم فروشی کی طرف نکل گئی۔ شیرل کا ہاتھ بھی کھل گیا۔ تاہم جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ ایک پُرتعفن دلدل میں پھنس چکی ہے۔ پھر اس کی ملاقات جو سے ہو گئی۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ تاہم جو نے شیرل کو وہاں سے نکال لیا اور بعدازاں شادی کر لی۔ جب جو کی مجرمانہ سرگرمیاں شروع ہوئیں تو شیرل کو احساس ہوا کہ وہ آسمان سے گر کر کھجور میں آن اٹکی ہے۔ شروع میں جو شیرل کو دوسرے کلب میں لے گیا تھا جہاں وہ صرف ڈانس کرتی تھی۔ شیرل کے بیان کے مطابق سابقہ کلب والوں نے ایک بندہ شیرل کی واپسی کے لیے متعین کیا، اور وہ جو کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بعد ایسی کوئی دوسری کوشش نہیں کی گئی۔

''اور میں آزاد ہو گئی۔'' اس موقع پر شیرل نے تبصرہ کیا۔

''تم آزاد نہیں ہوئیں۔ صرف تمہارا ''ماسٹر'' تبدیل ہوا تھا۔'' ول نے لقمہ دیا۔ ''اگر تم ابھی کو بچانے میں میری مدد کرو تو تاوان کی ساری رقم میں تمہارے حوالے کر کے تمہیں یہاں سے نکال دوں گا۔ تب تم حقیقی معنوں میں اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے آزاد ہو جاؤ گی۔'' ول نے خلوص سے کہا۔

شیرل کی آنکھوں میں امید کا دیا جل کر بجھ گیا۔

''میں کیسے یقین کر لوں؟''

''آہستہ آہستہ تمہیں یقین آجائے گا، یہ موقع تمہیں پھر نہیں ملے گا۔'' ول کے لہجے میں اعتماد تھا۔

☆☆☆

جو نے ایکسپیڈیشن گیراج میں داخل کر کے انجن بند کر دیا۔ انجن بند ہوتے ہی سکوت طاری ہو گیا۔ کیرین کو لگا جیسے یہ خاموشی نہیں، سناٹے کی چیخ ہے... آنے والے لمحات کی دہشت نے اس کے دل میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

''پارٹی ٹائم۔'' جو نے گاڑی کا دروازہ کھولا...

کیرین وزنی قدموں اور چکراتے ہوئے ذہن کے ساتھ جو کے ساتھ قدم بڑھا رہی تھی۔ وہ بھرپور کوشش کر رہی تھی کہ دماغ سوچنے کے قابل ہو جائے۔ داخلی دروازے پر جو نے چابیاں کیرین کے حوالے کر دیں۔

''تم کھولو، تمہارا گھر ہے۔'' وہ بولا۔

ہاں اس کا گھر ہے لیکن شاید آج کی رات یہ گھر جو کا ہے۔ کیرین نے لاک کھولا۔ اسے خیال آیا کہ دروازہ تھوڑا سا کھول کر اندر گھسے اور عقب میں دروازہ بند کر دے... پھر پولیس کو فون کر دے۔ تاہم یہ مشکل تھا، اگر ممکن بھی ہوتا تب بھی خطرناک حماقت ثابت ہوتی۔ سیل فون جو کے پاس تھا۔ وہ فوراً ایاسل سے رابطہ کرتا اور پھر... آگے کیرین نے سوچنا بند کر دیا... جو کی ہدایت پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ تاہم وہ مایوس نہیں تھی۔ اسے موقع ملے گا۔ کیرین نے اپنے ذہن کو فیڈ کیا۔

جو اسے ماسٹر بیڈ روم میں لے آیا۔ کیرین کے قدم بھاری ہوتے جا رہے تھے اور بمشکل اٹھ رہے تھے۔ خوف اس کے ذہن کو جکڑ کر بے بس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خوف کے خلاف کیرین کی مزاحمت جاری تھی۔ یہ اس کا گھر تھا، اس کا بیڈ روم تھا۔ لیکن آج کی رات سب کچھ جو کی دسترس میں تھا۔

''پہلے بوربن کا جام ہو جائے۔ پھر ہم دیکھیں گے کہ بستر کتنا آرام دہ ہے اور تم کیسا پرفارم کرتی ہو...'' جو کے چہرے پر خباثت ناچ رہی تھی۔ کیرین کے اعصاب ٹوٹنے لگے۔ کچھ کرنے کے لیے اس کے پاس مہلت کم تھی اور ضروری تھا کہ وہ دماغ کو خوف کے چنگل سے آزاد رکھے۔ اس نے بوربن کی بوتل جو کو پکڑائی۔

''میوزک بھی ہونا چاہیے۔'' جو نے بوتل کھولی۔ ''تمہیں ڈانس تو آتا ہو گا لیکن کپڑوں کے ساتھ مزہ نہیں

آئے گا۔'' اس نے کیرین کے لباس کی طرف فحش اشارہ کیا۔

کیرین کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کی لہر اٹھی۔ اس نے میوزک آن کر دیا۔ تاہم لباس کو ہاتھ نہ لگایا۔

''دیکھو ڈیئر، اس طرح رنگین شب، بے رنگ ہو جائے گی اور تمہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ پارٹی تو ہوتی رہی ہے اور آج بھی ہوگی۔'' جو کے تاثرات میں سختی گھل گئی۔

کیرین نے سوچا کہ جو جیسے کمینے فطرت شخص کو مشتعل کر کے وہ کچھ بھی نہ کر پائے گی۔ بہتر ہے کہ اسے خوش فہمی میں رکھا جائے۔

''میں بھی سوچ رہی ہوں کہ خوامخواہ رات کیوں خراب کی جائے۔'' کیرین نے بمشکل ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیری۔

''گڈ، ویری گڈ... مجھے تم سے یہی توقع تھی۔'' جو نے بوربن کی بوتل منہ سے لگائی۔

جو کے مکروہ مطالبات کے سامنے اس نے نیم برہنگی کی حالت میں موسیقی کی لہروں پر تھرکنا شروع کیا۔ جو کرسی میں نیم دراز تھا۔ اس کی آنکھوں میں بدمستی اور گرمجوشی کا رنگ گہرا ہونے لگا۔

کیرین سوچ رہی تھی کہ وہ کیا کر سکتی ہے؟ تاریکی بار بار اس کے ذہن پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ کیا وہ کسی کرشمے کی منتظر ہے۔ ایک خیال ذہن میں تھا کہ وہ جو کو برہم نہ ہونے دے اور زیادہ سے زیادہ پلا دے۔ اٹھلاتے ہوئے ایک اور بوتل اس نے جو کے حوالے کر دی۔ دوسری بوتل بھی تیزی سے خالی ہو رہی تھی۔ جو کی دست درازیاں بڑھنے لگیں۔ بوتل اس نے ایک طرف صوفے پر ڈال دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی پولو شرٹ اتار کر جو نے ایک طرف اچھال دی۔ پھر وہ اپنے زیریں لباس کی طرف متوجہ ہوا۔ کیرین کی نظریں قالین پر گڑ گئیں۔ جو کچھ ہونے والا تھا، وہ بدترین تھا۔ کہیں سے کوئی مدد نہیں آسکتی تھی۔ کیرین کا گلا خشک ہو گیا، سر گھومنے لگا۔ معاً اسے دل کا خیال آیا۔ غصے نے پھر ذہنی خوف کو پسپا کیا۔

دفعتاً موہوم سی امید نے سر اٹھایا۔ ایک موقع تو اسے ملے گا...

☆☆☆

باسل، ایمی کے سامنے فرش پر بیٹھا تھا۔ وہ ایک پرانا کمبل بیڈ روم سے لے آیا تھا اور کیبن کے فرش پر ڈال دیا تھا تاکہ ایمی کو کیبن کے چوبی فرش پر نہ بیٹھنا پڑے۔ خود وہ لکڑی کے ٹکڑے سے کھلونا تراشنے میں مصروف تھا۔

''کیسی طبیعت ہے؟'' باسل نے سوال کیا۔

''بہتر ہے۔''

''بھوک تو نہیں لگ رہی؟''

''ہاں، بھوک سے پیٹ میں تکلیف ہو رہی ہے۔'' ایمی نے منہ بنایا۔

باسل کے چہرے پر پریشانی ظاہر ہوئی۔ ''میں تمہارے لیے ''کیپٹن کرنچ'' بنا کر لاتا ہوں۔'' باسل نے اٹھ کر کچن کا رخ کیا۔ ایمی اسے بتا ہی نہیں سکی کہ ''کیپٹن کرنچ'' اس کی شوگر میں اضافہ کر دے گی... باسل کچن کی طرف جاتے جاتے اچانک رک گیا اور پلٹا، وہ اپنے سر پر ہاتھ مار رہا تھا۔ اس نے ایمی کے قریب سے اپنا فون اٹھایا۔

''جو نے کہا تھا کہ یہ میں ہر وقت اپنے ساتھ رکھوں۔ اس نے مجھے ایک فالتو بیٹری بھی دی تھی۔''

ایمی نے فون کو دیکھا، اسے ماں کی بات یاد آئی کہ موقع ملتے ہی پولیس کو فون کر دینا۔ لیکن باسل فون کے معاملے میں محتاط تھا۔ ''تم انتظار کرو۔ میں کچھ بنا کر لاتا ہوں۔'' باسل کچن میں چلا گیا۔

ایمی کیبن کی کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔ باہر گھور اندھیرا تھا۔ ایمی کو اندھیرے سے نفرت تھی۔ لیکن اس کی ماں کی ہدایت اس کے ذہن میں موجود تھی۔ وہ بھاگ سکتی تھی۔ تاہم فون کیسے حاصل کرے؟ باسل کے رویے نے ایمی کے دل میں پسندیدگی کے جذبات بیدار کر دیے تھے لیکن اسے ڈیڈی کی بات بھی یاد تھی کہ اجنبی پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ اگرچہ اجنبی کا رویہ اچھا ہی کیوں نہ ہو۔

ایمی نے باربی ڈول کو اٹھایا اور آنکھیں بند کر کے ماں کا تصور کیا۔ وہ بھاگنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ باسل ابھی تک کچن میں تھا۔ ایمی نے ماں کا چھوڑا ہوا ''آئس باکس'' بھی اٹھا لیا اور تیزی سے دروازے کا رخ کیا۔

باسل، کچن سے باہر آیا تو اس کے ایک ہاتھ میں کھانے کا برتن اور دوسرے ہاتھ میں سیل فون تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ایمی غائب تھی۔ چند سیکنڈ بعد اس کے موٹے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''تم چور سپاہی کھیلنا چاہتی ہو۔'' کیبن کا کھلا ہوا دروازہ ہوا کے ساتھ با آواز بند ہوا۔ باسل کے چہرے پر الجھن نظر آئی۔ اس نے برتن اور سیل فون نیچے رکھ دیا اور باہر کا رخ کیا۔

☆☆☆

جو کے بدن پر برائے نام لباس تھا۔ کیرین نے اس کی مدہوش، پُرہوس آنکھوں میں جھانکا اور حتی الامکان آواز کو نارمل رکھا۔ ''مجھے باتھ روم جانا پڑے گا۔''

''باتھ روم میں کیا ہے؟ ایک اور گن؟''

''یہ کسی فوجی کا گھر نہیں ہے کہ ہر کمرے میں گن رکھی ملے گی... ہوگی بھی تو میں کیا کرلوں گی۔'' کیرین نے آواز کو نارمل رکھا۔

''فائن، میں منتظر ہوں۔'' جو نے بستر پر چھلانگ لگا دی۔

کیرین نے باتھ روم میں گھس کر دروازہ بند کرلیا۔ پہلے اس نے نل کھول کر چھوڑ دیے۔ پھر آئینے کے عقب میں موجود کیبنٹ میں ہاتھ مارا۔ تاہم اسے مطلوبہ چیز نہیں ملی۔ اس کی نظر آئینے کے عکس پر پڑی۔ اسے لگا وہ کسی بھوت کو دیکھ رہی ہے۔ کیرین نے چھینٹے مار کر چہرہ تولیے سے خشک کیا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کی نظر ٹوتھ برش والے پلاسٹک کپ پر پڑی۔ تین برش کے ساتھ بظاہر نازک سا فولادی سرجیکل بلیڈ رکھا تھا۔ اس کی لمبائی چھ انچ تھی۔ اس کا مختصر پھل انتہائی تیز دھار تھا اور پلاسٹک کیپ میں محفوظ تھا۔ سرجری کے دوران میں مطلوبہ مقامات کو وہ مکھن کی طرح تراشنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

کیرین نے آلۂ سرجری کا حفاظتی کیپ الگ کیا اور اسے احتیاط سے انگلیوں میں چھپالیا۔ اسے باتھ روم سے نکلنے کے بعد بھی خاص احتیاط کرنی تھی، بصورتِ دیگر معمولی سی غلط حرکت خود اسے زخمی کرسکتی تھی۔ اس نے نل بند کیے اور نئے حوصلے کے ساتھ باتھ روم کا دروازہ کھول دیا۔

''بہت تڑپا رہی ہو تم۔'' جو نے بستر پر کہنی ٹکا کر گرسنہ نگاہوں سے کیرین کے نیم برہنہ شفاف بدن کو گھورا۔

''تڑپنے میں مزہ نہیں ہے؟'' کیرین نے نازو انداز کے تیر پھینکے۔

''ہاں، ہے تو... لیکن اب بس کرو، تم میرے اندازے سے زیادہ خوب صورت ہو۔'' جو نے بے قراری سے ہاتھ بلند کیا۔

''تجھے تو ایسا تڑپاؤں گی کہ زندگی بھر عورت کے لیے تڑپے گا۔'' کیرین نے نفرت ظاہر کیے بغیر دل میں کہا۔

☆☆☆

امبی، تاریکی میں جھاڑ جھنکاڑ میں چھپی ہوئی تھی۔

باسل چاند کی مدھم روشنی میں اس کے پاس سے گزر گیا۔

''امبی، تم کہاں ہو؟ مجھے خوف زدہ مت کرو۔''

امبی کوشش کررہی تھی کہ کوئی آواز پیدا نہ ہو، اگرچہ اس کی پنڈلیوں میں خراشیں پڑ گئی تھیں۔

''امبی تم کہاں ہو؟'' وہ بیس فٹ جاکر درختوں کی قطار کے ساتھ رک گیا۔

امبی کا بدن کانپ رہا تھا۔ وہ خوف زدہ تھی۔ حشرات الارض کی آوازیں اسے اور ڈرا رہی تھیں۔ اس نے کیبن کی روشنی کی طرف دیکھا۔ باسل کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ سیل فون کیبن میں ہی تھا۔ امبی انتظار کررہی تھی کہ باسل کچھ اور دور چلا جائے۔

☆☆☆

کیرین بیڈ کی طرف قدم قدم بڑھ رہی تھی۔ بیڈ کے قریب قالین پر اس نے ول کی گن۔ 38 پڑی ہوئی دیکھی۔ جو کو گن کی فکر نہیں تھی۔ اس نے جو جال پھیلایا تھا، اس پر اسے پورا اعتماد تھا۔ کیرین نے بستر پر جانے سے پہلے ٹانگ سے۔ 38 بیڈ کے نیچے کھسکا دیا اور بستر پر آگئی... جو کی دست درازیاں اور فحش گوئی جلد ہی عروج پر پہنچ گئی۔ جنس اور شراب کے دوآتشہ نشے نے مل کر جو کو نیم مدہوش کردیا تھا۔ کیرین نے زیر جاموں کو بچایا ہوا تھا اور موقع کی تاک میں تھی۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کیرین طوعاً و کرہاً عریاں حرکت کی حدود کو پھلانگ رہی تھی۔ نتیجتاً جو کے خمار میں اضافہ ہوتا گیا۔

''تمہارے اندر... بب... بوربن کی بوتل سے زیادہ نشہ ہے۔'' اس نے بہکی ہوئی آواز میں کہا۔ کیرین اس کے بے لباس جسم کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ جو اس کے بچے کھچے مختصر کپڑے نوچنا چاہ رہا تھا۔

''جلد بازی مت کرو، میں تمہیں کچھ نیا کر کے دکھاؤں گی۔'' کیرین پلٹ کر اس کے اوپر آگئی۔

''ہاں... کیوں نہیں... جلدی کرو۔ تم کمال کی چیز ہو۔''

جو کا چہرہ کیرین کی نرم زلفوں میں چھپ گیا... کیرین نے احتیاط سے اسکیلپل (scalpal) انگلیوں سے نکالا اور پھرتی سے بیڈ سے اتر گئی۔ چپٹے چھ انچ لمبے فولادی سرجیکل آلے کا چھوٹا سا انتہائی تیز دھار پھل اس نے جو کی ناف کے نیچے رکھ دیا۔ کیرین کی آنکھوں میں آگ اور نفرت تھی۔

''کوئی حرکت کی تو ساری زندگی پیشاب کرنے کے لیے کیتھر (Catheter) کے محتاج ہو کے رہ جاؤ گے۔ وہ بھی اگر بروقت اسپتال پہنچ گئے۔'' کیرین کی آواز میں

فیصلہ کن صلابت تھی۔
جو کی آنکھوں سے خمار اور مستی غائب ہو چکی تھی۔ اس نے دہشت سے زیریں بدن کی طرف دیکھا۔ اس کے بھڑکے ہوئے جذبات سرد ہوتے چلے گئے۔ اس نے گھونسا مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا اور رک گیا۔
''نہ... نہ... مسٹر جو کنی۔ یہ دس نمبر کا اسکیلپل ہے اور میں نے بطور سرجیکل نرس چھ سال کام کیا ہے میری اچٹتی ہوئی حرکت بھی تمہیں ناقابل تلافی نقصان پہنچائے گی۔ اپنے قیمتی اوزار کی حفاظت مطلوب ہے تو بے حس و حرکت پڑے رہو۔ اب میرا حکم چلے گا۔''
''میں تمہیں اور تمہاری بیٹی دونوں کو ختم کردوں گا۔''
کیرین نے ہاتھ کا دباؤ معمولی بڑھایا، جو کے زیرِناف خون پھوٹ پڑا۔
''رکو۔'' جو کا چہرہ سفید پڑ گیا۔
''اپنے کزن کو فون کرو کہ وہ ایبی کو یہاں لے آئے۔''
''مت کرو... تم اپنی بیٹی کی زندگی سے کھیل رہی ہو۔''
''بیڈ سائڈ سے فون اٹھاؤ۔'' کیرین کے لہجے میں غصہ اور نفرت تھی۔ ''آہستہ سے حرکت کرنا، کوئی ہوشیاری نہیں۔''
جو نے نمبر ملایا لیکن دوسری جانب گھنٹی بجتی رہی۔
''جواب نہیں آرہا۔''
''بکواس مت کرو۔'' کیرین نے سرجیکل بلیڈ کا دباؤ بڑھایا۔
''رک جاؤ۔'' جو چلانے لگا۔ ''میں پھر ملاتا ہوں۔''
دوسری مرتبہ بھی رابطہ نہیں ہوا۔ ''مجھ پر شک مت کرو۔ خود ملا کر دیکھ لو۔ کوئی گڑبڑ ہے، پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔''
''کیا مطلب؟ کیسی گڑبڑ؟''
''تم یہ ''خنجر'' ہٹاؤ، مجھے خود تشویش ہو رہی ہے۔''
''اپنا گندہ منہ بند رکھو، مجھے سوچنے دو۔'' کیرین کے چہرے پر الجھن تھی۔ لمحہ بھر کے لیے اس کی توجہ ہٹی اور جو نے فون ریسیور کھینچ کر اس کی کنپٹی پر مارا۔ کیرین کے دماغ میں سفید روشنی کا جھماکا ہوا، تاہم اضطراری طور پر اس کے سرجیکل بلیڈ والے ہاتھ نے جھٹکا لیا۔ جو کے حلق سے دلخراش چیخ بلند ہوئی... دونوں نے نیچے دیکھا۔ جو کے زیرِناف خون ہی خون تھا۔

☆☆☆

باسل، ایبی کی تلاش میں کیبن سے دور چلا گیا تھا۔ ایبی، کیبن سے آنے والی مدھم سی آواز پر سماعت کو مرکوز کررہی تھی۔ اچانک وہ آواز بند ہوگئی۔ ایبی نے باسل پر نظر رکھتے ہوئے کیبن کی طرف حرکت کی۔ معاً وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ایبی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ سیل فون کی آواز تھی۔ ایبی باسل کی نظروں میں آئے بغیر کیبن میں گھس گئی۔ آواز پھر تھم گئی تھی۔
بیڈروم کے دروازے کے قریب فرش پر کھانے کے برتن پڑے تھے، ساتھ ہی سیل فون بھی پڑا ہوا تھا۔ ایبی نے لپک کر فون اٹھالیا۔ اسی وقت باسل کی آواز آئی۔
''ایبی کہاں ہو؟ آجاؤ۔ میرے لیے مشکل کھڑی ہو جائے گی۔'' باسل قریب ہی تھا۔ ایبی منجمد ہو کے رہ گئی۔ اسے دوبارہ موقع نہیں ملے گا، اسے ہمت سے کام لینا چاہیے... وہ کھڑکی کی طرف بڑھی اور باہر جھانکا۔ اس کا چھوٹا سا بدن کھڑکی سے نکل سکتا تھا۔ باسل کی آواز دوسری جانب سے آرہی تھی۔ اس نے فون جیب میں ٹھونسا اور کھڑکی سے کود گئی۔ اس کی بائیں ٹانگ میں تکلیف ہوئی تاہم اس نے منہ سے آواز نہیں نکالی۔ البتہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ وہ لنگڑاتی ہوئی درختوں کے پیچھے چلی گئی۔
چاند کی روشنی درختوں کی وجہ سے کچھ اور مدھم ہوگئی تھی۔ ایبی کے لیے یہ روشنی کافی تھی۔ اس نے **911** پنچ کیا اور فون کان سے لگالیا۔
''سیل اسٹار، خوش آمدید کہتا ہے۔'' کمپیوٹر سے آواز آئی۔ ''آپ اس وقت نان۔ ایمرجنسی۔ سروس۔ زون میں ہیں، پلیز...''
''پولیس کہاں ہے؟'' ایبی رو پڑی۔ ''مجھے پولیس کی مدد چاہیے۔''
ایبی کی لڑکھڑاتی آواز کا کوئی جواب نہیں ملا۔

☆☆☆

جو کا چہرہ خوف اور اذیت سے مسخ ہوگیا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کا خوف کچھ کم ہوا کہ اس کے بدن کا اہم عضو بال بال بچ گیا تھا۔ سرجیکل بلیڈ نے اس کی ران کو چیر ڈالا تھا۔ خطرناک گھاؤ سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بھی دہشت کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ اس نے تکیہ اٹھا کر مضبوطی سے زخم پر جما دیا۔
''تمہیں کہا تھا کہ چالاکی مت دکھانا، اب تم جریان خون کے باعث مرو گے۔ اسپتال جانا ضروری ہے۔''

کیرین نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ایک ٹانگ سے وہ بستر کے نیچے گن کو تلاش کر رہی تھی۔

''مرے گی، تیری بیٹی مرے گی... ضرور مرے گی۔'' جو چوٹ کھائے کتے کی طرح بلبلایا۔

کیرین کو احساس تھا کہ ایمی کو یہاں لانے کا اس کا منصوبہ فیل ہو گیا ہے۔ لیکن فون پر رابطہ کیوں نہیں ہوا؟ وہ جو کو جریانِ خون کے ذریعے مرنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتی تھی نہ ہی خود کو اس کے رحم و کرم پر... اب تو وہ بالکل ہی پاگل ہوا جا رہا تھا۔

''باسل نے فون کا جواب کیوں نہیں دیا؟ کیا وہ دونوں کیبن میں نہیں ہیں؟''

''جہنم میں گئے دونوں، دیکھو کیا کیا ہے تم نے؟'' جو نے غرانے کی کوشش کی۔ اس کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔

''بک بک مت کرو، باتھ روم میں جا کر تولیا کس کے لپیٹو۔ میں کچھ کرتی ہوں۔'' کیرین نے بستر کے نیچے گن کو محسوس کر لیا تھا۔ جو لڑکھڑاتا ہوا باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ کیرین نے جھک کر گن اٹھالی۔ جلدی جلدی اپنے کپڑے پہنے اور میوزک بند کر کے باتھ روم کی طرف چل دی۔

جو بار بار دھمکیاں دے رہا تھا کہ وہ ایک فون کال کر کے ایمی کو مروا دے گا۔ تم نرس رہ چکی ہو۔ مجھے اسپتال جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ٹانکے لگا کر زخم کی سلائی کر سکتی ہو۔

کیرین نے پھر کانپنا شروع کر دیا۔ جو کو زندہ رکھنا اس کی مجبوری تھی۔ جو کی برہنگی اسے بری طرح کھل رہی تھی۔ اس کا دل جو کے گندے جسم کو ہاتھ لگانے کے لیے آمادہ نہ تھا۔

''تم اپنا منہ بند رکھو اور خود پر قابو رکھو۔ میں کچھ کرتی ہوں۔ تولیا لپیٹ کر رکھو، میں فرسٹ ایڈ بکس لے کر آتی ہوں۔''

''یہ گن کیوں نچا رہی ہو؟ گولی مار دو مجھے...''

'گولی تو تیرا مقدر ہے مردود، تو اس مرتبہ غلط فیملی سے ٹکرا گیا ہے،' کیرین نے دل ہی دل میں اسے ایک مکروہ خطاب سے نوازا اور باتھ روم سے نکل گئی۔ جاتے جاتے اس نے بتایا کہ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ پچاس ٹانکیں لگیں گے... پچاس ٹانکوں والی بات اس نے جھوٹ بولی تھی... جو دانت پیس کے رہ گیا۔

☆☆☆

ایمی بروقت درختوں میں چھپ گئی۔ اس مرتبہ اس نے گھر کا نمبر پنچ کیا۔ گھنٹی بجنے لگی...

کیرین، وال کا میڈیکل بکس تلاش کر رہی تھی۔ جب بیڈ سائڈ پر فون کی گھنٹی نے بجنا شروع کیا۔ جو، باتھ روم میں تھا۔ کیرین کو یقین تھا کہ مسز جو کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس نے قدرے تردد کے ساتھ فون اٹھالیا۔

''ہیلو۔'' کیرین نے کہا۔

ادھ کھلے باتھ روم سے جو چلایا۔ ''اسے ایک منٹ کے لیے روکو۔''

''ماما؟''

کیرین کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کا ہاتھ لرزنے لگا۔

''ایمی؟'' اس نے سرگوشی کی۔ ''تم ٹھیک ہو؟ تم کہاں ہو؟''

ایمی جواب دینے کے بجائے سسکیاں لینے لگی۔

''خود کو سنبھالو، بتاؤ تم کہاں ہو؟ سب ٹھیک ہونے والا ہے۔'' کیرین نے اس کی ڈھارس بندھائی۔

''میں کیبن سے باہر چھپی ہوئی ہوں۔''

''تم نے پولیس کو فون کیا؟''

''وہ کچھ اور کہہ رہے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آیا... ماما، میری مدد کرو۔''

''تم کیا کر رہی ہو؟ فون بند کرو۔'' جو لڑکھڑاتا ہوا باتھ روم سے نکل آیا۔ کیرین نے فون بائیں ہاتھ میں منتقل کیا اور دائیں ہاتھ سے اعشاریہ اڑتیس سے نشانہ لے کر فائر کیا۔ جو دونوں ہاتھوں میں سر چھپا کر فرش پر اوندھا ہو گیا۔

''سن آف بچ، میری بیٹی کہاں ہے؟''

جو بے حس و حرکت چپ چاپ پڑا تھا۔ ران پر سے تولیا کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی اور خون رِسنا شروع ہو گیا تھا...

''جواب دے، مردود انسان۔'' کیرین نے پھر فائر کیا۔ گولی جو کے قریب فرش سے ٹکرائی۔

''ڈونٹ شوٹ، ڈونٹ شوٹ۔'' جو زخمی پلّے کی طرح چیاؤں چیاؤں کرنے لگا۔ اس کی تمام ہوشیاری ران کے گھاؤ سے خون کی شکل میں بہہ رہی تھی۔ حسین، نشیلی رات کا سپنا کروڑوں کرچیوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔

''تمہاری بچی ماری جائے گی۔'' وہ کراہا۔ اس کے پاس یہی ترپ کا پتا تھا۔

''ماری جائے گی لیکن تیرے ساتھ۔ تیرے بعد

تیرے ساتھی بھی مارے جائیں گے۔'' کیرین نے مضبوط آواز میں کہا۔

''بے بی، فون مت بند کرنا، ماما ٹھیک ہیں۔ تم جنگل میں چھپی رہو۔''

''اندھیرا ہے ماما۔''

''ہاں، ہنی۔ اس وقت یہ اندھیرا تمہارا دوست ہے۔ گھبراؤ مت سویٹی، ماما تم کو لے جائیں گی۔''

''وعدہ؟''

''وعدہ، فون مت بند کرنا۔''

''لو، تم اٹھو۔'' کیرین نے جو کو حکم دیا۔

وہ ہاتھوں اور ایک ٹانگ کے سہارے کھڑا ہوا اور دیوار سے ٹیک لگائی۔ ''تم کیا کرنا چاہ رہی ہو؟''

''میں نے منصوبہ تبدیل کر دیا ہے۔'' کیرین نے سرد آواز میں کہا۔

☆☆☆

ڈاکٹر جیمس میکڈیل اور اس کی بیوی مارگریٹ، اسپیشل ایجنٹ، شالمر کے سامنے بیٹھے تھے۔ ریت کی رنگت والے بالوں کے شالمر کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ شالمر کا تعلق ایف بی آئی کے جیکسن فیلڈ آفس سے تھا۔

میکڈیل تنہا آنا چاہ رہا تھا لیکن مارگریٹ ساتھ چلنے پر بضد تھی۔ وہ اسپیشل ایجنٹ انچارج کے آفس میں براجمان تھے۔ آفس کے باہر تختی پر ایجنٹ کا نام فرینک زک لکھا تھا۔ شالمر اپنے باس کی ڈیسک پر موجود تھا۔

''یہ اغوا برائے تاوان کا کیس ہے، ٹھیک؟''

''یس۔'' میکڈیل نے جواب دیا۔

''اور یہ ایک برس قبل کی واردات ہے؟ ٹھیک؟''

''یس۔''

''بلوکسی میں جو میڈیکل کانفرنس ہو رہی ہے، ایک سال پہلے ٹھیک اس موقع پر ہمارے ساتھ یہ واردات ہوئی تھی۔'' مارگریٹ نے لقمہ دیا۔

''آپ لوگوں نے رپورٹ کرنے میں ایک سال گزار دیا، کیوں؟''

ڈاکٹر میکڈیل نے وضاحت سے اپنے خوف اور واردات کنندگان کی دھمکیوں کے ساتھ پیٹر کی پوسٹ ٹرامک حالت کا بھی ذکر کیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ میاں بیوی رپورٹ کے بارے میں اتفاقِ رائے پیدا نہیں کر پا رہے تھے۔

''ڈاکٹر، تمہیں یہ خیال کیوں آیا کہ اس مرتبہ پھر ایسی ہی واردات ہو گی؟'' شالمر نے پیڈ اور پنسل سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔

ڈاکٹر میکڈیل نے ایک گہری سانس لی اور بتانا شروع کیا۔ شیرل نے جو معلومات سابقہ ''کارناموں'' کے بارے میں بتائی تھیں، نیز اپنے طریقۂ کار کے اوپر جو روشنی ڈالی تھی۔ اس پر مجھے یقین ہے کہ اس سال بھی ایسا ہی ہونا ہے۔''

''اس نے یہ سب کچھ کیوں بتایا؟'' شالمر نے اعتراض کیا۔

''ایک وجہ یہ تھی کہ ہم ان کے پلان کو سمجھ جائیں اور رپورٹ کرنے کی حماقت نہ کریں۔ دوسرے ان کا منصوبہ فول پروف تھا اور وہ حد سے زیادہ پُراعتماد تھے۔''

''وہ لوگ ڈاکٹروں کو ہی نشانہ کیوں بناتے ہیں؟''

''اس بارے میں، میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''ہو سکتا ہے، اس مرتبہ وہ یہ واردات کسی اور علاقے میں کریں؟'' شالمر نے ایک اور منطقی سوال اٹھایا۔

''ممکن ہے۔۔۔ تاہم میرا خدشہ ہے کہ واردات یہی ہوگی بلکہ ہو چکی ہے۔۔۔ یہ میرا یقین یا چھٹی حس ہے، کچھ بھی کہہ لو۔ اگر وہ واردات کہیں اور کرتے ہیں تو ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں معلوم، البتہ ہم یہاں ٹرائی ضرور کر سکتے ہیں۔ میرے یقین کی ایک وجہ یہ ہے کہ اب تک کسی نے رپورٹ نہیں کی اور وہ لوگ خوش فہمی کا شکار ہیں۔''

بل نے تفہیمی انداز میں سر ہلا کر پیڈ پر چند لکیریں گھسیٹیں اور مارگریٹ کی طرف متوجہ ہوا۔

''کیا جو اس کا اصل نام ہے؟''

''مجھے یقین ہے۔''

''اگر فوٹو سامنے آئے تو تم پہچان لو گی؟''

''بلاشبہ۔'' مارگریٹ نے پھر یقین دہانی کرائی۔

''اور تم شیرل کو پہچان لو گے؟'' شالمر نے میکڈیل سے سوال کیا۔

''کیوں نہیں؟''

''ٹھیک ہے، ہم جیکسن پولیس ڈپارٹمنٹ کی ''مگ بکس'' اور نیشنل کرائم انفارمیشن سینٹر کے کمپیوٹر سے آغاز کرتے ہیں۔'' شالمر نے پنسل رکھ کر فون اٹھا لیا۔

☆☆☆

''فون اٹھاؤ۔'' کیرین نے کارڈلیس کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ پرائیویٹ لائن ہے۔ بلوکسی میں میرے

شوہر سے رابطہ کرو۔''
جو نے ہیوریج کا سوئٹ نمبر 28021 کا فون ملانا شروع کیا۔
کیرین نے سیل فون (یہ دوطرفہ سیل تھا وہ ایک بٹن دبا کر ول سے اور ایبی دونوں سے بات کرسکتی تھی) پر ایبی کی موجودگی کی تصدیق کی اور اسے پھر ہدایت کی کہ سیل فون آن رکھے... جو نے سوئٹ 28021 سے رابطہ ملا کر کارڈلیس واپس بستر پر پھینک دیا۔ کیرین نے سیل فون شانے اور رخسار کے درمیان دبایا، اس کے دائیں ہاتھ میں اعشاریہ 38 تھا، بائیں ہاتھ سے اس نے کارڈلیس اٹھایا۔
کارڈلیس پر شیرل کی آواز آئی۔ کیرین نے اختصار کے ساتھ شیرل کے شوہر کی پوزیشن بتائی اور اسے حکم دیا کہ فون ول کے حوالے کردے۔ شیرل نے کیرین کا حکم تسلیم کرنے سے قبل تھوڑا وقت لیا۔ پھر فون ول کے حوالے کردیا۔
''تھینک گاڈ، کیرین۔'' ول کی آواز آئی۔ ''وہاں کیا ہورہا ہے؟ ایبی خیریت سے ہے؟''
کیرین نے شوہر کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔
''تمہارے خیال میں، ایبی، جیکسن سے کتنی دور ہے؟'' ول نے سوال کیا۔
''میرے اندازے کے مطابق فاصلہ ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے مساوی ہے۔'' کیرین نے تخمینہ بتایا۔
''یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ لوگ کس کمپنی کی سروس استعمال کررہے ہیں ''سیل اسٹار'' کا نیٹ ورک بڑا ہے۔ جو کا سیل فون چیک کرو۔'' ول نے تیزی سے ہدایت دی۔
''اپنا سیل فون بستر پر پھینک دو۔'' کیرین نے جو سے کہا۔ جو نے ''نوکیا'' بستر پر اچھال دیا۔
''اب اسٹار، 1، 8، 1 ڈائل کر کے جواب سنو۔'' ول نے ہدایت کی۔ کیرین نے گن چھوڑے بغیر، ٹریگر والی انگلی سے بستر پر پڑے موبائل پر نمبر پنچ کیے۔
''ویل کم ٹو ''سیل اسٹار'' کسٹمر سروس''، کمپیوٹرائزڈ جواب آیا۔ کیرین نے اینڈ کا بٹن دبا کے ول کو ''سیل اسٹار'' کی تصدیق کی۔
''گڈ۔'' ول کی آواز میں اعتماد تھا۔ ''میں سیل اسٹار میں اپنے بندے سے بات کرتا ہوں۔ وہ سیل اسٹار کا باس ہے۔''
''تم لوگ نمبر ٹریس نہیں کرسکتے۔'' جو نے تکلیف دہ تاثرات کے ساتھ یقین کا مظاہرہ کیا۔
''کیوں؟'' کیرین نے استفسار کیا۔
''سیل کچھ نہیں ہے، یہ دراصل ایک قسم کا ریڈیو ہی ہے... متعلقہ سگنلز کی طاقت ٹاور پر منحصر ہے۔ مسی سپی، ٹاورز کے مقابلے میں، ملک کی دوسری ریاستوں سے کہیں پسماندہ ہے... پانچ سال پیچھے ہے۔ باسل جہاں ہے، وہاں سگنلز کے ذریعے لوکیشن ٹریس نہیں کی جاسکتی۔'' جو کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
کیرین ٹپٹا کے رہ گئی۔
''میں اسی لیے بتا رہا ہوں کہ مجھے اب بھی پیسوں کی ضرورت ہے۔'' جو نے کہا۔
کیرین نے دوسرے سیل فون پر ایبی کو تسلی دی اور ول کو جو کی اسکیم کے بارے میں بتایا۔
''جو سے بات کراؤ۔'' ول نے خود کو سنبھالا۔
''ڈاکٹر، باسل نے ایبی کو ڈھونڈ لیا تو وہ ماری جاسکتی ہے۔''
''اور تم مرڈر چارج میں پھنسو گے۔'' ول کا جسم کانپ رہا تھا۔
''ڈاکٹر، تم بھول رہے ہو کہ اغوا کی سزا بھی موت ہے۔''
''کیا تم یقین کرو گے کہ تمہاری بیوی میرے قابو میں ہے... وہ بھی ماری جائے گی۔''
''تمہاری آواز کھوکھلی ہے ڈاکٹر۔''
''جہنم میں جاؤ... کیرین سے بات کراؤ۔''
''صورتِ حال اتنی بدتر نہیں ہے۔ میرا یقین کرو، ڈٹی رہو... تم اچھا جا رہی ہو... یہ بتاؤ کہ تم نے باسل کو دیکھا ہے؟''
''یس؟'' کیرین نے دھیمے سے کہا۔
''جو کے کہنے پر کیا وہ ایبی کو مار سکتا ہے؟''
کیرین نے ماؤتھ پیس کور کر کے دھیرے سے کہا۔
''مشکل سوال ہے... وہ بظاہر دیوزاد ہے، لیکن اس کا دماغ بچوں جیسا ہے۔''
''کیا یہ ممکن ہے کہ ایبی، صبح تک چھپی رہے یا سڑک تک پہنچ جائے؟''
''کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' کیرین کی آواز میں مایوسی در آئی۔
''حوصلہ رکھو۔'' ول نے کہا۔ ''تم نے کہا تھا کہ تم وہاں انسولین چھوڑ آئی تھیں؟''
''ہاں لیکن ایک منٹ رکو۔'' کیرین نے کہا۔

''ابی!''

''ماما!''

''ابی انسولین کا باکس ہے تمہارے پاس؟''

''ماما، میں فون لینے دوبارہ کیبن میں گئی تھی تو انسولین وہیں بھول گئی تھی۔''

''گھبراؤ مت، میں ڈیڈی سے بات کر رہی ہوں۔'' حالانکہ کیرین خود ہراساں ہو گئی تھی۔

''ول، انسولین اس کے پاس نہیں ہے... ہوتی بھی تو وہ خود سے استعمال نہیں کر سکتی۔'' کیرین نے وضاحت کی۔

☆☆☆

باسل نے آسمان کی جانب دیکھا۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ اندھیرے میں گھورنے سے اس کی آنکھیں دکھنے لگی تھیں۔ اسے جو کے غصے سے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے بھی قاصر تھا کہ وہ ابی کو کیوں نہیں ڈھونڈ پا رہا ہے...

وہ واپس کیبن کے قریب پہنچ گیا تھا۔ باسل نے آنکھیں سکیڑ کے دیکھا۔ وہ تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اچانک نیم تاریکی میں کوئی زرد چیز چمک کر غائب ہو گئی زرد روشنی پھر نظر نہیں آئی۔ تاہم باسل کو سمت کا اندازہ ہو گیا تھا... ابی کو اندازہ نہیں تھا کہ باسل کہاں ہے... جب باسل نے اسے نرمی سے دبوچا تو ابی نے مسلسل چیخنا شروع کر دیا۔ وہ متواتر چیخے جا رہی تھی۔

باسل کا دل کر رہا تھا کہ کان دونوں ہاتھوں سے بند کر لے لیکن اسے ابی کو اٹھا کر کیبن تک بھی لے جانا تھا۔ ابی کی چیخ و پکار میں خوف تھا... ویسا ہی خوف جب باسل بچپن میں خوف زدہ ہو کر چلاتا تھا۔

باسل نے ابی کو باندھ دینا تھا۔ تاہم وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے چوڑے سینے کے اندر کوئی چیز لرز رہی تھی۔ شاید اس کے بچپن کے خوف کا ارتعاش تھا۔

☆☆☆

دفعتاً کیرین کا رابطہ ابی سے منقطع ہو گیا۔ آخری آواز جو اس نے سنی وہ ابی کی چیخ تھی... کیرین کا دل پھڑپھڑایا اور سینے میں برف سی جم گئی... دہشت نے اسے آکٹوپس کے مانند جکڑ لیا۔ جو بغور کیرین کو دیکھ رہا تھا۔

''ابی!'' کیرین چلا اٹھی۔

''ابی، میرے پاس ہے... جو کہاں ہے؟'' باسل کی آواز آئی۔

''ویل، ویل...'' جو لنگڑاتا ہوا کھڑا ہوا۔ ''بلاشبہ باسل نے ابی کو پکڑ لیا ہے۔''

کیرین نے 38. جو کے سینے کی جانب کیا۔ ''اس کو کہو ابی کو واپس لائے۔'' کیرین نے دلیری کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تاہم اس کی آواز مرتعش تھی اور چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

دوسری طرف ول دانت بھینچے خاموشی سے سب سن رہا تھا۔

''کھیل ختم ہو گیا۔ مسز جیننگ۔'' جو بے خوفی سے بستر کے گرد گھوم گیا۔ ''گولی چلی اور ابی مری۔'' جو نے گن کی پروا کیے بغیر سیل فون چھین لیا۔

''باسل، گولی کی آواز آئے تو ابی کو ختم کر دینا... اس کتیا نے پہلے ہی مجھے زخمی کر دیا ہے۔'' اس نے باسل کو حکم دیا۔ ''ابی کو باندھ دو، میں پھر کال کروں گا۔''

پھر جو نے گن کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا... کیرین نے تنویمی کیفیت میں گن چھوڑ دی۔

☆☆☆

کیرین، ول کا سیاہ رنگ کا بیگ اٹھا لائی تھی اور جو کی ران کے زخم پر ٹانکے لگا رہی تھی... نصف شب بیت گئی تھی۔ جیننگ ہاؤس پہاڑی پر تاریکی میں خاموشی سی ایستادہ تھا۔ پائن کے درختوں میں سے حشرات الارض وہاں ہونے والے دلخراش ڈرامے سے بے خبر اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔

جو کی ناف کے نیچے ایک تولیا بندھا تھا۔ ران کے گرد کسا ہوا خون آلود تولیا اس نے کھول دیا تھا... ہاتھ میں وائلڈ ٹرکی کی بوتل تھی۔ زخم کی سلائی کے دوران وقفے وقفے سے اس کی سسکی نکل جاتی اور وہ بوتل منہ سے لگا لیتا تھا۔

کیرین نے بمشکل ابی کو ذہن سے نکالا تھا، ورنہ وہ ماؤف ذہن کے ساتھ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے خود کو مکمل مایوسی کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

''آخر ہم لوگ ہی کیوں؟'' وہ نرمی سے بولی۔

''میری ماں کو حلق کا کینسر ہوا تھا، کیوں؟'' آخر میری ماں کو ہی کیوں؟'' وہ بولا۔

کیرین اس کی بے تکی منطق سن کر خاموش ہو گئی۔

☆☆☆

اپنے لگژری سوئٹ میں، ول کھڑکی میں کھڑا باہر گلف آف میکسیکو کو گھور رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں تھے۔ ذہن میں آگ بھری تھی... رُواں رُواں غیظ و غضب کا شکار تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ باسل نامی شخص نے

ایبی کو قابو میں کرلیا ہے۔ کیرین نے جو بازی کھیلی تھی وہ پھر پلٹ چکی ہے۔

اگرچہ وہ شیرل کو ساتھ ملانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ تاہم وہ، ول کی موجودہ جنونی کیفیت سے گھبرا کر گن سمیت باتھ روم میں چھپ گئی تھی۔ گن دونوں کے لیے ناکارہ ہو چکی تھی۔

کئی سوالات اس کو الجھا رہے تھے... جو کا مسئلہ رقم تھی لیکن جو نے جو کھڑاگ پھیلایا تھا، ول کے نزدیک وہ تاوان کی رقم تک محدود نہیں تھا، بظاہر یہ تاوان کا معاملہ ہی نظر آتا تھا۔ تاہم ول کے نزدیک اس معاملے میں جو کے کچھ اور خباثت بھرے محرکات بھی شامل تھے۔ کیا وہ ڈاکٹروں سے انتقام لے رہا تھا۔ لیکن کیوں؟ چوبیس گھنٹے میں ہر مرتبہ رات شامل ہوتی تھی کیوں؟ جو کی بیوی، رات میں تنہا ڈاکٹروں کے ساتھ اور ڈاکٹروں کی بیگمات رات کی تنہائی میں جو کی دسترس میں...

معاً اس کے دماغ میں بجلی کڑکی۔ اس کا چہرہ انگارہ ہو گیا۔ ہاتھ جیبوں سے باہر نکال کر مٹھیاں اس نے اتنی سختی سے بھینچیں کہ ہر ایک جوڑ چونے کے مانند سفید پڑ گیا۔

شیرل کا ماضی تو اس نے اگلوا ہی لیا تھا۔ لیکن کیرین... اسے کوئی شک نہ رہا کہ ایبی کی زندگی کے ساتھ کیرین کی عزت بھی خطرے میں ہے... ول کی دماغ کی نسیں چٹخنے لگیں۔ اسے کچھ کرنا ہے، ہر قیمت پر کرنا ہے۔

شیرل اس دوران باتھ روم سے نکل کر بستر پر لیٹ گئی تھی۔ گن اس نے ایک طرف ڈال دی تھی اور معنی خیز انداز میں بغور ول کو دیکھ رہی تھی۔ ول اسے نظرانداز کر کے باتھ روم میں گھس گیا۔ اس نے کپڑے اتارے اور شاور کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ ٹھنڈا پانی سر پر گرتا ہوا سارے جسم کو بھگو رہا تھا۔ سر میں الاؤ دہک رہا تھا جو آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونے لگا۔

کچھ دیر بعد وہ باہر نکلا تو دماغ کام کرنے کے قابل ہو چکا تھا، بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اس نے سر خشک کرنے کی کوشش نہیں کی۔

شیرل اشتعال انگیز انداز میں بستر پر لیٹی تھی... وہ، ہم تو مائل بہ کرم ہیں۔ کوئی سائل ہی نہیں کا، عنوان دکھائی دے رہی تھی۔

''پریشان لگ رہے ہو، لاؤ بال خشک کردوں؟''

''ٹھیک ہوں۔''

''مالش کردوں۔'' وہ مسکرائی۔

''شکریہ۔'' ول نے کہا۔

''کچھ اور؟ تمہاری بیوی کو کیونکر پتا چلے گا؟'' وہ مسکرائی۔

ول نے اس مرتبہ جواب ہی نہیں دیا۔

شیرل نے منہ بنا کر ٹی وی کی جانب پھیر لیا۔

☆☆☆

ایبی، صوفے کے کونے میں دبکی ہوئی تھی۔ ابھی تک اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے، باربی ڈول کو سختی سے اس نے سینے کے ساتھ بھینچا ہوا تھا۔

باسل فرش پر چھ فٹ دور بیٹھا تھا۔ حیرت ناک طور پر اس کی آنکھوں میں بھی ہراس تھا۔ جو کی ہدایت کے برعکس اس نے ایبی کو بے دست و پا نہیں کیا تھا۔

''میں تمہیں خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔'' وہ بولا۔ ''جو نے مجھ سے جو کہا وہ میں نے کیا۔ میں مجبور تھا۔''

''اس نے مجھے ممی اور ڈیڈی سے چھین لیا ہے۔'' وہ کراہی۔ ''اور تم نے بھی۔''

''تم باہر کیوں نکلیں؟ میں بدصورت ہوں نا اسی لیے تم بھاگ گئی تھیں۔ میں بھوت کی طرح لگتا ہوں۔'' باسل کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ''بچے مجھ سے ڈر جاتے ہیں۔''

ایبی کی آہ و زاری تھم گئی۔ اس نے باسل کے تبصرے پر نفی میں سر ہلایا۔

''تم منہ سے نہیں بولو۔ میں جانتا ہوں۔ اسکول میں بھی بچے مجھ سے دور بھاگتے تھے... میں تمہیں دوست سمجھ رہا تھا۔ میں تمہیں تکلیف نہیں دوں گا۔ تم کیوں باہر نکل گئی تھیں؟''

''میں نے بتایا نا کہ تم نے ممی ڈیڈی سے مجھے چھین لیا ہے۔'' ایبی نے متورم آنکھوں سے کہا۔

''نہیں یہ بات نہیں ہے... میں عفریت کی طرح ہوں، میں تمہیں اچھا نہیں لگا۔''

''نہیں، صورت سے فرق نہیں پڑتا۔ بیلا نے مجھے بتایا تھا۔'' ایبی نے پلکیں جھپکائیں۔

''کیا؟'' باسل الجھ گیا۔

''یہ بیلا ہے۔'' ایبی نے باربی کو آگے کیا۔ ''بیوٹی اینڈ بیسٹ'' بیلا از بیوٹی۔ بیلا نے مجھے بتایا کہ شکل سے زیادہ دل اہم ہوتا ہے... اور تمہارا دل اچھا ہے۔''

''لیکن میں ''بیسٹ'' ہوں۔'' باسل کا جبڑا لٹک گیا۔

''تم نے شاید ''بیوٹی اینڈ دی بیسٹ'' نہیں دیکھی۔

باسل نے نفی میں سر ہلایا۔
''دیکھو، میں بیلا ہوں اور تم بیسٹ، ٹھیک ہے؟''
''ہاں۔'' باسل نے افسردگی سے کہا۔
''اوہ... ہو... تم اچھے والے بیسٹ ہو... گڈ بیسٹ۔'' وہ صوفے سے اُتر آئی اور باربی، باسل کو دے دی۔ کوئی اچھی بات کرو اور مجھے بیلا کے نام سے پکارو۔''
''کوئی اچھی بات کروں؟'' باسل نے باربی کو دیکھا پھر ایبی پر نظر ڈالی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔
''ہاں، تم ''بیوٹی'' نہیں ہو۔'' وہ اچانک بولا۔
''کیا...؟''
''تم پری ہو، چھوٹی سی پری... پری کا نام بیلا ہے۔''
ایبی بے اختیار ہنسنے لگی۔
''تھینک یو گڈ بیسٹ... اب تم بولو تھینک یو بیلا۔''
''تھینک یو بیلا۔'' باسل بچوں کی طرح کھل اٹھا۔
☆☆☆
کیرین نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے ڈھائی بج رہے تھے۔ وہ کرسی میں بیٹھی تھی۔ جو، بستر پر لیٹا تھا۔ اس کی مجروح ٹانگ کے نیچے تکیہ اور بغل میں ''وائلڈ ٹرکی'' کی بوتل تھی۔ اعشاریہ اڑتیس کی گن اس کے پاس رکھی تھی۔ وہ بڑے ٹی وی اسکرین پر ہمفرے بوگارٹ کی فلم دیکھ رہا تھا۔
کیرین آس لگائے بیٹھی تھی کہ جو کی مجروح ٹانگ، خون کا ضیاع اور شراب کی زیادتی اسے سلا دے... وہ اس سے باتیں کرنا چاہ رہی تھی کہ وہ ڈاکٹروں کے پیچھے کیوں پڑا ہے؟ پھر کیرین نے ارادہ ملتوی کردیا۔ اگر وہ سونے لگا تو گفتگو اس کی نیند کا امکان ختم کردیتی۔
☆☆☆
ول، صوفے پر لیٹا تھا۔ گیلا تولیا چہرے پر پڑا تھا۔ وہ بے بسی کے احساس کو فنا کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے چہرے پر سے تولیا ایک طرف پھینکا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ محض تاوان کا معاملہ نہیں ہے۔ کچھ اور معاملہ بھی ہے... کیا شیرل نے جھوٹ بولا ہے یا پھر اصل بات صرف جو کے علم میں ہے... ڈاکٹروں کے خلاف تاوان کی وارداتیں اسے ہضم نہیں ہورہی تھیں۔ ول بیڈروم کی طرف چل پڑا...
☆☆☆
کیرین، جو کے بستر کے قریب کرسی پر جھول رہی تھی۔ بظاہر وہ پرسکون تھی۔ تاہم دماغ میں بگولے چکرا رہے تھے۔ اس کی چھٹی حس خطرے کا اعلان کررہی تھی۔ اسے شک ہو چلا تھا کہ جو نے منصوبہ تبدیل کردیا ہے۔ بالآخر وہ رہ نہ سکی۔
''تو تم تاوان وصول کرکے ہی ایبی کو چھوڑو گے؟'' اس نے اچانک سوال کیا۔
جو نے چونک کر اسکرین پر سے نگاہ ہٹائی۔
''ضروری نہیں ہے۔''
''کیا مطلب؟'' کیرین کا دل زور سے دھڑکا۔
''ڈاکٹر جیننگ کا معاملہ کچھ اور ہے۔''
''کیا مطلب ہے؟'' کیرین کا رنگ فق ہوگیا۔
''اس نے ماضی میں میری ماں کا قتل کیا تھا۔''
''کیا بکواس کررہے ہو؟'' کیرین چیخ اٹھی۔
''پرانی بات ہے۔ تم دونوں پہلے یونیوسٹی اسپتال میں ملے تھے؟''
''ہاں۔'' کیرین اس کی معلومات پر ششدر رہ گئی۔
''وہاں میری ماں کا کینسر کا علاج ہورہا تھا۔ بے ہوشی کی حالت میں SCD کا خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ SEQUEUTIAL COMPRESSION DEVICES... چنانچہ کلاٹ بن گیا اور وہ مرگئی، وہیں آپریٹنگ ٹیبل پر۔ اور یہ ول کی ذمے داری تھی۔ میں نے بعد میں آکر سرجن سے معلومات کی تھیں۔ اب وقت آگیا ہے... ول کو پورا پورا حساب دینا پڑے گا۔''
''بکواس، جھوٹ... یہ ول کی ذمے داری نہیں تھی۔ SCD پر نظر رکھنا نرس کا مسئلہ تھا۔'' کیرین پھر چیخی۔
''مجھے نہیں پتا، میں نے تصدیق کرلی تھی۔''
''مجھے بھی نہیں پتا یہ غلط فہمی یا جھوٹ کیوں بولا گیا... تم ایسا نہیں کرسکتے۔'' کیرین کی آواز بھرّا گئی۔
''کون روکے گا مجھے؟'' جو نے قہقہہ لگایا۔
☆☆☆
اسپیشل ایجنٹ شالمر دروازہ کھول کر اندر آیا۔ اس کے ہاتھوں میں مگ بکس تھیں۔ ان کی اونچائی نصف فٹ سے زیادہ تھی۔ بلا مبالغہ، ان میں ہزاروں تصاویر تھیں۔
ڈاکٹر میکڈیل اور اس کی بیوی، فیڈرل بلڈنگ سے چند بلاک کے فاصلے پر پولیس ہیڈکوارٹر میں تھے۔
''میں نے NCIC کے کمپیوٹر سے مدد لی ہے۔ ساؤتھ ایسٹ کے صرف اغوا کی وارداتیں سرچ کی ہیں اور صرف تین نام ہٹ کیے ہیں... جو، شیرل اور باسل...''
''اتنی تصویریں؟'' میکڈیل اور اس کی بیوی ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔

''وقت کم ہے، کام مشکل ہے... لیکن ہو سکتا ہے۔'' شالمر نے کہا۔ ''جو، نام بہت عام ہے لہٰذا اسے نظر انداز کر دو... اس طرح صحیح ہو جائے گی۔ البتہ باسل اور شیرل کی تصویر ملنے کا چانس ہے... شروع ہو جاؤ۔'' شالمر نے گائیڈ لائن دی۔

☆☆☆

میکڈیل نے کافی کی تیسری پیالی ختم کی اور آنکھوں کو مسلا اور پھر سے تصاویر کو چھانٹنا شروع کر دیا۔ معاً اس کی سانس رک گئی... وہ شیرل کی کم عمری کی تصویر تھی۔

''یہ شیرل ہے۔'' اس نے شالمر کو تصویر دکھائی۔

''شیور؟''

''سو فیصد۔''

شالمر تصویر لے کر کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گیا...

''معمولی وارداتیں ہیں۔ جسم فروشی کا دھندا بھی کرتی رہی ہے... گرفتار صرف ایک مرتبہ ہوئی ہے۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو، یہی ہے۔''

''اب کیا کرنا ہے؟'' ڈاکٹر نے سوال کیا۔

''تصویر کی کاپی بیوریج ریسورٹ جائے گی۔ امکان ہے کہ اسٹاف کے کسی ممبر نے اسے دیکھا ہو۔''

''پھر؟''

شالمر نے ابرو اچکا کر گہرا سانس لیا۔ اگر وہ وہاں ہے تو ٹرولیس کو کال کرنا پڑے گی... نیز ہمیں یہ فرض کرنا پڑے گا کہ تمہارا قیاس درست ہے کہ اغوا کی واردات زیرِ عمل ہے اور یہ ایک میجر سچویشن ہے۔''

☆☆☆

''اگر تم اس الزام کو ٹھیک سمجھتے تھے تو تم ول پر مقدمہ کر سکتے تھے؟'' کیرین نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔

''مقدمہ؟ مقدمے سے کیا ملتا، مجھے تو پوری قیمت وصول کرنی تھی۔''

''یعنی تم ول کو مارو گے؟'' میرین کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

''یوں۔'' جو نے چٹکی بجائی۔ ''اور ایمی کو بھی۔'' جو نے سفاک نظروں سے کیرین کو گھورا۔

اچانک کیرین بستر پر پڑے ہتھیار پر جھپٹی۔ تاہم جو چوکس تھا۔ اس نے اپنی صحت مند ٹانگ چلا کر کیرین کو دور پھینک دیا۔

کیرین کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ قالین پر پڑی کھانس رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی سانس بحال ہوئی تو وہ اٹھی اور واپس کرسی پر بیٹھ گئی... دونوں خاموش تھے۔ جو نے گن ہاتھ میں لے لی اور دوبارہ فلم کی جانب متوجہ ہو گیا۔

کیرین ناامیدی کی گھٹا میں خود کو سنبھال رہی تھی۔ سب سے پہلے، اسے کسی نہ کسی طرح شوہر کو خبردار کرنا تھا... بیڈ روم سے نکلنے کا ایک ہی معقول بہانہ تھا کہ وہ کھانے کی ضرورت کے تحت کسی طرح کچن تک پہنچے... لیکن کوئی ضمانت نہیں تھی کہ جو اس کے پیچھے نہیں آئے گا۔ وسکی کا اثر بھی جو پر ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دماغ لڑا رہی تھی کہ جو نے خود ہی اس کی مشکل آسان کر دی۔ کیرین خیالات میں غلطاں تھی اس لیے جو کی بات سن نہ سکی۔

''کچھ کہا تم نے؟'' کیرین نے پوچھا۔

''بھوک لگ رہی ہے۔'' جو نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

کیرین کی مشکل خود ہی آسان ہو گئی۔ تاہم اس نے تاثرات سپاٹ رکھے اور ظاہر کیا کہ وہ بددلی کے ساتھ اٹھ رہی ہے۔ وہ بیڈ روم سے نکل کر دبے قدموں بھاگی۔ کچن میں پہنچ کر اس نے پھرتی سے آملیٹ تیار ہونے کے لیے رکھا اور کچن وال کا فون اٹھا لیا۔

ول کے آفس کا نمبر ملا کر اس نے مدھم آواز میں آپریٹر کو بتایا کہ وہ کون بات کر رہی ہے... کیرین نے جلدی جلدی ایمرجنسی کی وضاحت کی اور بتایا کہ وہ 911 کیوں فون نہیں کر سکتی... کیرین نے بتایا کہ جتنی جلدی ہو سکے اس کا پیغام ڈاکٹر ول کے اسکائی ٹیل پیجر تک پہنچا دیا جائے...

''اوکے، میم۔''

کیرین نے پیغام ریکارڈ کرا کے فون رکھ دیا اور اوون کی طرف پلٹی۔ اس کا لہو چند لمحوں کے لیے جم گیا۔ جو کچن کے دروازے میں کھڑا ہوا تھا۔ وہ سرد نگاہوں سے کیرین کو دیکھ رہا تھا... ''فون کے پاس کیا کر رہی تھیں؟'' اس نے سوال کیا۔

کیرین نے نظر چراتے ہوئے فون کی طرف دیکھا۔ فون کے آس پاس تصویریں اور فوٹو چسپاں تھے۔ اس نے اوون کا ٹائمر آف کیا اور فون کی طرف چل دی۔ کیرین نے ایک تصویر... دیوار سے الگ کی اور اسے گھورنے لگی۔ یہ ایمی کی اسکول میں بنائی گئی تصویر تھی، جس کے ساتھ نوٹ بھی لکھا ہوا تھا۔

''میں ایمی کی تصویر دیکھ رہی تھی... مجھے اب تک لگ رہا ہے جیسے یہ سب ایک بھیانک خواب ہے۔'' اس نے دکھ بھری آواز میں کہا۔

''میں بستر پر ہوں، جو بنایا ہے لے آؤ۔'' وہ ٹوٹی چال کے ساتھ واپس چلا گیا۔ اگر اس کی ایک ٹانگ زخمی نہ ہوتی تو وہ کم وقت میں کچن تک پہنچتا اور کیرین کو فون کرتے دیکھ لیتا۔ تاہم کیرین کو اندازہ ہو گیا کہ مردود نہایت کائیاں اور محتاط ہے۔ کیرین کو حد سے زیادہ احتیاط کرنی پڑے گی۔ اس نے کاؤنٹر کا سہارا لے کر رکی ہوئی سانس خارج کی۔

☆☆☆

ول ایک گھنٹے سے شیرل کو ٹٹول رہا تھا۔ وہ جواب دے رہی تھی لیکن اس نے ول کے مطلب کی کوئی بات نہیں بتائی۔ شاید وہ ابھی تک ول پر پوری طرح اعتماد نہیں کر پا رہی تھی۔

ول نے پینترا بدلا اور جو کے بجائے پاسل کے بارے میں سوالات شروع کر دیے۔ اچانک وہ اچھل پڑا۔ اس نے اسکائی ٹیل پیجر کی جھنجھناہٹ محسوس کی تھی۔

''کیا ہو گیا؟'' شیرل نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''کشن میں کوئی مکوڑا ہے شاید۔'' شیرل ہنسنے لگی۔

ول پیجر چیک کرنے کے لیے بے قرار تھا۔ وہ کال پر نہیں تھا۔ لہٰذا یقیناً پیغام کیرین کی جانب سے آیا تھا۔

''برا نہ مانو تو باتھ روم ہو آؤں؟''

شیرل نے شانے اچکائے۔ ول نارمل رفتار سے باتھ روم کی طرف چل دیا۔ اگرچہ اندر سے وہ سخت بے چین تھا۔ پیغام جو بھی تھا۔ قطعی غیر متوقع تھا۔ اندر پہنچ کر اس نے بیلٹ سے پیجر الگ کیا اور بٹن پنچ کیا۔ سبز روشنی میں پیغام نمودار ہوا:

''صبح تک کچھ نہ کچھ کرو... ابھی مر سکتی ہے... کچھ بھی کرو... اپنی حفاظت کرو... معاملہ تاوان پر ختم نہیں ہو گا جو، تمہیں اپنی ماں کا قاتل سمجھتا ہے۔ کیرین۔''

ول نے پیغام دوبارہ نمایاں کیا۔ اس کا دماغ آندھیوں کی زد میں تھا۔ وہ بار بار پیغام کا ایک ایک لفظ پڑھ رہا تھا۔

کیا کیرین کو جو کے پلان کی کوئی نئی بات معلوم ہوئی ہے؟ کیرین نے ول کے تحفظ پر تشویش کیوں ظاہر کی؟ سب سے بڑھ کر جو معنویت اجاگر ہو رہی تھی، وہ یہ تھی کہ ول کو ابی کو بچانے کے لیے رسک لینا پڑے گا۔ رسک کی نوعیت کچھ بھی ہو... اچانک اسے باہر سے فون کی آواز سنائی دی۔ ول نے گھڑی دیکھی۔ تین بج رہے تھے۔ یقیناً یہ 30 منٹ کے وقفے سے جو کی چیک ان کال تھی۔ شیرل نے مختصر جواب دے کر فون بند کر دیا۔ ول کے دماغ کے

مرکز میں ایک ہی بات تھی۔ کچھ کرنے کے لیے اس کے پاس اب مکمل اور محدود تیس منٹ تھے یا پھر وہ اگلی چیک ان کال کے بعد والے تیس منٹ کو استعمال کرے؟

اسے شک ہو رہا تھا کہ شیرل نے اسے پوری باتیں نہیں بتائیں۔ ممکن ہے کہ وہ ابی کی لوکیشن سے بھی واقف ہو... جب سے شیرل اس کے کمرے میں آئی تھی، ول بہت کچھ تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں کافی کچھ معلوم بھی کر چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ شیرل، جسم فروشی اور جرائم پر اکتفا کے لیے دل سے تیار نہیں ہے۔ وہ ہالی ووڈ کے خواب دیکھتی ہے... پھر کیوں وہ اب تک جو کے ساتھ تعاون کر رہی ہے؟ کیا محض اس لیے کہ جو نے اسے جسم فروشی کے دھندے سے نکال کر اس سے شادی کر لی تھی۔

جو سے جان چھڑانے کے لیے شیرل کو گارنٹی چاہیے تھی، جو خطرات سے پاک ہو۔ اس کے بعد ہی وہ جو کے ساتھ دغابازی کرے گی۔ شیرل کو پتا تھا کہ جو اس کے ساتھ مخلص نہیں ہے اور اسے استعمال کر رہا ہے۔

تاوان کے معاملے میں بھی کوئی غلطی ہوتی ہے تو جو نہیں شیرل پھنسے گی اور جو بروقت نکل جائے گا... جو کے متعلق اس کا تجزیہ صحیح تھا۔ اس لیے وہ بھی باوفا بننے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ جبھی شیرل نے ول کو معنی خیز پیشکش کی تھی۔ یقیناً وہ جانتی تھی کہ جو، وارداتوں کے دوران ڈاکٹروں کی بیگمات کے ساتھ کیا کرتا رہا ہے... یہ وہی ڈاکٹرز تھے جو کسی نہ کسی طور جو کی ماں کے قتل میں ملوث تھے۔

شیرل کو جو سے غداری کے لیے گارنٹی چاہیے تھی اور گارنٹی کے لیے موٹی رقم چاہیے تھی۔ اتنی رقم کہ وہ بھاگنے کے بجائے غائب ہی ہو جائے اور شناخت بدل کر نئی زندگی کا آغاز کر سکے۔

ول نے ٹوائلٹ میں پانی بہایا اور باہر نکل آیا۔

''جو کی کال تھی؟'' اس نے شیرل سے سوال کیا۔

''ہاں، سب ٹھیک چل رہا ہے۔'' وہ بولی۔ ''ایک بات کہوں۔''

''ہاں، بولو۔''

''تم پہلے آدمی ہو جس نے مجھے ٹھکرایا ہے۔''

''تمہیں برا لگا؟''

''نہیں، تم مختلف ہو۔''

''اگر تم اعتراف کرتی ہو کہ میں مختلف ہوں تو بھروسا کیوں نہیں کرتیں کہ میں جو سے تمہاری جان چھڑا سکتا

ہوں۔ ''تم نے مجھ سے کوئی بات چھپائی ہے؟''
''نہیں۔'' شیرل نے نفی میں سر ہلایا۔
''وہ ڈاکٹروں کو کیوں نشانہ بناتا ہے؟ اور میرے ساتھ وہ کیا کرنے والا ہے؟''
''میرا یقین کرو۔ مجھے ہر بات نہیں معلوم... وہ بہت مکار ہے۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔''

☆☆☆

شیرل صوفے پر نیم دراز کوک سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ول، سوئٹ کے فرنٹ روم میں ڈائننگ ٹیبل پر لیپ ٹاپ کے ساتھ مصروفِ کار تھا۔ اس کو ''فیرس'' اور فون ٹریسنگ کے بارے میں کیرین کو پیغام دینا تھا۔ لیکن ول کو کوڈ کی ضرورت تھی۔ خطرہ تھا کہ ای میل کہیں جو کی نظروں میں نہ آجائے... اس نے کیرین کے ساتھ ان گنت فلمیں دیکھی تھیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ول نے ''کوڈ میل'' ٹائپ کر دی۔ ''ایمی بچ جائے گی۔ میرا بھروسا کرو۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ ''کونڈور'' کتنا خطرناک ہے؟''

ای میل روانہ کرتے ہی، جو کی چیک ان کال موصول ہوئی۔ چار بج کر پندرہ منٹ ہو رہے تھے۔ کیا جو نے پندرہ منٹ قبل کال کی ہے؟ نہیں، یہ یقیناً فیرس کی کال ہے۔ ول نے فون اٹھایا۔
''ول جیننگ۔''
ہارلے فیرس سیل اسٹار کا باس تھا۔ کسی وقت ول نے اس کی بیوی کی میڈیکل پرابلم حل کی تھی۔
''ہارلے فیرس۔'' ڈاکٹر، ہمارے کمپیوٹر نے صبح چار بجے کے بعد کال شو کی ہے... ہیزل ہرسٹ ایریا کو جو ٹاور سرو کرتا ہے، اس کی پروسیسنگ کے مطابق کال تمہارے گھر کی لینڈ لائن سے آئی تھی۔''
''اینی آئیڈیا؟ کال کہاں ریسیو ہوئی؟'' ول نے سوال کیا۔
''نہیں۔ حتیٰ کہ ہماری ٹریسنگ وین بھی علاقے میں ہے لیکن مذکورہ کال پندرہ سیکنڈ میں ہی بند ہو گئی تھی۔ پندرہ سیکنڈ بہت کم وقت ہے... میرا خیال ہے کہ اب ایف بی آئی سے رابطہ کر لینا چاہیے۔'' فیرس نے اظہارِ خیال کیا۔
''نہیں، ابھی نہیں... فیرس، تمہاری ٹریسنگ وین کہاں ہے؟''
''ٹیونکا کاؤنٹی۔''
ول دانت پیس کے رہ گیا۔ اس کا مطلب وین کو ہیزل ہرسٹ تک پہنچنے کے لیے مزید تین گھنٹے درکار تھے... آٹھ بجے سے قبل ٹریسنگ اسٹارٹ کرنا محال تھا۔

چند لمحے سکوت کی نذر ہو گئے۔ پھر فیرس کی آواز آئی۔ ''میرا ایک ریٹائرڈ دوست، انجینئر ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً ہمارے لیے کام کرتا ہے۔ اس کے گیراج میں خاصا ضروری سامان ہے۔ وہ اپنا ٹرک استعمال کرتے ہوئے شاید کچھ کر جائے۔'' فیرس نے رائے دی۔ ''وہ اپنے کام کا ماہر ہے۔''
ول کی دم توڑتی امید نے پھر انگڑائی لی۔ اس نے فیرس کو اسکائی ٹیل لائن کے ڈائریکٹ نمبر دیے اور شیرل کا سیل نمبر دیا اور کہا۔ ''مجھے یہیں ہونا چاہیے لیکن کچھ بھی ہو جائے، بات پھیلنی نہیں چاہیے۔ جیسے ہی کوئی کلیو ملے... فوراً مجھے کال کرو۔'' ول نے فون بند کیا تو اپنے شانے پر شیرل کا ہاتھ محسوس کیا۔ شیرل کی آنکھوں میں ہمدردی کا ہلکا سا عکس تھا۔
ول نے پیشانی رگڑی۔
''بینک سے تاوان کی رقم وصول کرنے کے بعد تمہاری کیا ذمے داری ہے؟'' ول نے استفسار کیا۔
''میں جو کو کال کروں گی۔ پھر ہم بروک ہیون کے موٹیل میں ملیں گے۔''
''تم مجھے ساتھ رکھو گی؟''
''ہاں۔''
''گزشتہ وارداتوں میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے؟''
شیرل ہچکچائی۔
''شیرل وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔'' ول نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔
''نہیں ایسا پہلی مرتبہ ہوگا۔'' بالآخر شیرل نے کہا۔
''کیا تم یقین کرو گی کہ اس مرتبہ صورتِ حال مختلف ہے، قطعی مختلف۔ جو چاہتا ہے کہ کیرین اور ایمی کو میرے سامنے ختم کرے۔''
''نہیں ایسا نہیں ہے۔'' شیرل نے تردید کی۔
''ایسا ہی ہے... وہ بہت مکار ہے اسی لیے آج تک بچا ہوا ہے۔ اس نے عمداً تمہیں ٹریکر ریسٹ موٹیل، بروک ہیون کا نام بتایا تھا... اس کے خیال میں، میں تم پر تشدد کر کے جائے مقام اگلوا لوں گا اور ایف بی آئی وہاں عذاب بن کر ٹوٹ پڑے گی جبکہ وہ وہاں ہوگا ہی نہیں۔'' ول پورے اعتماد سے بات کر رہا تھا۔ ''سوچو، شیرل سوچو... ہم دونوں کے پاس غلطی کی گنجائش نہیں ہے۔''
''تم تاوان دو اور بیٹی کو بچاؤ، جیسے دوسروں نے کیا۔''

''اوہ گاڈ، میرا کیس دوسروں کی طرح نہیں ہے، وہ جنونی مجھے اپنی ماں کا قاتل سمجھتا ہے... بہت ممکن ہے کہ یہ اس کی آخری واردات ہو... جس کے بعد تم کبھی اس کی شکل نہ دیکھ سکو۔''

''تم بہکا رہے ہو مجھے۔'' شیرل نے غیر یقینی سے اسے دیکھا۔

''تمہاری عقل پر منحصر ہے... میرے پاس تو دو ہی راستے ہیں۔ اپنی فیملی کو بچالوں یا تم تینوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دوں...'' ول کے تاثرات پتھرا گئے۔ ''تم اگر میکسوئی سے میرا ساتھ دو تو چانس ہے کہ جو کی کہانی ختم ہو جائے اور تم بھی بچ جاؤ۔'' ول کی آواز میں فولادی سختی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ ''مارو یا مرجاؤ'' کا فیصلہ کر چکا ہے۔

شیرل گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

☆☆☆

صبح کے تقریباً چار بجے جو سو چکا تھا یا بے ہوش تھا... بہرحال وہ قطعی غافل ہو چکا تھا۔ کیرین نے اسٹڈی میں آکر ول کی میل چیک کی۔ وہ پیغام کو گھور رہی تھی۔ پہلا حصہ تو واضح تھا لیکن دوسرا حصہ، بالائے فہم... یقیناً یہ کوڈ ہے، کیرین نے سوچا۔ ''کونڈور'' وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔ ذہن میں کئی بار اس نے کونڈور کا لفظ دہرایا... معاً اسے رابرٹ ریڈفورڈ کی مووی یاد آگئی۔ فلم کا نام تھا تھری ڈیز آف کونڈور... کونڈور، ریڈفورڈ کا کوڈ نیم تھا۔ ریڈفورڈ کی فلمیں، ول کے ساتھ اس نے بار بار دیکھی تھیں۔ ''تھری ڈیز آف کونڈور'' کے اسے تقریباً تمام ڈائیلاگ یاد تھے۔

مذکورہ ڈائیلاگ ''کونڈور'' (رابرٹ ریڈفورڈ) نے فون پر میکس وان سیڈو سے کہا تھا۔ میکس، مووی میں کرائے کے قاتل کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس ڈائیلاگ کے بعد فلم نے فیصلہ کن موڑ لینا شروع کیا تھا اور ''کونڈور'' نے اپنے ممکنہ قاتل ''میکس'' کو ناکامی سے دوچار کیا تھا...

کیرین نے ول کا پیغام سمجھ لیا تھا جس کے مطابق ول نے کوئی توڑ تلاش کر لیا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر میکڈیل اور اس کی بیوی، جیننگ ہاؤس سے محض پندرہ میل کے فاصلے پر جیکسن میں، ایف بی آئی کے فیلڈ آفس میں موجود تھے... اسپیشل ایجنٹ فرینک زک تھا۔ وہ چالیس سے اوپر، درمیانے قد کا ایک چوکس آدمی تھا۔ فرینک پچھلے نصف گھنٹے سے فون پر مصروف کار تھا۔ اس دوران میں اس نے مختلف بینک پریزیڈنٹس، ہیلی کاپٹر پائلٹس اور چند دیگر آفیشلز سے بات چیت کی۔ دوران گفتگو وہ متواتر اپنے سیاہ بالوں کو ایک ہاتھ کی انگلیوں سے سنوارتا رہا تھا۔

شالر سے بات کرنے کے بعد فرینک نے دونوں میاں بیوی کو اپنے دفتر میں طلب کر لیا تھا۔ وہاں خاصی سرگرمی دکھائی دے رہی تھی۔ فرینک کے دفتر میں آٹھ عدد مزید فیلڈ ایجنٹ موجود تھے۔

فرینک زک، ان آٹھوں سے مخاطب تھا... ''بلوکسی سے تیس میل کے اندر اندر تمام بینکس کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ پچیس ہزار ڈالرز سے بڑھ کر کوئی بھی رقم، کہیں سے بھی وائر ٹرانسفر کی جاتی ہے تو اس کی فوری اطلاع فراہم کی جائے... تم لوگ جانتے ہو کہ یہ تاوان کا کیس ہے۔ کچھ مختلف ضرور ہے، تاہم بنیادی طور پر ''اغوا برائے تاوان'' ہی ہے۔ ایکس جوانوں کی ٹیم نیو آرلینز سے آرہی ہے جو براہِ راست ''بلوکسی'' کی نگرانی کرے گی۔ تیسری بات فضائی نگرانی کے لیے ہیلی کاپٹرز ہوں گے، یہاں، اور بلوکسی میں بھی۔ ٹیکٹیکل حرکت پذیری کے لیے ایک اسپیشل مسلح ٹیم الگ ہوگی۔ جارحانہ کارروائی کے لیے چاپرز بھی استعمال کیے جاسکتے ہیں۔''

''کوئی سوال؟'' فرینک نے سب پر فرداً فرداً نظر ڈالی۔

ایجنٹ شالر نے کہا۔ سر! شیرل لین ٹل کو بیوریج ریسورٹ میں ابھی تک کسی نے نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر میکڈیل نے شیرل کو مگ بکس سے شناخت کیا تھا۔ وہ پرانی تصویر تھی۔ جو نامی شخص کی تصویر نہیں ملی۔ یعنی اس کا کوئی کرمنل ریکارڈ نہیں ہے... ہم کیسے یقین کر سکتے ہیں کہ گزشتہ برس کی طرح اس مرتبہ بھی واردات ہو رہی ہے؟''

فرینک نے مربیانہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''جنٹلمین، گلف پورٹ کے ریذیڈنٹ ایجنٹ نے بیس منٹ قبل اطلاع دی ہے کہ بیوریج کے بیل بوائے نے وہاں شیرل کو دیکھا ہے، ہمارے مذکورہ ایجنٹ نے اسٹاف کے متعدد اراکین کو فیکس فوٹو دکھایا تھا اس وقت جب ہم بات کر رہے ہیں تو وہ دونوں، سیکیورٹی ٹیپس کی جانچ میں مصروف ہوں گے... سیکیورٹی کیمروں میں جیسے ہی شیرل اسپاٹ ہوئی، ویڈیو شاٹ یہاں ای میل کر دیا جائے گا... جسے میکڈیل کو دکھایا جائے گا اور رہا سہا شک بھی دور ہو جائے گا۔ چند منٹ کی بات ہے۔ اس وقت تک ہم یہی سمجھیں گے کہ ہمارے علاقے میں واردات شروع ہو چکی

ہے۔ یہاں میں سر آرتھر کانن ڈائل کے لافانی کردار کا مختصر فقرہ دہراؤں گا کہ ''کھیل شروع ہو چکا ہے۔''

☆☆☆

صبح کے چھ بج چکے تھے۔ متواتر دباؤ سے ول کا دماغ تڑخنا شروع ہو گیا تھا۔ پانچ بجے تک اس کی امید جوان تھی لیکن پانچ بجے کوئی کال نہیں آئی۔ فیرس کا ریٹائرڈ دوست کامیابی سے دور تھا۔ ول، پنجرے میں بند نیولے کے مانند چکرا رہا تھا۔ اس نے بمشکل دس منٹ اور انتظار کیا، پھر گھر کا نمبر ڈائل کر دیا۔ خلافِ توقع، جو کے بجائے کیرین نے فون اٹھایا۔

ول کی آواز سنتے ہی وہ سسکیاں لینے لگی اور ول کے حلق میں کانٹے اگنا شروع ہو گئے۔ کیا ابی کو... وہ آگے نہیں سوچ سکا۔ کیرین کی وضاحت نے اس کا تناؤ کم کر دیا۔ وہ ٹینشن کے باعث رو پڑی تھی۔ اس نے ول کو بتایا کہ جو نے خوابِ غفلت کے باعث ساڑھے چار بجے کی کال مس کر دی تھی۔ غالباً جریانِ خون اور شراب کے باعث وہ خود کو بیدار رکھنے میں ناکام ہو گیا تھا...

''تم ابی کے لیے کیا کر رہے ہو؟''

''میرا فیرس سے رابطہ ہو گیا تھا۔ ہم لوگ باسل کا فون ٹریس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اگر باسل نے جو کو کال نہیں کی تو ہم اس کا فون ٹریس نہیں کر سکیں گے۔''

''میں جو کو اٹھا کر کہتی ہوں کہ مجھے ابی سے بات کرنی ہے۔''

''کیا وہ مان جائے گا؟''

''وہ تو اٹھنے کے لیے ہی تیار نہیں ہے لیکن ہمارے پاس اور چانس ہے بھی کیا؟'' کیرین نے کہا۔

''فکر نہ کرو کیرین، ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ شیرل میرا ساتھ دے رہی ہے۔ کیوں؟ یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ تم نے جو پیغام مجھے بھیجا تھا، اس کی بنیاد کیا تھی؟''

''جو، سمجھتا ہے کہ ماضی میں تم اس کی ماں کو قتل کرنے کا سبب بنے ہو۔ اس کا اصل منصوبہ کچھ اور ہے، وہ ہم لوگوں کو مار کر ملک چھوڑ دے گا۔ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا پڑے...''

''میں سمجھ رہا ہوں، شیرل کو یہ بات نہیں معلوم نہ اسے یقین آ رہا کہ وہ ابی کے ساتھ ہم دونوں کو بھی مار دے گا۔'' ول نے بتایا۔ ''اسے اٹھا کر کہو کہ تاوان کی رقم وائر نہیں ہو گی، جب تک تم ابی سے بات کر کے یقین نہ کر لو کہ وہ زندہ ہے... اور ہاں حوصلہ رکھو۔ تم نے اسے زخمی کر کے بڑا کام کیا ہے۔''

''اور تم نے شیرل کو ملا کر زیادہ بڑا کام کیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم آدھی جنگ جیت چکے ہیں۔''

''ہم پوری جنگ جیتیں گے۔'' ول کی آواز میں فولاد کی سی سختی تھی۔

''گڈ لک۔''

''گڈ لک۔''

☆☆☆

چند منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی۔ ول نے شیرل کو جھنجوڑا۔ وہ آنکھیں مسلتی ہوئی اٹھی اور فون پر سب ٹھیک ہے کا سگنل دے کر پھر غافل ہو گئی۔ چند منٹ بعد پھر گھنٹی چیخی... شیرل نے بڑبڑاتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔ لیکن ول نے جھپٹ کر فون اٹھا لیا۔ دوسری طرف فیرس تھا۔

''کیا خبر ہے، فیرس؟'' ول کی آواز میں بے چینی مترشح تھی۔

''چھ بجے سے ذرا دیر بعد تمہارے گھر سے لینڈ لائن کے ذریعے کال کی گئی تھی۔ جو ہیزل ہرسٹ کے ٹاور کے تھرو آگے گئی تھی۔ کال کا دورانیہ 16 سیکنڈ تھا۔ میرا دوست سرچ ایریا کو سات میل کے احاطے تک محدود کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ فون کرنے والا مکار ہے۔ اگر وہ 30 سیکنڈ بھی بات کر لے تو ہمیں زیادہ قریب پہنچنے کا موقع مل جائے گا۔'' فیرس نے کہا۔

''تم نے کسی اور کو تو نہیں بتایا؟'' ول نے پوچھا۔

''نہیں۔ ابھی تک نہیں۔ لیکن میرے خیال میں اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ایف بی آئی سے رابطہ کر لیں۔''

''نہیں ابھی نہیں۔'' ول نے انکار کیا۔ ''اگر ہمیں ایک اور کال مل جائے تو کیا امکان ہے؟''

''بلاشبہ ہم کافی قریب پہنچ جائیں گے۔'' فیرس نے جواب دیا۔

☆☆☆

جو کی ہدایت کے مطابق کیرین روانگی کے لیے حلیہ درست کر رہی تھی۔

''ابی مل جائے گی؟''

''ہاں، اگر تم نے اپنا رول ٹھیک ادا کیا۔''

''جھوٹ بول رہے ہو۔ تم مار دو گے اسے۔ اس کے بجائے تم میری جان لے لو۔'' کیرین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''میں جانتی ہوں، تم کیا کرنے جا رہے ہو۔''

''کیا کروں گا، میں؟''

''تم محض اپنی ایک غلط فہمی کی بنیاد پر ول سے انتقام لینے کا ارادہ رکھتے ہو۔'' کیرین نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

جو خاموشی سے کیرین کو گھورتا رہا۔ اس کی آنکھیں ساکت اور سرد تھیں۔ بے پناہ سرد... یہ آگ نہیں تھی، سرد شعلے تھے... ان میں آگ سے زیادہ خطرناک ارادے کروٹیں لے رہے تھے۔

''آج کوئی نہیں مارا جائے گا۔'' اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''ایک چھوٹا سا راز بتا دوں۔'' اس نے آنکھیں سکیڑ کر کہا۔ ''یہ میری آخری واردات ہے۔ پھر میں کوسٹاریکا جا کر آرام کی زندگی گزاروں گا۔ آج میرا گرینڈ ایگزٹ ہے۔''

'کتے، تیرا گرینڈ ایگزٹ، عالمِ بالا میں ہو گا۔' کیرین نے دل ہی دل میں نفرت سے سوچا۔

☆☆☆

ول اور شیرل ہلکا پھلکا ناشتا کر رہے تھے۔ چند منٹ قبل جو کی چیک ان کال آئی تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے۔ کال کے بعد شیرل نے ول کو اطلاع دی کہ وہ ایک گھنٹے کے اندر میکولیا فیڈرل بینک کی بلوکسی برانچ جا رہے ہیں۔

فیرس کی جانب سے ابھی تک کوئی رپورٹ نہیں موصول ہوئی تھی۔ تاہم ول نے امید کا دامن تھام رکھا تھا۔ کاؤنٹی سے فیرس ہیزل ہرسٹ تک آ گیا تھا۔ وہاں سے سات میل کے دائرے میں۔ آٹھ بجے کے بعد غالب امکان تھا کہ جو نے باسل کو کال کی ہو گی۔ ول دعا کر رہا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔

''ول آئی ایم سوری۔'' فیرس کی آواز آئی۔

''کیوں؟''

''کال بہت مختصر ہوتی ہے... ہمیں قلیل وقفہ ملتا ہے۔ انتہائی ناکافی۔'' فیرس نے وضاحت کی۔ ''اگرچہ ہم واضح طور پر قریب ہیں لیکن سرچ سرکل اب بھی کافی وسیع ہے۔ مزید یہ کہ کسی کھلے میدان کی طرح نہیں ہے۔ کافی پیچیدہ علاقہ ہے... اس علاقے کو کھنگالنا کافی دشوار اور وقت طلب ہے۔''

ول نے دانت پیستے ہوئے کھڑکی سے باہر گلف کو گھورا...

''مائی گاڈ۔'' اس نے رکی ہوئی سانس چھوڑی۔

''شیرل!''

''کیا؟'' فیرس نے پوچھا۔

''ایک منٹ، ڈیئر۔''

''کیا مسئلہ ہے؟'' شیرل نمودار ہوئی۔

''باسل کے پاس گاڑی کون سی ہے؟''

''سبز رنگ کی پرانی شیوی۔ رنگ سبز ہے۔ اس کے ساتھ پک اپ منسلک ہے۔'' شیرل نے نقشہ کھینچا۔

''سنو، فیرس... ہیزل ہرسٹ میں اس بندے کے پاس پرانی شیوی ہے... سبز رنگ کا پک اپ ٹرک۔ اگر ایف بی آئی ہیلی کاپٹر استعمال کرے تو بہت جلد گاڑی کو تلاش کر لیں گے۔''

''شاندار، اب مجھ پر چھوڑ دو۔'' فیرس کی آواز کھل اٹھی۔

''لیکن تمہیں مجھ سے وعدہ کرنا پڑے گا کہ تم موجودہ صورتِ حال کے بارے میں کوئی بات نہیں بتاؤ گے، وہ سیکڑوں سوال کریں... نہ تم میرا نام اور نمبر بتاؤ گے... وہ دس منٹ میں میرے گھر پہنچ جائیں گے، پھر میری بیٹی کو کوئی نہیں بچا سکے گا... ایف بی آئی کو سبز گاڑی اور کیبن تلاش کرنا ہے اور بس!! 90 منٹ کے اندر، تم انہیں سب کچھ بتانے کے لیے آزاد ہو گے۔ اس سے پہلے کچھ بھی نہیں۔'' ول نے زور دے کر کہا۔

''جینگ...''

''پلیز، میرا کوئی نمبر مت دینا... اگر انہوں نے غلط وقت پر کال کر دی، تب بھی ابھی ماری جائے گی۔ سمجھ گئے؟''

''اگرچہ میرا دل نہیں مان رہا ڈاکٹر لیکن میں ایسا ہی کروں گا۔''

''گڈ اینڈ تھینکس۔ ان کو بتا دینا کہ چاپرز میں پیرا میڈیکل اسٹاف ساتھ رکھیں۔ انسولین کا بندوبست ضروری ہے۔ میری بیٹی بچکانا ذیابیطس میں مبتلا ہے۔''

''اوہ گاڈ، میں سمجھ گیا... جلد رابطہ کروں گا۔'' فون بند ہونے کی کلک سنائی دی۔

شیرل ابھی تک دروازے میں کھڑی تھی۔ ''مجھے فلو محسوس ہو رہا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''پریشان مت ہو، ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ہم... م... م... ایک بات میں نے ابھی تک تمہیں نہیں بتائی۔'' شیرل نے انکشاف کیا۔

''وہاٹ؟'' وہ چونک اٹھا۔

''یہ جو کی آخری واردات ہے۔ سارا سال وہ اس بارے میں بات کرتا رہا ہے۔ اس نے کوسٹاریکا میں ایک

رینج خرید رکھا ہے۔ میں اسے بکواس سمجھتی رہی۔ لیکن اب مجھے یہ حقیقت معلوم ہورہی ہے۔"

اس نئی اطلاع نے ول کے خدشات کی تصدیق کر دی۔ یہ واردات، گزشتہ وارداتوں جیسی نہیں ہے... جو، ابھی، کیرین اور ول کو ختم کر کے غائب ہو جائے گا۔ رقم بھی ساتھ لے جائے گا۔

"تم نے پولیس کو اطلاع دی؟" شیرل نے سوال کیا۔

"نہیں۔"

"کیا ہم تاوان کی رقم لینے جائیں گے؟"

"یقیناً۔ اور یہ تمام کی تمام صرف تمہاری ہوگی۔"

"اس کے بعد کیا تم مجھے جانے دو گے؟" شیرل نے وضاحت مانگی۔

"کیوں نہیں۔ لیکن شیرل، جو جیسے خطرناک اور ناقابل اعتبار شخص کے ساتھ بلف کرنے کے لیے کچھ دیر کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔"

"میں ماری جاؤں گی۔"

"نہیں، میرا وعدہ ہے۔ میں جو کی طرح نہیں ہوں۔"

شیرل نے کانپتے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا۔ ول اس کا ذہن پڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔

"شیرل، اپنے خیالات کو صاف رکھو۔ میں تمہاری مدد کے لیے ہر حد تک جاؤں گا۔ ممکن ہے تم جو کے لیے اب بھی ہمدردانہ جذبات رکھتی ہو... تاہم جب تم نے اس کا اصل روپ دیکھ لیا تو صرف ہاتھ ملتی رہ جاؤ گی... تم نے اگر اسے خبردار کرنے کی کوشش کی تو اپنے لیے مشکلات کھڑی کر لو گی۔"

"میں کہہ سکتی ہوں کہ تم نے بذریعہ تشدد مجھ سے معلومات لی ہیں۔" شیرل نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔

"اسے بےوقوف بنانا اتنا آسان نہیں ہے اگر اسے ذرا بھی شک ہو گیا تو وہ ابھی اور کیرین کو ختم کر کے غائب ہو جائے گا۔ تم یہاں اکیلی رہ جاؤ گی۔ تمہاری جان موت سے چھوٹے گی۔ چاہے وہ پولیس کے ہاتھوں ہو..."

"شٹ اپ، او کے، جسٹ، شٹ اپ۔" شیرل کے رخساروں پر آنسو پھسلنے لگے۔

"یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے۔ تمہارے پاس ایک معقول رقم ہوگی اور تم آزادانہ ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکو گی۔" ول نے ایک بار پھر اسے ہمت دلائی۔

☆☆☆

ڈاکٹر میکڈیل، میگنیفائنگ گلاس کے ذریعے شیرل کے فوٹو کا معائنہ کررہا تھا۔ اس کے نزدیک گلاس کی ضرورت نہیں تھی۔ تاہم فرینک زک نے فوٹو کے ساتھ گلاس فراہم کیا تو ڈاکٹر نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ فوٹو میں شیرل نے سیاہ لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔

"وہی ہے؟" فرینک نے سوال کیا۔

"سو فیصد۔" ڈاکٹر نے گلاس ایک طرف رکھ کر بیوی کی جانب دیکھا۔ "میرا قیاس درست تھا۔ واردات شروع ہو چکی ہے۔" وہ قدم بہ قدم چلتا ہوا مارگریٹ کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "ہم نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔"

اسی وقت ایک عورت درانہ وار، دھماکا خیز انداز میں کمرے میں داخل ہوئی۔

فرینک نے ناگواری سے اسے گھور کر دیکھا۔

"ایجنٹ پیری..."

ایجنٹ پیری کے چہرے پر ہیجانی تاثرات تھے۔ اس نے انچارج کی ناگواری کو نظرانداز کردیا۔

"پریذیڈنٹ آف سیل اسٹار، ہارلے فیرس، لائن پر ہے۔ وہ تمہیں طلب کررہا ہے۔"

"کیوں؟"

"اغوا کی واردات کے سلسلے میں۔"

فرینک کے ساتھ ڈاکٹر میاں بیوی کا چہرہ بھی سفید پڑ گیا...

☆☆☆

گرے ڈیوڈسن، کلین ڈیوڈسن کا فاؤنڈنگ پارٹنر تھا۔ یہ ایک خود مختار بروکریج فرم تھی جو شمالی جیکسن کے متمول کلائنٹس کی رقوم کی دیکھ بھال کرتی تھی۔

کیرین نے آخری بار جو کو قائل کرنے کی کوشش کی، پھر اس کے انکار پر گرے ڈیوڈسن کو فون ملایا...

"معاف کرنا، تمہیں انتظار کرنا پڑا۔" ڈیوڈسن کی آواز آئی۔

"کوئی بات نہیں، ول کی کال آئی ہوگی؟" کیرین نے سوال کیا۔

"ایک سنگی مجسمے کے لیے اتنی رقم؟"

"وہ ایک نادر چیز ہے اور ول کسی قیمت پر دست بردار ہونا نہیں چاہتا۔" کیرین نے کہا۔

ڈیوڈسن نے دبے دبے انداز میں اپنی حیرت اور ہچکچاہٹ کا اظہار کیا۔ تاہم وہ اس سے زیادہ کربھی کیا سکتا

تھا۔
''میں دفتر آرہی ہوں۔'' کیرین نے بات ہی ختم کر دی۔
کیرین نے احتیاطاً ایک سرنج اور انسولین کی دو عدد وائل بیگ میں رکھیں۔
''ہم سفر کے دوران ایکسپیڈیشن استعمال کریں گے۔'' جو نے کہا۔ کیرین نے چابیاں اٹھائیں اور اس کے ساتھ باہر نکل گئی۔ جو کی چال میں لنگڑاہٹ تھی۔ اس نے پسنجر سیٹ سنبھالی۔ کیرین نے دیکھا کہ اس کی مجروح ٹانگ کے پائنچے پر خون کا دھبا نظر آرہا تھا...
بروکریج فرم کے قریب پہنچ کر جو نے پھر کیرین کو دھمکایا... کیرین ڈیوڈسن سے ملنے فرم میں داخل ہوگئی۔
☆☆☆
بلوکسی میں میکولیا بینک کی پارکنگ میں رش تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ ول کی بیٹی کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی اور وہ عالمِ بے بسی میں وہاں بیٹھا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک دشوار تر کام تھا۔ اسے جو پر بھروسا تھا اور نہ فیرس کی ٹیم پر... اس وقت ول سوچ رہا تھا کہ جو نے بلوکسی میں یہ برانچ کس نیت کے تحت منتخب کی ہے؟
سیل فون کی گھنٹی بجی... شیرل نے جواب دیا۔
''رائٹ... او کے۔'' بات ختم۔ شیرل نے ول کو دیکھا جو اسی کی جانب نگراں تھا۔
''رقم پہنچ گئی ہے، تیار ہوجاؤ۔'' وہ بولی۔
ول نے شیرل کا فون طلب کیا۔
''مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟'' شیرل نے اعتراض کیا۔
''میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔'' ول نے جواب دیا۔
شیرل نے توقف کے بعد سیل فون، ول کو دے دیا۔
ٹیمپو کی چابیاں اور فون اس نے جیب میں رکھا اور گاڑی سے اُتر گیا...
☆☆☆
وہ دونوں پچپن میل کی رفتار سے انٹراسٹیٹ کے ساتھ محوِ سفر تھے۔ جو کی دائیں ران پر سے پتلون، خون میں بھیگتی جارہی تھی۔ غالباً کچھ اور ٹانکے ٹوٹ گئے تھے۔
''تم ناکام ڈاکٹر ہی ہو۔'' وہ بھنا کر بولا۔
''میرا مطلوبہ سامان پورا نہیں تھا۔ اگر تم کسی ڈرگ اسٹور پر رک جاؤ تو میں میڈیکل ٹیپ لگا دیتی ہوں۔'' کیرین نے پیشکش کی۔
جو نے عقبی آئینے پر نظر ڈالی اور کیرین کو لین (Lane) تبدیل کرنے کا اشارہ کیا۔
کیرین، ڈرگ اسٹور کی تلاش میں نگاہیں دوڑا رہی تھی...
''ادھر پولیس مین کھڑا ہے، دوسری طرف لو۔'' جو نشست میں سکڑ گیا۔
''پولیس، انٹراسٹیٹ پر پٹرولنگ کرتی ہے۔'' تم خوامخواہ اعصاب زدہ ہورہے ہو۔''
''میں احمق نہیں ہوں۔'' جو غرایا۔ ''تمہارا باسٹرڈ شوہر ایف بی آئی کو اطلاع دے چکا ہے۔''
''کیا ہذیان بک رہے ہو؟'' کیرین کو غصہ آگیا۔
''تمہاری بیٹی جہاں ہے، وہاں فضا میں ہیلی کاپٹرز گردش کررہے ہیں... اس گاڑی کا نمبر کیوں سرکولیٹ نہیں کیا گیا؟ ایک ہی وجہ ہوسکتی ہے کہ وہ مردود گاڑی کی براہِ راست نگرانی کررہے ہیں۔'' جو نے سن روف سے گردن نکال کر عقبی فضا کو تاڑا۔ کیونکہ سڑک پر تو اس نے کوئی تعاقب کرنے والی گاڑی محسوس نہیں کی تھی، اس نے فاصلے پر فضا میں ایک موٹا دھبا دیکھ لیا تھا۔
''میں ہذیان بک رہا ہوں۔'' جو خاصا تلملایا ہوا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ پکڑا اور بولا۔ ''پیچھے فضا میں دیکھو۔''
کیرین کو ادراک ہوگیا کہ نظر آنے والا دھبا دراصل ہیلی کاپٹر ہے۔
''ممکن ہے کہ یہ ٹی وی ٹریفک میں سے ہو۔'' کیرین نے دبی آواز میں کہا۔ وہ خوف زدہ ہوگئی تھی۔ جو پہلے ہی پوری طرح کھل چکا تھا اور اپنے بھیانک عزائم ظاہر کردیے تھے۔ وہ بپھرا ہوا تھا۔ بچنے کے برائے نام امکانات مزید کم ہوکر مایوسی کے بادل منڈلانے لگے تھے۔
کیرین کا دماغ سُن ہوگیا، ول ایسی حرکت کیوں کرے گا؟
جو سیل فون پر نمبر پنچ کررہا تھا۔ کیرین کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔
''جو؟''
''ہاں، بچے... بیک اَپ پلان شروع کردو۔''
''او کے۔''
''میں ابھی سے بات کرسکتی ہوں؟'' آواز کے ساتھ کیرین کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ ''پلیز... ز... ز۔''
''باسو، بچی کہاں ہے؟'' جو نے خلافِ توقع ردِعمل

دیا۔

☆☆☆

باسل فرش پر براجمان، اہی کے لیے چاقو سے کھلونا تراش رہا تھا کہ معاً سیل فون کی گنگناہٹ گونجی...

''جو۔'' دوسری جانب سے آواز آئی۔ ''سب ٹھیک ہے؟''

''بظاہر تو ٹھیک ہے۔'' باسل نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''میں نے آسمان میں آواز سنی تھی... شاید ہیلی کاپٹر تھا۔''

''فاریسٹ سروس ہوگی۔'' جو نے خیال ظاہر کیا۔ ''یہ بتاؤ کہ تم نے آواز ایک بار سنی تھی؟''

''نہیں، چاپر کی آواز گھوم پھر کر بار بار آرہی تھی۔''

''او کے، بیک اپ پلان کی تیاری کرو۔''

''اسی وقت، فوری طور پر؟'' باسل پریشان ہوگیا۔

''نہیں۔ لیکن تیار رہو... میرے فون کا انتظار کرو... چاپر کی آواز پر کان رکھو۔''

''او کے۔'' باسل کے، او کے کہتے ہی فون بند ہو گیا۔ باسل نے پلٹ کے دیکھا۔ اہی دروازے میں کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر زردی نمودار ہو رہی تھی۔

''کیا ہوا؟'' باسل مزید بوکھلا گیا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے... مجھے انسولین کی ضرورت ہے۔''

باسل کا رنگ اڑ گیا۔

''تم گھبراؤ مت، میں کچھ کرتا ہوں، پرامس۔''

☆☆☆

دوسری جانب ول کرائے کی ''ٹیمپو'' میں میگنولیا (Magnolia) فیڈرل بینک پہنچ چکا تھا۔ شیرل اس کے ہمراہ تھی۔ ''اب کیا کرنا ہے؟'' ول نے پوچھا۔

''انتظار... جو کی کال آئے گی کہ منی ٹرانسفر ہوگئی ہے۔ پھر تم اندر جا کر بیگ بھر کے لے آنا۔''

ول نے گہری سانس لی اور فیرس کا نمبر ملایا۔

''ول بات کررہا ہوں، کیا خبر ہے؟''

''ایف بی آئی کے چاپرز ہیزل ہرسٹ کی فضاؤں میں ہیں۔ تاہم جنگلات خاصے گھنے ہیں کوئی مثبت خبر نہیں ملی ہے۔ ہم لوگ منتظر ہیں۔'' فیرس نے بتایا۔

''اور فون ٹریس؟''

''زمین پر، اس حد تک ہم تقریباً سر پر ہیں۔''

''سبز رنگ کا شیوی ٹرک مل گیا تو آگے منصوبہ کیا ہے؟''

''ایف بی آئی کی SWAT ٹیم روانہ ہو چکی ہے۔''

ول کی پیشانی پر پسینا آگیا۔ ''انہیں ڈائریکٹ اسالٹ کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔''

''انہیں اہی کے بارے میں علم ہے۔ وہ محفوظ کھیل کھیلیں گے۔'' فیرس نے اطمینان دلایا۔

''بہت احتیاط کرنی ہے۔''

''ول، بے فکر رہو۔ وہ لوگ پروفیشنل ہیں۔''

☆☆☆

کیرین نے بمشکل خود کو نارمل رکھا ہوا تھا۔ ڈیوڈسن کے سوالات اسے پریشان کررہے تھے۔ تاہم اسے یقین تھا کہ بذاتِ خود اس کی وہاں موجودگی کے باعث ڈیوڈسن کو رقم روانہ کرنی ہی پڑے گی۔ ڈیوڈسن اپنے کلائنٹ سے سوالات کرتے ہوئے محتاط تھا کہ ان میں تفتیشی عنصر شامل نہ ہو۔ اگرچہ وہ قدرے حیرت زدہ تھا۔ کیرین نے پُرسکون انداز میں مناسب جواب دیے۔ حالانکہ وہ جوابات دینے کی پابند نہیں تھی۔ تاہم بہتر تھا کہ ڈیلنگ کو خوشگوار رکھا جائے...

رقم وائر ہونے کے بعد وہ رہی باتیں کر کے باہر آگئی۔

☆☆☆

''وہ باتھ روم میں ہے۔''

کیرین کے دماغ میں سرخ بتی جل اٹھی۔

''کیا وہ صبح سے بار بار باتھ روم جارہی ہے؟'' کیرین کی پریشانی عرق آلود ہوگئی۔

چند سیکنڈ بعد جواب ملا۔ ''ہاں، ایسا ہی ہے۔''

''اوہ گاڈ۔'' کیرین تڑپ اٹھی۔ ''اہی کو انسولین کی ضرورت ہے۔''

''وہ انسولین کی وجہ سے مرے گی اور میں خون بہنے کے باعث جان دوں گا۔'' جو کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ ''بہرحال ابھی وقت ہے، ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ پھر تم اسے انسولین دے دینا۔'' جو نے فون بند کردیا۔

کیرین کو جو کی بات پر اعتبار نہ آیا۔ اس کے ذہن میں بدترین اندیشوں کے کالے، پیلے کن کھجورے رینگ رہے تھے۔

''باسٹرڈ۔'' جو نے سن روف میں سے دوبارہ باہر

جھانکا۔

''اگر تمہارے شوہر نے وہی کیا، جیسا میں نے اسے سمجھایا تھا تو پھر تم جلد ابی سے ملوگی۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہوجائے گا۔ پیچھے ایک اسکواڈ کار بھی آچکی ہے... تاہم وہ بار بار دور چلی جاتی ہے... مطلب وہ اس وقت تک قریب نہیں آئیں گے، جب تک ہم ابی تک نہ پہنچ جائیں۔'' جو دانت پیسنے لگا۔ ''یہ میری آخری واردات تھی اور شروع سے کچھ نہ کچھ... لیکن میں بھی...'' وہ چپ ہو گیا، اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

'ول تم نے یہ کیا کردیا... میرا دل نہیں مانتا کہ تم نے ایف بی آئی کو ملوث کیا ہے۔' کیرین کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔

اچانک جو نے اسے ڈرائیونگ کے لیے احکامات جاری کرنے شروع کردیے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی لیک لینڈ ڈرائیو پر آگئی۔ کیرین چونک اٹھی۔ ''یہ روڈ، ائرپورٹ کی طرف جاتی ہے۔''

''ہاں۔'' جو مکروہ انداز میں ہنسا۔ 'چاہے ہم سب مر جائیں، لیکن یہ تیری آخری واردات ہی ہوگی، بلکہ آخری دن... کیرین نے شدید نفرت کے ساتھ سوچا۔

☆☆☆
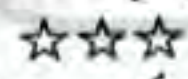
ول، بینک کے وائس پریذیڈنٹ کے سامنے بیٹھا تھا۔ اتنی بڑی رقم کی ڈیلنگ کے لیے اسے اعلیٰ سطح پر ہی ملاقات کرنی تھی... دونوں کے درمیان ملی جلی گفتگو کا آغاز ہوا۔ سوال جواب ول کی توقعات کے برعکس نہیں تھے۔ بات کرتے کرتے جیک مور (وائس پریذیڈنٹ) نے اپنے دائیں جانب دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازہ کھلا، ایک دراز قامت، نیلی آنکھوں والا آدمی اندر داخل ہوا۔

''ڈاکٹر جیننگ، میں اسپیشل ایجنٹ، شالمر ہوں۔ مجھے تمام صورت حال کا علم ہے۔ میں یہاں آپ کی مدد کے لیے موجود ہوں۔''

ول ہکا بکا رہ گیا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں کیونکر علم ہوا کہ میں یہاں آؤں گا؟ ہارلے فیرس نہیں جانتا تھا کہ میں ہوٹل سے نکل کر کہاں جاؤں گا؟''

''پلیز ڈاکٹر، وقت کم ہے، تمام سوالات کے جواب مل جائیں گے... کیا آپ کارڈیو سرجن ڈاکٹر جیمس میکڈیل سے واقف ہیں؟'' شالمر نے بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

''یقیناً۔''

شالمر نے تیزی سے تمام ضروری باتیں گوش گزار کر دیں۔

ول خاموشی سے یہ حیرت ناک کہانی سن رہا تھا۔

''ہارلے فیرس سے بات ہوئی؟ میری بیٹی کہاں ہے؟''

''مسٹر فیرس، ہمارے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ سیل اسٹار کا ٹریسنگ گروپ SWAT ٹیم کے ساتھ ہے۔ بالآخر ہماری قسمت کام کر گئی۔ کچھ دیر پہلے ہمیں اہم بریک تھرو ملا۔ جس آدمی کے پاس کال آئی تھی اور وہ سیل فون آف کرنا بھول گیا۔ SWAT ٹیم کے اندازے کے مطابق وہ لوگ مطلوبہ لوکیشن سے دو منٹ کے فاصلے پر ہیں۔''

ول کے چہرے پر رونق چمکی اور معدوم ہوگئی۔

''پلان کیا ہے؟'' اس نے قدرے تفکر سے سوال کیا۔

''ٹیم اپنے مخصوص طریقے سے اندر جائے گی اور ابی کو حاصل کرے گی۔ ٹیم کے پاس اسپیشل انٹری ڈیوائسز ہیں۔ ہیٹ سینسرز اور وڈیو... اندر کون کہاں پر ہے ہمیں بالکل ٹھیک نظر آجائے گا۔ اس کے علاوہ اسٹن (STUN) گرینیڈ اور ٹینگو... پھر...''

''ٹینگو؟'' ول نے بات کاٹ دی۔ ''یہ دہشت گردوں کے خلاف استعمال ہوتا ہے؟''

''ہاں، ٹیم کی بیشتر تربیت میں یہ بات شامل ہے کہ دہشت گردوں کی گرفت سے یرغمالیوں کو کیسے رہا کرانا ہے۔''

''کیا اس آدمی سے بات نہیں ہوسکتی؟''

''ہوسکتی ہے۔ لیکن اس میں خطرہ زیادہ ہے۔ وہ ذہنی طور پر پسماندہ ہے۔ لیڈر آزاد پھر رہا ہے۔ وہ کسی بھی وقت اسے فون کرکے حکم دے سکتا ہے کہ تمہاری بیٹی کو ختم کر دے۔'' شالمر نے کہا۔

''کیا فیرس، باسل کا سیل فون بند کرسکتا ہے؟''

''کرسکتا ہے۔ لیکن اس طرح وہ پینک ہوجائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے پاس پہلے سے آرڈرز ہوں کہ کمیونیکیشن منقطع ہونے کی صورت میں ابی کو ختم کر دیا جائے۔''

''اس وقت باسل اور ابی اکیلے ہیں۔ جو اور ڈاکٹر کیرین گھر سے نکل چکے ہیں اور ہمارے زیر نگرانی ہیں۔ اس سے پیشتر کہ صورتِ حال میں خرابی پیدا ہو، ہمیں موقع سے فائدہ اٹھا کر ابی کو نکال لینا چاہیے۔'' شالمر نے عندیہ دیا۔

''میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ تم اس بینک تک کیسے

پہنچے؟''

''بہت آسان۔'' شالمر نے بتایا۔ ''ڈاکٹر میکڈیل کی کہانی کی روشنی میں ہم نے جو پلان بنایا تھا، اس کا ایک جز یہ تھا کہ اس علاقے کے بینکوں میں کہیں بھی بڑی رقم وائر کی جائے تو فوراً ایف بی آئی کو اطلاع پہنچے...''

''فرینک زک۔ وہ SWAT ٹیم کے ساتھ ہے۔''

''پلیز، کال کرو... اسے بتاؤ کہ اغوا کنندگان کی ایک ساتھی عورت بینک کے باہر کرائے کی گاڑی میں موجود ہے۔''

شالمر نے سر ہلایا۔ ''ہم شیرل کو جانتے ہیں۔ اسے اس وقت تک چھیڑا نہیں جائے گا جب تک SWAT ٹیم کیبن کو ہٹ نہیں کر لیتی۔ بینک پر ہم مزید ایجنٹ تعینات کر رہے ہیں... بظاہر وہ شیرل سے لاتعلق رہیں گے... پلیز، مسٹر مور کیا آپ کچھ دیر کے لیے...''

''کیوں نہیں۔'' وائس پریذیڈنٹ شالمر کا مدعا سمجھ کر کمرے سے نکل گیا۔

شالمر نے اس کا فون اٹھا کر نمبر ملانا شروع کیا۔

''لیڈر کا نام جو ہنی ہے۔ میری بیوی کو اس نے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ کیا تمہیں پتا ہے کہ وہ دونوں اس وقت کہاں ہیں؟''

''وہ دونوں اس وقت جیکسن انٹرنیشنل ائرپورٹ کی طرف جا رہے ہیں۔ ہم نے ہیلی کاپٹر کے ذریعے ان پر نظر رکھی ہے۔''

''وہاٹ؟'' ول سٹپٹایا۔

''گھبراؤ مت، وہ کہیں نہیں جا سکتے۔'' بل نے تسلی دی اور فون پر بات شروع کر دی۔

☆☆☆

وہ آٹھ آدمی تھے، پروفیشنل، کیموفلاج... سروں پر کنٹوپ نما ہیلمٹ تھے، وہ بھی سیاہ تھے۔ وہ محض ہیلمٹ ہی نہیں تھے۔ ان کی اپنی افادیت تھی۔ درحقیقت وہ پنڈلی سے سر تک مسلح تھے۔ صرف سب مشین دکھائی دے رہی تھی جو ہاتھوں میں تھی۔ نواں ایجنٹ، مارٹن کوڈی پہلے ہی کیبن کی دیوار تک پہنچ چکا تھا۔

بظاہر اغوا برائے تاوان کی عام سی واردات، انوکھے منصوبے کے ساتھ شروع ہو کر متواتر رنگ بدلتی، زگ زیگ ہوتی ہوئی کلائمیکس کی طرف جا رہی تھی... ابھی چوبیس گھنٹے مکمل نہیں ہوئے تھے۔ کوئی ہاتھا پائی، دھماکا نہ کوئی لاش... پھر بھی ہر لمحہ تھرل اور سسپنس کا ایک نیا رنگ لے کر طلوع ہو رہا تھا۔ ول جیننگ فیملی اذیت میں تھی، جو فیملی خطرے سے دوچار نظر آ رہی تھی اور میکڈیل فیملی انتظار کی سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ کہانی بہ آسانی اختتام پذیر ہونے والی ہے۔ لیکن اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا، یہ راز آنے والے وقت کی گود میں تھا۔

اسپیشل ایجنٹ مارٹن کوڈی انچارج تھا۔ غیر معمولی حساس مائیکروفون اور ہیڈفون کے ساتھ وہ کیبن کی اندرونی صورتِ حال کو تاڑ رہا تھا۔

''کوئی کلیو؟'' ماسک کے اندر لگے مائیکروفون میں اس نے سوال کیا۔

''نہیں کچھ نہیں۔'' سم جیکسن کی سرگوشی، کوڈی کے کان میں گونجی۔ جیکسن کے پاس تھرمل امیجنگ کیمرا تھا۔

''ایک ہاٹ واٹر ہیٹر کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔''

کوڈی بدمزہ ہو گیا۔ سبز پک اپ ٹرک موجود تھا لیکن اہداف ندارد تھے۔

''کوڈی ٹو ٹریسنگ وین۔'' وہ پھر مائیک میں بولا۔ سیل اسٹار وین ستر گز پیچھے تھی۔ ''سیل فون کہاں ہے؟''

''اپنی جگہ پر، جوں کا توں۔'' وین سے جواب آیا۔

''ہم اندر جا رہے ہیں۔'' کوڈی نے فیصلہ سنایا۔ ''دھماکا خیز انٹری کے لیے تیار ہو کر پھیل جاؤ... کھڑکیوں سے اسٹن (Stun) گرینیڈ پھینک کر دروازہ توڑ دو۔ بچی کو بچانا ہے... شوٹنگ کی ضرورت پڑے تو برسٹ پانچ فٹ سے اوپر ہونا چاہیے۔ چاقو سے لے کر ہینڈ گرینیڈ تک تیار حالت میں... اس مفروضے پر نہ جانا کہ اندر ایک ہی آدمی ملے گا... بلف بھی ہو سکتا ہے... اوکے... ریڈی... پانچ تک گنتی گنوں گا... مشن ریڈی... پانچ... چار... تین... دو... گو۔''

سب کچھ ہدایت کے مطابق ہوا۔ دن کی روشنی کے باوجود اسٹن گرینیڈ نے وقتی طور پر بینائی چھین لینے والی خیرگی پیدا کر دی تھی۔ کوڈی اپنے آدمیوں کے پیچھے اندر داخل ہوا تھا۔ وہاں خاموشی تھی۔ دھواں بھی تیزی سے ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں کے راستے باہر نکل گیا۔

''بیڈروم۔''

''نو گڈ نیوز'' مخصوص ہیلمٹ میں جواب آیا۔

''کچن۔''

''نو گڈ نیوز۔''

''سیل فون یہاں ہے۔'' کوئی چیخا۔

''لینڈ لائن ادھر ہے۔'' دوسری چیخ سنائی دی۔

"لینڈ لائن؟" کوڈی کی اطلاعات کے مطابق وہاں کوئی لینڈ لائن نہیں تھی۔ اسے باہر بھی کوئی تار نظر نہیں آیا تھا۔ اگر ہے تو پھر زیرِ زمین بچھائی گئی ہوگی۔ وہ کچن میں داخل ہوا اور اپنے آدمی سے سیل فون لے لیا۔ اس کے ہاتھ میں آتے ہی فون بجنے لگا۔ کوڈی نے ہیلمٹ ہٹا کر فون کان سے لگایا۔

"یس؟"

"شہزادی تو محل میں ہوگی، تم جنگل میں ڈھونڈ رہے ہو؟" اجنبی مردانہ آواز آئی۔ آواز میں تضحیک عیاں تھی۔

"کون بول رہا ہے؟" کوڈی کے جبڑے بھنچ گئے۔ جواب میں قہقہہ سنائی دیا اور فون بند ہوگیا۔ کوڈی نے ہیلمٹ واپس سر پر جمایا اور مائیک سیٹ کیا۔ "ٹریسنگ وین، تم نے کال سنی؟"

"یس۔"

"کہاں سے آئی تھی؟"

"نامعلوم، ہم کوشش کررہے ہیں۔"

کوڈی نے جیب سے اپنا سیل فون نکالا اور جیکسن میں فرینک زک کا نمبر ملایا۔

☆☆☆

ول بے قراری سے بینکر کے کمرے میں چکر کاٹ رہا تھا۔ شالر مدھم آواز میں فرینک سے فون پر بات کررہا تھا۔ دفعتاً شالر کی پکار نے ول کے قدم جکڑ لیے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ول کی چھٹی حس نے تکلیف دہ ٹھوکا لگایا۔ وہ چپ چاپ ایجنٹ شالر کو گھور رہا تھا۔ ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ اس نے زبان کے بجائے آنکھوں سے سوال کیا... جو بہت واضح تھا۔ شالر کے چہرے کی زردی میں پوشیدہ جواب بھی عیاں تھا۔

"کیبن خالی تھا۔ SWAT ٹیم کو وہاں کچھ نہیں ملا۔" شالر نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

ول نے توقف کیا اور بولا۔ "وہ غلط کیبن پر پہنچے ہوں گے۔"

"نہیں، وہ ٹھیک مقام پر پہنچے تھے۔ انہیں سبز گاڑی اور سیل فون بھی مل گیا تھا۔ سیل فون پر کسی نے کال کرکے مضحکہ بھی اڑایا تھا۔ وہاں زیرِ زمین لینڈ لائن بھی ملی ہے۔"

ول ناقابلِ یقین انداز میں نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

"لینڈ لائن کا مطلب، وہ ہماری بے خبری میں خفیہ ہدایات سیل فون پر نہیں دے رہا تھا۔ فون کمپنی کے پاس لائن کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ غالباً یہ غیر قانونی ٹیپ ہے۔ وہ پیدل نہیں نکل سکتے۔ دوسری گاڑی کے پہیوں کے نشانات بھی ملے ہیں۔"

ول معاً بھڑک اٹھا اور شالر سے فون چھین کر چیخا۔ "تم مشن انچارج ہو؟ یہ بھی تمہاری اعلیٰ کارکردگی؟"

"ڈاکٹر، دس از فرینک زک۔ ٹمپر کھونے سے تمہاری بچی کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔"

"تم مجھے نیا پلان بتاؤ۔ جو میری بیٹی کو فائدہ پہنچا سکے۔"

"کیا شیرل نے کسی ایسی منزل کی نشاندہی کی تھی، جس کے لیے ہوائی سفر کی ضرورت پڑتی ہے؟"

"کوسٹاریکا۔" ول نے اعصاب پر قابو پانے کی سعی کی۔

"جیکسن سے کوسٹاریکا، کوئی فلائٹ نہیں جاتی اور جو یا جوزف ہکی کی کوئی ریزرویشن بھی نہیں ہے۔ وہ جیکسن سے نکلا تو کوئی اور نام استعمال کرے گا۔ پھر ساؤتھ امریکا کے لیے کنکٹنگ فلائٹ پکڑے گا۔"

"مسٹر فرینک، اگر جو نے تمہارے آدمی کو کیبن میں فون کیا تھا تو وہ جانتا ہے کہ تم ملوث ہو... تم نے میری بیٹی کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔"

"ایسا نہیں ہے، ڈاکٹر۔ جو کو دو چیزیں درکار ہیں۔ پیسا اور آزادی۔ ایبی کو مارنے سے اسے کچھ بھی نہیں ملے گا۔ ایبی کی زندگی اب بھی اس کے نزدیک اہم ہے۔"

"فرینک، تم نہیں سمجھ رہے ہو کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ یہ تاوان سے زیادہ انتقام کا کیس ہے... وہ برسوں سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ آپریٹنگ ٹیبل پر اس کی ماں میری غلطی سے مری تھی... وہ مجھے سزا دینے کے لیے ایبی کو مار دے گا، جبکہ کیرین کی زندگی بھی خطرے میں ہے... مزید یہ کہ اسے موقع ملا تو وہ مجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔"

"بیڈ، ویری بیڈ نیوز۔"

ول کو فون بجنے کی آواز آئی۔ آواز اس کی جیب سے آرہی تھی۔

"ہینگ آن، میرے خیال میں جو کی کال ہے۔" ول نے شالر کو بھی اشارہ کیا۔

ول نے فون برآمد کیا۔ "ہیلو۔"

"کیا مسئلہ ہے، ڈاکٹر... سو گئے کیا۔"

"نہیں، میں بینک میں ہوں، تمہارے پیسوں کے لیے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم نے ایف بی آئی کو بتا

دیا ہے۔ ’’شیرل کہاں ہے؟‘‘
’’وہ پارکنگ میں ہے۔ فون میں لے آیا تھا کہ تمہاری کال آئے تو تمہیں صورت حال سے آگاہ کرسکوں۔‘‘ ول نے بات گھمانے کی کوشش کی۔
’’ہونہہ... پلان تبدیل ہوگیا ہے۔ میں تمہاری بیوی کے ساتھ ایک چھوٹا سا ہوائی سفر کرنے جارہا ہوں۔ اگر ایک میل کے دائرے میں کوئی پولیس یا ایف بی آئی ایجنٹ نظر آیا تو تم اپنی بیوی سے دوبارہ نہیں مل سکو گے۔ سمجھ میں آیا؟‘‘
’’میں تمہاری رقم کہاں پہنچاؤں؟‘‘
’’اس کا حل ہم بعد میں نکالیں گے۔ تب تک تم اسے سنبھال کے رکھو اور اپنے نئے دوستوں کو خبردار کردو کہ ائرپورٹ سے دور رہیں۔‘‘
’’میں سمجھا نہیں... میری بیٹی کہاں ہے؟‘‘
جو کے ہنسنے کی آواز آئی اور فون بند ہوگیا۔
ول نے فرینک زک کو تازہ احوال سے باخبر کردیا۔
’’میں اپنے آدمی پیچھے ہٹاتا ہوں۔ انہیں ائرپورٹ میں جانے دیا جائے گا۔‘‘
’’کیوں؟‘‘
’’باہر ہم نے اسے چھاپنے کی کوشش کی تو وہ غائب ہوسکتا ہے۔ امکان یہ ہے کہ پاسل اور ابھی پہلے ہی اندر اس کے منتظر ہوں... ائرپورٹ کے اندر وہ محدود ہوجائے گا۔‘‘
’’لیکن تم اسے روکو گے کیسے؟ اگر گن ابھی کے سر پر رکھی ہوئی نظر آئی تو تم لوگ کیا کرلو گے؟‘‘
’’ڈاکٹر، میں وعدہ کرتا ہوں اگر ابھی اندر ہوئی اور جو نے ایسی کوئی حرکت کی تو ہمارے شارپ شوٹرز بے ہوش کیے بغیر جو کا بھیجا کھوپڑی سے نکال دیں گے... اب تم فون شالمر کو دے دو، مجھے ضروری انتظامات کرنے ہیں۔‘‘
ول نے فون شالمر کو پکڑا دیا۔ وہ اپنے طور پر تیزی سے حالات کا تجزیہ کررہا تھا۔ اس کی سوچ کہہ رہی تھی کہ فرینک، شالمر کے ذریعے، ول کو ایف بی آئی کے کنٹرول میں دیکھنا چاہتا ہے۔ یقیناً وہ سمجھ رہا ہے کہ یہ کام ایف بی آئی کرسکتی ہے جبکہ جو اب تک ایف بی آئی سمیت ہر ایک کو کنٹرول کررہا تھا... کیبن والے واقعے نے سب کو شاک پہنچایا تھا۔ فرینک کی اہلیت تسلیم شدہ تھی لیکن ول کی چھٹی حس چلا رہی تھی کہ آنے والا وقت اتنا آسان نہیں ہے، جتنا فرینک سمجھ رہا ہے... جو نے ثابت کردیا تھا کہ وہ SWAT جیسی پروفیشنل ٹیم سے بھی دو قدم آگے چل رہا

ہے۔
شالمر کا رخ دوسری طرف تھا، وہ غور سے اپنے باس کی ہدایات سن رہا تھا۔ ول نے لمحہ بھر سوچا اور خاموشی سے آفس سے باہر نکل گیا۔
ہال میں رک کر اس نے تاوان کی رقم وصول کی اور تیز قدمی سے باہر کا رخ کیا۔

☆☆☆

پانچ میل مشرق میں۔ ڈاؤن ٹاؤن جیکسن میں جو گاڑی ڈرائیو کررہا تھا... وہ ائرپورٹ کے قریب تھے۔
’’کیا کررہے ہو؟‘‘
’’دیکھتی رہو۔‘‘
’’ہمیں ابھی تک پہنچنا ہے، اس کی شوگر بڑھ رہی ہے۔‘‘ کیرین کی آواز میں گہری التجا تھی۔
’’اپنا منہ بند رکھو۔ سب کچھ میرے کنٹرول میں ہے۔‘‘
کیرین نے سن روف سے باہر دیکھا۔ ہیلی کاپٹر موجود تھا بلکہ اب وہ گاڑی کے اوپر تھا۔
جو نے بیریئر کے پاس گاڑی روک کے ٹکٹ لیا اور کنکریٹ کی چھت والی وسیع پارکنگ میں داخل ہوگیا۔ پارکنگ، گیراج نما تھی۔ ہیلی کاپٹر غائب تھا۔ جو گیراج سے نکلتا تو نظر میں آتا۔ اس نے تیزی سے بے مقصد ایک دو موڑ کاٹے پھر گاڑی ایک بڑی بی پر تقریباً چڑھا ہی دی۔ بڑی بی اپنی سفید رنگ کی کیمری کے ٹرنک سے ایک بیگ نکالنے کی کوشش کررہی تھیں۔ بڑی بی نے بمشکل خود کو بچایا۔ پہیے چرچرائے اور جو نے ایکسپیڈیشن، کیمری کے پاس روک دی۔ اس سے پہلے کہ کیرین یا بڑی بی کچھ سمجھ پاتیں، جو نے ول کا اعشاریہ اڑتیس نکال کر بڑی بی کے سر پر بجایا۔ چوٹ بڑی بی کو لگی اور چیخ کیرین کی نکلی... بڑی بی بے جان پتھر کے مانند زمین بوس ہوگئیں۔
’’باہر نکلو اور میری مدد کرو۔‘‘ جو نے کیرین کو آرڈر دیا۔ نیم بے ہوش بڑی بی کے ہاتھ سے کیمری کی چابی جھپٹ کر جو نے کیرین کے ساتھ مل کر اسے ٹرنک میں ٹھونس دیا۔
’’تم پچھلی نشست پر بیٹھو، جلدی کرو۔‘‘
کیرین سکتے کے عالم میں تھی۔ جو نے اس کی جانب دیکھے بغیر کیمری اسٹارٹ کردی۔ کیرین کو ہوش آیا اور وہ گاڑی میں سوار ہوگئی۔
’’نیچے کارپٹ پر لیٹ جاؤ۔‘‘ جو، کیمری کو وسیع

گیرج کی چھت کے نیچے سے نکالنے کی تیاری کر رہا تھا۔
کیرین نے محسوس کیا کہ وہ ائرپورٹ سے نکل رہا ہے۔
''کہاں جا رہے ہو؟''
''باہر، ایبی کے پاس۔'' وہ عین ہیلی کاپٹر کے نیچے سے صاف نکل گیا۔ اس وقت پہلی بار کیرین نے اس کے حق میں دعا کی کہ وہ نکل جائے۔ اگر وہ پکڑا جاتا تو پولیس کے سامنے آرام سے مسکراتا رہتا اور ایبی کے زندہ بچنے کے امکانات معدوم ہو جاتے۔
کیمری، ائرپوٹ سے دور ہوتی گئی۔ ہیلی کاپٹر وہیں منڈلاتا رہ گیا۔

☆☆☆

وائس پریذیڈنٹ نے ول کی مطلوبہ رقم بذاتِ خود بریف کیس میں پیک کرائی تھی۔ ول بریف کیس ہاتھ میں لیے باہر نکل رہا تھا کہ اچانک رک گیا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ اگلا قدم کیا ہونا چاہیے... خیال آیا کہ پہلے ائرپورٹ کا احوال معلوم کیا جائے۔ وہ پہلی منزل پر وی سی کے آفس میں واپس آ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی فرینک کی کال اس کے سامنے آئی۔ شالمر نے فون اٹھایا تھا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ شالمر کے چہرے کا رنگ بدلتا رہا پھر زرد رنگ پر یہ بدلاؤ تھم گیا۔
ول کے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی۔
''مجھے بتاؤ، کیا ہوا؟'' ول تڑخا۔
''فرینک میں کال اسپیکر پر منتقل کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر ول یہاں موجود ہے۔''
''میری بیوی اور بچی کہاں ہے؟ کیا دونوں محفوظ ہیں؟ کیا جو کی کہانی ختم ہو گئی؟'' ول نے کڑوے لہجے میں پے در پے سوالات کی بوچھاڑ کی۔
فرینک زک نے محتاط انداز میں بتانا شروع کیا۔ ''وہ دونوں ائرپورٹ کے پارکنگ گیراج میں گئے تھے۔ لیکن وہاں سے واپس نہیں آئے۔ تمہاری گاڑی وہاں گیراج میں کھڑی ہے۔ ہم ائرپورٹ کو کھنگال رہے ہیں۔ تاہم یوں لگتا ہے کہ وہ گیراج سے گاڑی بدل کر ائرپورٹ سے نکل گیا ہے۔''
''شاندار، بہت اچھے۔'' ول کے لہجے میں برہمی تھی، وہ بریف کیس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔
''کیا کر رہے ہو، ڈاکٹر؟ ہم لوگ پارکنگ کے سکیورٹی کیمروں کی ٹیپ چیک کر رہے ہیں۔'' شالمر نے کہا۔
''جو کرنا ہے، کرتے رہو۔ میں باہر گاڑی میں بیٹھ کر جو کی کال کا انتظار کروں گا۔''
''یہ ٹھیک نہیں ہے، ڈاکٹر۔'' اسپیکر سے فرینک کی آواز آئی۔ ''بہتر حکمتِ عملی یہ ہے کہ موجودہ صورتِ حال میں تم ہمارے ساتھ رہو۔ بصورتِ دیگر ہم مجبور ہوں گے کہ تمہیں گرفتار کر لیں۔''
''مذاق مت کرو، کوئی اور بات بتاؤ۔''
''شالمر، تمہیں ایک ٹریکنگ ڈیوائس دے گا۔ جس کی مدد سے ہم تمہاری لوکیشن سے باخبر رہیں گے اور مناسب موقع پر تاوان کے ساتھ ایبی اور کیرین کا تبادلہ ہوگا۔ خفیہ وائر کے ذریعے ہم جو کی گفتگو سنتے رہیں گے اور تم سے زیادہ دور نہیں ہوں گے... سمجھ گئے؟''
''ٹر... ر... رخ۔'' ول نے مینڈک کی طرح آواز نکال کر نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں سمجھا، بالکل نہیں سمجھا۔''
''ڈاکٹر تم تعاون سے انکار کر رہے ہو؟''
''ہاں، تم ٹھیک سمجھے ہو... میرے لیے میری بیوی اور بیٹی سب سے زیادہ اہم ہیں۔''
''پھر سوچ لو، تم اکیلے کیا کر لو گے؟''
''تم سب نے مل کر کیا کر لیا... تم لوگوں کو دو مواقع ہاتھ آئے اور دونوں مرتبہ ایک اکیلے عام ملزم کے خلاف کچھ بھی نہ کر سکے۔ اب میری باری ہے۔'' ڈاکٹر ول نے مستحکم لہجے میں فیصلہ صادر کیا اور شیرل کی گن نکال لی۔
''شالمر؟'' فرینک کی آواز آئی۔
''فرینک، اس نے مجھ پر گن تان لی ہے۔'' شالمر نے بتایا۔
''ڈاکٹر، تم بہت بڑی حماقت کر رہے ہو... حالات کو بدترین رخ پر لے جا رہے ہو۔'' فرینک کی آواز میں درشتگی در آئی۔
ول نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔ ''بدترین! تم ہوش میں ہو؟ کل سے ہم لوگ جس بدترین صورتِ حال سے دوچار ہیں، اس سے بڑھ کر بھی بدتر کچھ ہو سکتا ہے؟''
ول کے تیور دیکھتے ہوئے شالمر نے ہاتھ اٹھا کر مداخلت نہ کرنے کا عندیہ دیا۔ ''ڈاکٹر، کم از کم ٹریکنگ ڈیوائس لے لو۔''
''کہاں ہے؟''
''نیچے سیڑھیوں کے پاس آ جاؤ، میں انتظار کروں گا۔''
''ایجنٹ شالمر، ڈاکٹر کے کمرے سے نکلتے ہی نیچے

موجود اہلکاروں کو گرفتاری کے احکامات جاری کردو۔'' اسپیکر سے فرینک کی برہم آواز سنائی دی۔

شالمر نے ول کی آنکھوں میں جھانکا۔ جہاں ناقابلِ شکست عزم کے سوا کچھ نہ تھا۔ ''سر یہ ممکن نہیں۔ ڈاکٹر کو شوٹ کیے بغیر روکنا ممکن نہیں۔''

سکوت... کمرے میں سناٹا تھا، اعصاب میں تناؤ رگوں کو توڑ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، ڈاکٹر کو ٹریکر دے دو۔'' فرینک کی سپاٹ آواز ابھری۔ ''مسٹر ول، تم اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کرنے جارہے ہو۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں بڑے کام ہی کرتا ہوں۔'' ول کی آنکھوں میں دیوانگی کی چمک نظر آئی۔ ''میں جارہا ہوں۔ مہربانی کر کے کوئی ایڈونچر کی کوشش نہ کرے۔''

☆☆☆

ول عمارت سے نکل کر بھاگتا ہوا ٹیمپو تک پہنچا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے پارکنگ سے نکل گیا۔ اس نے گاڑی ہائی وے 90 پر ڈال دی۔

''کہاں مر گئے تھے؟'' شیرل نروس دکھائی دے رہی تھی۔

''بتاتا ہوں۔'' ول نے عقب کا جائزہ لیا اور ٹیمپو ایک پک اپ ٹرک کے پیچھے لگادی۔ قریب پہنچ کر ٹریکنگ ڈیوائس اس نے ٹرک میں اچھال دی۔

''یہ کیا تھا؟'' شیرل نے اظہارِ حیرت کیا۔

''ٹریکنگ ڈیوائس۔ اب ایف بی آئی ہمارے بجائے اس ٹرک کے پیچھے لگی رہے گی۔''

''ایف بی آئی؟ کیا ایف بی آئی بینک میں تھی؟'' شیرل کے دیدے چوڑے ہوگئے۔

''ہاں، وہ باسل تک پہنچ گئے تھے۔ لیکن وہاں کیبن میں کوئی نہیں تھا۔ سوائے سیل فون اور سبز ٹرک کے... البتہ زیرِ زمین لینڈ لائن موجود تھی۔'' ول نے گردن گھما کر شیرل کو گھورا۔ ''تم نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں ریگولر فون نہیں ہے؟''

''میں نے سچ بولا تھا۔ میرے علم میں نہیں تھا۔ میں کبھی وہاں نہیں گئی۔''

ول نے بریف کیس اس کی گود میں ڈال دیا۔ شیرل کا چہرہ روشن ہوگیا۔ اس نے بریف کیس کھولا۔ کرارے نوٹوں کی گڈیاں سلیقے سے جمی ہوئی تھیں۔ شیرل نے جلدی سے بریف کیس بند کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں سپنے اتر آئے۔

شیرل نے خوابناک نگاہوں سے ول کو دیکھا۔ ''تت... تم واقعی بہت مختلف ہو۔''

''یہ سب تمہارا ہے۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کردیا۔ تم آزاد ہو... میکسیکو، برمودا، جہاں دل کرے جاسکتی ہو۔''

''کیا ابھی، فوراً؟'' شیرل نے پلکیں جھپکائیں۔

''شیرل مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔ میری بیٹی اور بیوی اب بھی جو کے پنجوں میں پھنسے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت کال کرے گا۔ تمہیں نہ پاکر وہ ایبی اور کیرین کو ماردے گا۔'' ول نے نرم آواز میں پُرامید انداز اختیار کیا۔

''وہ مجھے جان سے ماردے گا، ڈاکٹر۔'' شیرل کے خوب صورت چہرے پر خوف کا سایہ نمودار ہوا۔

''نہیں، وہ تمہیں چھو بھی نہیں سکے گا۔'' ول کے لہجے میں اعتماد تھا۔ ''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ وہ ایبی کو ہلاک کردے گا۔''

شیرل کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ''اگر میں ایبی کا پتا بتادوں تو تم مجھے جانے دو گے؟''

''وہاٹ؟'' ول نے بے اختیار بریک لگائے۔ ''تم جانتی ہو وہ کہاں ہے؟ اور جو کہاں جارہا ہے؟''

''تم مجھے جانے دو گے؟'' شیرل نے سوال دہرایا۔

''اس کا جواب کئی باتوں پر منحصر ہے۔'' ول نے جواب دیا۔

شیرل نے ہونٹ دبا کر گود میں رکھے بریف کیس کو دیکھا... ''ایف بی آئی نے کیبن پر ریڈ کیا ہے، جو کو اس بات کا پتا ہے؟''

''ہاں، وہ جانتا ہے۔''

''اس صورت میں وہ بیک اپ پلان پر عمل کرے گا۔''

''بیک اپ پلان کیا ہے؟''

''اب مجھے بروک ہیون کے موٹیل میں جانا ہے، اس کا نام میں تمہیں بتاچکی ہوں... اگر جو ایک دو منٹ میں فون کر کے بیک اپ پلان کی بات کرتا ہے تو میں رضامندی ظاہر کروں گی۔ وہ جگہ یہاں سے ڈیڑھ سو میل شمال میں ہے۔ منصوبہ بندی کے لیے تمہارے پاس کافی وقت ہوگا۔ تم اپنی بیٹی کو بچاسکتے ہو۔ لیکن تم ایف بی آئی سے کیوں بھاگ رہے ہو؟''

''وہ پہلے ہی دو مرتبہ فیل ہوچکے ہیں۔ تیسری بار انہوں نے غلطی کی تو جو ایبی کو نہیں چھوڑے گا۔ یہ بھی نہیں پتا چل رہا کہ ایبی زندہ ہے بھی یا نہیں۔'' ول کی آواز بھرّا گئی۔

''لیکن تم اکیلے کیا کرو گے؟ جبکہ جو برو ک ہیون سے ہمارے مقابلے میں بہت قریب پہنچ چکا ہوگا۔''
''ضروری نہیں ہے۔'' ول نے اشارے سے کانٹی نینٹل 727 کی جانب اشارہ کیا جو انٹر اسٹیٹ 10 کے قریب تھا اور نزدیکی ائرپورٹ پر لینڈ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔
''اوہ گاڈ... تمہارا اپنا ائرکرافٹ...؟'' شیرل کا منہ کھل گیا۔
''ہاں میں کار پر نہیں اپنے ائرکرافٹ پر سفر کروں گا۔''
''لیکن وہاں تم کہاں پر لینڈ کرو گے؟'' شیرل نے حیرت کا اظہار کیا۔
''ایک گھنٹا چاہیے مجھے، صرف ایک گھنٹا، مجھے جو کے ساتھ بلف کھیلنا پڑے گا کہ تم میرے ہمراہ نہیں ہو؟''
اچانک فون کی گھنٹی نے دونوں کو خاموش کر دیا۔
ول نے ''نوکیا'' شیرل کی جانب بڑھایا۔
شیرل نے فون لینے سے انکار کر دیا۔

☆☆☆

ایمی نے کئی حیرت انگیز مناظر دیکھے۔ باسل انسولین کا مخصوص باکس اور بیلا (باربی ڈول) کے ساتھ ایمی کو لے کر کیبن چھوڑ چکا تھا۔ وہ سبز ٹرک کے پاس آیا۔ لیکن اس میں بیٹھنے کے بجائے، ہڈ اٹھا کر بیٹری کھولنی شروع کر دی۔
بیٹری لے کر وہ سفید کار کے پاس آیا جو کنکریٹ کے بلاکس پر کھڑی تھی۔ بیٹری اس نے سفید کار میں فٹ کی اور گاڑی کے نیچے گھس گیا۔ کچھ دیر بعد گاڑی نے کھانسنا شروع کیا، چند ہچکیاں لیں، کچھ دھواں چھوڑا اور اسٹارٹ ہو گئی۔
باسل گاڑی کے نیچے سے نکل آیا۔ وہ ایمی کو لے کر واپس کیبن میں چلا گیا۔ کچن میں اس نے سیل فون نکالا اور آن کر کے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ ایمی کو گود میں اٹھا کر وہ پھر باہر آ گیا تھا۔
سفید کار نے دھواں اگلنا بند کر دیا تھا۔ انجن روانی سے گھوم رہا تھا۔ باسل بلاکس پر کھڑی گاڑی کی پچھلی جانب چلا گیا۔ دونوں ہاتھ اس نے بمپر کے نیچے ڈالے اور بہ آسانی، کھلونے کے مانند گاڑی کا عقبی حصہ نیچے اتار دیا۔ پھر وہ گھوم کر آگے آیا۔ چابیاں نکال کر اس نے دروازہ کھولا، شیشہ نیچے کیا اور انجن بند کر دیا... بونٹ کی جانب آ کر اس نے دونوں ہاتھ نیچے ڈالے اور گاڑی کا اگلا حصہ بھی بلاکس پر سے اتار دیا۔
ایمی حیرت اور خاموشی سے سب کارروائی دیکھ رہی تھی۔ باسل نے اسے پسنجر سیٹ پر بٹھایا۔ انسولین کا مخصوص باکس اور بیلا (باربی ڈول) کو وہ نہیں بھولا تھا۔ سفید کار درختوں میں سفر شروع کر چکی تھی...
''روکو، روکو، گڈ بیسٹ۔'' ایمی معاً کراہ اٹھی تھی۔
باسل سمجھ گیا تھا۔ اس نے گاڑی روکتے ہی ہاتھ بڑھا کر دروازہ بھی کھول دیا... ایمی جلدی سے اتر کر درختوں کے پیچھے چلی گئی۔ چند منٹ بعد وہ واپس آتی دکھائی دی۔ باسل کے چہرے پر تشویش تھی۔ ایمی کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ باسل نے ہاتھ لہرایا۔ ایمی نے بھی ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی، تاہم وہ منہ کے بل گر پڑی۔
ایمی کو احساس ہوا کہ اس کی شوگر خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ سر دکھ رہا تھا اور شدید تھکن کا احساس حاوی تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے کھولیں تو دیکھا کہ باسل گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھا تھا۔ اس نے ایمی کو سیدھا لٹا کر منہ پر سے گندگی صاف کر دی تھی۔
''بیسٹ، میری شوگر ہائی ہے... مجھے انسولین کا شاٹ چاہیے۔''
''میں ابھی آیا، بیلا گھبراؤ مت۔'' وہ اٹھ کر بھاگا۔ لحیم شحیم باسل بھاگتا ہوا عجیب بے ڈول سا لگ رہا تھا۔ وہ انسولین باکس لے کر واپس آیا تو مزید پریشان لگ رہا تھا۔ شاٹ کون لگائے گا؟
''تمہیں انسولین شاٹ لگانا آتا ہے؟'' اس نے ایمی سے پوچھا۔
''میں نے ممی، ڈیڈی کو یہ کام کرتے دیکھا ہے، خود میں نے کبھی نہیں کیا۔ تم سرنج میں دوائی کھینچو اور سوئی یہاں رکھ کر پلنگر (Plunger) کو دباؤ۔ تم کر لو گے نا؟''
باسل کے تاثرات میں بوکھلاہٹ تھی۔ ''م... مجھے سوئیوں سے ڈر لگتا ہے۔''
''لیکن میری حالت خراب ہو رہی ہے... شاٹ لگانا پڑے گا۔''
باسل نے بے بسی اور شرمندگی سے ایمی کو دیکھا۔
''اچھا تم یہ باکس کھولو۔''
باسل نے پش بٹن کے ذریعے باکس کھول دیا۔ ایمی نے ہاتھ ڈال کر انسولین کی شیشی اور ایک سرنج نکالی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ سرنج میں دوائی بھرنے میں کامیاب ہو گئی... ران پر سے لباس ہٹا کر اس نے ہونٹ

دبائے اور انسولین شاٹ لگا ہی ڈالا۔

باسل کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ''بیلا، تم بہت بہادر ہو۔'' ایبی حیران تھی دیو نما باسل نے گاڑی کو کھلونے کے مانند اٹھا لیا تھا اور ایبی کو بہادر قرار دے رہا تھا... کچھ دیر بعد سفر پھر شروع ہو گیا۔

''کیا ہوا؟ تم رو رہے ہو؟'' ایبی نے باسل کو دیکھا۔

''نہیں۔'' باسل نے آستین سے آنکھیں صاف کیں۔

''تم گڈ بیسٹ ہو، جھوٹ مت بولو... بیلا سے جھوٹ بول رہے ہو۔''

باسل نے ایبی کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ اس کا نچلا موٹا ہونٹ ہل رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' ایبی نے اس کا ہاتھ دبایا۔

''تمہاری ماما تمہیں لے جائیں گی۔ میں تمہیں کبھی نہیں دیکھ پاؤں گا۔''

''نہیں ایسا نہیں ہوگا۔'' ایبی نے اس کے بازو پر ہاتھ پھیرا۔

''ایسا ہی ہوگا... ہمیشہ ایسا ہوتا ہے۔''

ایبی کے دل میں اداسی سرایت کرنے لگی۔ اس نے بیلا کو اٹھا کر باسل کے پاس رکھ دی۔ تاہم باسل نے گڑیا کو ہاتھ نہیں لگایا۔

☆☆☆

''پکڑو اسے۔'' ول چیخا۔ ''اسے جواب دو۔''

شیرل نے ترچھے ہو کر فون لے لیا۔

''ہیلو؟ یاہ، میں سمجھ گئی... وہ یہیں ہے... نہیں، نہیں میں نے نہیں دیکھا... ہم انٹر اسٹیٹ دس پر ہیں۔ انٹر اسٹیٹ 55، رائٹ... نارتھ، او کے... اوہ گڈ... وکے۔ ایک سیکنڈ۔'' شیرل نے ٹوکیا ول کے حوالے کیا۔

''جو؟''

''تم نے ہیرو بننے کی کوشش کیوں کی؟''

''جو، میں نے وہی کیا جیسے تم کہتے رہے، کیونکہ مجھے اپنی بیٹی عزیز ہے۔''

''جھوٹ۔ تم نے ایف بی آئی کو اطلاع دی۔''

''یہ غلط ہے، وہ بینک میں موجود تھے۔ میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے ان کو کال نہیں کی۔ یہ تمہاری غلطی تھی۔''

''میری غلطی؟ کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''ہارٹ سرجن جیمس میکڈیل نے کال کی تھی۔ جن کے بیٹے کو تم نے گزشتہ برس اغوا کیا تھا۔''

خاموشی۔

''سرجن کے دماغ میں یہ بات گھس گئی تھی کہ اس سال بھی کوئی فیملی نشانہ بننے والی ہے... بالآخر اس نے کل رات ایف بی آئی کو بتا دیا۔''

خاموشی۔

''اس کے بعد ہی ساری گڑبڑ شروع ہوئی۔

خاموشی۔

''بینک میں تمہارے خلاف انہوں نے مجھے کس طرح استعمال کرنے کی کوشش کی اور میں کس طرح وہاں سے نکلا... یہ کہانی شیرل سے سن لو۔''

گہری خاموشی... اچانک جو نے سرجن میکڈیل کی فیملی کی سرجری زبان سے شروع کر دی... ٹوکیا، ول نے شیرل کو پکڑا دیا...

شیرل نے اس کی بغیر نقطے والی زبانی سرجری کو لگام دے کر ول کی باتوں کی تصدیق کی۔ کچھ دیر بات ہوئی اور ٹوکیا ایک بار پھر ول کے ہاتھ میں تھا۔

''تم شیرل کو واپس ہیوریج لے جاؤ۔ فون اس کو واپس کر دو۔ تم بھی اس کے حوالے کر دو۔ بعد ازاں اپنے سوئٹ میں میری کال کا انتظار کرو۔ اگلے چند گھنٹوں میں کال بار بار آئے گی اور تم جواب دو گے۔ کیونکہ میرے کال کرنے پر تم نے جواب نہیں دیا تو ایبی کو ختم سمجھو۔''

''سنو جو... میں جانتا ہوں کہ یہاں تمہیں صرف رقم سے مطلب نہیں ہے، او کے؟ تم مجھے اور میری فیملی کو سزا دینا چاہتے ہو۔ میں نے رقم نکلوالی ہے اور یہ تمہاری ہے۔ لیکن ٹریڈنگ کے وقت مجھے سامنے ہونا چاہیے۔ جب میں کیرین اور ایبی کو دیکھ لوں گا تو چلا جاؤں گا۔ پیسے تمہیں دے دوں گا۔ اس کے بعد جو تمہارا دل کہے کرو۔ تم مجھے مار بھی سکتے ہو۔ لیکن ان دونوں کو جینے دو۔ مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔''

''قربانی، عظیم قربانی... ابھی تک ہیرو بننے کی کوشش کر رہے ہو... بھول جاؤ۔ یہ میرا طریقہ ہے، مائی وے، یا ہائی وے... بچے تمہارے پاس کوئی چوائس نہیں ہے۔'' جو نے فون آف کر دیا۔

ول کی گردن کی رگیں پھول گئیں، اس نے دونوں مٹھیاں اسٹیئرنگ وھیل پر ماریں۔

''کیا غلط ہو گیا؟'' شیرل چلائی۔

''وہ شیطان صفت ہے۔'' ول نے بتایا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔

''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ ہمیشہ دو تین قدم آگے رہتا ہے۔'' شیرل نے بھنکی ہوئی آواز میں کہا۔

''دیکھوں گا وہ کتنا بڑا شیطان ہے۔ ہم نہیں تو وہ بھی نہیں۔'' ول نے نشست سے ٹیک لگالی۔ اس کے ہاتھوں اور سر میں دکھن ہو رہی تھی۔'' چند گھنٹے کے لیے اپنے کسی بھی دوست کو سوئٹ میں بٹھا دوں گا۔ وہ اس کی کالنز کا جواب دیتا رہے گا۔''

''حماقت مت کرو، وہ ایک منٹ میں پہچان لے گا۔ کوئی بھی ایسا سوال کرے گا، جس کا صرف تمہیں پتا ہوگا تمہارا دوست جواب نہیں دے پائے گا۔ اس کے بعد کیا ہو گا۔ تم سمجھتے ہو۔''

ایک اور جہاز گرج دار آواز کے ساتھ سر پر سے گزرا۔ یہ جیٹ F-18 ہارینٹ تھا۔ کار لرز اٹھی۔ ول کے ذہن میں ایک خیال کوندا... اس نے والٹ نکال کر ایک کارڈ برآمد کیا، شیرل کا فون لیا اور بیوریج کیسینو ریسورٹ کا نمبر ملایا۔

آپریٹر کی آواز سن کر اس نے ایمرجنسی کا لفظ استعمال کیا اور گیوٹریو سے بات کی خواہش ظاہر کی۔

''دس از گیوٹریو، کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''میں ڈاکٹر ول جیننگ ہوں۔ کل ہم ملے تھے جب میں چیک ان کر رہا تھا۔''

''ہاں، ڈاکٹر، مجھے یاد ہے۔''

''آج صبح ایف بی آئی وہاں تھی، رائٹ؟''

''ٹھیک بات ہے۔'' گیوٹر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''کیا وہ اب بھی ہوٹل میں ہیں؟''

''چند منٹ پیشتر آخری اہلکار نکل چکا ہے۔'' منیجر نے بتایا۔

''سنو، مجھے نہیں پتا کہ ایف بی آئی نے تمہیں کیا بتایا ہے۔ میں ہوٹل میں نہیں ہوں۔ میری بیٹی اور بیوی اغواکنندگان کے قبضے میں ہیں۔ مجھے ہر قیمت پر انہیں چھڑانا ہے۔ تمہاری تھوڑی سی مدد درکار ہے۔''

''ڈاکٹر، میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ ایف بی آئی کا کیس لگتا ہے۔''

''ایف بی آئی پہلے ہی کئی مرتبہ ناکام ہو چکی ہے... لمبی کہانی سنانے کا وقت نہیں ہے میرے پاس۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ میرے سوئٹ میں جو کال آئے وہ اس نمبر پر ٹرانسفر کر دی جائے، جو نمبر میں اس وقت استعمال کر رہا ہوں۔ کئی گھنٹے تک بار بار کال آئے گی۔'' ول نے نمبر بتایا۔

ول نے اس انتظام کے لیے ایف بی آئی کو کاؤنٹ کیا تھا۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ ایف بی آئی کو آخری وقت تک الگ رکھنا ہی بہتر ہے۔

''گیوٹریو، میں جواب کا منتظر ہوں۔'' ول نے کہا۔

''سنو ڈاکٹر...''

''پلیز صرف اتنا بتا دو کہ ٹیکنیکلی کیا یہ ممکن ہے؟''

''ڈاکٹر یہ ممکن تو ہے، لیکن ہوٹل کی پالیسی...''

''منیجر، تم اپنی ذاتی پالیسی بتاؤ۔'' ول نے شیرل والی ترکیب آزمانے کا فیصلہ کیا۔'' کئی زندگیاں داؤ پر لگی ہیں اور میں کوئی غلط کام نہیں کر رہا... پھر تعاون کے بدلے میں ذاتی طور پر تمہیں دس ہزار ڈالرز ادا کروں گا۔''

''دس ہزار...؟'' منیجر کا لہجہ بدل گیا۔

''پندرہ ہزار کر لو، چند گھنٹے کے پندرہ ہزار۔ لیکن کال کرنے والے کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ درحقیقت ہو کیا رہا ہے... اپنے پندرہ ہزار پکے سمجھو۔''

''ڈاکٹر، معافی چاہتا ہوں۔ ضمانت کیا ہے اور رقم کیسے ملے گی؟'' منیجر کی کاروباری رگ پھڑکنے لگی۔

''معقول بات ہے۔ ڈاکٹر جیکسن ایورٹ کے کمرے میں ملاؤ۔'' ول نے ہدایت دی۔'' میرا نام لینا۔''

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر جیکسن لائن پر تھا۔

''ول، اس وقت کیا افتاد آن پڑی؟ تم ہو کہاں؟'' ڈاکٹر جیکسن ایورٹ کی آواز آئی۔

''غور سے سنو، وقت بہت کم ہے... یہ میری زندگی موت کا معاملہ ہے... تمہاری بھتیجی اغوا ہو چکی ہے... کہانی بعد میں سناؤں گا۔ فی الحال یہ احسان کرو کہ منیجر کو دو ہزار ڈالرز دے دو... آج کی تاریخ میں زندہ یا مردہ آجاؤں گا۔ زندہ نہ آیا تو تیرہ ہزار مزید منیجر کو دے دینا۔ پلیز کوئی سوال نہ کرنا۔ میں مصیبت میں ہوں اور وقت بالکل نہیں ہے۔''

''کام ہو جائے گا۔ اتنا کہہ دے کہ تو زندہ آئے گا اور کامیاب آئے گا... گڈ لک۔'' ڈاکٹر جیکسن نے فون بند کر دیا۔

''میں نے سن لیا ہے، ڈاکٹر ول۔'' منیجر کی آواز آئی۔

''رازداری کا خیال رکھنا، تھینکس۔''

''بے فکر ہو جاؤ۔''

ول نے فون بند کر کے ائرپورٹ کا رخ کیا۔

☆☆☆

''بیرن 58'' وہیں کھڑا تھا جہاں کل ول نے چھوڑا تھا۔ ایوی ایشن کی رسمی کارروائی اور گلف ٹاور سے رابطے کے بعد تھوڑی دیر میں ''بیرن 58'' فضا میں بلند ہونے والا تھا۔ شیرل ہمراہ تھی۔ تاہم چند قیمتی منٹ ضائع ہو گئے۔ وہاں خاصا ٹریفک تھا۔ C-130، F-18 فائٹر، ہارینٹ... ائر نیشنل گارڈ کا فلائٹ آپریشن جاری تھا۔

ول ذہن میں حساب کتاب کر رہا تھا۔ ساتھ شیرل سے بھی مشورہ کر رہا تھا۔ جو گاڑی بدل کر جیکسن ائرپورٹ کی پارکنگ سے نکلا تھا تو اس نے یقیناً انٹراسٹیٹ 55 پر جنوب کی سمت سفر شروع کیا ہوگا... وہ ہیزل ہرسٹ جاتا ہے یا بروک ہیون، کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ دونوں ٹاؤن ایک ہی لائن پر تھے۔ جس وقت وہ جیکسن ائرپورٹ سے نکلا ہے، تخمینے کے مطابق اسے 35 منٹ میں منزل پر ہونا چاہیے۔ ول بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ تاہم بیرن 58 کے ذریعے اب بھی وہ جو سے پہلے پہنچ سکتا تھا۔

ابھی اس نے بیرن 58 کے انجن اسٹارٹ ہی کیے تھے کہ ائرپورٹ سیکیورٹی وہیکل کا تیز سیٹی جیسا سائرن سنائی دیا۔ گاڑی، بیرن کے پیچھے آرہی تھی۔ گاڑی کی چھت پر سرخ بتی جھلملا رہی تھی۔

''لعنت ہے۔'' ول نے تھراٹل کھینچ کر بیرن 58 کو جنرل ایوی ایشن کے رن وے کے متوازی ٹیکسی کرنا شروع کیا۔ سیکیورٹی وہیکل تعاقب میں تھا لیکن ائرکرافٹ کی بڑھتی ہوئی رفتار کو چھونا کسی گاڑی کے بس کی بات نہیں تھی۔

معاً ریڈیو سے گلف ٹاور کی وارننگ جاری ہوئی جو بیرن 58 کو واپس لانے کے لیے تھی۔ وارننگ نظرانداز کر کے ول رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ اس کی کوشش تھی کہ ٹیکسی وے سے ہی فضا میں بلند ہوجائے۔ اسے اپنی امید خاک میں ملتی نظر آئی جب سامنے دیوہیکل C-130 ہرکولیس ٹرانسپورٹر نظر آیا... ایک امکان بچا تھا کہ وہ C-130 کے بازو کے نیچے سے ہو کر دوسرے ٹیکسی وے پر چلا جائے... ریڈیو پر ٹاور سے برابر وارننگ نشر ہورہی تھی۔ ول کمال مہارت اور جرأت کے ساتھ C-130 سے بچ کر دوسرے ٹیکسی وے پر نکل آیا... وہاں آٹھ سو فٹ کے فاصلے پر دو F-18 ہارینٹ، ٹیک آف کرنے جارہے تھے۔ ول کو ٹیک آف کے لیے وقت کی تفریق کا خیال رکھنا تھا۔ وہ پُراعتماد تھا۔ ہارینٹ کی رفتار، بیرن 58 کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ رفتار کے فرق کی وجہ سے ول کو یقین تھا کہ دونوں ہارینٹ، بیرن 58 سے پہلے ہوا میں ہوں گے اور وہ خود ان دونوں کے درمیان سے گزرتا ہوا ٹیک آف کرے گا۔ وہ جانتا تھا کہ آئندہ بھی وہ اس ائرپورٹ سے اڑنے کی اجازت حاصل نہ کر پائے گا بلکہ آئندہ وہ کسی بھی ائرپورٹ سے نہیں اڑ پائے گا۔ یہ اس کا آخری مگر بہترین ٹیک آف ہوگا۔

ول نے بیرن 58 کے بریکس پر سے توجہ ہٹالی۔ بیرن 58 آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی رفتار کو خاص حد میں رکھنے کے لیے، ول نے تمام مہارت اور تجربہ جھونک دیا۔ ریڈیو پر کیا واویلا ہورہا تھا، اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ دونوں F-18 گرجتے ہوئے بیرن 58 پر چڑھے آرہے تھے... شیرل نے چیخ ماری اور چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا۔

ول کی تمام حسیات آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ کہ دونوں F-18 کے درمیان سے گزرنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ دونوں بیرن 58 سے پہلے ہوا میں چلے جائیں۔ بصورتِ دیگر ایک قیامت خیز تصادم یقینی تھا۔

ہارینٹ والے بھی اندھے نہیں تھے۔ انہوں نے رفتار مزید بڑھادی، وہ رن وے پر جانے کا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ شیرل متواتر چیخ رہی تھی۔

سیکنڈوں کے فرق سے ہارینٹ ہوا میں چلے گئے۔ بیرن 58 ہانپتا کانپتا درمیان سے گزرا۔ ول نے رفتار بڑھائی اور ٹیک آف کر گیا۔

''تم پاگل ہو ڈاکٹر۔'' شیرل نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔

''اور جو؟''

''وہ جنونی ہے۔''

''کیا فرق ہوا؟''

''پتا نہیں۔''

فضا میں آنے کے بعد گزشتہ چوبیس گھنٹے کی تھکاوٹ جیسے تحلیل ہوگئی۔ ایک اہم اور خطرناک مرحلہ وہ طے ہو چکا تھا۔ ول نے پیشانی سے پسینہ صاف کیا۔

کنٹرول ٹاور کا واویلا معدوم تھا... تاہم ول فضا میں ابھی ہزار فٹ ہی اٹھا تھا کہ ایک نئی کرخت آواز سنائی دی۔

''بیرن وہسکی، جولیٹ، میں ہیلی کاپٹر میں تمہاری اسٹار بورڈ سائڈ پر ہوں۔ میرا نام جان اسمتھ ہے۔ اسپیشل ایجنٹ آف ایف بی آئی تم متواتر قانون شکنی کے مرتکب ہوتے آرہے ہو۔ فوراً ائرپورٹ کی طرف واپس چلو۔ پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''کیا وہ ہمیں مجبور کرسکتا ہے؟'' شیرل نے استفسار

کیا۔
''ناممکن۔ ہم 220 ناٹ کی رفتار تک جا سکتے ہیں۔ بادل آنے والے ہیں۔ اسے بھول جاؤ۔'' ول نے جواب دیا۔ وہ بیرن 58 کو بادلوں کی سمت اوپر ہی اوپر لے جا رہا تھا...

''ڈاکٹر جیننگ۔'' ریڈیو پھر بڑبڑایا۔ ''وز از فرینک۔'' فرینک زک... ہمیں سائڈ لائن کر کے تم نے اپنی بیٹی اور بیوی کے لیے خطرات میں اضافہ کر دیا ہے۔ تمہیں ہماری مدد کی ضرورت پڑے گی۔ بصورتِ دیگر ایک المیہ جنم لے سکتا ہے۔''

ول نے مائیک سنبھالا۔ ''میں رسک لے چکا ہوں اور ذہنی طور پر نہ صرف تیار ہوں بلکہ پُرامید بھی۔ آفیسر میں تمہارے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ تم میری مدد کرنا چاہتے ہو تو چند ایجنٹ سادہ لباس میں بروک جیون پہنچا دو۔ میں جلد رابطہ کروں گا۔'' ول نے ریڈیو آف کرنے کے بعد ٹرانسپورڈر بھی بند کر دیا۔ ائر ٹریفک کنٹرولرز کو عام طور پر طیارے کی پوزیشن براڈ کاسٹ کرنے کا کام ٹرانسپورڈر نامی آلہ ہی کرتا ہے۔

''ہیلی کاپٹر تو تمہیں چھو نہیں سکتا۔ لیکن تم نے اس سے بڑا ایک مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔'' معاً شیرل نے خبردار کیا۔

''وہاٹ؟''

''ہوٹل سے جو کال یہاں فارورڈ ہوگی، میرے فون پر... وہ سمجھے گا تم ہوٹل سے جواب دے رہے ہو۔''

''ہاں تو پھر...؟''

''لیکن اگر اس نے براہ راست مجھے میرے نمبر پر فون کر دیا تو کون فون وصول کرے گا۔ کیسے پتا چلے گا کہ کال ہوٹل سے ٹرانسفر ہو کے آئی ہے یا وہ ڈائریکٹ مجھے فون کر رہا...''

ول کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ شیرل کی بات سمجھ گیا تھا۔ اگر وہ فون اٹھانے میں غلطی کرتے تو سارا منصوبہ ہی درہم برہم ہو جاتا... ول کچھ سوچ کر بولا۔ ''اگر کال آئی تو میں وصول کروں گا۔ پندرہ بیس منٹ اور گزار دیں گے... میں کہوں گا کہ ٹریفک جام کی وجہ سے ہم ابھی تک ہوٹل نہیں پہنچ سکے۔''

''تم بھول رہے ہو کہ کال ہوٹل سے ٹرانسفر ہو کے آئے گی۔ اگر تم ابھی راستے میں ہی ہو تو سوئٹ میں ہونے کا جھانسا کیسے دے سکتے ہو اور اگر فون وصول نہیں کرو گے تو کہانی ختم سمجھو۔''

ول نے جھلا کر پیشانی پر ہاتھ مارا۔ ''ہاں تو ٹھیک ہے نا... میں ٹریفک کا بہانہ کیوں بناؤں گا۔ کال ٹرانسفر ہو کے آئے گی... میں وصول کروں گا... وہ یہی سمجھے گا کہ میں سوئٹ میں ہوں۔ کیوں کنفیوز کر رہی ہو؟''

بیرن 58 بادلوں میں گھس گیا۔ اب دور رہ جانا والا ہیلی کاپٹر اسے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس بات کا امکان کم تھا کہ اس کے پاس ریڈار بھی ہوگا۔

''ایف بی آئی نے کیبن پر ریڈ کیا تو پاسل کا سبز ٹرک وہاں تھا۔ کیا وہاں کوئی دوسری گاڑی بھی تھی؟'' ول نے پُرسوچ انداز میں پوچھا۔

''میں نے بتایا تھا کہ میں وہاں کبھی نہیں گئی؟''

''لیکن کبھی تم نے باتوں کے دوران میں تو کچھ سنا ہوگا؟''

شیرل نے انکار میں سر ہلایا۔

☆☆☆

بیوریج کے سوئچ بورڈ سینٹر پر موجود نوجوان آپریٹر ''اسٹیفن کنگ'' کے ناول میں کھویا ہوا تھا۔ ہوٹل کی مرکزی لائن گنگنائی تو اس نے حسبِ معمول رٹا رٹایا فقرہ دہرایا... کال کرنے والا سوئٹ نمبر 28021 مانگ رہا تھا۔ آپریٹر نے مخصوص بٹن پنچ کیا اور فارورڈنگ نمبر ڈائل ہونے لگا۔ ڈیجیٹل کنکشن اپنا کام کر رہا تھا... منیجر کی ہدایت کے مطابق آپریٹر اپنا کام کر کے پھر ناول میں گم ہو گیا۔ فون کی گھنٹی، ہوٹل کے سوئٹ کے بجائے بیرن 58 میں شیرل کے سیل پر بج رہی تھی۔

☆☆☆

گھنٹی کی آواز سن کر ول اچھل پڑا۔ اس نے گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''میں جواب دوں گا۔ فون میرے کان سے لگا کر بٹن دباؤ...'' شیرل نے ایسا ہی کیا۔ دفعتاً ول نے اسے بٹن دبانے سے روک دیا۔ گھنٹی پھر بجی... ول کو اچانک احساس ہوا تھا کہ جو فون پر بیرن 58 کی گھن گرج بہ آسانی سن لے گا۔

''کیا ہوا؟'' شیرل نے پریشانی سے پوچھا۔ ول نے پھرتی سے پینل بورڈ کو ایڈجسٹ کیا اور انجن بند کر دیے۔ پُراسرار خاموشی... بیرن 58 نے زمین کی طرف گرنا شروع کیا۔

''شٹ۔'' شیرل چیخی۔ ول نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ اور اسے فون آن کرنے کا اشارہ کیا۔ بپ کی آواز سنائی دی اور اوپن کنکشن کی مخصوص ہسنگ (Hissing)

سا ؤنڈ سنائی دی۔ ’’جو؟‘‘

’’ڈاکٹر، سو گئے تھے کیا؟‘‘

’’ان حالات میں کون سو سکتا ہے۔‘‘ ول نے آواز نارمل رکھی۔

’’وہاں اوپر کیا کررہے ہو؟‘‘

ول کا دل زور سے دھڑکا۔ پھر اسے خیال آیا کہ جو کا اشارہ بلند و بالا ہوٹل کے اونچے سوئٹ نمبر 28021 کی جانب تھا۔

’’ابھی کہاں ہے؟‘‘ ول نے سوال کیا۔ وہ بیرن 58 کی گرتی ہوئی بلندی سے غافل نہیں تھا۔ جو 1000 فٹ فی منٹ کے حساب سے نیچے جارہا تھا۔ ’’میں ابھی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’بات کرنے کا موسم ابھی نہیں آیا۔ دوبارہ فون کروں گا۔‘‘ ول نے فون، شیرل کی گود میں پھینکا اور تیزی سے پینل بورڈ کوری ایڈجسٹ کر کے انجن اسٹارٹ کیے۔

شیرل کا چہرہ ہڈی کے مانند سفید ہورہا تھا۔

بیرن 58 نے پھر سے بلندی پکڑنی شروع کر دی۔

’’شیرل، باسل سبز شیوی ٹرک چھوڑ کر ابھی کے ساتھ پیدل نہیں نکل سکتا۔ وہ جس پلان بی کی بات کرتے رہے، اس کے لیے دوسری گاڑی کی موجودگی وہاں لازمی تھی۔ سوچو باسل کون سی گاڑی استعمال کررہا ہے... ڈرومت بیرن 58 کیش نہیں ہوگا۔ ہم اب 7000 فٹ کی بلندی پر ہیں۔ بہت نیچے بھی جانا پڑا تو میں سات منٹ انجن کے بغیر گلائیڈ کرسکتا ہوں۔‘‘

’’باسل کی گاڑی کے سلسلے میں تم ایف بی آئی سے مدد لے سکتے ہو۔‘‘ شیرل نے مشورہ دیا۔

’’نہیں ابھی نہیں۔ ویسے SWAT کی ٹیم کو وہاں دوسری گاڑی کے پہیوں کے نشانات ملے تھے۔‘‘ دفعتاً فون کی گھنٹی بجی۔

’’کون جواب دے گا؟‘‘ شیرل نے پریشانی سے پوچھا۔

’’وہ مجھ سے بات کرچکا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس نے ڈائریکٹ کال کی ہے۔‘‘ ول نے پینل کی سیٹنگ میں ضروری تبدیلیاں کیں اور انجن بند کر دیے۔

بیرن 58 نے ایک بار پھر زمین کی جانب رخ کیا اور شیرل نے فون پر بات شروع کی۔

’’جو...؟‘‘

’’ہاں، رقم میرے پاس ہے۔‘‘ شیرل نے انگوٹھا بلند کر کے ول کو اشارہ کیا۔

’’ہاں، کوئی مسئلہ نہیں ہے... وہ... وہ ہارا ہوا جواری لگ رہا تھا... ہاں مجھے یاد ہے... باسل کہاں ہے... اوکے... اب مجھے کہاں جانا ہے؟... اوکے... اوکے...‘‘

’’شیرل غور کرو باسل کس گاڑی پر سفر کررہا ہے۔‘‘ ول نے انجن دوبارہ اسٹارٹ کر کے بیرن 58 کو اوپر اٹھانا شروع کیا۔ ’’کیا کہہ رہا تھا وہ؟‘‘

’’اس نے مجھے ’’پاکو‘‘ پہنچنے کی ہدایت کی ہے۔

’’..... پاکو کی جگہ کلب میں ہے... کلب کا نام پیراڈائز ایلے ہے۔ میں وہیں ’’کام‘‘ کرتی تھی۔ کلب پیٹس برگ کے قریب ہے۔ میں وہاں رقص کرتی تھی۔ وہاں لڑکیوں کے لیے کمرے بنے ہوئے تھے۔ جو نے کلب کا نام لیا ہے... ’’پاکو‘‘ وہاں کام کرتا ہے۔‘‘ ول نے نقشہ نکال کر پیٹس برگ کی لوکیشن کا جائزہ لیا۔

’’سن آف بچ۔‘‘

’’کیا؟‘‘ ول نے گردن گھمائی۔

’’دی ریمبلر۔ جو کی ماں کے پاس ایک AMC ریمبلر تھی۔ پرانی سلور رنگ کی۔ کلب کا نام آیا تو مجھے خیال آیا۔ ایک رات ہم ریمبلر میں پیراڈائز ایلے پہنچے... واپسی پر ریمبلر کسی صورت اسٹارٹ نہ ہوسکی۔ نہ ہی بعد میں جو اسے ڈرائیو کرنے میں کامیاب ہوا۔ دو سال وہ کھڑی رہی پھر اچانک غائب ہوگئی... ممکن ہے کہ کیبن پر ریمبلر ہی موجود ہو...‘‘

ول اپنی ہیجانی کیفیت کو چھپا نہ سکا۔ ایسا ہی ہے تو باسل اور ابھی ریمبلر میں محوِ سفر ہوں گے۔ لیکن وہ کہاں ہوں گے؟

’’ایف بی آئی کو باسل کا سیل فون کیبن میں ملا تھا۔‘‘ ول نے باآوازِ بلند کہا۔ ’’اگر باسل روڈ پر ہے تو جو اس سے رابطہ نہیں کرسکتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ باسل کے پاس دوسرا سیل فون ہوگا۔‘‘

’’ہاں، اس کے پاس وہی فون تھا۔‘‘ شیرل نے تصدیق کی۔

’’باسل کو پیراڈائز ایلے کے بارے میں پتا ہے؟ وہ گیا ہے وہاں کبھی؟‘‘

شیرل ہنس پڑی۔ ’’مذاق کررہے ہو، وہاں اگر وہ کسی بے لباس لڑکی کو دیکھ لیتا تو مسئلہ بن جاتا۔ ایک مرتبہ جو اسے میرا ڈانس دکھانے وہاں لایا تھا، تو وہ اسٹیج پر چڑھ گیا تھا اور

اپنا کوٹ اتار کر میرے بدن پر ڈال دیا تھا۔''

''کیا اس نے پیٹس برگ کے آس پاس وقت گزارا ہے؟''

''میرے علم میں نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ باسل پاکو کے مسکن پر نہیں جائے گا۔ وہ معمول کے بیک اپ پلان پر عمل کرے گا۔ مزید یہ کہ جو اسے فون کے ذریعے نئی ہدایات بھی جاری نہیں کر سکتا۔ تو اوریجنل ''بیک اپ'' پلان کے تحت اسے کہاں کا رخ کرنا چاہیے؟''

''جو نہیں چاہے گا کہ باسل اور ابھی زیادہ دور جائیں کیونکہ ہائی وے پٹرول انہیں روک سکتے ہیں... میرے اندازے کے مطابق باسل کو بروک ہیون جانا چاہیے۔ جو ہیزل ہرسٹ سے 20 منٹ کے فاصلے پر ہے۔ کیبن سے تقریباً 60 منٹ دور۔ جو، جیکسن ائرپورٹ سے نکل کر 55 منٹ میں باسل اور ابھی تک پہنچ سکتا ہے پھر ان دونوں کو لے کر پیٹس برگ میں تمہیں مدعو کرے گا۔''

''اس کا مطلب جو اس وقت انٹراسٹیٹ 55 پر ہے اور باسل بھی... ساؤتھ بینڈ لینز پر دونوں کے درمیان تقریباً 20 منٹ کا فاصلہ ہونا چاہیے... بھول جاؤ ہائی وے 49 کو۔''

ول نے بیرن 58 کا رخ بدلنا شروع کیا۔

☆☆☆

کیرین نے کیمری کے ٹرنک میں جھانکا۔ وہ مجروح بڑی بی کو سفید کیمری کے ٹرنک سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ لوگ جہاں تھے وہاں ویرانی اور سناٹے کا راج تھا۔ صرف ایک گیس اسٹیشن نظر آ رہا تھا۔

''قبل اس کے کہ اس کا ارادہ بدلے، نکلو یہاں سے۔'' کیرین اس کی مدد کر رہی تھی۔ جو ڈرائیونگ سیٹ پر فون پر بات کر رہا تھا۔ کیرین بڑی بی کو سہارا دے کر سڑک کے کنارے درختوں تک لے آئی۔

''تم مجھے یہاں چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟''

''تم یہاں زیادہ محفوظ ہو... گو، رن... گو... گیس اسٹیشن میں چلی جاؤ۔''

☆☆☆

بیورنج کے سوئچ بورڈ سینٹر پر آپریٹر بدستور ''اسٹیفن کنگ'' کے ناول میں ڈوبا ہوا تھا... پرائمری لائن کے آٹو پائلٹ پر کوئی کال سوئٹ نمبر 28021 کا رابطہ مانگ رہا تھا۔

''ون منٹ۔'' آپریٹر نے حسبِ عادت کہا اور کنکشن ملا دیا۔ اٹھائیس منزل اوپر ول کے سوئٹ میں فون کی گھنٹی بجی... آپریٹر دوسرا پیراگراف پڑھتے پڑھتے رک گیا۔ وہ پلکیں جھپکا رہا تھا۔ کوئی غلطی ہو گئی تھی۔ غلطی سمجھنے میں اسے چند سیکنڈ لگے۔ ناول اس نے ایک طرف رکھ دیا۔ اس نے سوچا کہ وہ اپنی غلطی اب بھی درست کر سکتا ہے۔ اس نے کمپیوٹر کی بورڈ سنبھال کر کال ٹرانسفر کرنے کے لیے کمانڈ ٹائپ کی۔ تاہم سوئٹ 28021 میں فون بجتا بند ہو گیا تھا۔

''شٹ۔'' وہ بڑبڑایا۔ گیوٹریو نے اگلے تین گھنٹے تک کال ٹرانسفر کرنے کے لیے الگ سے 100 ڈالر معاوضہ دیا تھا۔

☆☆☆

بیرن 58 انٹراسٹیٹ 55 پر 200 ناٹ کی رفتار سے پرواز کر رہا تھا۔ ول کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ ریمبلر سے کتنے فاصلے پر ہے۔ اگر واقعی باسل ریمبلر، ڈرائیو کر رہا تھا۔ تاہم وہ پُرامید تھا اور ساؤتھ بینڈ کی سڑکوں کے متوازی فلائی کر رہا تھا۔

معاً سیل فون بج اٹھا۔

''کون جواب دے گا؟'' شیرل نے ول کو دیکھا۔

''تم۔'' ول کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوئیں۔

''نہیں۔ وہ گزشتہ کال میں مجھے بتا چکا ہے کہ کہاں جانا ہے... لہٰذا یہ کال تمہارے لیے ہے۔'' شیرل نے بتایا۔

ول 300 فٹ کی بلندی پر انجن بند نہیں کر سکتا تھا۔ اسے ادراک ہو گیا کہ نازک اور دشوار ترین مرحلہ بالآخر آن پہنچا ہے۔ یہ ڈو اور ڈائی والی سچویشن تھی۔ شیرل کے چہرے پر بھی ہراس تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ کوئی گڑبڑ نہیں بھی ہوئی تو جو جہازی انجنوں کی آواز سن لے گا۔ اگر ول فون سرے سے اٹینڈ نہ کرتا تو بھی پھنستا... تاہم روشنی کی ایک کرن اب بھی تاریکی سے لڑ رہی تھی۔ جو، باسل کو ہدایت جاری نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ابھی کو مار دے۔ رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا... جو کو ڈرائیونگ کے ذریعے باسل تک پہنچنا پڑتا۔ ول کے خیالات برق رفتاری سے ذہن میں چکرا رہے تھے۔

مہیب خطرات کے حامل پرندے نے پر کھول دیے تھے۔ گھنٹی تیسری، چوتھی بار بجی۔ ول نے کشتیاں جلائیں اور فون ریسیو کیا۔

''جو؟''

''شیرل کہاں ہے؟''
''ہوٹل میں ہوگی۔''
''بکواس مت کرو۔'' جو دھاڑا۔ ''اوہ، تم اپنے طیارے میں سفر کر رہے ہو؟ خوب، بہت خوب۔''
''جو...''
''شیرل کو فون دو۔'' وہ شکاری کتے کے مانند غرایا۔
ول کی سانسیں اٹکنے لگیں۔
''تمہاری بیٹی گئی، ڈاکٹر... گئی... تم نے بہت ہوشیاری دکھائی۔ لیکن بھول گئے کہ تمہارا واسطہ جو سے پڑ گیا ہے۔ ماں میرے لیے انمول تھی، تم نے چھین لی۔ ابھی تمہارے لیے انمول ہے، میں چھین لوں گا۔''
جو کے الفاظ، ول کی ہڈیوں میں اُتر گئے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ گفتگو سن کر کیرین کی چیخ ضرور سنائی دیتی... کیا وہ کیمری میں نہیں ہے؟
''جو، کیرین کہاں ہے؟''
''تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''
دفعتاً ول کے جسم کا ہر خلیہ تپنے لگا۔ چہرہ سرخ ہوگیا۔
''جو!''
''بولو۔''
''تم نے کہا تھا نہ کہ یہ تمہاری آخری واردات ہے؟''
''ہاں، پھر؟''
''تو نے ٹھیک کہا تھا لیکن تو یہ بھول گیا کہ دن بھی یہ تیرا آخری ہے۔'' ول کی آواز میں عزم کا لاوا ابل رہا تھا۔
شیرل نے حیرت سے ول کو دیکھا۔ آواز کے شدید غیظ وغضب نے چند لمحے کے لیے جو کی بولتی بند کردی۔
''ڈاکٹر، ہذیان بک رہا ہے... تیری بیوی، بیٹی کو تیرے سامنے ماروں گا... بعد میں تجھے...'' وہ بھی تو تڑاخ پر اتر آیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی لگ رہی تھی۔ اسے ڈاکٹر سے اس ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔
''میں ہذیان بک رہا ہوں... تجھے بکنے کا بھی موقع نہیں ملے گا۔'' ول نے جواب سنے بغیر فون بند کردیا۔

☆☆☆

کیرین نے کیمری کا ٹرنک بند کیا اور مڑ کر گیس اسٹیشن کی طرف دیکھا۔ چند قدم چل کر وہ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جو کا فون بند تھا اور وہ پلکیں جھپکائے بغیر ونڈ شیلڈ کی دوسری جانب گھور رہا تھا۔
''ول سے بات ہوئی؟''
''ہاں۔''
''کیا کہہ رہا تھا؟''
''یہ پوچھو کہاں سے کہہ رہا تھا؟''
''کیا مطلب؟''
''وہ اپنے سوئٹ میں نہیں ہے۔''
کیرین کے دماغ میں الارم نے شور کیا۔ ''وہاٹ؟''
''وہ میری توقع سے زیادہ ہوشیار اور خطرناک ہے...'' جو نے بہت مشکل یوٹرن لیا۔ ٹائروں سے دھواں اٹھا۔ اس نے سمت یکسر تبدیل کردی تھی۔

☆☆☆

ول نے اسپیڈ مزید کم کر کے 100 ناٹ کر دیا۔ اب وہ شمال سے کافی فاصلے پر تھے۔ ''باسل اور ابھی کی گاڑی ڈھونڈو۔'' یہی آخری روشن کرن تھی۔ ول کے چہرے کے عضلات اکڑے ہوئے تھے حیرت انگیز طور پر گھٹنے کا درد غائب تھا۔ جب آدمی کرب واذیت کے سمندر میں تیر رہا ہو تو چھوٹے موٹے درد اور تکالیف کا احساس فنا ہو جاتا ہے... ول جانتا تھا کہ باسل بیک اپ پلان پر عمل کر رہے اور یہ بات جو کے علم میں بھی تھی۔ سوال یہ تھا کہ کون پہلے باسل تک پہنچتا ہے... ڈراما سپر کلائمکس میں داخل ہوگیا تھا جس میں خطرات ہی خطرات تھے۔
شیرل اور ول نیچے روڈ پر ریمبلر کو اسکین کر رہے تھے۔ ایف بی آئی سے مدد لینے کا وقت آگیا تھا... ول نے ریڈیو آن کر دیا۔
''دس از بیرن وہسکی جولیٹ، اوور، ایمرجنسی ہے، پلیز جواب دیں۔''
مختصر خاموشی کے بعد آواز آئی۔ ''ڈاکٹر جیننگ، دس از فرینک زک۔ تم کہاں ہو؟''
''فرینک، وقت بہت کم ہے۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ میری گاڑی جیکسن ائرپورٹ کی پارکنگ میں ہے۔ یعنی وہ ہوائی سفر کا دھوکا دے کر دوسری گاڑی کے ذریعے واپس ائرپورٹ سے نکل گیا... میری مدد کرو، وہ کس گاڑی میں وہاں سے نکلا ہے؟''
''اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سفید ٹویوٹا کیمری میں سفر کر رہا ہے۔ ہم نے سیکیورٹی ٹیپ چیک کر لی ہیں۔ ڈاکٹر پلیز اپنی لوکیشن بتاؤ، اس کے بغیر...'' ول نے ریڈیو آف کر دیا۔
''تم نے روڈ پر کچھ دیکھا؟''
''نہیں، ابھی تک نہیں۔''
''فوکس مت کرو، اسکین کرو اور پُرسکون رہو اور ہاں

جو سفید رنگ کی ٹویوٹا کیمری میں ہے۔''
''اوہ گاڈ، شاید میں نے ریمبلر کو دیکھ لیا ہے۔'' شیرل چلائی۔ ''میں نے باسل اور ابی کو بھی دیکھ لیا ہے۔''

ول کا چہرہ روشن ہو گیا۔ اس نے عقب میں دیکھنے کی کوشش کی، تاہم ناکام رہا۔ اس نے بیرن 58 کا رخ آسمان کی طرف کیا اور چکر کاٹ کر پیچھے کی جانب گیا۔

☆☆☆

ول کا رخ سامنے سے آنے والی ٹریفک کی جانب تھا۔ اس نے چھوٹی سی پرانی سفید ریمبلر دیکھ لی۔ ول نے رفتار اور بلندی کم کرنا شروع کر دی۔ پسنجر سیٹ میں اسے چھوٹا سا سر نظر آیا۔ اسٹیئرنگ وھیل پر دیوزاد باسل موجود تھا۔ زندگی میں وہ سکون اور مسرت اس نے محسوس نہیں کی تھی جو ابی کو زندہ دیکھ کر اس نے محسوس کی...

جیسے ہی ول نے چکر مکمل کیا۔ بیرن 58 مخالف سمت سے آنے والی ٹریفک کی جانب جانے لگا۔ ریمبلر باکس نما سلور رنگ کی پرانی اور سست رفتار گاڑی تھی۔ ول رفتار کم کرتا گیا، حتیٰ کہ بیرن 58 اڑنے کے بجائے تیرتا ہوا لگ رہا تھا۔ رفتار مزید کم ہوتی تو وہ کریش کر جاتا...

ابی زندہ تھی اور اب دنیا کی کوئی طاقت ول کو ابی تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی تھی۔

☆☆☆

باسل اور ابی ایک ساتھ گا رہے تھے۔ ''بٹسی اسپائیڈ... بٹسی اسپائیڈر...'' جس وقت جہاز پہلی مرتبہ سامنے نمودار ہوا۔ بلند درخت کی چوٹیوں سے ذرا اونچا وہ سیدھا ان کی طرف آرہا تھا۔

''وہ دیکھو۔'' باسل نے اشارہ کیا۔

''اسے اتنا نیچے پرواز نہیں کرنا چاہیے۔'' ''میں جانتی ہوں، کیونکہ میرے ڈیڈی بھی جہاز اڑاتے ہیں۔''

جہاز ان کے اوپر سے گزر گیا۔ ابی نے مڑ کر دیکھا۔ وہ بلند ہو رہا تھا۔

ان دونوں نے پھر گانا شروع کر دیا۔ دفعتاً باسل نے بریک پیڈل دبایا۔ جھٹکا لگا اور ابی نے ڈیش بورڈ پر ہاتھ رکھ کر اپنا سر بچایا۔ جہاز پھر نمودار ہو گیا تھا۔ اس مرتبہ اس کی بلندی بہت ہی کم تھی اور وہ سیدھا ریمبلر کی جانب آرہا تھا... انٹر اسٹیٹ پر موجود ٹریفک میں ہلچل مچ گئی۔ ابی کی چیخ نکل گئی تھی... ابی پلکیں جھپکائے بغیر جہاز کو گھور رہی تھی۔ اس کا ننھا سا ذہن کنفیوز ہو رہا تھا۔ جہاز کے بازو تھوڑے سے ڈگمگائے۔ پہلے دایاں بازو، پھر بایاں بازو جھک کر سیدھا ہو گیا۔

ابی کا منہ کھل گیا۔ ''وہ میرے ڈیڈی کی طرح کر رہا ہے۔'' ابی کا چہرہ تمتما اٹھا۔ ''وہ میرے پاپا ہیں... بیسٹ وہ میرے پاپا ہیں... اب سب ٹھیک ہو جائے گا...'' فرطِ ہیجان سے وہ بے قابو ہوئی جارہی تھی۔ دو مرتبہ جہاز کے نمودار ہونے کے بعد انٹر اسٹیٹ کی ٹریفک یہی سمجھ رہی تھی کہ کوئی خرابی ہے اور جہاز وہاں اترنا چاہ رہا ہے۔ ٹریفک کو بچانے کے لیے جہاز نے اچانک کریش لینڈنگ نہیں کی تھی۔

☆☆☆

بیرن 58 دوبارہ ریمبلر کے پاس سے گزر گیا۔ ابی کا چہرہ گاڑی کے شیشے سے چپکا ہوا تھا۔ بے اختیار ول آبدیدہ ہو گیا۔

''کیا کرو گے؟'' شیرل نے پوچھا۔

''لینڈ کروں گا۔''

''روڈ پر؟''

''بے شک۔''

شیرل کا چہرہ پھر سفید پڑ گیا۔

''سیٹ بیلٹ باندھ لو۔'' ول نے کہا۔

ول نے 500 فٹ کی بلندی پر آکر رفتار 180 ناٹ کر دی۔

''کیا ہوا لینڈ نہیں کر رہے؟''

''پہلے کیمری کو تلاش کرنا ہے۔'' ول نے دیکھ لیا تھا کہ ٹریفک کو گڑبڑ کا احساس ہو گیا ہے۔ گاڑیوں کی لمبی قطار لگ گئی تھی۔ بیشتر روڈ سے اتر گئی تھیں۔ ول نے اندازہ لگایا کہ اسے زیادہ سے زیادہ پانچ میل صاف ملیں گے اور 90 سیکنڈ۔

''میں نے کیمری دیکھ لی ہے، وہی ہے... سلور رنگ کی۔'' ضروری نہیں تھا کہ وہ ول کی مطلوبہ کیمری ہو... بہرحال اس نکتے پر سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ یہی کافی تھا کہ ریمبلر اور کیمری ایک روڈ پر تھیں۔ اتنی منطق بھی حوصلہ افزا تھی۔

ول فرمانبردار بیرن 58 کو 1000 فٹ اوپر لے گیا۔ وہاں سے وہ مڑا تو بھاری پتھر کے مانند گرا... ہر طرف سے دھیان ہٹ گیا تھا۔ ارتکازِ توجہ محفوظ ترین لینڈنگ پر تھا۔

ائیر اسپیڈ 85 ناٹ ہوتی ہے۔ روڈ کی سفید پٹی کو سینٹر لائن بنا کر اس نے رفتار گراتے گراتے 82 ناٹ کر دی۔

یوک (YOKE) کو ذرا سے آگے کیا اور پاور مزید گھٹا کر روڈ پر اُتر گیا۔

☆☆☆

جو، ہیرن 58 سے تین میل پیچھے تھا۔

''سن آف اے بچ، کریش لینڈنگ کرنی تھی تو ہائی وے پر جاتا۔'' جو کا منہ بن گیا۔

کیرین خاموش تھی۔ جس وقت جہاز آسمان سے گر کر انٹر اسٹیٹ کے متوازی ہوا تھا، اس وقت سے اس کا دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔ اس کا دل نعرہ زن تھا کہ یہ اس کا شوہر ول ہے... یقیناً یہ ول ہے۔

''یہ خودکشی کے لیے اوپر گیا تھا۔'' جو نے تبصرہ کیا۔ ''یا اس کا ایک انجن فیل ہو گیا ہے؟'' اس نے کیرین کو دیکھا۔ کیرین خاموش اور ساکت تھی۔ انٹر اسٹیٹ پر لینڈ کر کے ول نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگایا تھا۔ اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ ایمی زندہ ہے...

''تمہیں کیا ہوا؟'' جو پھر بولا۔ ''دیکھ رہی ہو اس پاگل کو... CNN کو ایک بڑی اسٹوری مل گئی ہے... تم خاموش کیوں ہو... بیمار ہو؟ کیا مسئلہ ہے، خوف زدہ...''

چانک جو کے جبڑے بھنچ گئے۔ ''مردود، ٹھیک جگہ پہنچا ہے۔ یہیں مرے گا۔'' جو نے ایکسلریٹر دبایا۔ وہ آگے کیڈی لاک کو اوورٹیک کرنا چاہ رہا تھا۔

ایمی نہ صرف زندہ ہے بلکہ یہیں آس پاس ہے۔ اسی لیے ول اور جو یہاں پہنچے تھے۔ چوبیس گھنٹے سے جاری بھیانک خواب کی تعبیر کا وقت آن پہنچا تھا۔ یہ زندگی کا طویل ترین اور ڈراؤنا خواب تھا۔ کیرین اپنا کردار ادا کرنے کے لیے نئے سرے سے توانائی جمع کرنے لگی۔

اچانک کیرین نے وہیل پکڑ کر پوری قوت سے کھینچا۔ کیمری لڑکھڑائی اور کیڈی لاک گھبرا کر سڑک سے اتر گئی۔ جو نے کیرین کے سر پر گھونسا رسید کیا لیکن کیرین اسٹیئرنگ وہیل چھوڑنے کے بجائے بری طرح وہیل سے لپٹ گئی۔ کیمری نے بھی سڑک سے اتر کر درختوں کی جانب رخ کیا۔

جو کے حلق سے گالی برآمد ہوئی۔ اس نے کہنی کیرین کے کان کے قریب ماری۔ چند لمحات کے لیے وہ اندھیروں میں ڈوب گئی۔ نگاہ کے سامنے سے تاریکی ہٹی تو کیرین نے دیکھا کہ کیمری واپس روڈ پر تھی اور ول کی گن اعشاریہ اڑتیس کا رخ اس کے پیٹ کی جانب تھا۔ جو متواتر بائیں پٹی پر گاڑی بھگا رہا تھا۔

''کوئی غلط حرکت کی تو جان سے مار دوں گا۔'' جو نے سرد و سفاک آواز میں سنجیدہ دھمکی دی۔ کیرین نے اسپیڈومیٹر پر نظر ڈالی۔ سوئی 90 کے ہندسے پر لرز رہی تھی... 90 سے اوپر ہوتی ہوئی وہ 100 تک چلی گئی۔

کیرین نے جو کے ہاتھ میں گن کا جائزہ لیا۔ گولی کب چلے گی، کیا کرے گی؟ تاہم اتنی اسپیڈ پر ہونے والے حادثے میں دونوں کی موت یقینی تھی۔ اگر صرف گولی چلی تو کیرین مرے گی۔

جو کے حلق سے پھر گالی نکلی اور اسے بریک لگانے پڑے۔ سامنے گاڑیوں کی قطار کی سرخ بیک لائٹس اشارہ کر رہی تھیں کہ وہ بریک لگا رہی ہیں۔ آگے کیا ہو رہا تھا کچھ پتا نہ تھا۔ جو نے بے محابا ایمرجنسی کے لیے ریزرو پٹی پر گاڑی ڈال دی اور کیمری کو دوڑاتا چلا گیا۔ اس کا چہرہ سرخ نہیں ہو رہا تھا بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے چہرے پر آگ کے شعلے رقص کر رہے ہیں... اس کی یادداشت میں ول کے زہریلے فقرے چھریوں کی طرح پیوست تھے۔ ''تو نے ٹھیک کہا تھا کہ یہ تیری آخری واردات ہے، مگر تو بھول گیا کہ دن بھی یہ تیرا آخری ہے... تجھے مرنے سے پہلے ہذیان بکنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔'' جو کا تن بدن آگ میں پھنک رہا تھا۔ آخری واردات... آخری دن... آخری دن... دن... دن...

کیرین نے آنکھیں بند کر کے ایمی کا تصور کیا۔ اس چھوٹی سی ایمی کا جب وہ صرف چھ ماہ کی تھی۔ ننھی منی، مسکراتی ہوئی، گول مٹول... جس کے لیے کیرین نے اپنا کیریئر قربان کر دیا تھا، سپنا بھلایا تھا۔ سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ اس کا دل جیسے سرخ آنسو ٹپکا رہا تھا۔ اداسی کی چادر نے اس کے وجود کو لپیٹ لیا... معاً سب احساسات و جذبات ایک عمیق سکون کی نذر ہو گئے... نہ غم نہ خوف... وہ خود فراموشی کی حالت میں تھی۔ دل دھڑکتا ہے تیری قربت کے لیے... قربان اک لمحے پر سارا جیون... اندیشوں سے آزاد ہے ہر دھڑکن...

اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔ ''آئی لو یو، ایمی۔'' اس نے خود سے سرگوشی کی۔ ''آئی ایم سوری، ول۔''

''وہاٹ؟'' جو نے پوچھا۔

جواب میں، سود و زیاں سے بیگانہ وہ خونخوار بلی کی طرح جھپٹی۔ ایک ساعت کے فرق سے جو نے گولی چلا دی۔

☆☆☆

بیرن 58 تیر کی طرح، ریمبلر کی جانب جارہا تھا۔ درمیان میں اسکول وین دیکھ کر ول کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیا ڈرائیور بچوں کو چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ ول نے پاور آف کر کے بریک لگائے۔ فوراً ہی اسے اندازہ ہو گیا ہے کہ بیرن 58 بروقت نہیں رک پائے گا، اس نے دوبارہ ہوا میں جانے کے بارے میں سوچا لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ ول کی سانس رک گئی۔

شیرل پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر چیخنے لگی یہ اور بات کہ ول کو اس کی چیخ وپکار سنائی نہیں دے رہی تھی۔

ول نے فیول بھی بند کر دیا اور انتہائی بائیں جانب جھکتے ہوئے وین کے قریب سے گزر گیا۔ آہ... بیرن 58 کے دائیں بازو کی ٹپ نے وین کو چھولیا تھا۔ وین، پھرکی کے مانند گھومی اور دو تین دائرے بنا کر سڑک کے کنارے پر رک گئی۔ ول نے رکی ہوئی سانس خارج کی، یہ سنسنی خیز مرحلہ ایک منٹ سے پہلے ختم ہو گیا۔ ول کا چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔

''ول!'' شیرل پھر چیخی اور سامنے اشارہ کیا جہاں گاڑیوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ وہاں ایمرجنسی پٹی پر سفید کیمری آکر رکی۔ ایمرجنسی پٹی کو بلاک کرنا خلاف قانون تھا نہ کہ بلا جواز، اس پر سفر کرنا۔ بیرن 58 ابھی فاصلے پر تھا۔ کیمری میں کون ہے، چہرے نظر نہیں آرہے تھے۔ تاہم کیمری سے ایک ہی فرد برآمد ہوا۔ ''نہیں۔'' اس بار ول چلایا۔ ایک ہی مطلوبہ کیمری تھی تو کیرین کہاں ہے؟ اترنے والا یقیناً جو تھا۔ دوسری بات ول کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ ریمبلر بڑھی کیوں چلی آرہی ہے۔ اگرچہ بیرن 58 کی رفتار کم ہو چکی تھی۔ تاہم اب بھی وہ ماچس کی ڈبیا جیسی ریمبلر کے پرخچے اڑا سکتا تھا۔

گاڑیوں کی قطار کے آگے فولاد اور مضبوط لکڑی کا بنا ہوا جگرناٹ ٹرک کھڑا تھا جس پر درختوں کے موٹے، وزنی تنے لدے ہوئے تھے۔ کیمری سے اترنے والا ٹرک کے ڈرائیور کو باہر نکال کر خود اندر چلا گیا یقیناً جو کے پاس کوئی ہتھیار تھا۔

جگرناٹ، اسٹارٹ ہو کر بیرن 58 کی جانب چل پڑا، اس کی رفتار لحہ بہ لحہ بڑھتی جارہی تھی۔ اس کے آگے ریمبلر تھی۔ ریمبلر کو رک کر بہت پہلے سائڈ میں ہو جانا چاہیے تھا۔ ول کو محسوس ہوا کہ 30 ٹن وزنی ٹرک ریمبلر کو اڑانے جارہا ہے۔ ٹرک کی رفتار بڑھتی جارہی تھی۔ اچانک ریمبلر بے ڈھنگے طریقے سے سڑک چھوڑ کر ڈھلوان میں اتر گئی، گاڑی کا رخ درختوں کی جانب تھا۔ ول کا سکون عارضی ثابت ہوا۔

دفعتاً اس کی نگاہ پھر ٹرک کی جانب گئی۔ وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ ٹرک کی رفتار خاصی بڑھ چکی تھی۔ وہ سیدھا بیرن 58 کی جانب آرہا تھا۔ یوں کہنا چاہیے کہ دونوں ایک دوسرے کی طرف جارہے تھے۔

ول نے پھرتی سے دونوں سیٹ بیلٹس کھولیں اور شیرل کی جانب جھک کر اس کی جانب کا ڈور بھی کھول دیا۔ ''باہر کودو۔'' وہ چلایا۔ تاہم شیرل کودنے کے بجائے طیارے کے عقبی حصے میں جھانکنے لگی۔

''باہر کودو۔'' ول نے لوڈڈ ٹرک کی جانب دیکھا۔

بریف کیس میں رقم طیارے کے پچھلے حصے میں پڑی تھی ''میرے پیسے...'' وہ چلائی۔

''اپنی جان بچاؤ، پاگل ہوئی ہو'' ول نے دھکیل کر اسے باہر پھینکا اور خود بھی نکل گیا... بیرن 58 کی رفتار کم ہو چکی تھی۔ ورنہ وہ اب تک ٹرک سے ٹکرا چکا ہوتا۔ شیرل اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ اب بھی کاک پٹ کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی یا شاید اٹکی ہوئی تھی۔ ول نے دیکھا کسی نہ کسی طرح وہ دوبارہ اندر گھس گئی تھی، وہ اتنی بڑی رقم چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ حالانکہ موت ٹرک کی صورت میں بڑھی چلی آرہی تھی۔ خوفناک تصادم ناگزیر تھا۔ ول سڑک کے کنارے کی طرف بھاگا... بھاگتے ہوئے وہ ٹرک ڈرائیور کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ذرا دیر بعد گونج دار دھماکا سنائی دیا۔ دھماکے سے چند سیکنڈ پہلے ول نے مڑ کے دیکھا۔ ٹرک ڈرائیور دروازہ کھول کر باہر کود رہا تھا۔

☆☆☆

گھاس کے ترچھے قطعہ اراضی پر ریمبلر درختوں کی طرف جارہی تھی۔ باسل تو اتر سے بریک پیڈل دبا رہا تھا۔ گاڑی برابر درختوں کی طرف بڑھ رہی تھی... ایبی، باسل کے کان کے پاس چلا رہی تھی۔ باسل کا دماغ ماؤف تھا۔ معاً اس نے گاڑی روکنے کی کوششیں ترک کر دیں اور ایبی کو اٹھا کر عقبی نشست پر پھینک دیا۔ ٹھیک دس سیکنڈ بعد گاڑی ایک درخت سے ٹکرائی۔ ایبی اچھل کر اگلی نشست کی نرم پشت سے ٹکرائی۔

ونڈ شیلڈ ٹوٹ گئی تھی۔ باسل کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ بے حس وحرکت تھا۔ ایبی پھر آگے آگئی۔

''بیسٹ۔'' ایبی نے باسل کو ہلانے کی ناکام کوشش کی۔ وہ کراہا اور ایک ہاتھ اپنی پسلیوں پر رکھ لیا۔

اینی نے اس کا بڑا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہلایا۔ ''اٹھو، بیسٹ... اٹھو...''
''کیا تم بات کر سکتے ہو؟''
باسل کی دائیں آنکھ پھڑکی۔ وہ پھر کراہ اٹھا۔
''بھاگو۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''تیل کی بو آرہی ہے۔ تم بھاگ جاؤ۔''
''جاؤ، ڈیڈی کے پاس جاؤ۔ بُرا آدمی آرہا ہے۔''
''ایلن' بھاگو...''
اینی کو یاد آیا کہ باسل کی چھوٹی بہن کا نام ایلن تھا۔
اینی نے نیچے دیکھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشوں پر گڑیا اور وہ بھالو پڑا تھا جو باسل نے اینی کے لیے تراشا تھا۔ اس نے گڑیا اٹھا کر باسل کی گود میں ڈال دی اور بھالو لے کر گاڑی سے اتر گئی۔ ''گڈ بیسٹ، میں ڈیڈی کے ساتھ واپس آرہی ہوں۔'' وہ بھاگ اٹھی۔ وہ ترچھی ڈھلان پر اوپر چڑھ رہی تھی... اوپر کنارے پر ایک دراز قامت ہیولہ نظر آیا۔
''ڈیڈی... ی... ی...'' وہ چلائی۔
دراز قامت ہیولہ نیچے کی جانب بھاگا۔

☆☆☆

شیرل کا حلیہ بگڑ چکا تھا۔ اس کے گھٹنے اور بایاں بازو زخمی تھے۔ تاہم وہ نہ صرف زندہ تھی بلکہ لاکھوں ڈالرز والا بریف کیس بھی نکال لائی تھی۔ اس کے عقب میں دھواں اور شعلے بلند ہو رہے تھے۔ چھوٹے موٹے دھماکے بھی جاری تھے۔ وہ گھاس پر لیٹی تھی۔ گاڑیاں اور ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ بریف کیس لے کر شیرل رختوں کی جانب چل پڑی... گاڑیوں کی قطار ایک میل تک چلی گئی تھی۔

☆☆☆

کیرین پسنجر ڈور کے ساتھ نیم دراز تھی۔ گولی اس کے پیٹ میں قدرے اوپر لگی تھی۔ جو جا چکا تھا۔ ونڈ شیلڈ سے کیرین کو بیرن 58 دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چند منٹ قبل اسے خاصا زوردار دھماکا سنائی دیا تھا وہ امید ہی کر سکتی تھی کہ بیرن 58 سلامت ہو... اس نے ول اور اینی کے لیے دعا کی۔ پھر گلو باکس کھلا، باکس میں اسے کلینکس کا پیڈ مل گیا۔ (نرم ٹشو جسے رومال کی طرح استعمال کیا جاتا ہے) کلینکس کا گولہ بنا کر اس نے گولی کے سوراخ میں گھسا دیا۔ درد و کرب کو برداشت کرتے ہوئے کیسری کا دروازہ کھولا اور باہر لڑھک گئی۔

☆☆☆

ول نے اینی کو دبوچ کر اوپر اٹھا لیا۔
''مام کہاں ہیں؟'' اینی نے سوال کیا۔
ول کے پاس اس آسان سوال کا جواب نہ تھا۔
''سوئٹی، ہم ممی کو بھی ڈھونڈ لیں گے۔''
''رکیے، باسل گاڑی میں پھنس گیا ہے، وہ زخمی ہے۔'' اینی نے کہا۔
ول، ریمبلر کے قریب چلا گیا۔ فضا میں پیٹرول کی بو تھی۔ اگر آگ لگ جاتی تو وہ زندہ جل جاتا۔ ول نے اینی کو نیچے اتارا اور ڈرائیونگ ڈور کی طرف بھاگا۔ ڈور جام نہیں ہوا تھا لیکن اسٹیئرنگ کے ساتھ باسل نامی بھاری جثہ پھنسا ہوا تھا۔ ول بمشکل اسے ہلا پایا۔
''ہیلپ...'' باسل کی آواز آئی۔
ول نے دونوں ہاتھوں سے اس کا بازو دبوچا ایک ٹانگ گاڑی کے فریم پر جمائی، کچھ باسل نے کوشش کی اور دونوں لڑھک گئے... اور کروٹیں بدلتے ہوئے ریمبلر سے دور ہو گئے۔
کیرین اور جو کا مسئلہ نہ ہوتا تو ول درختوں میں جا کر پولیس کا انتظار کرتا۔ اسے شیرل کی گن بھی یاد آئی جو یقیناً ٹرک اور بیرن 58 کے تصادم میں ضائع ہو گئی ہو گی۔ وہ اپنے اگلے قدم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ انتظار کرنا بے سود تھا۔ اوپر سڑک کے کنارے کافی لوگ جمع تھے اور نیچے دیکھ رہے تھے۔ اگر جو ان میں شامل ہوا تو؟ کسی نہ کسی کے پاس تو گن ہو گی، آخر یہ مسی سپی تھا... ول نے اینی کو اٹھایا اور روڈ کی طرف چل دیا۔
''پیچھے ہٹ جاؤ... پیچھے ہٹو۔'' کوئی زور سے چیخا۔
ول کا دھیان پولیس کی جانب گیا۔ وہ آدمی 30 فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں۔ اس کی پتلون کا ایک پائنچہ خون آلود تھا۔
''جو!'' ول کے دماغ میں گھنٹی بجی۔ جو کے ہاتھ میں ول کی ہی گن تھی۔
''میرے پیسے کہاں ہیں، ڈاکٹر؟''
''ٹرک میں تم تھے؟'' ول نے سوال کیا۔
''اور کون ہو سکتا ہے؟''
ول ہنس پڑا۔ ''بہت چالاک ہو۔ تمہیں خیال نہیں آیا کہ ظاہر ہے پیسے جہاز میں ہوں گے۔''
جو نے ٹرک اور جہاز کے ملبے کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اس نے گولی چلائی اور ول لڑکھڑا کر ایک گھٹنے کے بل پر گر گیا۔
''یہ تمہاری ہی گن ہے، کیسا لگ رہا ہے؟'' جو نے

کہا۔

ول سوچ رہا تھا کہ ایمی کو، جو اس کے پیچھے تھی اور چلائے جا رہی تھی، بھاگنے کے لیے کہے لیکن خدشہ تھا کہ آڑ سے نکلتے ہی جو ایمی کو گولی مار دے گا۔ جو کی چلائی ہوئی گولی ول کی ران میں گھس گئی تھی۔

''شیرل کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' ول نے جواب دیا۔

جو مزید آگے آیا، اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کی نظر باسل پر پڑی۔

''کم آن بوائے۔'' اس نے باسل کو پکارا۔

''تم نکل سکتے ہو جو، یہاں سے نکل جاؤ۔'' ول نے کہا۔

جو نے قہقہہ لگایا۔ ''ہاں جاؤں گا، ضرور جاؤں گا لیکن تمہارے ساتھ کاروبار ابھی نامکمل حالت میں ہے اور وہ چھوٹی گڑیا جو تمہاری پشت پر ہے، وہ لیگل ٹینڈر ہے۔''

جو دو قدم اور آگے آیا۔ ول جانتا تھا کہ ران میں لگنے کے باوجود وہ ہمت کر کے بھاگ سکتا ہے اگرچہ یہ ایک فضول کوشش ثابت ہوتی تاہم اسے کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ ایمی کو اٹھا کر بھاگ نکلے۔ اسے حیرت تھی کہ پولیس اور ایف بی آئی اب تک کہاں ہیں اور روڈ پر موجود جمِ غفیر میں سے کسی نے جو پر حملہ آور ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ول بھاگنے کے لیے ذہن کو تیار کر رہا تھا، معاً اس کی نظر ایک قریبی پتھر پر پڑی... اس نے اپنا ارادہ بدل دیا... اچانک ایک نسوانی آواز گونجی۔

''جو میں نے پیسے بچالیے ہیں۔'' وہ شیرل کی آواز تھی۔ ''کم آن، نکلو یہاں سے۔'' وہ مسکرائی بھی تھی۔

''ویل ویل...'' جو نے تعریف کے ساتھ شیرل کے لیے ایک قدرے نازیبا لفظ استعمال کیا جو اس کے بدنما ماضی سے متعلق تھا۔ ''بے بی، مجھے اپنا کام تو پورا کرنے دو۔''

جو تو مستی میں تھا لیکن ول نے تاڑ لیا کہ شیرل فطری انداز میں نہیں مسکرائی تھی۔ جو کا جواب سن کر اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

''اس معصوم بچی کو نقصان پہنچانے کی اب کوئی وجہ نہیں رہ گئی ہے۔'' وہ بولی۔

''بہت اچھا مشورہ ہے۔'' جو کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اس نے ول کی ٹانگوں کا نشانہ لیا کہ کسی طرح گولی ایمی تک پہنچ جائے۔ یہ ایک مشکل نشانہ تھا۔

''جو، نہیں۔'' شیرل چیخی۔ اس نے بریف کیس کھول کر گن نکالی۔ ''ایمی کو مارنے سے تمہاری ماں واپس نہیں آئے گی۔ ایمی کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے بلکہ ول بھی بے قصور ہے۔ کوسٹاریکا چلو، تمہارا رینچ تمہارا منتظر ہے۔''

''کتیا، میرے دشمن کی حمایت میں بول رہی ہے۔ ایک رات میں بدل گئی۔'' اس نے سرسری انداز میں شیرل کی جانب رخ کیا۔

ول کی چھٹی حس نے خطرے کا واضح سگنل نشر کیا... پیشتر اس کے کہ وہ شیرل کو خبردار کرتا۔ جو کا سرسری انداز بدل گیا۔ اس نے پھرتی سے فائر کیا اور مکروہ قہقہہ بلند کیا۔

''یہ گندی گائے شروع سے احمق تھی۔'' جو نے نفرت بھرا تبصرہ کیا۔ شیرل نیچے گری، بریف کیس کھلا تھا۔ لہٰذا ڈالرز کی گڈیاں اطراف میں بکھر گئیں۔

جو نے دوبارہ ول کی طرف توجہ دی۔ سر سے ٹانگوں تک وہ گن اوپر نیچے، دائیں بائیں کر کے ایمی کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی کھیل کھیل رہا ہے۔ آہ راحتِ جاں پشت پر تھی اور آفتِ جاں سامنے... ول نے کن انکھیوں سے پتھر کو تاڑا...

وھپ، وھپ، وھپ... دور سے ایک اجنبی آواز ابھرنا شروع ہوئی۔ ول نے لمحہ بھر میں پہچان لیا کہ یہ روٹر بلیڈ کی آواز تھی۔ بعدازاں جو نے بھی ہیلی کاپٹر کی قریب ہوتی ہوئی آواز شناخت کر لی۔ اس کا ردِعمل تبدیل ہونا چاہیے تھا۔ لیکن وہ دو قدم اور آگے آگیا۔

''کوسٹاریکا کے رینچ میں کیا رکھا ہے، ڈاکٹر اصل مزہ تو یہاں ہے، اس جگہ...''

''ڈیڈی، دیکھو۔'' ایمی کی آواز آئی۔

جو نے نشانہ باندھا... ول نے ایمی کو نیچے گرا کر پوری طرح چھپا لیا۔ ایمی نیچے دبی ہوئی تھی۔ موت کا سامنا کرنے کے لیے ول نے گردن موڑی۔ ایک تعجب خیز منظر سامنے تھا۔ ول پوری طرح گھوم گیا۔

درخت کی شاخ جیسا موٹا بازو جو کی گردن کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ باسل نے گردن دبوچ کر جو کو اوپر اٹھا لیا تھا۔ جو کی ٹانگیں زمین چھونے سے قاصر تھیں۔

''تم ایمی کو چھو نہیں سکتے... تم ایمی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے... وہ میری بیلا ہے... بیلا ہے...''

وھپ... وھپ... وھپ...

جو بری طرح تڑپا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور دہشت تھی۔ اس کا نرخرا دبتا جا رہا تھا۔ آخری کوشش کے طور

پر اس نے ہاتھ گھما کر فائر کیا، لیکن گولی باسل کو چھو کر گزر گئی۔

وھپ... وھپ... وھپ...

گردن پر باسل کی گرفت فولادی تھی۔ اس نے جو کو مزید اوپر اٹھالیا۔ لگ رہا تھا جیسے جو کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا ہو۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی، لیکن حلق سے خرخراہٹ ہی برآمد ہوسکی۔ اس کے ہاتھ سے گن نکل کر نیچے گر گئی۔ آنکھیں حلقوں میں ابل پڑیں۔

''وہ میری بیلا ہے۔''

ابی سامنے آگئی۔ ''مار دو، بیسٹ .... اس کو مار دو...'' وہ چلا رہی تھی۔

جو کے چہرے پر موت کا سایہ گہرا ہوتا چلا گیا۔ ہاتھ پیر لٹک گئے... آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کی روشنی آنکھوں سے معدوم ہوتی چلی گئی۔ جو باسی مولی کی طرح باسل کی جان لیوا گرفت میں لٹک رہا تھا۔ باسل نے اسے نیچے لٹا دیا اور اس کے پاس بیٹھ کر سر سہلانے لگا۔ ''جو... جو؟'' وہ رو رہا تھا۔ ''تم نے بیلا کو مارنے کی کوشش کیوں کی؟''

''ہمیں، اس کی مدد کرنی چاہیے، ڈیڈی۔'' ابی نے کہا۔

''پہلے مما کو تلاش کرتے ہیں۔'' ول نے بیلٹ کھول کر ران پر باندھ لی، اور کھڑا ہو گیا۔ ابی، روتے ہوئے باسل کی طرف جانا چاہ رہی تھی۔ تاہم ول نے روک لیا۔ ''ہنی، ہمیں تمہاری ماما کو تلاش کرنا ہے۔''

''میں یہاں ہوں۔''

ول نے چونک کر سر اٹھایا۔ کیرین روڈ کے کنارے پر شیرل کی گن تھامے کھڑی تھی۔ شیرل گھاس پر رینگتے ہوئے ڈالرز کی گڈیاں بریف کیس میں جمع کر رہی تھی۔ کیرین نے شیرل کا نشانہ باندھا ہوا تھا۔

''ماما!'' ابی ماں کی طرف بھاگی۔ ول نے بروقت ابی کو پکڑ لیا۔ ول نے بہ آسانی جانچ لیا کہ کیرین حواس میں نہیں ہے۔ وہ نارمل حالت میں ہوتی تو بیٹی کو دیکھتے ہی اس کی جانب لپکتی جبکہ وہ ایک ہی جگہ کھڑی تھی۔

''گن مجھے دے دو۔'' وہ آہستہ آہستہ کیرین کی طرف بڑھا۔ کیرین نے جیسے سنا ہی نہیں۔ اس کے ہاتھ میں موجود گن کا رخ چند فٹ دور زخمی شیرل کے سر کی جانب تھا۔ ہیلی کاپٹر تقریباً سر پر پہنچ چکا تھا۔

ول نے شیرل کے شانے پر خون دیکھا۔ اس کی حرکات بتا رہی تھیں کہ جو اسے کوئی مہلک زخم لگانے میں ناکام رہا تھا۔

''کیرین! پلیز گن مجھے دے دو۔'' وہ پھر بولا۔

''یہ بھی ان میں سے ایک تھی۔'' کیرین دفعتاً رو پڑی۔

''سب ختم ہو گیا۔ جو مر چکا ہے۔ شیرل نے ہماری بہت مدد کی تھی۔''

اچانک ول کا جسم سنسنا اٹھا۔ اس کی نگاہ کیرین کے پیٹ پر پڑی تھی۔

''کیا ہوا تمہیں۔'' اس نے اشارہ کیا۔

''مزاحمت پر جو نے گولی ماری تھی۔''

''ہتھیار گرا دو۔'' کوئی چیخا۔ ''پولیس... ڈراپ اٹ ناؤ... ہتھیار پھینک کر نیچے لیٹ جاؤ۔''

ول نے مڑ کے دیکھا۔ وردی میں دو اسٹیٹ ٹروپر ریوالور تانے کھڑے تھے۔

''فائر مت کرنا۔'' ول چیخا۔ ''وہ شاک میں ہے۔''

''ڈراپ دی گن۔'' ایک وردی پوش پھر چلایا۔

کیرین، ٹروپرز کی طرف مڑی، لیکن گن نہیں چھوڑی۔ ول کو پتا تھا کہ ٹروپرز کسی بھی لمحے فائر کر دیں گے۔ وہ زخم کی پروا کیے بغیر کیرین کے سامنے آگیا۔

وھپ... وھپ... وھپ...

ایک اور ہیلی کاپٹر آرہا تھا۔ وہ قریب آیا تو ول نے ایف بی آئی کے چاپر کو پہچان لیا۔ ہیلی کاپٹر کے اترتے ہی دو آدمی کود کر باہر نکلے اور جھک کر بھاگتے ہوئے ٹروپرز کی طرف گئے۔ ان کے بیج ہاتھوں میں تھے۔ چند منٹ دونوں نے ٹروپرز سے گفتگو کی... پھر ول کی طرف آگئے۔

''تم یقیناً ڈاکٹر ول جیننگ ہو؟''

''یس۔''

''میں فرینک زک۔'' دونوں نے مصافحہ کیا۔

''مجھے خوشی ہوئی۔'' فرینک نے کہا۔ ''تم زندہ ہو۔''

''تمہاری مدد چاہیے، میری بیوی کے پیٹ میں گولی لگی ہے۔''

''کیا تم گن اس کے ہاتھ سے لے لوگے؟''

''سوئٹ ہارٹ، یہ لوگ ہماری مدد کے لیے آئے ہیں، ابی تم سے ملنے کے لیے تڑپ رہی ہے۔ گن کی ضرورت نہیں ہے۔ پلیز گن مجھے دے دو۔'' ول نے نرمی سے کہا اور ہاتھ آگے بڑھایا۔

''ماما!'' ابی چیخی۔ کیرین جیسے ایک دم ڈھے گئی...

وہ گھٹنوں کے بل بھی نہ ٹک سکی اور لیٹ گئی۔ گن اس نے چھوڑ دی تھی۔ ول نے بیٹھ کر اس کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔ گن فرینک نے اٹھالی۔

نبض دیکھنے کے بعد ول نے زخم کا جائزہ لیا۔ فوری طبی امداد ملتی تو کیرین کو بچایا جا سکتا تھا۔ ول نے فرینک زک کو ایمرجنسی سے آگاہ کیا۔ کیرین کی نبض کمزور تھی۔

''پندرہ سے بیس منٹ میں ایمبولینس یہاں پہنچ رہی ہے۔'' فرینک نے بتایا۔

''تو... تو... اپنے چاپر میں یونیورسٹی اسپتال پہنچانے میں تمہیں دس منٹ لگیں گے۔'' ول نے زور دے کر کہا۔ ''ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔''

''ممی کو کیا ہوا؟'' ابی چلائی۔

''کسی بھی طرح کیرین کو دس منٹ میں اسپتال پہنچا دو۔'' ول کے لہجے میں اضطراب کروٹیں لے رہا تھا۔

''ممی ٹھیک ہو جائیں گی۔'' ول نے کہا۔ تاہم وہ دیکھ رہا تھا کہ زیادہ خون بہنے کی وجہ سے زخم ہلاکت خیز صورت اختیار کر گیا ہے۔

''پیرامیڈیک، ایمبولینس کے ساتھ جلد پہنچ جائیں گے میں ان کو کال کرتا ہوں۔'' فرینک نے کہا۔

''اوہ گاڈ، فرینک میں ڈاکٹر ہوں... دس منٹ میں کیرین کو اسپتال میں ہونا چاہیے آپریٹنگ ٹیبل پر...''

''لیکن یہ ہیلی کاپٹر ''ائر ایمبولینس'' نہیں ہے۔ اس میں صرف نشستیں ہیں۔'' فرینک نے وضاحت کی۔

''فرینک کوئی فرق نہیں پڑتا... کچھ کرو... یہی چاپر استعمال کرنا پڑے گا... چاہے ایک آدھ نشست اکھاڑنی ہی پڑے... وقت ضائع مت کرو... جلدی کرو...'' ول نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

فرینک سر ہلا کر پائلٹ کی جانب دوڑا۔

''ابی کہاں ہے؟'' کیرین نے نقاہت زدہ آواز میں کہا۔

''آپ کے پاس۔'' ابی گھٹنوں کے بل ماں کے پاس بیٹھ گئی۔ ول نے دوبارہ کیرین کی نبض چیک کی اور گھبرا گیا۔

''ڈیڈی سب ٹھیک کرلیں گے مما۔'' ابی نے تسلی دی۔

کیرین نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''میں جانتی ہوں ابی۔''

''بہت تکلیف ہو رہی ہے؟'' ابی نے معصومیت سے پوچھا۔

''تم میرا ہاتھ پکڑے رہو تو درد نہیں ہوگا۔''

''چلو۔'' فرینک کی بلند آواز سنائی دی...

''یہ رقم کس کی ہے؟'' ایک ٹروپر نے سوال کیا۔

''میری ہے۔'' شیرل چیخ اٹھی اور ول کی جانب اشارہ کیا۔ ''پوچھ لو اس سے۔''

''کتنی ہے؟''

جواب سن کر ٹروپر کے ہونٹ سکڑ گئے۔ دوسرے نے دھیمی سی لمبی سیٹی بجائی...

''باسٹرڈ، تم نے جھوٹ بولا تھا۔'' شیرل، ول پر چیخی۔

''میں بھولا نہیں ہوں، میں کورٹ میں آؤں گا اور گواہی دوں گا۔'' ول نے کہا اور ہیلی کاپٹر میں سوار ہو گیا۔ ابی اس کے ہمراہ تھی۔

''باسل کا کیا ہوگا؟'' فرینک نے سوال کیا۔ باسل ابھی تک جو کا سر ہاتھوں میں لیے بیٹھا تھا۔

''وہ کنٹری جیل کے لیے موزوں نہیں ہے۔ اسے نفسیاتی علاج کی ضرورت ہے۔ اگر تم اسے یونیورسٹی اسپتال پہنچا دو تو میں مدد کر سکتا ہوں۔'' ول نے کہا اور کیرین کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کیرین کو ایک موٹے دری نما کپڑے پر...... لٹایا گیا تھا۔ ول باتوں کے ذریعے اس کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ ول کی کوشش تھی کہ وہ بے ہوش نہ ہو۔

انہوں نے ہیلی کاپٹر کے کمیونیکیشن سسٹم کے ذریعے اسپتال میں ایمرجنسی روم اور (آپریشن روم) تیار کر لیا تھا۔ علاوہ ازیں کیرین کی حالت بھی بتا دی تھی۔ ول نے بلڈ گروپ بھی بتا دیا تھا۔

کیرین نے کچھ کہا، لیکن روٹر کے شور میں ول کو سنائی نہیں دیا۔ اس نے اپنا کان کیرین کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

''فیملی۔'' کیرین نے سرگوشی کی۔ ''اگین۔''

''وی آر فیملی اگین۔'' ابی زور سے بولی۔

''یس، اگیری۔'' ول نے کہا۔

تینوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر دائرہ بنا لیا۔ کیرین پھر ہولے سے مسکرائی۔ مسکراہٹ میں یقین کی آمیزش تھی۔

یہ دن طویل تھا... کتنا طویل تھا یہ دن ... بقا بھی ایک سراب اور فنا بھی ایک سراب۔ یہ دن طویل تھا، کتنا طویل تھا یہ دن...

لالچ و ہوس کے کھیل میں زندگی داؤ پر لگا دینے والے مجرم کا قصہ۔۔

وراثت کیسی بھی ہو... وارث کے لیے اپنے بزرگوں کا یادگار تحفہ ہوتی ہے... ہر کوئی اس سے دستبرداری کا سودا نہیں کرتا... اس کی زندگی میں بھی وہ نہایت اہمیت کی حامل تھی... مگر کچھ گرسنہ نگاہیں مسلسل اس کے تعاقب میں تھیں... شوق اور فرض کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اپنی ذمّے داری نبھانے والے ایماندار دوستوں کا پُرفریب کردار...

لالچ کا انجام

تنویر ریاض

اس خوب صورت عورت نے کریم کلر کا لباس پہن رکھا تھا اور وہ سرخ روشنی کے دائرے میں رقص کر رہی تھی۔ اسٹیج کے بقیہ حصے پر سرخ رنگ کا ویلوٹ بچھا ہوا تھا اور اس کے اطراف میں ہلکی روشنیاں لگائی گئی تھیں۔

”کاش میں اس کی آواز سن سکتی۔“ چارلین کے اسمارٹ فون پر ویڈیو ختم ہونے کے بعد میں نے کہا۔

وہ گاڑی چلاتے ہوئے بولی۔”ہاں، مجھے معلوم ہے کہ اس کے دو ریکارڈ منظرِ عام پر آئے تھے لیکن مجھے ان

میں سے کوئی بھی نہیں ملا۔"
"تمہیں یہ ویڈیو کہاں سے ملی؟" میں نے پوچھا۔
"انکل ایلن کے پاس ایک پرانی آٹھ ملی میٹر کی مووی تھی۔" اس نے مسکراتے ہوئے پیچھے بیٹھے ہوئے انکل کی طرف اشارہ کیا۔" میں نے اسے ڈسک پر منتقل کرلیا۔"
انکل ایلن اس کا موسیقی کا استاد تھا اور ماضی میں لوٹی کروم ویل کے ساتھ بجایا کرتا تھا۔ یہ اسی عورت کی ویڈیو تھی جو چارلین کی دادی بھی تھی۔
"کیا اس ویڈیو کا تعلق لاروگ سے ہے؟" میں نے پوچھا۔
انکل نے مسکراتے ہوئے تصحیح کی۔" لاروگ جولی۔ اس زمانے میں وہاں ثقافتی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ سناترا، ڈینو اور سامی ڈیوس جیسے بڑے فنکار وہاں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے جبکہ لوٹی ہماری اسٹار تھی۔ وہ اس علاقے میں واحد جگہ تھی جہاں ہمارے لوگ اپنا فن دکھا سکتے تھے۔ ان دنوں سیاہ فام افراد کو بڑے پیمانے پر شو کرنے کی اجازت نہیں تھی۔"
"یقین نہیں آرہا کہ ساٹھ کی دہائی میں یہ سب کچھ ہورہا تھا۔" میں نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"بہت جلد یہ یادگار عمارت مسمار ہونے والی ہے۔" ایلن نے کہا۔" نیلسن کینی کا بیٹا اس جگہ پر ایک بڑی اور نئی عمارت تعمیر کرنے والا ہے۔"
"تمہارا مطلب ہے کہ ماضی میں لاروگ کو کبھی نہیں چھیڑا گیا۔" میں نے پوچھا۔
ایلن ہنستے ہوئے بولا۔" یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ ولیم وارنر اب بھی اس جگہ کا مالک ہے۔ حال ہی میں اس کا انتقال ہوا ہے لیکن اس نے ہمیشہ اس عمارت کو فروخت کرنے سے انکار کیا۔"
"میں وہاں جاؤں گی تاکہ مسمار ہونے سے پہلے اسے دیکھ سکوں۔" میں نے کہا۔" وہ عمارت کہاں ہے؟"
"مغرب کی جانب۔" ایلن نے پتا سمجھاتے ہوئے کہا۔ اس وقت ہماری گاڑی مارکیو گریو یارڈ پہنچ چکی تھی۔ اس جگہ کی تجویز میں نے ہی دی تھی کیونکہ وہاں تمام خیمے پرانے دور کی عکاسی کرتے تھے۔ چارلین نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ شادی کی تقریب میں آنے والے سب لوگ داخلی دروازے پر انتظار کررہے تھے۔ اس نے انہیں دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور تیزی سے ان کی جانب بڑھی جبکہ میں اور ایلن آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے صرف چارلین کے گھر والے ہی وہاں آئے ہوئے تھے۔ میں حیران تھی کہ ابھی تک دولھا والوں کی طرف سے کوئی نہیں آیا۔ تاہم میں خاموش رہی۔ چارلین نے شادی کی شوٹنگ کی نگرانی کے لیے میری خدمات حاصل کی تھیں لیکن وہ میری دوست بھی تھی۔ اس نے مجھے گریگ بوٹیر سے بھی ملوایا تھا جب تین ہفتے قبل ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی اور مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب چارلین نے بتایا کہ گریگ نے اسے ایفل ٹاور پر پروپوز کیا ہے۔ وہ ایک ہینڈسم شخص تھا اور ایلیٹ پارکر کی قانونی فرم میں جونیئر معاون کے طور پر کام کررہا تھا لیکن مجھے اس پر حیرانی تھی کہ وہ کچھ تیزی دکھا رہے تھے لیکن یہ میرا نہیں بلکہ چارلین کا مسئلہ تھا۔
ایلن بھی شاید اسی لیے حیران تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔" مجھے امید ہے کہ یہ لڑکی وہ غلطی نہیں کرے گی جو لوٹی نے ایک سفید فام شخص سے محبت کرکے کی تھی۔"
"تم اس کی دادی کی بات کررہے ہو؟" میں نے پوچھا۔
"وہ گلوکارہ تھی۔" ایلن نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔" بہتر ہے کہ میں اپنی زبان بند رکھوں۔ ماضی کے بارے میں بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔"
چارلین کی نظریں کسی کو تلاش کررہی تھیں اور وہ کسی سے فون پر بات کررہی تھی۔" تم کہاں ہو؟" اس نے کہا۔" ہم سب یہاں ریہرسل کے لیے جمع ہیں۔ تم فوراً مجھے کال بیک کرو۔"
جب اس نے فون بند کیا تو وہ کچھ غصے میں لگ رہی تھی۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ہمیں اندر جا کر آج رات کی ریہرسل کے بارے میں بات کرنا چاہیے کیونکہ تقریب میں صرف چند روز باقی تھے۔
جب سب لوگ اندر جارہے تھے تو اس کا سیل فون بج اٹھا۔ میں نے سننے کی کوشش نہیں کی لیکن بتا سکتی تھی کہ وہ گریگ کا فون تھا۔ چارلین نے میرے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا اور مجھے اندر جانے کے لیے کہا۔ ایونٹ کوآرڈی نیٹر مہمانوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ میں گیٹ کے پاس کھڑی ہوگئی اور سلاخوں کے پار جھانکنے لگی۔ میں نے چارلین کو گریگ اور ایک لمبے بالوں والے سفید فام کے ساتھ دیکھا جس نے بالوں کی پونی ٹیل بنا رکھی تھی۔ وہ ایک گولڈن کلر کی لیکسس کار کے پاس کھڑے تھے۔ چارلین خوش نظر نہیں آرہی تھی۔ پونی ٹیل والے نے اپنا ہاتھ اٹھا کر کچھ کہا جو میں نہیں سن سکی۔ اس کے بعد وہ اپنی لیکسس کار میں بیٹھ کر چلا گیا

جبکہ گریگ اور چارلین کے درمیان اس وقت بھی بحث جاری رہی جب وہ داخلی دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جب وہ قریب آئے تو چارلین نے دوبارہ ہم دونوں کا تعارف کروایا اور بولی۔ ''ہنی، تمہیں میری دوست اسٹاسی ڈیٹیے یاد ہے۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔'تم سے مل کر خوشی ہوئی۔''

چارلین نے دوسرے لوگوں سے بھی گریگ کا تعارف کروایا۔ میں نے اسے بتایا کہ کون سے بورڈ استعمال کیے جائیں گے اور یہ کہ وہ فوٹو گرافی کے دوران پس منظر میں کون سا بورڈ چاہتی ہے۔

''میں جاننا چاہتی ہوں کہ ان کے پاس لاروگ جولی کا علامتی بورڈ ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے سرخ روشنیوں سے لکھے ہوئے الفاظ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور مجھے لگا کہ وہ رو دے گی۔ چارلین کے والدین وفات پا چکے تھے اور اس کے پاس یہی یادیں رہ گئی تھیں۔

''ہنی، میں چاہتی ہوں کہ تم بھی اسے دیکھو۔'' چارلین نے کہا۔

گریگ نے برا سا منہ بنایا اور بولا۔''میں کیوں یہ گونگی نشانیاں دیکھوں۔''

مجھے بہت برا لگا۔ دل چاہا کہ اس کے منہ پر تھپڑ مار دوں۔ اس کے بعد ریہرسل شروع ہوگئی۔ گریگ نے زیادہ وقت ہم سے دور رہ کر گزارا۔ اس دوران میں وہ سگریٹ پیتا اور سیل فون پر باتیں کرتا رہا۔ جب ہم نے ابتدائی ریہرسل ختم کی تو چارلین نے اچانک کہا کہ ہمارا کام ختم ہو گیا اور سب لوگوں کو ڈنر کے لیے بگی کے اسٹیک ہاؤس پر پہنچنے کے لیے کہا۔ جب لوگ اپنی گاڑیوں کی طرف جانے لگے تو اس نے میرا بازو پکڑ کر کہا۔

''کیا تم کسی کی گاڑی میں بیٹھ کر ڈنر کا انتظام کرنے جا سکتی ہو؟'' اس کے چہرے پر سختی چھائی ہوئی تھی۔

''یقیناً۔'' میں نے کہا اور اس کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔''سب ٹھیک ہے نا؟''

اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اسے گھر چھوڑنے جانا ہے۔ اس نے بہت زیادہ ڈرنک کی ہے۔''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''پریشان مت ہو۔ میں تم سے بعد میں ملوں گی۔''

میں نے ریستوران والوں سے معذرت کی کہ گریگ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور چارلین بہت جلد آجائے گی لیکن ایک گھنٹے بعد اس کا فون آیا۔ ''کیا تم مجھ سے باہر آکر مل سکتی ہو؟'' اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی جیسے وہ رو رہی ہو۔

میں نے لیڈیز روم میں جانے کا بہانہ بنایا اور بیرونی دروازے سے باہر آگئی۔ اس کی ٹویوٹا کیمری پارکنگ لاٹ میں کھڑی تھی۔ جب میں قریب پہنچی تو وہ گاڑی سے باہر نکلی اور اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے میری طرف بڑھی جب اس نے مجھے دیکھا تو اس کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ اس کا بایاں گال سرخ ہو رہا تھا۔ اس پر سوجن آگئی تھی اور اس کے سفید بلاؤز پر سرخ دھبے پڑے ہوئے تھے۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''گریگ۔'' اس نے کہا اور گالوں پر آنسو بہنے لگے۔''اس نے مجھے مارا ہے۔''

میں نے اسے گلے لگایا اور اسے لے کر داخلی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ وہ بولی۔

''اسٹیسی، میں نہیں چاہتی کہ لوگ مجھے اس حالت میں دیکھیں۔''

''تم اندر چل کر اپنا حلیہ درست کرو۔ باقی باتیں ہم بعد میں کریں گے۔''

ہم لیڈیز روم میں گئے اور میں نے تولیا پانی میں بھگو کر اس کے چہرے سے مسکارا صاف کیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ مسلسل سسکیاں لے رہی تھی۔ اس نے مجھے پورا واقعہ سنایا۔ اس کے اپارٹمنٹ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ہی ان کے درمیان تلخ کلامی ہوگئی۔ وہاں پہنچ کر گریگ نے اصرار کیا کہ وہ اس کے ساتھ اوپر چلے۔ وہ کچھ کاغذات پر اس سے دستخط کروانا چاہتا تھا۔ وہ کچھ قانونی کاغذات تھے۔ جب اس نے انہیں پڑھنا چاہا تو وہ پھٹ پڑا، اور چلاتے ہوئے بولا کہ ان پر فوراً دستخط کردے۔

''اس نے میرے لیے نازیبا الفاظ استعمال کیے۔'' چارلین نے شکستہ آواز میں کہا۔''میں نے وہ کاغذات پھاڑ دیے تو اس نے مجھے تھپڑ مارا۔ میں نے بھی اسے جواب میں تھپڑ مارا۔ پھر اس نے مجھے گھونسے مارے اور نیچے گرا دیا۔''

میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں جو کچھ سن رہی تھی، اس کے بارے میں تصور کرنا بھی محال تھا۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں نے اس کے سر پر گل دان دے مارا۔ اس نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی لیکن میں دروازے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئی اور کار کی طرف بھاگی۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کار دوڑاتی رہی پھر یہاں چلی آئی۔''

میں نے اس سے کہا کہ تھوڑی سی برف لے کر آئی ہوں لیکن اس نے میرا بازو پکڑ لیا اور انکار میں سر ہلانے لگی۔

''دیکھو، تمہیں ان چوٹوں پر کچھ لگانے کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے بعد ہم پولیس کو فون کریں گے۔''

''پولیس۔'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''ہاں، کسی مرد کو اس طرح تم پر تشدد کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔''

اس نے نظریں جھکا لیں اور بولی۔ ''یہاں سے چلو۔ اس وقت میں کسی کا سامنا نہیں کر سکتی۔''

ہم باہر آئے۔ دیکھا تو دو پولیس والے اس کی کار کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔

''یہ تمہاری کار ہے؟'' ان میں سے ایک نے پوچھا۔ چارلین نے اثبات میں سر ہلایا تو پولیس والے نے ریڈیو پر کوئی بات کی اور جیب سے ہتھکڑی نکال لی۔ جیسے ہی اس نے چارلین کی کلائی پکڑی تو میں نے کہا۔

''یہ کیا کر رہے ہو۔ یہ تو خود مصیبت زدہ ہے۔''

''یہ زیرِ حراست ہے۔'' پولیس والے نے اس کے بازو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''کس جرم میں؟'' میں نے پوچھا لیکن اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور چارلین کو اپنی اسکواڈ کار کی طرف لے جانے لگا۔ جبکہ دوسرے پولیس والے نے اس کے پرس کی تلاشی لے کر کار کی چابیاں نکال لیں اور ریموٹ کا بٹن دبا دیا۔

''کیا تمہارے پاس گرفتاری کا وارنٹ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمیں یقین ہے کہ ہم نے صحیح گاڑی ضبط کر لی ہے۔''

''ضبط کر لی۔ مگر کیوں؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے چلّاتے ہوئے کہا۔

پولیس والے نے مجھے نظرانداز کر دیا اور دوبارہ ریڈیو پر بات کرنے لگا۔ میں دوڑتی ہوئی اسکواڈ کار تک گئی اور چارلین سے کہا۔ ''وکیل کے آنے تک تم اپنی زبان بند رکھنا۔''

دوسرے پولیس والے نے مجھے وہاں سے ہٹ جانے کے لیے کہا تو میں بولی۔ ''کم از کم اتنا تو بتا دو کہ اسے کس جرم میں گرفتار کیا جا رہا ہے؟''

اس نے اپنی گول گول آنکھیں گھمائیں اور بولا۔ ''قتل، اس کا بوائے فرینڈ مر چکا ہے۔''

''قتل۔'' میں نے یقین نہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے تو کہا تھا کہ اس کے سر پر گل دان مارا تھا لیکن ....''

اسکواڈ کار چارلین کو لے کر چلی گئی اور میں وہاں کھڑی دیکھتی رہی کہ ایک ٹرک اس کی کار کو کھینچتے ہوئے لے جا رہا ہے۔

''کیا تم مجھے اس کی کار لے جانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔'' میں نے دوسرے پولیس والے سے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں اطلاع ملی ہے کہ اس نے اپنی کار میں گن رکھی ہوئی ہے۔''

''گن! اس کے پاس تو کوئی گن نہیں ہے۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''ہاں، میرا خیال ہے کہ اس نے اسے گولی بھی نہیں ماری۔''

مجھے رونا آ گیا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور حیران رہ گئی۔ وہی گولڈن کلر کی لیکسس کار پارکنگ لاٹ سے باہر آ رہی تھی۔ میں اندر گئی اور چارلین کی آنٹی وکزنز کو بتایا کہ ایک ذاتی مسئلے کی وجہ سے وہ ڈنر میں شرکت نہیں کر سکے گی پھر میں نے اپنا فون نکالا اور ان لوگوں کے نمبر تلاش کرنے لگی جن سے کچھ مدد مل سکتی تھی بالآخر مجھے ایک ایسا نمبر مل ہی گیا۔ سراغ رساں مائرز نے میری بات سن کر کہا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ تمہارا واسطہ ایک اور قتل سے پڑ گیا ہے۔''

میری ملاقات مائرز سے کچھ عرصے قبل ہوئی تھی جب میرے ایک کلائنٹ کا قتل ہوا اور مجھ پر شبہ کیا جا رہا تھا۔ وہ اتنا برا نہیں تھا لیکن اسے اچھا بھی نہیں کہا جا سکتا لیکن ہماری دوستی نہیں تھی تاہم ایک قربت ضرور ہو گئی تھی۔

''اس کی بہترین مدد یہ ہو گی کہ اس کے لیے ایک اچھا سا وکیل تلاش کرو۔'' مائرز نے مشورہ دیا۔

''تمہارے پاس کہنے کے لیے یہی کچھ ہے؟'' میں نے طنزاً کہا۔

''اس لیے کہ یہ ایک سیدھا سادہ کیس ہے۔''

"میں توقع کر رہی تھی کہ شاید تم کچھ کر سکو۔ بہر حال میں اس سے پہلے ایک قتل کے کیس کو حل کرنے میں تمہاری مدد کر چکی ہوں۔"

"ہاں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں بعد میں فون کروں گا۔"

"شکریہ مائرز۔" میں نے کہا اور تقریب میں موجود لوگوں سے معذرت کر کے گھر آگئی۔ جب کافی دیر تک مائرز کا فون نہیں آیا تو میں نے خود ہی اس سے رابطہ کر کے پوچھا۔ "تم نے کچھ پتا لگایا۔"

وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ "ہاں، اور تم اسے پسند نہیں کرو گی۔"

"تم بتاؤ تو سہی۔"

"اس کے ایک پڑوسی سے میری بات ہوئی ہے جس نے ان دونوں کو بحث کرتے ہوئے سنا اور اس کے بلاؤز پر خون کے دھبے دیکھے۔"

"وہ گل دان سے لگے تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب اس نے چارلین کو دھکا دیا تو اس نے جواب میں اس کے سر پر گل دان دے مارا، کیا یہ عمل ذاتی دفاع کے زمرے میں نہیں آتا۔"

"اس کے منگیتر کو گولی لگی ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔ پولیس والے نے مجھے یہی بتایا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسی نے گولی چلائی ہوگی۔"

"اس کی کار سے گن برآمد ہوئی ہے۔"

"اسے پھنسایا گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"دیکھو اسٹیسی، اس کے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو تشدد زدہ عورت ثابت کرے جو اپنا دفاع کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اس کا محبوب ایک ناکام و محروم شخص تھا جسے ایلیٹ پارکر نے بھی معطل کر دیا تھا۔ اگر چارلین اعتراف کرے تو شاید وہ اس سے معاملہ طے کر لیں۔"

"کیسا اعتراف جبکہ اس نے یہ قتل نہیں کیا۔"

"یقینی طور پر یہی لگتا ہے کہ اس نے ہی یہ قتل کیا ہے۔"

"میں نے پارکنگ لاٹ کے گرد ایک گولڈن کلر کی لیکسس دیکھی تھی۔ ممکن ہے کہ کسی نے اس کی کار میں گن رکھ دی ہو۔"

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ "جب پولیس نے وہ برآمد کی تو کار کے دروازے مقفل تھے اور چابیاں چارلین کے پاس تھیں۔ ایسی کوئی علامت نظر نہیں آئی جس سے لگتا ہو کہ کسی اور طریقے سے دروازہ کھولا گیا ہو۔ بہر حال میں اس پر غور کروں گا۔"

مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کچھ نہیں کرے گا۔ اب مجھے اپنے طور پر ہی اس معاملے کو دیکھنا ہوگا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا چارلین سے ملاقات ہو سکتی ہے لیکن اس نے کہا کہ اس کی اجازت نہیں ہے۔ ابھی اس پر فردِ جرم عائد نہیں کی گئی ہے اور وہ اسے بہتر گھنٹے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔

"کم از کم میری اس سے فون پر بات کروا دو۔"

"میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"شکریہ مائرز۔ میں تمہاری احسان مند ہوں گی۔"

ایک گھنٹے بعد اس نے مجھے دوبارہ فون کیا لیکن اس کے انداز سے معلوم ہو گیا کہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔

"اچھی خبر سننا چاہتی ہو یا بری؟"

"کیا اس کی کوئی اہمیت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پہلی بات تو یہ کہ تمہاری گرل فرینڈ کے دوست کو بہت قریب سے گولی ماری گئی ہے۔ ایک پڑوسی نے انہیں لڑتے ہوئے سنا پھر گولی چلنے کی آواز آئی۔ اس نے فوراً ہی نائن الیون پر فون کیا۔ پولیس پہنچی تو وہ مر چکا تھا۔ بعد میں چارلین کو آلۂ قتل سمیت گرفتار کر لیا گیا جو اس کی کار سے برآمد ہوا تھا۔ اس کے بلاؤز پر بھی خون کے دھبے لگے ہوئے تھے جو اسی ۔۔۔"

مائرز چند سیکنڈ خاموش رہا پھر بولا۔ "لیکن اسے ایک اچھا وکیل مل گیا ہے۔"

"کیا میں اس کا نام جان سکتی ہوں؟"

"بنجامن بے ہیوم۔ اس کا شمار چوٹی کے وکیلوں میں ہوتا ہے۔"

"واقعی لیکن میں نے کبھی اس کا نام نہیں سنا۔"

مائرز قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "اسے ٹی وی پبلسٹی کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں حیران رہ گئی کہ چارلین کس طرح اتنا بڑا وکیل کر سکتی ہے۔ "کیا میں اس سے مل سکتی ہوں؟"

"نہیں لیکن میں نے اس کا انتظام کر دیا ہے جب وہ اسے کوٹھڑی سے باہر لائیں گے تو وہ تمہیں فون کر سکے گی لیکن تمہارے پاس صرف تین منٹ ہوں گے اور یہ گفتگو ٹیپ ہوگی۔"

میں سیدھی پولیس اسٹیشن پہنچی اور اپنا تعارف کروایا۔ شیشے کے پیچھے بیٹھی ایک عورت نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا اور

دس منٹ بعد میرے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''تمہاری آواز سن کر بہت اچھا لگا۔'' میں نے چارلین سے کہا۔

''تم جھوٹ نہیں بول رہی ہو لیکن یہ ایسا ڈراؤنا خواب ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ گریگ مر چکا ہے۔''

''جانتی ہوں، تمہارا وکیل کیا کہتا ہے؟''

وہ روتے ہوئے بولی۔'' کچھ نہیں۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ ابھی میں کچھ نہ بولوں جب تک وہ مجھ سے مل نہیں لیتا۔''

''اور پہلی پیشی کب ہوگی؟'' میں پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ پرسوں، اس وقت تک اسی کوٹھڑی میں بند رہوں گی۔''

اس نے مجھ سے پوچھا کہ ریستوران میں کیا ہوا تھا تو میں نے کہا۔'' اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ کہ جب تم گریگ کو اس کے گھر لے کر گئیں تو وہاں کیا ہوا تھا؟''

اس نے وہی کہانی دہرائی کہ گریگ نشے میں دھت تھا۔ جب وہ گھر پہنچے تو اس نے کچھ کاغذات نکالے اور کہا کہ ان پر دستخط کردوں۔

''وہ کیسے کاغذات تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''ان میں کچھ قانونی باتیں لکھی ہوئی تھیں جیسے میں کسی جگہ کے بارے میں اپنے حق سے دستبردار ہوجاؤں۔'' میں نے انہیں پڑھنے کی کوشش کی اور جب اس سے پوچھا کہ یہ کیا ہے تو وہ غصے میں آگیا۔ ہم ایک دوسرے پر چلاّنے لگے۔ میں نے وہ کاغذات پھاڑ کر اس کے منہ پر دے مارے۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر؟'' اس کی آواز گھٹنے لگی۔'' اس نے مجھے دھکا دیا۔ باقی تم جانتی ہی ہو؟''

''کوئی شخص تمہیں پھنسانا چاہتا ہے۔''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'' اس نے کہا۔

''کسی اور کے پاس بھی تمہاری کار کی چابی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، البتہ میرے پاس گھر پر ہنگامی ضرورت کے لیے دوسری چابی ہوتی ہے۔''

''کسی ایسے شخص کو جانتی ہو جس کے پاس گولڈن لیکسس کار ہو؟''

''ہاں، گریگ کا منہ بولا بھائی جری!''

''اس کا پورا نام کیا ہے؟''

کسی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ ملاقات کا وقت ختم ہونے میں دس سیکنڈ رہ گئے ہیں۔

''خدا حافظ اسٹیسی۔'' اس نے کہا۔'' کیا تم میری خاطر عدالت میں آؤ گی۔''

میں نے کہا ضرور آؤں گی تو، وہ بولی۔'' کیا تم میری آنٹی اور خاندان کے دوسرے لوگوں کو بتاؤ گی کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ان سے کہہ دینا کہ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔''

''کہہ دوں گی لیکن تم نے جری کا پورا نام نہیں بتایا۔''

اس نے رونا شروع کردیا اور اس کے ساتھ ہی ہمارا رابطہ منقطع ہوگیا۔ ایک پولیس والا بڑا سا پلاسٹک بیگ لے کر آیا جس میں چارلین کا پرس بھی تھا۔ اس نے بیگ کھول کر اس میں رکھے ہوئے سامان اور نقد رقم کی فہرست بنائی اور میں نے دستخط کر کے وہ چیزیں وصول کرلیں اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ اب مجھے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کیسے کاغذات تھے جن پر گریگ دستخط کروانا چاہ رہا تھا۔ یہ جری کون ہے اور وہ پارکنگ لاٹ میں کیا کر رہا تھا۔ اگر میں اس کی برادری کے بارے میں پتا کرلوں تو اس کا پورا نام بھی معلوم ہوسکتا ہے۔ میں نے چارلین کا پرس کھول کر چابیاں دیکھیں۔ ان میں اگنیشن کی نہیں تھی۔ اس کے اپارٹمنٹ کو ایک نظر دیکھنا بھی ضروری تھا لیکن پہلے میں نے مائرز سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''اب کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے چارلین سے بات کروانے اور اس کا سامان دلوانے میں میری مدد کی پھر پوچھا۔'' کیا جائے وقوعہ سے کچھ پھٹے ہوئے قانونی کاغذات بھی ملے ہیں۔''

اس نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا پھر بولا۔'' اب میں سمجھا۔ تم نے صرف میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے فون نہیں کیا بلکہ ایک بار پھر بلا اجازت تحقیقات کا منصوبہ بنا رہی ہو۔''

میں نے معصوم بنتے ہوئے کہا۔'' بالکل نہیں، البتہ مجھے تجسس ضرور ہے۔ کیا تم میری خاطر یہ معلوم کرسکتے ہو۔''

''یہ میرا کیس نہیں ہے۔ پہلے ہی غیر ضروری طور پر اس میں ٹانگ اڑا چکا ہوں۔''

''تھوڑی سی اور سہی۔ اس سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

اس نے قہقہہ لگا کر فون بند کردیا۔ میں نے اپنا ٹرک اسٹارٹ کیا اور چارلین کے گھر کی طرف چل دی۔ اس کا گھر مقفل تھا اور دروازے کے باہر زرد فیتہ لگا ہوا تھا۔ میں نے

تالے میں چابی گھمائی اور ٹیپ کے نیچے سے گزر گئی۔ اندر اندھیرا تھا لہٰذا میں نے لائٹ جلا دی اور کمروں کی تلاشی لینے لگی۔ نہیں جانتی تھی کہ مجھے کس چیز کی تلاش ہے البتہ میری خواہش تھی کہ کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے چارلین کی بے گناہی ثابت ہو سکے۔ اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی تو میں پریشان ہو گئی۔ کہیں اصلی قاتل تو میرا تعاقب نہیں کر رہا۔ دوسری بار دستک کے ساتھ ہی مجھے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ ''دروازہ کھولو۔ میں جانتا ہوں کہ تم اندر ہو۔ میں نے تمہارا ٹرک دیکھ لیا ہے۔''

یہ مائرز تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور بولی۔ ''اچھا ہوا، تم بھی آگئے۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ پولیس کے کام میں مداخلت کرنے پر تم کتنی بڑی مشکل میں پھنس سکتی ہو؟''

''یہ قتل چارلین نے نہیں بلکہ کسی اور نے کیا ہے۔ اسے پھنسایا جا رہا ہے۔ یقین کرو۔ میں بھی ایسی ہی صورتِ حال سے گزر چکی ہوں۔''

''بہتر ہے کہ تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔'' وہ بولا۔

میں نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا۔ ''کیا تمہیں ان پھٹے ہوئے کاغذات کے بارے میں کچھ پتا چلا؟''

وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''میں نے متعلقہ سراغ رساں کو فون کیا تھا لیکن انہیں جائے وقوعہ سے ایسے کاغذات نہیں ملے۔ وہ اس قتل کو گھریلو تشدد کا شاخسانہ سمجھ رہے ہیں۔''

میں جھلاتے ہوئے بولی۔ ''ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے کہ انہوں نے اپنا ذہن بنا لیا ہے۔ کوئی ایسا شخص بھی ہے جو چارلین کی حمایت میں بول سکے۔''

''اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کا وکیل آیا تھا اور اس نے چارلین سے کہا ہے کہ وہ عدالت میں پیش ہونے سے پہلے کسی سے کوئی بات نہ کرے۔ ثبوت کے بغیر ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔''

''کم از کم تم ان کاغذات کو تلاش کرنے میں میری مدد تو کر سکتے ہو؟'' میں نے کہا۔

اس نے مایوسی کے انداز میں کہا۔ ''وہاں اس طرح کے کوئی کاغذات نہیں تھے۔''

''ممکن ہے کہ کوڑے دان میں پھینک دیے گئے ہوں۔''

''تم کچرے کے ڈھیر میں غوطہ لگانا چاہتی ہو۔ میری گزارش ہے کہ تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔ میں صرف تمہاری ہمدردی میں یہاں آگیا تاکہ تمہیں کسی مشکل سے بچا سکوں۔''

''اس نے کہا تھا کہ کار کی چابیوں کا ایک سیٹ اور بھی ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کی کار میں گن کیسے رکھی ہوگی۔''

وہ غراتے ہوئے بولا۔ ''فوراً یہاں سے نکلو۔''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کروں۔ میں کار کی چابیاں یا پھٹے ہوئے کاغذات تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اگر یہ چیزیں پولیس کے پاس نہیں ہیں تو کوئی اور شخص انہیں لے گیا ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چیزیں کتنی اہم تھیں۔ گریگ چاہ رہا تھا کہ چارلین کسی چیز سے دستبرداری کے لیے دستخط کر دے۔ جب اس نے کاغذات کو پڑھے بغیر دستخط کرنے سے انکار کیا تو دونوں میں تلخ کلامی ہو گئی۔ چارلین نے کاغذات پھاڑ دیے اور وہاں سے چلی گئی۔ اس کے بعد کسی نے گریگ کو گولی مار دی اور اس کی کار سے گن برآمد ہوئی۔ ان واقعات کی کڑیاں ملاتے ہوئے مجھے ایک بات اور یاد آگئی۔ وہ گولڈن میکس کار جسے میں نے پارکنگ لاٹ سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا، ممکنہ طور پر گریگ کے بھائی جری کی ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے پاس بھی ایسی ہی گاڑی تھی۔ جس میں اس نے گریگ کو ریہرسل والے دن چھوڑا تھا۔ اب مجھے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھیں۔ میں نے اپنا آئی فون نکالا اور فیس بک چیک کرنے لگی۔ پہلے میں نے چارلین کا صفحہ دیکھا جس سے میں گریگ کے صفحے پر پہنچ گئی جس پر اس کی برادری کے افراد کی فہرست

آج بھی کھانے کا دعوت نامہ نہیں آیا......
ہم ہر شام تیار ہو کر انتظار کرتے ہیں

موجود تھی۔ میں نے اس میں جرمی، نام کے شخص کو تلاش کرنا شروع کیا جو گریگ کا ہم عمر ہو۔ اس نام کا ایک ہی شخص تھا جرمی ٹیٹم اور جب میں نے اس کی فیس بک پر تصویر دیکھی تو یہ وہی شخص تھا جس نے گریگ کو ڈراپ کیا تھا۔ وہ نیروبی کا رہنے والا تھا اور بحیثیت وکیل بنجامن جے ہیوم، جیسے مشہور قانونی فرم میں کام کرتا تھا۔

میں نے گہری سانس لی۔ کچھ اشارے ضرور مل رہے تھے لیکن ابھی تک کوئی واضح جواب نہیں مل رہا تھا۔ میرے فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے چارلین کا انکل ایلن بول رہا تھا۔ ''میں یہاں ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوں۔ سب لوگ جا چکے ہیں اور مجھے کسی سواری کی تلاش ہے۔''

میں وہاں سے صرف دس منٹ کے فاصلے پر تھی۔ اس نے بیٹھتے ہی پوچھا۔ ''چارلین کسی مشکل میں ہے؟''

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں باتھ روم جانے کے لیے کھڑکی کے پاس سے گزرا تو میں نے تمہیں، چارلین اور پولیس کو باہر کھڑے دیکھا۔''

میں نے اسے مختصراً پوری بات بتائی تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے وہ شخص بھی اچھا نہیں لگا۔ یہ معاملہ بھی بے چاری لوٹی سے ملتا جلتا ہے۔''

''اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے بہہ چکا ہے۔ اب اس کے بارے میں بات کرنا بیکار ہے۔''

''تمہیں بتانا ہوگا۔ میں جاننا چاہ رہی ہوں کہ کیا ہوا تھا۔ تاکہ میں چارلین کی مدد کرسکوں۔''

اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ کہانی اب بہت پرانی ہو چکی ہے اس زمانے میں بہت سی باتیں مختلف تھیں۔ گورے اور کالے بہت کم ملتے تھے اور وہ بھی کھلے عام نہیں۔'' اس نے لب بھینچ لیے جیسے سوچ رہا ہو کہ مجھے کیا بتائے پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''یاد ہے' میں نے تمہیں لاروگ جولی کے بارے میں بتایا تھا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ''لوٹی اس زمانے میں اسٹار تھی۔ وہ بھی ایلا فٹز گیرالڈ اور نینا سیمون کی طرح مشہور ہو سکتی تھی لیکن ......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔ گاڑی ایک سگنل پر رکی ہوئی تھی۔ سبز اشارہ ملا تو اس نے بھی بولنا شروع کر دیا۔ ''لیکن وہ لاروگ کے مالک ولیم وارنر سے محبت کرنے لگی اور پھر وہ حاملہ ہوگئی اور لوگوں سے چھپنے لگی پھر وہ اپنے والدین کے پاس نارتھ کیرولینا چلی گئی اس کے بعد.....''

''پھر کیا ہوا؟''

''ڈلیوری کے دوران اس کی موت واقع ہوگئی۔ اس کی بہن نے بچی کو پالا۔''

''اوہ، یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ ولیم وارنر نے اس بچی کی ذمے داری قبول نہیں کی؟''

''میں نہیں جانتا کہ لوٹی نے بچی کے باپ کے بارے میں کیا بتایا ہوگا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وارنر کو اس بچی کے بارے میں پتا تھا یا نہیں۔ وہ چھوٹی سی لڑکی ایک دن جوان ہوگئی اور شادی کے بعد اس نے بھی ایک بیٹی کو جنم دیا۔''

''اوہ میرے خدا!'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''وہی بچی، چارلین کی ماں تھی؟''

ایلن مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم واقعی ایک اچھی سراغ رساں ہو۔''

''تم ولیم وارنر کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''تم نے پہلے بتایا تھا کہ وہ بھی لاروگ جولی کو نہیں فروخت کرے گا۔''

''گو کہ اب وہاں کوئی سرگرمی نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود وارنر نے عمارت کو اسی حال میں رہنے دیا۔ میں نے سنا ہے کہ اس نے اپنی وصیت میں یہ جائداد لوٹی کے وارثوں کو دے دی تھی لیکن اس کے انتقال کے بعد گھر والوں نے اس کا سودا ٹیلسن کینی کے بیٹے سے کر دیا جو وہاں ہوٹل اور شاپنگ پلازہ بنانا چاہتا ہے۔''

مجھے اچانک ان کاغذات کا خیال آیا جن پر گریگ، چارلین سے دستخط کروانا چاہ رہا تھا۔ ''تم وارنر خاندان کے وکیل کا نام جانتے ہو؟''

''شاید بنجامن ہیوم ہے۔'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

اس کا گھر آ گیا تھا۔ وہ گاڑی سے اترا، اور کہنے لگا۔ ''مجھے بتاؤ کہ میں اس کے لیے کیا کرسکتا ہوں۔ میرے پاس بہت زیادہ پیسے نہیں ہیں لیکن اگر چارلین کو میری مدد کی ضرورت ہو تو.....''

میں نے کہا کہ اگر ضرورت ہوئی تو ضرور بتاؤں گی پھر میں نے اپنے ٹرک کا رخ لاروگ جولی کی طرف موڑ دیا۔

وہاں پہنچی تو ایک بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا۔ ''بہت جلد آرہا ہے۔ نیلسن کینی جونیئر کی طرف سے شاندار تحفہ'' اس کے ساتھ ہی مزید معلومات جاننے کے لیے فون نمبر بھی دیا ہوا تھا۔ مجھے اس اشتہار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن گیٹ پر لگے ہوئے ایک سرخ رنگ کے سائن بورڈ کو دیکھ کر میں چونک گئی۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔ ''کام روک دیا جائے'' گویا کوئی دوسرا فریق اس منصوبے کو مکمل نہیں ہونے دینا چاہتا۔ میں نے اس بارے میں سوچنا شروع کیا کہ وہ کون ہوسکتا ہے پھر میں نے ایلیٹ پارکر نامی قانونی فرم سے رابطہ کر کے اپنا نمبر انہیں دے دیا تاکہ وہ مجھے کال بیک کرسکیں۔ تقریباً پینتالیس منٹ بعد میرے فون کی گھنٹی بجی۔

''میں ایلیٹ پارکر لاء فرم سے بول رہا ہوں۔'' ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ ''تم نے کسی ایمرجنسی کے بارے میں فون کیا تھا؟''

''ہاں، میرا ایک دوست گرفتار ہوگیا ہے۔''

''کس الزام میں؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ ''میں تمہاری فرم کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی لیکن مجھے یقین ہے کہ تم کسی اچھے وکیل کا نام تجویز کرو گے۔ کیا یہ وہی فرم ہے جو ولیم وارنر کی جائداد کے معاملات دیکھتی ہے؟''

چند سیکنڈ بعد اس نے ہاں میں جواب دیا لیکن اس کی آواز سے بے یقینی جھلک رہی تھی۔ ''تمہیں کس نے اس فرم کا نام بتایا؟''

میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا گریگ بویئر تمہاری فرم کے لیے کام کرتا ہے؟''

اس نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟''

''فوکس براؤن۔ اوہ معاف کرنا، ایک اور کال آرہی ہے۔ میں تمہیں بعد میں فون کروں گی۔''

تمام چیزیں ایک معمے کی شکل میں سامنے آرہی تھیں۔ گریگ اسی قانونی فرم کے لیے کام کررہا تھا جو ولیم وارنر کی جائداد کے معاملات دیکھتی تھی۔ وہ چارلین سے ان قانونی کاغذات پر دستخط کروانا چاہ رہا تھا جن کے مطابق وہ اپنے حق سے دستبردار ہوجاتی۔ اس کا منہ بولا بھائی جری، اسی فرم میں نیلسن کینی جونیئر کے نام سے کام کررہا تھا۔ میں جان گئی تھی کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے سری کو فون کر کے بنجامن ہیوم لاء فرم کا ہنگامی فون نمبر مانگا اور جری ٹیتم سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

تقریباً تیس منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی لیکن جری کے بجائے کوئی اور شخص بول رہا تھا۔

''میرا نام بریڈ ہے اور مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہو گی۔''

''میں نے جری ٹیتم سے بات کرانے کے لیے کہا تھا۔''

''آج جری کی ڈیوٹی نہیں ہے لیکن مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوگی، ہم سب بنجامن ہیوم کے لیے کام کرتے ہیں۔''

''تب میں تمہیں مشورہ دوں گی کہ اپنے ذرائع استعمال کر کے جری سے رابطہ کرو اور اس سے کہو کہ وہ مجھے فون کرے۔ میں اپنی بات دہرانا پسند نہیں کرتی۔''

''تم نے کسی ہنگامی حالت کا ذکر کیا تھا پھر مجھے اپنا مسئلہ کیوں نہیں بتاتیں؟''

''مجھے کوئی مسئلہ نہیں بلکہ تمہارے ساتھی جری کو ہے۔'' میں نے اسے چند سیکنڈ سوچنے کے لیے دیے پھر کہا۔ ''اسے صرف اتنا بتا دینا کہ میرے پاس گریگ کا لیپ ٹاپ ہے اور اس میں کچھ ایسی دستاویزات ہیں جن سے اسے دلچسپی ہوسکتی ہے۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''لگتا ہے کہ میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکا۔''

''پریشان مت ہو۔ جری سمجھ جائے گا۔ اسے بتا دینا کہ اگر اس نے دس منٹ میں فون نہ کیا تو میں کسی اور سے رابطہ کرنے پر مجبور ہوجاؤں گی۔''

''دیکھوں گا کہ تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''مس براؤن!'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کردیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے پسینے آنے شروع ہوگئے۔ میں نے پانی میں پتھر پھینکا تھا۔ اب مجھے سوچنا تھا کہ اچانک حملے کی صورت میں کیا کرنا ہے۔ اگر جری، گریگ کی موت میں ملوث ہے تو ان دونوں نے رف کھیل کھیلا تھا۔ اب مجھے کسی سہارے کی ضرورت تھی، مائرز کو فون کرنا چاہا لیکن رک گئی، مجھے خاموش رہنا تھا جب تک کوئی ٹھوس ثبوت نہ مل جائے۔

پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں جری نے مجھے فون کیا اور بولا۔ ''کیا ہم پہلے مل چکے ہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ہمارا ایک مشترکہ

شناسا ضرور ہے۔ شاید مجھے اس کا نام بتانے کی ضرورت نہیں۔''

وہ چند منٹ خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''تم نے بتایا تھا کہ تمہارے پاس میری دلچسپی کی کوئی چیز ہے؟''

''ہاں، میں نے یہی کہا تھا۔ اس لیپ ٹاپ میں ایک دستاویز ہے جو واقعی دلچسپ ہے۔''

''وہ کیا ہوسکتی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں تمہیں صرف تین لفظ بتاؤں گی، لارو گ جولی۔''

''یہ تمہیں کہاں سے ملی؟''

''کیا یہ بتانا ضروری ہے؟'' میں نے تیز آواز میں کہا۔ ''اگر تم اس میں دلچسپی رکھتے ہو تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میں اسے پولیس کے حوالے کردوں گی۔''

''تمہیں اتنی تیزی نہیں دکھانی چاہیے۔'' وہ بولا۔

''میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے آج رات کو ملو اور میرا معاوضہ دے دو۔ ورنہ پھر پولیس کا انتظار کرو جو صبح تمہارے دروازے پر کھڑی ہوگی۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس کی مریل سی آواز سنائی دی۔ ''تمہیں کتنے پیسے چاہئیں؟''

''میرا خیال ہے کہ ایک لاکھ ڈالر ٹھیک رہیں گے۔''

''میں اتنے کم وقت میں اس رقم کا انتظام نہیں کر سکتا۔''

''اپنے باس کے پاس جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہ بندوبست کرسکتا ہے۔''

اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''تم کہاں ہو؟''

''میں تمہیں وقت اور مقام بتادوں گی۔ جب تم فون کر کے تصدیق کردو گے کہ رقم کا انتظام ہوگیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، ہو جائے گا۔ صرف اتنا بتادو کہ کہاں ملنا ہے؟''

میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا لیکن اس پر اپنی کوئی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہ رہی تھی چنانچہ بے اختیار کہہ دیا۔ ''مارکیو گریو یارڈ۔''

''وہ رات میں بند ہوتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''جانتی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم وہ رقم وہاں چھوڑ دینا اور میں تمہیں بتاؤں گی کہ لیپ ٹاپ کہاں ہے؟''

''تم مجھے بے وقوف سمجھتی ہو۔ یہ اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے کا معاملہ ہے ورنہ بات ختم سمجھو۔''

میں اس کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہی تھی لیکن میں نے محسوس کرلیا تھا کہ اس گفتگو کو ریکارڈ کرنے کی ضرورت ہے، اب مجھے اس سے اعتراف کروانا تھا کہ اس نے گریگ کو قتل کیا اور چارلین کی گاڑی میں گن رکھ دی۔

''میں تمہارا منصوبہ سمجھ گئی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''جب تم اس جگہ کے لیے روانہ ہوجاؤ تو مجھے فون کردینا۔''

میں نے رابطہ منقطع کیا اور پچھلی سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اب تک مجھے صرف یہ حاصل ہوا تھا کہ میں ایک ممکنہ قاتل سے ملاقات کا وقت لینے میں کامیاب ہوگئی تھی اور میرے پرس میں ایک ہتھیار کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں نے مائرز سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکی تب میں نے اسے بدحواسی کے عالم میں ایک پیغام بھیجا اور اسے پوری صورتِ حال بتانے کے بعد اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔ اگر میں وہاں پہلے پہنچنے میں کامیاب ہوجاتی تو میرے پاس موقع تھا کہ وہاں کوئی چیز نصب کرسکوں کیونکہ میرے پاس کوئی لیپ ٹاپ نہیں تھا لیکن اگر جری پیسوں کے ساتھ وہاں آجاتا تو اس طرح وہ بھی پولیس کی نظر میں چارلین کی طرح مشتبہ ہوسکتا تھا۔

جب میں گریو یارڈ پہنچی تو پوری عمارت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی لیکن احاطے میں تمام نیون سائن روشن تھے جبکہ بقیہ حصہ سنسان تھا۔ یہ عمارت ایک پارک اور خالی پلاٹ کے برابر میں تھی اور سڑک کے پار اپارٹمنٹ پر مشتمل دو عمارتیں خالی اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ میں نے ٹرک ایک جگہ کھڑا کیا اور اس میں سے ایک شاپنگ بیگ اور دو فیشن میگزین نکالے، انہیں بیگ میں رکھ کر ایک بنڈل بنایا اور اسے ربربینڈ سے باندھ دیا۔ اب وہ دور سے دیکھنے میں لیپ ٹاپ کے مانند ہی لگ رہا تھا۔

میں نے ٹرک کی ہیڈ لائٹس بجھادیں اور ایک بار پھر مائرز سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ میں نے فون بند کیا ہی تھا کہ جری کی کال آگئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں ایک بلاک کے فاصلے پر ہوں، تم کہاں ہو؟''

''بہت قریب۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے فون کال ریکارڈ کرنا شروع کردی تاکہ اس سے کچھ اگلوا سکوں لیکن مجھے بہت محتاط رہنے کی ضرورت تھی، میں نے کہا۔ ''تم اس راستے پر سیدھے چلے آؤ۔ تم پیسے دینا اور میں مطلوبہ چیز تمہارے حوالے کردوں گی۔ ویسے بائی دا وے تم کون سی گاڑی چلا رہے ہو؟''

اس نے پہلے تو کوئی جواب نہیں دیا پھر میرے دوبارہ ہیلو کہنے پر بولا۔ ''میں لیکسس میں ہوں۔''

"ٹھیک ہے۔ باتیں کرتے رہو۔ میں تمہاری گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھ لوں گی۔"

"تم اس معاملے میں کیسے شامل ہوگئیں؟" اس نے پوچھا۔ "اور یہ لیپ ٹاپ تم نے کیسے حاصل کیا؟"

"میں گریگ کو پہلے سے جانتی تھی۔ اس نے چارلین کی خاطر مجھے چھوڑ دیا۔ لیکن میرے پاس اب بھی اس کے گھر کی ڈپلیکیٹ چابیاں ہیں۔"

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اس لحاظ سے تو وہ واقعی خوش قسمت تھا۔"

"تم اُسے جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، اس کے لیے میں بڑے بھائی جیسا تھا۔"

اسی لمحے میں نے اس کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھیں۔ اب میرے پاس بالکل وقت نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔ "پھر تم نے اسے قتل کیوں کیا؟"

اس نے ایک اور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "کون کہتا ہے کہ میں نے اسے قتل کیا؟"

"رہنے دو۔ وہ تم ہی تھے۔ اس کے بعد چارلین کو پھنسانے کے لیے اس کی کار میں گن رکھ دی۔"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ یہ تمہارا کام ہے۔ میں نے تمہیں ریستوران کی پارکنگ لاٹ میں دیکھا تھا۔"

"کیا یہ حقیقت ہے؟" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ہاں، تم ان کے اپارٹمنٹ میں جھگڑے کے دوران یا اس کے بعد داخل ہوئے۔ تم نے سوچا کہ گریگ کو راستے سے ہٹانے اور اس کے قتل کا الزام چارلین پر ڈالنے کا ایک اچھا موقع ہے۔"

اس کی گاڑی سڑک کے درمیان رک گئی تھی۔ اس نے کہا۔ "ویسے تم نے ایک اچھا ٹرک حاصل کیا ہے۔"

مجھے لگا کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ اسے میرے ٹرک کے بارے میں کیسے علم ہوا۔ اب مجھے فوری طور پر کوئی قدم اٹھانا تھا۔ میں نے ٹرک کی ہیڈ لائٹس روشن کیں اور دیکھا کہ ایک بڑی سی پک اپ میری طرف آرہی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے ٹرک کو گیئر میں ڈالتی، اس کی پک اپ کا اگلا حصہ میرے ٹرک سے ٹکرایا اور ڈیش بورڈ میں لگی ہوئی تھیلی میرے چہرے پر آگئی۔ میں نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پایا اور گاڑی کو ریورس میں ڈال کر پیچھے دیکھنے لگی۔ تب میں نے دیکھا کہ ایک... ٹرک میری جانب بڑھ رہا ہے۔ میں نے اس سے بچنے کے لیے اسٹیئرنگ گھمایا لیکن وہ میرے دائیں جانب آکر ٹکرایا۔ میرا ٹرک ایک جھٹکے سے رک گیا۔ اب پک اپ نے ایک بار پھر سامنے والے حصے پر ٹکر ماری اور میں آگے کی طرف لڑھک گئی۔

میں نے دروازے کو دھکا دیا اور باہر آگئی۔ البتہ وہ مصنوعی پیکٹ وہیں چھوڑ دیا۔ اس امید پر کہ وہ اسے لیپ ٹاپ سمجھ کر میرا تعاقب نہیں کریں گے لیکن ایسی قسمت نہیں تھی۔ میں نے گریو یارڈ کے عقبی دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ جرمی مجھ سے پچاس فٹ کے فاصلے پر تھا جبکہ دوسرا شخص بھی میری جانب بڑھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں جاؤں۔

عمارت کے چاروں طرف باڑھ لگی ہوئی تھی لیکن اس میں ایک جگہ خلا نظر آیا جو میرے چھپنے کے لیے کافی تھا۔ میں نے اپنے دونوں بازو میوزیم کی دیوار پر رکھے اور اس پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں دوسری طرف چھلانگ لگانے ہی والی تھی کہ جرمی نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ پچیس فٹ کے فاصلے پر گن لیے کھڑا ہوا تھا۔ وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے چلانے لگا لیکن میں نیچے کی جانب جھکی اور نیون سائن کے درمیان دوڑنے لگی پھر ایک تاریک جگہ پر میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنا سیل فون نکالنا چاہا لیکن وہ کہیں گر گیا تھا۔ جرمی اور دوسرا آدمی باڑھ کے باہر ہی رک گئے اور جرمی نے کہا۔ "وہ اندر ہے۔"

"پھر ہم بھی باڑھ پھلانگ لیتے ہیں۔" دوسرے آدمی نے کہا۔

"اتنی تیزی مت دکھاؤ۔" جرمی نے کہا اور سیل فون پر کسی سے باتیں کرنے لگا۔ دوسری جانب سے کسی نے کہا۔ "نیلسن، تم پہنچ گئے؟"

"ہاں۔"

"لیپ ٹاپ کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔ اس نے جو چیز پھینکی وہ جعلی تھی۔"

"دفع کرو۔ وہ لڑکی بھاگنے نہ پائے۔"

"میں اور فریڈی اس کے پیچھے جا رہے ہیں۔" جرمی نے کہا۔

اس نے سیل فون جیب میں رکھا اور باڑھ پر چڑھنے لگا۔ میں گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی ایک بڑے سے بورڈ کی آڑ میں چھپ گئی۔

"تم اس جانب جاؤ۔" جرمی نے کہا۔ "اگر اسے دیکھ لو تو گولی مت چلانا جب تک ہم اس سے لیپ ٹاپ کے

بارے میں معلوم نہ کرلیں۔''
اچانک ہی مجھے اپنی جیب میں رکھے ہوئے ٹیسر کا خیال آیا۔ گویا میں بالکل نہتی نہیں تھی لیکن ٹیسر کا گن سے کوئی مقابلہ نہیں جبکہ وہ دو تھے۔ میں نے اپنے سامنے تین فٹ کے فاصلے پر ایک آواز سنی اور دیکھا کہ دوسرا آدمی دبے پاؤں آگے بڑھ رہا ہے۔ وہ جھلملاتی روشنیوں کے درمیان دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں گن پکڑی ہوئی تھی۔ خوش قسمتی سے ان دونوں کے پاس ٹارچ نہیں تھی۔ میں نے اپنا بازو آگے بڑھایا اور ٹیسر سے اس کا نشانہ لیا۔ اس سے نکلنے والے دو چھرّے اس کے سینے میں پیوست ہوگئے اور وہ نیچے گر پڑا۔ میں جانتی تھی کہ وہ نوے سیکنڈ تک اس کے اثر سے باہر نہیں آسکے گا۔ میں آگے بڑھی تاکہ اس کی گن اپنے قبضے میں لے سکوں۔ اسی لمحے میں نے دوڑتے قدموں کی آواز سنی اور جرمی اچانک ہی میرے سامنے آگیا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

''یہ کیا ہورہا ہے؟'' اس نے کہا۔
میں نے اس کے متوقع حملے سے بچنے کے لیے ایک جانب چھلانگ لگائی اور ایک بورڈ کے سخت کنارے سے جا ٹکرائی اور دیکھا کہ لوہے کا بورڈ نیچے گر رہا ہے۔ جرمی کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس کی زد سے بچا سکے۔ میں نے تیزی سے حرکت کی اور دیکھا کہ جرمی شدید تکلیف میں ہے۔ چنانچہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسرے آدمی کی طرف چھلانگ لگا کر اس کی گن قابو میں کرلی اور اس کا رخ جرمی کی طرف کرتے ہوئے بولی کہ وہ کوئی حرکت نہ کرے۔
''ایمبولینس بلاؤ۔'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''شاید میرا بازو ٹوٹ گیا ہے۔''
''یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے۔'' میں نے اس کی گن کو ٹھوکر مارتے ہوئے اس کی پہنچ سے دور کردیا پھر بولی۔ ''تم میں سے کس کے پاس فون ہے؟''
دوسرے آدمی نے قہر آلود انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں نے ایک بار پھر کہا۔ ''اپنے سیل فون یہاں پھینک دو۔'' اور اس کے ساتھ ہی پستول کی نال کا رخ اس کی طرف کردیا۔ مجبوراً اسے میرے حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔
میں نے چند قدم پیچھے ہٹ کر نائن الیون پر فون کیا اور آپریٹر کو بتایا کہ اس وقت کس جگہ پر ہوں اور یہ کہ ہمیں دو پولیس گاڑیاں، ایک ایمبولینس اور سراغ رساں مائرز کی ضرورت ہے۔
''تمہارا نام کیا ہے؟'' ڈسپیچر نے پوچھا۔
میں نے اپنا اصلی نام بتانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی۔ اس نے مجھے ہولڈ کرنے کے لیے کہا اور چند منٹ بعد مائرز سے میرا رابطہ ہوگیا۔
''اسٹیسی، تم کہاں ہو۔ میں تمہیں گزشتہ دس منٹ سے فون کررہا ہوں لیکن تمام کالیں وائس میل میں جارہی ہیں۔''
''خوش آمدید!'' میں نے اسے بتایا کہ اس وقت کہاں ہوں اور بولی۔ ''اگر تم فوراً یہاں پہنچ جاؤ تو نیلسن کینی جونیئر کو پکڑ سکتے ہو۔ وہ چارلین کے قتل میں ملوث ہے۔''
''کیا واقعی؟'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اسے مجرم ثابت کرنے کے لیے تمہیں کافی وضاحت کرنا پڑے گی۔''
''یہ بعد کی بات ہے مائرز۔'' میں نے کہا۔ ''فی الحال تم جلدی سے آجاؤ اور اسے اپنی تحویل میں لے لو، میں نے تمہارے لیے ایک بار پھر تمہارا کیس حل کردیا ہے۔ اگر اس سے تمہاری تسلی ہوجائے تو تم میرا شمار بھی سراغ رسانوں میں کرسکتے ہو۔''
دورانِ تفتیش نیلسن نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا۔ اس کے منصوبے کی راہ میں چارلین سب سے بڑی رکاوٹ تھی کیونکہ اس نے بھی اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے لاروگ جولی کو فروخت کرنے سے انکار کردیا تھا۔ چنانچہ نیلسن نے گریگ کو یہ ذمے داری سونپی کہ وہ چارلین کو اپنے حق سے دستبرداری پر آمادہ کرلے۔ گریگ، چارلین سے محبت کرتا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ اس کا کہنا نہیں ٹالے گی لیکن ساتھ ہی اس نے نیلسن کو بھی بلیک میل کرنا شروع کردیا اور معاوضے کے طور پر ایک خطیر رقم مانگی۔ نیلسن کا مقصد چارلین کو راستے سے ہٹانا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ وہ ان دونوں کا تعاقب کرتا ہوا ان کے اپارٹمنٹ تک پہنچا اور جس وقت وہ دونوں لڑ رہے تھے تو نیلسن دوسرے کمرے میں چھپ کر یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ جب چارلین لڑ جھگڑ کر واپس چلی گئی تو اس نے گریگ کو گولی ماردی اور آلۂ قتل چارلین کی گاڑی میں پھینک دیا تاکہ گریگ کے قتل کا الزام اس پر آئے اور وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلی جائے۔ اس جھگڑے میں بے چارہ گریگ خوامخواہ اپنی جان سے گیا اگر وہ لالچ نہ کرتا تو شاید نیلسن بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔

محبتوں اور نفرتوں کی سرزمین کو لپیٹ میں لینے والی نفرتوں کی چنگاریاں...

آشیانہ

منظر امام

گھر... سکون... اور امن و آشتی کا گہوارہ ہے... جہاں گزارے لمحے اس وقت امر ہو جاتے ہیں... جب ہر مکین کا چہرہ جگمگاتا اور منوّر ہو... خوشی کے ساتھ غم سے مفر ممکن نہیں ہے... بس زندگی میں تازگی اور توانائی برقرار رہنی چاہیے... تلخ گوئیوں اور حقائق پر لکھی ایک ایسی ہی خاص تحریر...

''ابا، ابا... وہ کون ہے؟'' بیٹے نے باپ کی توجہ ایک آدمی کی طرف دلائی جو ایک درخت کے تنے سے لپٹ کر روئے جا رہا تھا اور کچھ لوگ اسے دیکھ رہے تھے۔

''بیٹا، وہ ہٹلر کا داماد ہے۔'' باپ نے سرگوشی میں بتایا۔

''نہیں ابا۔'' بیٹا مچلنے لگا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہٹلر کی بیٹی تو میں ہوں۔ میرا تو کوئی شوہر بھی نہیں ہے۔''

''اب ایک شوہر تھا۔ لیکن تیری پیدائش سے چار سال پہلے مر گیا تھا۔'' باپ نے بتایا۔

’’پھر تو میں بیوہ ہوئی نا ابا۔‘‘
’’ہاں۔‘‘ باپ نے گردن ہلائی۔ ’’تو بیوہ۔ تیرا باپ بیوہ۔ تیرا پورا خاندان بیوہ۔ بس اب بکواس بند کر اور مجھے سوچنے دے۔‘‘
’’تم کیا سوچ رہے ہو ابا؟‘‘
’’میں یہ سوچ رہا ہوں کہ سکندر اعظم نے مغل اعظم دیکھی تھی یا نہیں دیکھی تھی؟‘‘
’’دیکھی تھی ابا۔‘‘
’’ابے تجھے کیسے معلوم؟‘‘
’’ابا، تم کو یاد ہوگا کہ جب اسے دفنایا گیا تو اس کے دونوں ہاتھ قبر سے باہر تھے۔ ایک ہاتھ کی مٹھی میں سینما ہال کا ٹکٹ دبا ہوا تھا۔ وہ مغل اعظم فلم کا ٹکٹ تھا۔‘‘
’’بیٹا، تو کب سے اتنا عقل مند ہوگیا؟‘‘ باپ نے پیار سے پوچھا۔
’’جب سے میرا شوہر مرا ہے۔ میں بہت سمجھدار ہوگیا ہوں۔‘‘ بیٹے نے کہا۔
’’اس کا مطلب یہ ہوا کہ سمجھدار ہونے کے لیے شوہر کی موت ضروری ہے۔‘‘ باپ نے سوچتے ہوئے گردن ہلائی۔
’’ہاں ابا، لگتا تو ایسا ہی ہے۔‘‘
’’چل، کہیں بیٹھ کر اس مسئلے پر سوچتے ہیں۔ میں تو پچھلے پندرہ سال سے اسی جگہ کھڑے کھڑے تھک گیا ہوں۔‘‘
دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ایک طرف چل دیے۔ درخت سے لپٹ لپٹ کر رونے والا اب درخت سے باتیں کررہا تھا۔ ’’ارے میں نے تو مذاق میں کہا تھا کہ کھچڑی میں نمک زیادہ ہوگیا ہے۔ آئندہ جب کریلے بنایا کرو تو اس میں نیم کے پتے بھی ڈال دیا کرو۔ تم نے میری بات کا برا مان لیا اور درخت بن کر کھڑی ہوگئیں۔ ایسا نہ کرو۔ واپس آجاؤ۔ میں تمہیں پولینڈ کا وزیر اعظم بنا دوں گا۔ پلیز واپس آجاؤ۔ ورنہ میں چار بالٹی پانی پی کر مرجاؤں گا۔‘‘
یہ ایک بہت بڑا پاگل خانہ تھا۔
درجنوں کے حساب سے پاگلوں کو رکھا گیا تھا۔ بہت سی بیرکس بنی ہوئی تھیں۔ کچھ بیرکس میں عورتیں بھی تھیں۔ زیادہ تر مرد تھے۔
اس پاگل خانے میں مریضوں کے لیے ڈاکٹروں کا بہت معقول انتظام تھا۔ ہر ہفتے کئی ڈاکٹرز آتے اور پاگلوں کا معائنہ کرکے اپنی رپورٹ مرتب کیا کرتے۔
کبھی کبھی ڈاکٹرز کے ساتھ طالب علم لڑکے اور لڑکیاں بھی پاگلوں کی اسٹڈی کے لیے آیا کرتے۔ ان کے لیے یہاں کا ماحول بہت انوکھا اور دلچسپ ہوتا تھا۔
شہر کے بہت سے مخیر حضرات مل کر اس پاگل خانے کے اخراجات پورے کیا کرتے تھے۔ انہیں بہترین اور صاف ستھرے کھانے دیے جاتے۔ ان کے کمروں کی صفائی ہوتی، اُجلے بستر، اُجلے کپڑے غرض ان کو سب کچھ حاصل تھا۔
دونوں باپ بیٹے ایک جگہ آکر زمین پر بیٹھ گئے۔ باپ نے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔
’’ابا، اب یہ کیا کررہے ہو؟‘‘ بیٹے نے پوچھا۔ ’’آنکھیں کیوں بند کرلیں؟‘‘
’’ابے سوچ رہا ہوں۔‘‘ باپ نے جواب دیا۔
’’آنکھیں کھول کر سوچو ابا۔‘‘ بیٹے نے کہا۔ ’’تم آنکھیں بند کرلیتے ہو تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تمہارا انتقال ہوگیا ہو۔‘‘
’’ابے جب آنکھیں کھول لیتا ہوں تو تیری منحوس صورت دکھائی دینے لگتی ہے۔‘‘ باپ نے کہا۔ ’’اس لیے مجھے آنکھیں بند کرکے سوچنے دے۔‘‘
’’ابا، جب تم سوچتے ہو تا تو بالکل افلاطون کی طرح دکھائی دیتے ہو۔‘‘ بیٹے نے تعریف کی۔
’’اب یہ بھی بتادے کہ یہ افلاطون کون ہے؟‘‘ باپ نے پوچھا۔
’’یہ لو ابا، تم کو اتنا بھی نہیں معلوم۔ وہ سامنے جو دیوار دیکھ رہے ہو نا۔‘‘
’’ہاں دیکھ رہا ہوں۔ تو تیرا افلاطون اس دیوار کے پیچھے رہتا ہے؟‘‘
’’نہیں ابا، اس دیوار کا نام افلاطون ہے۔‘‘
’’اچھا اچھا۔‘‘ باپ نے اپنی گردن ہلادی۔
اسی وقت ایک آدمی ان دونوں کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ اس کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ ’’باہر چلنا ہے؟‘‘ اس نے پوچھا۔
’’باہر کہاں؟‘‘
’’شتر مرغ کے انڈے لینے۔‘‘ اس نے بتایا۔
’’اچھا۔‘‘ باپ اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ’’کہاں ملتے ہیں یہ انڈے؟‘‘
’’کپڑوں کی دکان پر۔‘‘
’’کپڑوں کی دکان؟ یہ کیا ہوتا ہے؟‘‘ بیٹے نے پوچھا۔
’’تم کو یہ بھی نہیں معلوم؟‘‘
’’نہیں۔‘‘ دونوں باپ بیٹے نے گردنیں ہلادیں۔

"پھر تو تم دونوں نے مگر مچھ بھی نہیں دیکھا ہوگا؟"

"نہیں تو، بالکل نہیں دیکھا۔"

"تو پھر چلو میرے ساتھ۔" اس نے کہا۔ "میں تم کو باہر کی ہر چیز دکھادوں گا۔"

"لیکن ہم کیسے جائیں۔ یہاں سے کوئی جانے نہیں دیتا؟"

"میں نے ایک راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔" اس نے بتایا۔

"وہ جو سامنے دیوار دیکھ رہے ہو نا۔۔۔"

"ہاں دیکھ رہا ہوں۔"

"ہم تینوں مل کر اس دیوار کو الٹا کردیں گے۔" اس نے کہا۔ "پھر اس کی جڑ سے راستہ نکل آئے گا۔"

"ابا، یہ ترکیب تمہارے ذہن میں کیوں نہیں آئی؟" بیٹے نے شکوہ کیا۔ "ورنہ ہم کب کے باہر چلے جاتے۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔" اس آدمی نے تسلی دی۔ "معاف کردو ابا کو۔ ہر آدمی میری طرح عقل مند تو نہیں ہوتا ہے نا۔"

"تو پھر کب باہر چلنا ہے؟" باپ نے پوچھا۔

"رات کے وقت۔" اس نے بتایا۔ "رات کے وقت سورج کی روشنی بھی ہوتی ہے اسی لیے سب نظر بھی آجائے گا۔"

"ٹھیک ہے تو پھر رات کے وقت تیار رہیں گے۔"

وہ آدمی اٹھ کر چلا گیا۔ دونوں باپ بیٹے اس خیال سے خوش ہو رہے تھے کہ اب انہیں باہر جانے کا موقع ملے گا۔

"ابا، تم نے تو باہر کی دنیا دیکھی ہو گی؟" بیٹے نے پوچھا۔

"ہاں ہاں پانچ بار دیکھی ہے۔"

"بتاؤ نا، باہر کیا کیا ہوتا ہے۔"

"باہر سمندر ہوتا ہے۔" باپ نے کچھ یاد کرتے ہوئے بتایا۔ "سمندر میں رنگ برنگے پھول لگتے ہیں۔ دن کے وقت سمندر آرام کرنے چلا جاتا ہے اس لیے دن کو نظر نہیں آتا۔"

"وہ آرام کرنے کہاں جاتا ہے ابا؟" بیٹے نے پوچھا۔

"ابے ہر شہر میں اس کے گھر ہوتے ہیں۔" باپ نے بتایا۔ "کسی ایک گھر میں چلا جاتا ہے۔"

اسی وقت گھنٹی بجنے لگی۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ ان کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ دونوں باپ بیٹا اس ہال کی طرف چل پڑے جہاں کھانے کا انتظام کیا جاتا تھا۔

دونوں کو اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ رات ہوتے ہی وہاں سے نکل جائیں گے۔

رات کے کھانے کے بعد دونوں اپنی بیرک سے باہر آگئے۔ بیرکس کے باہر کسی قسم کی چوکیداری نہیں کی جاتی تھی اور نہ ہی چہار دیواری کے پاس کسی پہرے کا انتظام ہوتا تھا۔

دوپہر میں ملنے والا آدمی بیرک کے باہر ہی کھڑا تھا۔ وہ اس وقت بہت پُرجوش اور خوش دکھائی دے رہا تھا۔

"میں نے تو اکیلے یہ دیوار الٹی کردی۔" اس نے بتایا۔

"کیوں، تم نے اکیلے کیوں کی؟" بیٹے نے پوچھا۔

"میں نے کہا چلو چل کر اپنی طاقت آزماتے ہیں۔ بس ذرا سا زور لگایا اور دیوار الٹی ہوگئی۔"

"اور راستہ؟" باپ نے پوچھا۔

"ہاں، راستہ بھی مل گیا۔ بہت مزے کا راستہ ہے۔"

"لیکن یہ تو بے ایمانی ہے۔" بیٹا چیخ پڑا۔ "تم نے کہا تھا کہ تینوں مل کر دیوار الٹی کریں گے پھر تم نے اکیلے کیوں کر دی۔"

"چلو، غلطی ہوگئی۔" باپ نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔

"نہیں ابا، اس سے کہو پہلے دیوار سیدھی کرے۔ پھر ہم تینوں مل کر الٹا کریں گے۔"

"ابے اس چکر میں یہاں سے نکلنے میں دیر ہو جائے گی۔" باپ نے کہا۔

بیٹا خاموش ہو گیا۔ تینوں چہار دیواری کے پاس آگئے۔ اندھیرے کے باوجود دیوار میں موجود بڑا سا سوراخ انہیں دکھائی دے گیا تھا۔

"یہ ہے وہ راستہ۔" اس آدمی نے بتایا۔ "ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"چلو۔" باپ نے کہا۔

سب سے پہلے وہی آدمی باہر نکلا تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں بھی باہر آگئے۔ ان کے سامنے ایک میدان تھا جو اندھیرے کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ میدان سے ہٹ کر سڑک کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

"ابا، وہ روشنیاں کیسی ہیں؟" بیٹے نے پوچھا۔

"بیٹے وہ ستارے ہیں۔" باپ نے بتایا۔ "رات کے وقت نیچے اتر آتے ہیں اور دن میں آسمان پر چلے جاتے ہیں۔"

"اب چلو نا تم لوگ۔" اس آدمی نے کہا۔ "ہمیں افریقہ تک جانا ہے۔ یہیں کھڑے رہیں گے تو دیر ہو جائے گی۔"

تینوں اس اندھیرے میدان سے ہوتے ہوئے سڑک تک آگئے۔

رات کے دس بجے ہوں گے۔ اس لیے ہر طرف چہل پہل تھی۔ گاڑیاں آجا رہی تھیں۔
''پیارے بھائی ہم افریقہ کیسے جائیں گے؟'' بیٹے نے اس آدمی سے پوچھا۔
''یہاں سے سیدھے چلتے جائیں گے پھر دائیں طرف کو مڑ جائیں گے۔ اس کے بعد ایک گلی آئے گی اس گلی سے نکلیں گے تو سامنے افریقہ ہوگا۔''
وہ تینوں افریقہ کی طرف چل دیے۔
ابھی کچھ ہی دور چلے تھے کہ پولیس کی ایک موبائل ان کے پاس آکر رک گئی۔ اس میں سے دو پولیس والے اتر کر ان کے سامنے آگئے۔
''ابے کون ہو تم لوگ؟'' ایک نے پوچھا۔
''ہم پاگل ہیں۔'' اس آدمی نے بتایا۔ ''ہم نے دیوار الٹی کر کے راستہ بنایا تھا۔ پھر وہاں سے باہر آئے ہیں۔''
''واہ، دیوار بھی الٹی کر دی۔'' دوسرا ہنس پڑا۔ ''اور دیوار کود کر کہاں جا رہے ہو؟''
''ہم تو افریقہ جا رہے ہیں۔'' بیٹے نے کہا۔ ''بس یہاں سے سیدھے جائیں گے۔ وہاں سے سیدھے ہاتھ کی گلی میں مڑ جائیں گے۔ سامنے افریقہ آجائے گا۔''
اب وہ دونوں ہنس رہے تھے۔
''اچھا افریقہ جا کر کیا کرو گے؟'' ایک نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔
''وہاں کے بادشاہ بنیں گے۔'' باپ نے کہا۔ ''پہلے تین مہینے تک یہ بادشاہ رہے گا'' اس نے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کے بعد تین مہینے تک میں بادشاہ بنوں گا۔ اس کے بعد یہ میرا بیٹا بادشاہ بنے گا۔''
''اوہو، تو تم دونوں باپ بیٹے ہو۔''
''ہاں، اس سال میں اس کا باپ ہوں۔ پچھلے سال یہ میرا باپ تھا۔''
''اور اگلے سال میں ان دونوں کا باپ بن جاؤں گا۔'' اس آدمی نے کہا۔
''ابے کن چکروں میں پڑ گیا۔'' ایک پولیس والے نے دوسرے سے کہا۔ ''یہ تینوں واقعی پاگل ہیں سالے۔ ان سے کچھ نہیں ملنے والا۔ خواہ مخواہ ٹائم برباد ہو رہا ہے۔''
وہ دونوں پولیس والے موبائل میں بیٹھ گئے۔ موبائل روانہ ہوگئی۔
''ابا، لگتا ہے یہ دونوں پاگل تھے۔'' بیٹے نے کہا۔
''ہاں بیٹا، مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ پاگل ایسے ہی ہوتے ہیں۔''
''چلو نا۔'' اس آدمی نے کہا۔ ''دیر ہوگئی تو افریقہ کہیں چلا جائے گا۔''
''پیارے بھائی، یہ افریقہ جاتا کہاں ہے؟'' بیٹے نے دریافت کیا۔
''وہ کبھی کبھی یورپ کی طرف چلا جاتا ہے۔ پھر تین چار مہینوں میں واپسی ہوتی ہے۔''
''اوہو، پھر تو ہمیں جلدی کرنا چاہیے۔''
وہ تینوں تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئے۔ شہر کی دکانوں میں رش ہو رہا تھا۔ لوگ ہوٹل کے آگے بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔
''ابا، یہ کون لوگ ہیں؟'' بیٹے نے ہوٹل کے آگے کرسیوں پر بیٹھے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔
''بیٹا یہ ہماری طرح انسان ہیں۔'' باپ نے بتایا۔
''نہیں ابا، یہ ہماری طرح کے انسان تو نہیں ہیں۔'' بیٹے نے کہا۔ ''ہم جہاں رہتے تھے ابا، وہاں تو ہر وقت کام کرنا ہوتا تھا۔ کبھی پودوں کی دیکھ بھال، کبھی بیرک کی صفائی، کبھی باورچی خانے جا کر برتن صاف کرنا، ہمارے پاس تو بیٹھنے کی بھی فرصت نہیں ہوتی تھی۔''
''ہاں یہ بات تو ہے۔''
''اب ان کو دیکھو نا، کتنے آرام سے بیٹھے ہیں۔ جیسے ان کو کوئی کام ہی نہیں ہے۔'' بیٹے نے کہا۔ ''سب چائے پی رہے ہیں۔ چند ایک مذاق کر رہے ہیں۔ اس لیے ابا یہ ہماری طرح کے انسان نہیں ہیں۔ یہ تو پاگل معلوم ہوتے ہیں۔''
بیٹے کی بات سن کر باپ اور وہ آدمی خوف زدہ ہو گئے۔ ''ہاں، یہ ہماری طرح کے نہیں ہیں۔ یہ پاگل ہیں۔ چلو جلدی سے آگے بڑھو ورنہ یہ ہم کو مارنے لگیں گے۔ پاگل ہیں نا، پاگلوں کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔'' تینوں پھر آگے بڑھ گئے۔
بہت دور تک چلنے کے بعد بیٹے نے اس آدمی سے پوچھا۔ ''بھائی تمہارا نام کیا ہے؟''
''آدمی۔'' اس نے جواب دیا پھر پوچھا۔ ''اور تمہارا کیا نام ہے؟''
''بیٹا۔'' بیٹے نے جواب دیا۔ ''اور یہ میرا ابا ہے اور اس کا نام ہے ابا۔''
''چلو ٹھیک ہے۔ میں آدمی، تم بیٹا اور یہ ابا۔''
''اچھا آدمی یہ بتاؤ وہ افریقہ کب آئے گا۔ ہم کتنی دیر

سے چل رہے ہیں؟''
''فکر مت کرو اس کا تو باپ بھی آئے گا۔''
اب وہ جس علاقے سے گزر رہے تھے، وہ نسبتاً ویران تھا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر بڑے بڑے مکانات تھے۔ جن میں روشنیاں تو ہو رہی تھیں لیکن باہر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
اچانک ایک بائیک ان کے پاس آکر رک گئی۔ اس پر دو آدمی بیٹھے تھے۔ دونوں بائیک سے اتر آئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔
''اوئے، جلدی موبائل نکالو۔'' ایک نے کہا۔ ''جلدی کرو۔ ہمارے پاس ٹائم نہیں ہے۔''
''لیکن ہمارے پاس موبائل کہاں ہے؟'' باپ نے بتایا۔ ''ہم تو پاگل ہیں۔ پاگلوں کے پاس موبائل نہیں ہوتے۔''
''پاگل بنا رہے ہیں سالے۔'' دوسرے نے پہلے سے کہا۔ ''ٹپکا دے کسی ایک کو۔ ہمارا کوٹہ بھی پورا ہو جائے گا۔''
''ہوں ٹھیک ہے۔'' پہلے نے ہنکاری لی۔ ''چل ان سے تفریح لے کر ٹپکا دیتے ہیں۔'' پھر اس نے ان تینوں کو مخاطب کیا۔ ''ہاں اب بتاؤ۔ تم تینوں میں سے کون دنیا سے جانا چاہتا ہے؟''
''میں اپنے باپ کے بغیر کہیں نہیں جاتا۔'' بیٹے نے کہا۔ ''اور میرا باپ میرے بغیر کہیں نہیں جاتا۔''
''اور میں ان دونوں کے بغیر کہیں نہیں جاتا۔'' وہ آدمی بھی بول پڑا۔
''پاگل ہی معلوم ہوتے ہیں سالے۔'' ایک نے ہنس کر کہا۔ ''چل جلدی سے کسی ایک کو ٹپکا۔ ہمیں جا کر رپورٹ بھی دینی ہے۔''
''ایک بات بتاؤ۔ تم کسی کو کیوں ٹپکانا چاہتے ہو؟'' باپ نے پوچھا۔
''واہ۔'' دوسرا ہنس پڑا۔ ''اس وقت تو عقل مندی کی بات کر رہا ہے۔''
''بتاؤ نا، کیوں مارنا چاہتے ہو؟''
''چل سن ہی لے۔ مرنے سے پہلے تیری معلومات میں اضافہ ہو جائے گا۔ دیکھ بھائی، ہم لوگوں کو ٹاسک ملتا ہے کہ آج پانچ کو مارنا ہے۔ چھ کو مارنا ہے یا سات کو مارنا ہے۔ آج ہمیں پانچ کو مارنا تھا۔ چار کو تو ٹپکا چکے تھے۔ ایک رہ گیا تھا۔ اب تم لوگ مل گئے ہو۔ تم میں سے کسی ایک کو ٹھکانے لگانا ہے۔''

''لیکن ہم سے تمہاری کوئی دشمنی تو نہیں ہے۔'' باپ نے کہا۔
''اوئے عقل مند پاگل، ہم لوگوں کے لیے دشمنی وشمنی کچھ نہیں ہوتی۔ ہمیں صرف مارنے کا کام دیا جاتا ہے۔ بس اس کے علاوہ ہم کچھ نہیں جانتے۔''
''بھائی، میں تم کو ایک مشورہ دوں۔'' بیٹے نے کہا۔
''کیسا مشورہ؟''
''یہاں سے سیدھے چلے جاؤ۔ ایک ایسی جگہ ملے گی جس کی دیوار الٹی ہے۔ اس دیوار میں ایک سوراخ ہے۔ اس سوراخ سے تم دونوں اندر چلے جانا۔ وہ بہت اچھی جگہ ہے۔ وہاں کوئی کسی کو مارنے کے لیے نہیں کہتا۔''
''اوئے مذاق کرتا ہے۔'' پہلا دہاڑنے لگا۔ ''سب سے پہلے تو ہی جا۔''
اس نے پستول کا رخ بیٹے کی طرف کر دیا۔ اسی وقت آدمی نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ لیکن وہ اس کا پستول چھیننے میں ناکام رہا۔
اسی کشمکش میں پستول چل گیا۔ اور آدمی ایک چیخ کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔ اس کے سینے سے خون ابل رہا تھا جبکہ وہ دونوں بائیک اسٹارٹ کر کے بھاگ نکلے تھے۔ ان کا کوٹا پورا ہو چکا تھا۔
دونوں باپ بیٹا آدمی کی لاش کے پاس کھڑے رہ گئے تھے۔
''ابا، اس کے سینے سے یہ لال لال خون کی طرح کیا نکل رہا ہے؟'' بیٹے نے پوچھا۔
''بیٹا یہ خون ہی ہے۔'' باپ نے بتایا۔ ''اور یہ مر چکا ہے۔''
''خون۔''
''خون نہیں بے وقوف، یہ آدمی۔''
''لیکن اس کو تو افریقہ جانا تھا۔ یہ افریقہ گئے بغیر کیسے مر گیا؟''
''بیٹا، لگتا ہے یہی اس کا افریقہ تھا۔''
''ابا، ایک بات اور بھی ہے۔''
''وہ کیا ہے؟''
''دیکھو نا، جہاں ہم رہتے تھے۔ وہاں اگر کسی کو چوٹ بھی لگتی اور وہ روتا چلاتا تو سب اس کے پاس پہنچ جاتے تھے۔''
''یہ بات تو ہے۔''
''لیکن ابا، یہاں تو کوئی اپنے گھر سے باہر بھی نہیں

نکلا۔'' بیٹے نے کہا۔

''شاید یہاں کا یہی دستور ہو، چل اب ہم چلتے ہیں۔''

دونوں پھر آگے بڑھ گئے۔ اب ان کے ساتھ وہ آدمی بھی نہیں تھا۔ ان دونوں کو خود ہی افریقہ پہنچنا تھا۔ اب رات گہری ہوتی جارہی تھی اور افریقہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

''ابا، مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔'' بیٹے نے کہا۔

''بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔''

''نہیں ابا، یہ دھوکا ہے۔ پہلے میں نے کہا ہے، کھانا پہلے میں کھاؤں گا۔''

''چل ٹھیک ہے۔'' باپ ہنس پڑا۔ ''لیکن کھانا ملے گا کہاں سے؟''

''ہم افریقہ کی طرف جارہے ہیں۔ شاید وہیں مل جائے۔''

کچھ دیر چلے تھے کہ کچھ آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں بہت عجیب تھیں۔ زندہ باد زندہ باد کے نعرے بھی لگ رہے تھے اور تالیاں بھی بج رہی تھیں۔ درمیان میں کسی آدمی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''ابا، یہ سب کیا ہورہا ہے؟'' بیٹے نے پوچھا۔

''لگتا ہے کہیں کوئی جلسہ ہورہا ہے۔'' باپ نے بتایا۔

''یہ جلسہ کیا ہوتا ہے ابا؟''

''جب بہت سے لوگ کسی ایک آدمی کی خوشامد کرتے ہیں نا تو اس کو جلسہ کہا جاتا ہے۔''

''وہاں تو کھانا بھی ہوتا ہوگا۔''

''پتا نہیں۔ چل، چل کر دیکھتے ہیں۔''

جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے، آوازیں واضح ہوتی چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد وہ ایک بڑے سے میدان میں کھڑے تھے۔

وہاں بہت سے لوگ تھے۔ ایک طرف ایک اونچا سا اسٹیج بھی بنایا گیا تھا۔ کوئی اعلان کررہا تھا۔

''خواتین و حضرات! آپ لوگوں کے لیے کھانے کا بندوبست بھی ہے۔''

دونوں خوش ہوگئے تھے۔ ''ابا، یہاں تو کھانا بھی مل رہا ہے۔''

''ہاں، چل آگے چل۔ وہ دیکھ کھانا لگایا جارہا ہے۔'' باپ نے اشارہ کیا۔

وہ آگے بڑھے اور اس کے ساتھ ہی بھگدڑ شروع ہوگئی۔ کچھ لوگوں نے پیچھے سے ان دونوں کو دھکا دیا۔ وہ دونوں آگے جا گرے۔

کچھ لوگ ان دونوں کو کچلتے ہوئے کھانے کی طرف دوڑ پڑے تھے۔ ساتھ ہی ماں، بہن کی گالیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

کچھ دھڑا دھڑ برتن گرنے اور ٹوٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک آدمی جو بریانی کی ٹرے لیے ایک طرف بھاگا جارہا تھا۔ باپ سے ٹکرا کر اس پر گر پڑا۔ باپ کا پورا چہرہ اور اس کے کپڑے بریانی سے بھر گئے تھے۔

دوسری طرف بیٹے کے بدن پر قورمے کا بڑا پیالہ گر پڑا تھا۔ وہ تکلیف سے چیختا ہوا لوٹ پوٹ ہوا جارہا تھا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہورہا ہے۔ کیوں ہورہا ہے۔ ایک افراتفری مچی ہوئی تھی۔

''ابا، کہاں ہو تم؟'' بیٹے کی آواز سنائی دی۔

''میں تیرے پاس ہی ہوں، ہاتھ پکڑ لے میرا۔''

دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا۔ اور لڑھکتے، لوگوں کی ٹانگوں سے ٹکراتے، مٹی میں لت پت ہوتے ہوئے اس مجمع اور افراتفری سے باہر نکل آئے۔

دونوں کا بہت بُرا حال ہورہا تھا۔ ذرا سی دیر میں ان کا کچومر نکل گیا تھا۔

''ابا، یہ سب کیا تھا؟'' بیٹے نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

''شاید باہر کی دنیا میں یہی کچھ ہوتا ہے۔''

''ابا، اب ہمیں آگے نہیں جانا۔'' بیٹے نے کہا۔ ''یہاں تو سب پاگل ہیں۔''

''ہاں بیٹا، سب پاگل ہیں۔''

''چلو ابا واپس چلتے ہیں۔ وہ راستہ تو ابھی تک ہوگا نا؟''

''ہاں، راستہ تو ہوگا۔''

''تو پھر چلو واپس، وہاں تو یہ سب نہیں ہوتا ہے ابا۔ وہاں تو ہر ایک کو بہت آرام سے کھانا مل جاتا ہے۔''

''ہاں اور وہاں بغیر کسی دشمنی کے کوئی کسی کو مارتا بھی نہیں ہے۔''

''چلو ابا واپس چلیں۔ صبح ہونے والی ہے۔'' بیٹے نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''جہاں ہم رہتے ہیں، وہاں کی صبح بہت سکون والی ہوتی ہے ابا۔''

دونوں واپس اسی طرف چل دیے جہاں وہ دیوار تھی۔ وہ دنیا تھی اور وہ زندگی تھی جس میں کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ کوئی ٹارگٹ کلنگ نہیں تھی۔ کوئی چھینا جھپٹی نہیں تھی۔ کوئی تقریریں نہیں تھیں۔

"اب کیا تم یقینی طور پر چاہتے ہو کہ یہ کام مکمل کر لیا جائے؟"

"ہاں، میری طرف سے جواب مثبت ہے۔"

"اس لیے کہ جب یہ کام رواں ہو جائے گا تو پھر اسے روکا نہیں جا سکے گا۔ تمہارے پاس مجھ سے رابطہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوگا۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔"

"او کے۔ تم رقم اور تصویریں لائے ہو؟"

الٹی بازی

سلیم انور

پُرسکون... مطمئن اور آسودہ روز و شب گزارنے کی تمنا ہر دل میں بسی ہوتی ہے... خصوصاً شادی شدہ زندگی میں کوئی ہلچل بپا نہ ہو... مگر ان دونوں میاں بیوی کی زندگی ایک فیصلہ کن موڑ پر آپہنچی تھی... دونوں اپنی اپنی جگہ اپنے فیصلے پر مطمئن اور پُراعتماد تھے...

ڈرامائی موڑ اختیار کرنے والے کھیل کا انوکھا اور دلچسپ انجام

''ہاں، دونوں چیزیں اسی میں ہیں۔'' جیف پنکلی نے ایک لفافہ بریڈ بارنٹ کی جانب سے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''دس ہزار ڈالر کی رقم اور چھ مختلف تصویریں۔ ساتھ میں 'روشن بریز' نامی بحری جہاز پر سمندری سیروتفریح کا ٹکٹ اور میامی کی فلائٹ کا ٹکٹ بھی موجود ہے۔''

بریڈ بارنٹ نے لفافہ اپنے اسپورٹس کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ ''شکریہ۔''

''کیا تم لفافے کے اندر نہیں دیکھو گے؟''

بریڈ مسکرا دیا۔ ''ابھی نہیں اور خاص طور پر یہاں نہیں۔ میرے پاس بعد میں اسے دیکھنے کے لیے بہت وقت ہوگا۔ اب اپنا منصوبہ ایک بار پھر میرے گوش گزار کر دو۔''

''لیزلی اس سمندری سیروتفریح پر تنہا جائے گی۔ یوں تو ہم دونوں نے اس سفر پر اکٹھا جانا تھا لیکن آخری لمحات میں مجھے ایک کاروباری معاملہ درپیش آجائے گا۔ وہ اب اس قسم کی چیزوں کی عادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے ہمراہ جانے کے لیے کسی کو بھی تلاش کر لے گی۔ لیکن تمہیں اس معاملے سے کوئی سروکار نہیں ہوگا، ہے نا؟'' جیف نے بتایا۔

''نہیں۔'' بریڈ نے کہا۔

''باقی سارا معاملہ تم پر ہے۔ بس یہ یقین کر لینا کہ وہ اس سمندری سیروتفریح سے زندہ واپس نہ لوٹے۔ ہمارے ازدواجی معاہدے کے مطابق اگر ہمارے درمیان سادگی سے طلاق ہو جاتی ہے تو مجھے کچھ بھی نہیں ملے گا۔ البتہ اس صورت میں سب کچھ مجھے مل جائے گا۔'' جیف نے اسکاچ کی ایک چسکی لیتے ہوئے کہا۔

''اپنے ڈیڈی کے مرنے کے بعد اسے وراثت میں بہت بڑی رقم ملی ہے۔'' جیف نے جیسے گھوڑے کے مانند ہنہناتے ہوئے کہا۔ ''یہ کوئی عقلمندی نہیں ہوگی کہ اس کی ڈیڈی کی سخت محنت سے کمائی ہوئی رقم خیرات میں ضائع ہو جائے۔''

لیزلی اور جیف پنکلی کی شادی کو ابھی صرف چھ برس ہی ہوئے تھے۔ ان کی شادی کے دو برس بعد لیزلی کے ماں باپ کار کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ جیف نے جب لیزلی کو شادی کی پیشکش کی تھی تو اسے علم تھا کہ وہ اس کے باپ کی دولت پر کبھی نہ کبھی ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن اس کے باپ نے اپنی بیٹی کے تحفظ کی خاطر تحریری ضمانت پر اصرار کیا تھا۔ البتہ اس کے باپ نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ جیف اس کی تمام دولت کو ہتھیانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

اپنے والدین کے مرنے کے ایک سال بعد لیزلی سمجھنے لگی کہ اس کی ازدواجی زندگی بے حد خوش و خرم گزر رہی ہے۔ لیکن جیف پنکلی مطمئن نہیں تھا۔

اپنی اس شادی کا خاتمہ کرنے کے فیصلے کے بعد اسے اس کام کے لیے درست آدمی کو تلاش کرنے میں دو سال صرف کرنے پڑے۔

اور وہ درست آدمی بریڈ بارنٹ تھا جو ایک پیشہ ور قاتل تھا۔ البتہ جیف پنکلی کو یہ یقین نہیں تھا کہ اس پیشہ ور کا اصلی نام یہی ہوگا۔ لیکن اس کے کام کے لیے نام کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے ایک کاروباری وسیلے نے اسے بریڈ بارنٹ کا حوالہ دیا تھا اور سفارش بھی کی تھی۔

جب ان کی میٹنگ ختم ہو گئی تو جیف پنکلی ہوٹل کے بار سے پہلے نکل کھڑا ہوا۔ اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ اس کی مشکلات ختم ہونے میں اب صرف تین ہفتے باقی رہ گئے ہیں۔ بحری جہاز کی سمندری سیروتفریح کے لیے روانگی میں ابھی دو ہفتے باقی تھے اور اس کی میامی واپسی تین ہفتے بعد ہونا تھی۔ اسے یہ بھی اطمینان تھا کہ بحری جہاز کی واپسی اس کی بیوی کے بغیر ہوگی۔

جیف پنکلی کے جانے کے بعد بریڈ بارنٹ مزید آدھے گھنٹے تک بار میں بیٹھا رہا۔ اسے اپنے موٹیل کے کمرے میں واپس پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ یہ ایک تسلیم شدہ بات تھی کہ اپنے پیشے کی وجہ سے اس کی زندگی کا ایک خاصا وقت موٹیل کے کمروں میں گزرا کرتا تھا لیکن موٹیل اس کی پسندیدہ جگہ نہیں تھی۔ اس کی پسندیدہ جگہ مسوری اوزارک میں وہ کیبن تھا جو اس کی ملکیت تھی۔ یہ کیبن برانسن، مسوری سے مغرب میں تیس میل کے فاصلے پر واقع تھا اور بیس ایکڑ اراضی پر محیط تھا۔

اسے جب مکمل تنہائی کی خواہش ہوتی تو وہ اس کیبن میں چلا جاتا تھا۔ چونکہ یہ اراضی برانسن سے نزدیک تھی اس لیے جب وہ سوشل لائف گزارنے کا خواہش مند ہوتا تو برانسن آجاتا تھا۔

وہ اس وقت بار میں دیر تک اس لیے بھی بیٹھا ہوا تھا کہ اسے ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی یہاں ضرور آتا ہے۔ بریڈ بارنٹ کو 'ڈبل ڈپنگ' کا آئیڈیا پسند تھا۔ یہ اصطلاح خود اس کی ایجاد کردہ تھی۔ ایک ہی وقت میں دو کاموں کا معاوضہ۔

اسے دوسرے شخص کی آمد کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس شخص کا نام جم آلٹن تھا۔ وہ سیدھا اس عورت کی

میز پر آ گیا جو اس کا انتظار کر رہی تھی۔ انہوں نے عجلت میں اپنے مشروب پیے اور پھر میز پر سے اٹھ کر لفٹ کی جانب چل پڑے۔ ان کا رخ اوپری منزل کے کسی کمرے کی جانب تھا۔

بریڈ بارنٹ بھی ان کے پیچھے اٹھ کھڑا ہوا۔ جب وہ دونوں لفٹ میں داخل ہو گئے تو بریڈ بھی اسی لفٹ میں سوار ہو گیا۔ لفٹ میں ان تینوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ دونوں اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے بلکہ جذباتی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔

بریڈ نے اپنے کوٹ کا بٹن کھولا اور اندر سے اعشاریہ دو دو کی چھوٹی پستول چپکے سے باہر نکال کر اس پر تیزی سے سائیلنسر فٹ کر دیا۔ وہ جوڑا اب بھی اس کی طرف سے غافل ایک دوسرے میں کھویا ہوا تھا۔

بریڈ بارنٹ گھوما اور اس نے جم آلٹن کے سر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ اس کی ساتھی عورت نے ایک چیخ ماری لیکن بریڈ نے اس کی کھوپڑی پر فائر کر کے اسے بھی خاموش کر دیا۔

بریڈ کا ارادہ اس عورت کو مارنے کا نہیں تھا لیکن جب جم آلٹن کو ٹھکانے لگانے کا وقت آیا تو وہ عورت بھی راستے میں آ چکی تھی۔ وہ اپنے لیے کوئی عینی شاہد نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس لیے مجبوراً اس عورت کو بھی ٹھکانے لگانا پڑا۔ فوج نے اسے سکھایا تھا کہ اسے 'ضمنی نقصان' کہتے ہیں۔ یہ منصوبے میں شامل نہیں تھا لیکن ایسا کرنے کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔

بریڈ چوتھی منزل پر لفٹ سے باہر آ گیا اور ہال سے گزر کر زینے کے راستے نچلی منزل پر چلا گیا۔ وہاں سے اس نے ایک اور لفٹ پکڑی اور مین فلور پر آ گیا۔ وہ ہوٹل کی لابی سے گزرتا ہوا داخلی دروازے سے باہر نکل گیا اور ایک ٹیکسی پکڑ لی۔ ٹیکسی ابھی ہوٹل سے دو بلاک کے فاصلے پر پہنچی تھی کہ اس نے مخالف سمت سے سائرن بجاتی ایک پولیس کار کو تیزی سے آتے ہوئے دیکھا جس کا رخ ہوٹل کی جانب تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے اسے ایک عمدہ ریسٹورنٹ پر اتار دیا۔ اس نے اطمینان کے ساتھ شام کا کھانا کھایا اور ٹیکسی سے ائرپورٹ کے قریب اپنے موٹیل کے کمرے میں پہنچ گیا۔

اپنے موٹیل سے اس نے ائرلائن کے دفتر فون کیا اور پوچھا کہ کیا وہ سنیچر تک انتظار کرنے کے بجائے کل صبح کی پرواز سے میامی روانہ ہو سکتا ہے۔ اسے مزید تین دن موٹیل

کے کمرے میں گزارنے کے خیال سے وحشت ہو رہی تھی۔
ائر لائن کے آپریٹر نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ وہ کل صبح کی پرواز سے میامی روانہ ہو سکتا ہے۔ اس اطمینان کے بعد بریڈ بارنٹ نے ٹیلی وژن آن کر دیا اور اپنا پسندیدہ کامیڈی شو ''لاء اینڈ آرڈر'' دیکھنے لگا۔ اسے یہ دیکھ کر بے حد ہنسی آتی تھی کہ اس پروگرام میں جرائم کو کس طریقے سے حل کیا جاتا تھا۔
بحری جہاز کی روانگی سے ایک رات قبل بریڈ بارنٹ میامی، فلوریڈا کے ایک موٹیل میں مقیم تھا۔ بحری جہاز نے وہیں سے روانہ ہونا تھا۔
اگلے روز سہ پہر تین بجے کے قریب وہ بحری جہاز میں سوار ہو گیا۔ وہ پہلے بھی آسکتا تھا لیکن اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ لیزلی پنکلی جہاز کے کس کمرے میں ٹھہرے گی کیونکہ اس کے شوہر نے ان ٹکٹوں کے حوالے سے جو انہوں نے خریدے تھے، اسے یہ معلومات پہلے ہی سے فراہم کر دی تھیں۔
وہ جہاز پر اپنے نجی کمرے میں چلا گیا اور اپنے سامان کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس دوران اس نے لیزلی کی وہ چھ تصویریں نکال لیں جو اس کے شوہر جیف پنکلی نے اسے دی تھیں۔ وہ اس عورت کا چہرہ شناس کرنا چاہتا تھا۔ جسے اس کو ٹھکانے لگانا تھا۔
ان چھ تصویروں میں سے صرف ایک تصویر ایسی تھی جو اس کے خیال سے لیزلی کی صحیح اور واضح خدوخال والی تصویر تھی۔ باقی تمام تصویریں یا تو کسی ریسٹورنٹ کی میز پر کھینچی گئی تھیں یا دوسری جگہوں پر جہاں اس کے چہرے پر غیر معمولی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ صرف اس تصویر میں وہ سنجیدہ نظر آ رہی تھی جو کسی قسم کی میٹنگ کے دوران کھینچی گئی تھی جہاں ہر کوئی ایک بڑی سی بیضوی میز کے گرد بیٹھا ہوا تھا۔
بریڈ بارنٹ اس تصویر کا غور سے جائزہ لینے لگا۔ لیزلی کی صورت کچھ شناسا سی لگ رہی تھی لیکن تصویر میں اس کا چہرہ بہت چھوٹا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے پیشے کی بنا پر اس کی ملاقات ڈھیروں لوگوں سے ہوتی تھی۔ اس لیے اس بات پر اس نے زیادہ توجہ نہیں دی۔
ساڑھے چھ بجے جہاز سمندر میں تھا۔
بریڈ بارنٹ شام کے کھانے کے لیے ڈائننگ روم میں چلا گیا۔ جیف پنکلی نے پہلے ہی سے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ جس ڈائننگ روم میں اور جن اوقات میں لیزلی وہاں جائے، بریڈ بارنٹ بھی انہی موقعوں پر وہاں موجود ہو۔ وہ ڈائننگ روم کھلنے کے انتظار میں کھڑے ہوئے لوگوں کی قطار میں شامل نہیں ہوا بلکہ ایک طرف کھڑے ہو کر لوگوں کو اندر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔
اس کا خیال تھا کہ وہ پہلی بار ہی لیزلی کو پہچان لے گا۔ لیکن اس وقت اس کے بالوں کی رنگت وہ نہیں تھی جو تصویروں میں تھی۔ لیکن یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔
اسی شب بریڈ وہ براڈوے ٹائپ کا شو دیکھنے چلا گیا جو جہاز میں پیش کیا جا رہا تھا۔ شو ختم ہونے کے بعد اس نے لیزلی کو مخالف سمت کے دروازے سے باہر نکلتے دیکھا تو وہ بھی اس کے پیچھے لپکا۔
لیزلی 'کروز نیسٹ' نامی لاؤنج میں چلی گئی جو جہاز پر موجود بہت سے لاؤنجز میں سے ایک تھا۔ بریڈ لاؤنج میں داخل ہونے سے پہلے دروازے پر رک گیا تاکہ دیکھ سکے کہ لیزلی کہاں بیٹھ رہی ہے۔ جب لیزلی بار کے ایک اسٹول پر بیٹھ گئی تو بریڈ بھی لاؤنج میں داخل ہو گیا۔
لیزلی کے برابر میں ایک اسٹول خالی تھا۔
''اس پر کوئی بیٹھا ہوا تو نہیں؟'' بریڈ نے خالی اسٹول کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لیزلی سے پوچھا۔
''نہیں۔ ہیلپ یور سیلف۔'' لیزلی نے جواب دیا اور اس کی جانب گھوم گئی۔ ساتھ ہی اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھر آئے۔ ''کیا تم فرینک ڈٹن ہو؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔
بریڈ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے دوبارہ غور سے اس عورت کی طرف دیکھا۔ پھر بولا۔ ''لیزلی فاؤلر؟''
''دی ون اینڈ اونلی۔ ہولی شٹ! ہم کتنے عرصے بعد مل رہے ہیں؟''
بریڈ خالی اسٹول پر بیٹھ گیا۔ ''اتنے برس ہو چکے ہیں کہ اب شمار نہیں کیے جا سکتے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
''جانتے ہو ہائی اسکول میں مجھ سے ناتا توڑنے پر میں ابھی تک تم سے ناراض ہوں۔'' لیزلی نے کہا۔
''بھئی، غلطیاں ہم سب سے ہوتی ہیں۔ سو آج کل تم کیا کر رہی ہو؟'' بریڈ نے بات گھماتے ہوئے پوچھا۔
''فی الوقت تو میں تنہا ہی سمندر کی سیر و تفریح کرنے نکلی ہوئی ہوں کیونکہ میرا شوہر ایک انتہائی گھامڑ آدمی ہے۔ اس نے میرے ساتھ نہ آنے کا ایک جواز تلاش کر لیا تھا جیسا کہ اب وہ اکثر کیا کرتا ہے۔''
بریڈ نے اس بات پر اپنا سر جھکا لیا۔ ''یہ سن کر افسوس

ہوا۔''

''ہاں، مجھے بھی افسوس ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ میری غلطی ہے۔ مجھے اس بات کا حقیقت میں احساس گزشتہ ہفتے تک نہیں ہوا تھا۔ اگر تمہیں یاد پڑتا ہو تو بعض اوقات میرا چھوٹا سا دماغ معاملات کا تخمینہ لگانے میں درست کام نہیں کرتا تھا۔''

''اوہ، میں تو ہمیشہ یہی سمجھتا تھا کہ تم خاصی ذہین ہو۔''

''لیکن یہ اندازہ لگانے کے لیے کسی ذہانت کی ضرورت نہیں ہوتی کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ جب آپ کا شوہر بینک اکاؤنٹ سے بڑی بڑی رقمیں نکال رہا ہو اور آپ کو اس بارے میں کچھ نہ بتا رہا ہو۔ اور اس بحری سفر پر روانگی سے دو دن قبل مجھے ایک ہوٹل کے پارکنگ گیراج کی رسید مل گئی۔ غالباً وہ خفیہ طور پر کسی سے رابطے میں ہے۔''

بریڈ نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ رسید کہاں سے تعلق رکھتی تھی۔ اب وہ اس بارے میں پُریقین نہیں تھا کہ اپنے پلان پر عمل کر سکے گا یا نہیں۔ آج تک کسی نے بھی اس کی خدمات کسی ایسے کو ٹھکانے لگانے کے لیے حاصل نہیں کی تھیں جسے وہ ذاتی طور پر جانتا ہو۔

''مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ تمہیں کچھ مشکلات در پیش ہیں۔'' بریڈ بہ مشکل تمام یہ جملہ ادا کر سکا۔

''جانتے ہو، شاید تم ہی وہ شخص ہو سکتے ہو جو میری مشکلات میں سے کچھ کو بھلانے میں میری مدد کر سکے۔ اس بارے میں کیا خیال ہے کہ ہم تمہارے کمرے میں چلتے ہیں اور ایک پرائیویٹ پارٹی کا اہتمام کرتے ہیں؟ وہاں پہنچنے کے بعد میں روم سروس سے اسکاچ کی ایک بوتل بھی منگوا لوں گی۔''

یہ ایک ایسی پیشکش تھی جس سے بریڈ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ ہائی اسکول کے زمانے میں اپنی شدید خواہش کے باوجود وہ کبھی لیزلی کو یک جان دو قالب کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

''آؤ، کمرے میں چلتے ہیں۔'' بریڈ نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں ٹہلتے ہوئے بریڈ کے کمرے میں آ گئے۔

لیزلی کمرے کی مخالف سمت کی دیوار کے پاس پہنچ کر گھوم گئی۔

بریڈ نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور اپنا کوٹ اتار دیا۔ اسے اپنے ریوالور کی فکر نہیں تھی کیونکہ وہ اسے اپنے ساتھ لے کر نہیں گیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس بحری سفر میں اسے ریوالور کی ضرورت پیش آ جائے گی۔

کیونکہ اس کی تمام تر توجہ لیزلی کی جانب تھی اس لیے وہ یہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ اس کے کوٹ اتارنے کے دوران اندر کی جیب میں سے ایک تصویر نکل کر فرش پر گر پڑی تھی۔

لیزلی نے پہلے تصویر کو اور پھر واپس بریڈ کی طرف دیکھا۔ ساتھ ہی اس کا ہاتھ اپنے پرس میں چلا گیا۔

''سو وہ تم ہو جس کی خدمات اس نے مستعار لی ہیں۔''

''معاف کرنا، کیا کہا؟''

''مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھے قتل کرنے کے لیے کسی کی خدمات حاصل کرے گا۔ وہ مجھے طلاق دینے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے کبھی بھی یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ کوئی تم جیسا ہوگا۔''

بریڈ نے ایک قدم آگے بڑھایا اور بولا۔ ''لیزلی......''

لیکن یہ اس کے منہ سے ادا ہونے والے آخری الفاظ تھے کیونکہ لیزلی نے اپنے اعشاریہ تین آٹھ کے پستول کا ٹریگر دبا دیا تھا۔ وہ یہ پستول اس وقت سے اپنے پرس میں ہر وقت رکھتی تھی جب سے اسے خدشہ ہو گیا تھا کہ اس کا شوہر جیف پنکلی اسے مارنے یا مروانے کی کوشش ضرور کرے گا۔

وہ بریڈ کی لاش کو پھلانگ کر دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ دروازہ کھولنے سے قبل وہ پلٹی اور فرش پر پڑی فرینک مڈلٹن عرف بریڈ بارنٹ کی لاش کو گھورنے لگی۔ ''پہلی گولی مجھے قتل کرنے کی کوشش کے جواب میں تھی۔'' اس نے کہا۔ پھر اس بے جان لاش پر ایک اور فائر کرتے ہوئے بولی۔ ''اور یہ گولی ہائی اسکول میں مجھ سے یکا یک ناتا توڑنے کے صلے میں ہے۔''

پھر بیرونی ڈیک کی جانب جاتے ہوئے اس نے اپنے پرس میں سے پستول کے علاوہ باقی تمام چیزیں نکال لیں۔ عرشے پر پہنچ کر اس نے اپنا پرس اور پستول نیچے سمندر کے پانی میں پھینک دیے۔

''جیسا کہ میں نے سوچا تھا، یہ رات تو درحقیقت اس سے کہیں زیادہ بہتر ثابت ہوئی ہے۔ اب میں اپنی بقیہ سمندری سیر و تفریح کا بھرپور لطف اٹھا سکوں گی۔''

پھر وہ اس خوشی میں ایک اور جام پینے کے لیے واپس 'کروز ضیسٹ' نامی لاؤنج میں چلی گئی۔

طاہر جاوید مغل

انگارے

ساتویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خودغرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا، مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

منظر منظر رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے اپنے پیارے وطن پاکستان لوٹا تھا۔ مجھے کسی کی تلاش تھی۔ لیکن یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرِ راہ ایک ایسے زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا جسے کوئی گاڑی ٹکر مار کر گزر گئی تھی۔ مقامی پولیس نے مجھے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے لے آیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ اب انسپکٹر قیصر چودھری اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ میرا ماضی کیا ہے۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ میں WWF کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن اپنے وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں نے اپنی چچی اور چچازاد بہن فائزہ کے قاتل لالہ نظام کو بیدردی سے قتل کر دیا۔ انسپکٹر قیصر چودھری شدید زخمی ہو کر اسپتال نشین ہوا۔ شکیل داراب ایک شریف النفس زمیندار کی بیٹی عاشرہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا۔ وہ اسی عارف نامی نوجوان سے محبت کرتی تھی جسے میں نے زخمی حالت میں اسپتال پہنچانے کی ''غلطی'' کی تھی۔ میں نے شکیل داراب کی ایک نہایت اہم کمزوری کا سراغ لگایا اور یوں اس پر دباؤ ڈال کر عاشرہ کی جان اس سے چھڑا دی۔ عاشرہ اور عارف کو میں نے بیرونِ ملک بھجوا دیا تاکہ وہ تحفظ کے ساتھ اپنی نئی زندگی شروع کر سکیں۔ میں خود بھی بیزار ہو گیا تھا اور واپس ڈنمارک لوٹ جانے کا تہیہ کر چکا تھا مگر پھر ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں کچھ نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں تاجور کے ساتھ گاؤں پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہو گیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ مجھے پتا چلا کہ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ پیر ولایت نے گاؤں والوں کو باور کرا رکھا تھا کہ اگر تاجور کی شادی اسحاق سے نہ ہوئی تو چاند گڑھی پر آفت آئے گی۔ ان لوگوں نے چاند گھڑی کے راست گو امام مسجد مولوی فدا کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ مولوی فدا جو پہلے زبردستی کی شادی کو غلط قرار دے رہے تھے، اب نامعلوم وجہ سے اسحاق کی حمایت کرنے لگے تھے۔ اسی دوران میں کسی نے تاجور کے گھر آئی ہوئی مہمان نمبردارنی کو بری طرح زخمی کر دیا۔ اسحاق کے ہمنواؤں نے اس کا الزام بھی تاجور پر لگانے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے کھوج لگانے کی ٹھانی۔ مجھے شک گزرا کہ اس کام میں مولوی فدا یا اس کا کوئی شاگرد ملوث ہے۔ ایک رات میں نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ کر مولوی فدا کا تعاقب کیا۔ وہ ایک ہندو میاں بیوی رام پیاری اور وکرم کے گھر میں داخل ہوئے۔ پہلے تو مجھے یہی غلط فہمی ہوئی کہ شاید مولوی فدا یہاں کسی غلط نیت سے آئے ہیں لیکن پھر حقیقت سامنے آ گئی۔ مولوی فدا ایک خدا ترس بندے کی حیثیت سے یہاں وکرم اور رام پیاری کی مدد کے لیے آئے تھے۔ تاہم اسی دوران میں وکرم اور رام پیاری کے کچھ مخالفین نے ان کے گھر پر ہلا بول دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ٹی بی کا شکار وکرم ان کے بچے کی موت کا باعث بنا ہے۔ اس موقع پر مولوی فدا نے دلیری سے وکرم اور رام پیاری کا دفاع کیا، لیکن جب حالات زیادہ بگڑے تو میں نے ہڈیوں کے ڈھانچے وکرم کو کندھے پر لادا اور رام پیاری کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں نمبردارنی کو زخمی کرنے والے کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ پتا چلا کہ یہ مولوی صاحب کے شاگرد طارق نے کیا ہے۔ وہ تاجور کی جان لینا چاہتا تھا کیونکہ ا… کی وجہ سے مولوی صاحب کسی بلیک میلنگ کا شکار ہو رہے تھے۔ طارق سے مجھے معلوم ہوا کہ مولوی جی کی بچی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار ہے۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی ہے لیکن جب اسے وہاں سے لایا جائے تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس ''بلیک میلنگ'' سے نکالنے کا عہد کیا، مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ میرا شک عالمگیر اور اسحاق وغیرہ پر تھا۔ رات کی تاریکی میں، میں نے عالمگیر اور اسحاق کو کسی خاص مشن پر جاتے دیکھا۔ وہ ایک ویرانے میں پہنچے۔ میں نے ان کا تعاقب کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عالمگیر، سجاول کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا۔ میں نے چھپ کر ان کی تصاویر کھینچ لیں۔ پھر میں اقبال کے ساتھ شاد پور روانہ ہوا جہاں میری ملاقات اس شخص سے ہونا تھی جو یاسر بھائی کے نام سے خراجِ تحسین وصول کر رہا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

جلد ہی مجھے شاد پور گاؤں کے آثار نظر آنے لگے۔ کہیں کہیں ہلکی روشنی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ رات سرد تھی اور موٹر سائیکل پر سفر کرنے والے کے لیے تو مزید سرد تھی۔ میری توقع کے عین مطابق کریانہ فروش اقبال نے مجھے گاؤں کے اندر جانے کی زحمت نہیں دی۔ گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی اس نے مجھے موٹر سائیکل روکنے کا اشارہ دیا۔ میں رک گیا تو وہ فوراً نیچے اتر آیا۔

بولا۔ ''تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی بات کا مفہوم سمجھانے کے لیے میرا کندھا بھی تھپکا۔

تب اس نے اپنے بوسیدہ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پیٹرول کے خرچے کے طور پر پچاس روپے میرے ہاتھ میں تھمانے کی کوشش کی۔ میں نے شدومد سے انکار میں سر ہلایا اور اشاروں کی زبان میں اسے بتایا کہ ہم ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں اور بھائی چارے میں ایسا لین دین نہیں ہوتا۔ اس نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا اور چل پڑا۔ وہ بہت جلدی میں نظر آتا تھا۔ اس نے شلوار قمیص کے اوپر غالباً لنڈے کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ دیکھنے میں وہ قبول صورت تھا اور اس کا قد بھی کوئی ایسا چھوٹا نہیں تھا۔ جسم کے لحاظ سے مناسب ہی تھا۔

اس کو دکھانے کے لیے میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور واپس چل دیا مگر کچھ ہی آگے جا کر میں نے انجن بند کر کے موٹر سائیکل کو درختوں میں کھڑا کیا اور اس سمت میں بھاگا جہاں اقبال گیا تھا۔ جلد ہی مجھے اس کا ہیولا نظر آ گیا، وہ گاؤں کے اندر جانے کے بجائے آبادی کے ساتھ ساتھ چلتا جا رہا تھا پھر وہ کھیتوں میں داخل ہو گیا۔ اس کے انداز میں عجلت تھی۔ میں فاصلہ رکھ کر محتاط انداز میں اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ پھر وہ گاؤں کے قبرستان میں داخل ہو گیا۔ قبرستان کو کیکر اور جنتر وغیرہ کے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔

اب میں نے فاصلہ کم کر دیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ کہیں اوجھل ہی نہ ہو جائے۔ قبرستان کے اندر نیچی چھت والے دو کچے کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں لالٹین کی روشنی بھی موجود تھی۔ اقبال نے ایک دروازے پر دستک دی اور اس کے ساتھ ہی محتاط انداز میں مڑ کر پیچھے دیکھا۔ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اگر مجھے ایک قبر کے پیچھے لیٹنے میں ذرا بھی تاخیر ہوتی تو اقبال کی نظر مجھ پر پڑ سکتی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ''السلام علیکم چاچا'' کی مدھم آواز میرے کانوں تک پہنچی، یہ آواز یقیناً اقبال ہی کی تھی۔

اقبال اندر اوجھل ہو گیا تو میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ شہر خموشاں میں مکمل خاموشی اور تاریکی کا راج تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ کمروں کے گرد گھوم پھر کر دیکھا۔ دو کھڑکیاں موجود تھیں مگر اچھی طرح بند تھیں۔ پھر میری نگاہ ایک گول روشن دان پر پڑی۔ یہ چھت سے بس ایک ڈیڑھ فٹ ہی نیچے ہوگا۔ میں کوئی بھی آہٹ پیدا کیے بغیر کھڑکی کی چوکھٹ پر پاؤں جمانے میں کامیاب ہوا اور پھر چھت پر پہنچ گیا۔ یہاں الٹا لیٹ کر میں نے گول روشن دان میں جھانکا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں مجھے اقبال کی پشت نظر آئی۔ اس کے سامنے جو ادھیڑ عمر شخص کھڑا تھا، وہ اپنے حلیے سے کوئی گورکن ہی نظر آتا تھا۔ کمرے میں کھدائی کے آلات، کسیاں، کھرپے وغیرہ موجود تھے۔ ایک طرف لحد کے اوپر رکھے جانے والے لکڑی کے پھٹے ڈھیر کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔ اقبال کی دھیمی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ ''میں اس کا دکھ سمجھتا ہوں شمس چاچا پر اس کا جانا بالکل ٹھیک نہیں۔ تم اسے بلاؤ، میں بتاتا ہوں سب کچھ۔''

''اچھا تم بیٹھو۔ سردی لگ رہی ہے تو یہ کمبل لے لو۔'' ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔

''نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اقبال بولا۔

پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ادھیڑ عمر چاچے شمس نے ایک پلنگ نما چارپائی کو گھسیٹ کر ایک کونے میں کیا۔ چارپائی کے نیچے ایک بڑے سائز کا جستی صندوق تھا۔ چاچے نے اسے بھی اس کی جگہ سے کھسکایا۔ نیچے لکڑی کے پھٹے نظر آئے۔ دو پھٹے ہٹانے کے بعد چاچے شمس نے آواز دی۔ ''یاسر پتر! باہر آ۔ بالا ملنے آیا ہے تجھے۔''

کچھ دیر کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر خلا میں لکڑی کی سیڑھی نظر آئی، اور اس سیڑھی پر چڑھ کر وہ شخص باہر آ گیا جس کا ڈنکا آج کل (میری وجہ سے) پورے علاقے میں گونج رہا تھا۔ یہ یاسر تھا، لیکن میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ برسوں کا بیمار دکھائی دیتا تھا۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا اور سیاہی مائل تھا۔ شلوار قمیص ایسے تھی جیسے کسی طویل لکڑی پر جھول رہی ہو۔ اس کی گردن پر ایک پٹی بھی بندھی ہوئی تھی، مجھے تاجور کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا۔ جب عالمگیر کے بندوں سے یاسر بھائی کی لڑائی ہوئی تھی تو ان کی گردن پر چوٹ آئی تھی۔

یاسر کو دیکھ کر مجھے گہری مایوسی ہوئی۔ اس کی آنکھیں بھی سوجی ہوئی تھیں۔ ممکن ہے کہ یہ سوزش اس دکھ کا نتیجہ ہو

جو اسے اپنی پیاری پھوپھو کی ناگہانی موت سے ہوا تھا۔ تاہم اس کے ساتھ مجھے یہ بھی لگا کہ اس نے تھوڑی بہت پی رکھی ہے۔

اقبال اور یاسر نم آنکھوں کے ساتھ ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ ''یاسر بھائی! تمہاری پھوپھی جی کا بہت افسوس ہے۔ یقین کرو ایسے لگتا ہے کہ اپنا کوئی خون کا رشتہ وچھڑ گیا ہے۔''

''اللہ کے کاموں میں کس کو دخل ہے۔'' چاچے شمس نے دلاسا دینے والے انداز میں کہا۔

وہ تینوں چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ چاچا شمس تو مجھے نظر نہیں آرہا تھا مگر یاسر اور اقبال دونوں دکھائی دیتے تھے۔ یاسر نے روکھے سے لہجے میں کہا۔ ''بالے! تم سے کہا بھی تھا کہ بہت ضرورت کے وقت ہی آیا کرو۔ زیادہ آؤ گے تو کوئی بھی تمہارا پیچھا کر کے یہاں تک پہنچ جائے گا۔''

''اس وقت سخت ضرورت ہی تھی تو آیا ہوں یاسر بھائی، مجھے ڈر تھا کہ تم کہیں چاند گڑھی کا رخ نہ کرلو۔ میرا مطلب ہے پھوپھو سے تم کو بڑا پیار تھا۔ تم ان کا منہ بھی نہ دیکھ سکے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ تم ان کی قبر پر آنے کی کوشش کرو گے۔''

''اگر کرتا بھی تو اس میں کیا ہے؟'' یاسر نے چڑچڑے سے انداز میں کہا۔

''پولیس چاند گڑھی میں قبرستان کا پہرا دے رہی ہے۔ ابھی دو چار ہفتے تک بھول کر بھی ایسی سوچ دماغ میں نہ لانا۔''

یاسر نے اپنی بغلی جیب ٹٹول کر سگریٹ کا ایک مڑا تڑا پیکٹ نکالا اور لرزتے ہاتھوں سے اسے جلایا۔ اس کا انداز اس امر کی تصدیق کر رہا تھا کہ وہ نشے میں ہے۔ سگریٹ مٹھی میں دبا کر اس نے دو لمبے کش لیے۔ دوسرے کش کے بعد اسے کھانسی ہونے لگی۔ کھانسی ہوتے ہی اس کے مدقوق چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا تھام لیا۔ یقیناً گلے کا پرانا زخم اسے تکلیف دے رہا تھا۔

گورکن چاچا شمس نے اٹھ کر اسے جلدی سے پانی پلایا۔ اس کی کھانسی تھمی تو نہیں لیکن کم ہوگئی۔ اقبال نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''یاسر بھائی! تمہاری ساری مشکلوں کی اصل جڑ میں ہی ہوں۔ کبھی کبھی تو زندہ رہنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔''

''ہر بار یہ رونا نہ رویا کر۔ بس جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔'' یاسر نے ایک بار پھر چڑچڑے انداز میں کہا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر کھانسنے لگا۔

گورکن شمس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''بالے! وہ کالی پگڑی والے کا کیا قصہ ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ یاسر ہے بلکہ کئی تو اس پر پکا پکا یقین کر کے بیٹھے ہوئے ہیں۔''

''ہاں چاچا، چاند گڑھی میں بھی زیادہ تر لوگوں کا خیال یہی ہے کہ وہ یاسر بھائی ہے اور یہ جو یاسر بھائی کے گھر پر سیالکوٹی کے غنڈوں نے ہلا بولا ہے، اس کی وجہ بھی تو یہی ہے۔''

گورکن شمس نے کہا۔ ''ہاں، کوئی تصویروں والی گل بھی سنی ہے۔ ان تصویروں کی وجہ سے ہی عالمگیر اور تحصیل دار میں خون خرابا ہوا ہے۔''

''اور کہا یہ جارہا ہے کہ یہ تصویریں یاسر بھائی نے اتاری ہیں۔'' اقبال نے شمس کی بات مکمل کی۔

''مجھے اس سارے بکھیڑے سے کچھ بھی لینا دینا نہیں ہے۔'' یاسر نے تقریباً چلا کر کہا اور سگریٹ کا خالی پیکٹ دور پھینک دیا۔ ''بالے! تم بس میرا ایک پیغام میرے تایا جی تک پہنچا دو۔''

''جو حکم یاسر بھائی۔'' اقبال نے سراپا اطاعت بن کر کہا۔

یاسر دھیمی آواز میں اسے اپنے پیغام کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ اپنے تایا سے کہنا چاہ رہا تھا کہ وہ اس کی والدہ اور بہن وغیرہ کو چیمل والے گاؤں سے نکال کر سیالکوٹ یا پھر لاہور پہنچا دیں۔ وہ ان کے لیے مزید خطرات مول لینا نہیں چاہتا اور خود اس کے بیمار جسم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ان کی حفاظت کرسکتا۔ ان لمحوں میں وہ مجھے ایک بالکل بے بس اور کمزور شخص دکھائی دیا۔ جو بے شک دلیر تھا لیکن اب اپنی بیماری اور حالات کے ہاتھوں شکست کھا چکا تھا۔ وہ اس وقت ایک خوف زدہ شخص کی طرح اس گورکن کے زمین دوز ٹھکانے میں چھپا ہوا تھا۔ یہ تصویر اس تصویر سے بہت مختلف تھی جو میں نے یاسر کے حوالے سے اپنے ذہن میں بنائی تھی۔ اس نے اقبال سے یہ بھی کہا کہ وہ اس کے تایا تک اس کا پیغام ڈاک کے گمنام خط کے ذریعے پہنچائے یا ایسا ہی کوئی اور طریقہ اختیار کرے۔ کچھ دیر بعد اس کی کھانسی پھر شدت پکڑ گئی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا سا اٹھ کھڑا ہوا۔ اقبال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم دونوں بیٹھو، چائے شائے پیو، میں اب نیچے جاتا ہوں۔''

اقبال نے اسے سہارا دینا چاہا مگر اس نے اسے پیچھے

ہٹا دیا۔ خود ہی سنبھل سنبھل کر لکڑی کے زینے تک پہنچا اور اترنے لگا۔ اترتے اترتے رک گیا اور اقبال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تمہاری اطلاع کا شکریہ۔ ٹھیک ہے اگر تم کہتے ہو تو میں ابھی باہر نہیں نکلوں گا۔“

اقبال نے اثبات میں سر ہلایا۔ یاسر کے اوجھل ہونے کے بعد گورکن شمس نے خلا پر تختے برابر کر دیے اور ان پر ٹرنک اس طرح رکھ دیا کہ وہ چھپ گئے۔

سردی میں چھت پر اوندھے لیٹے لیٹے میرا جسم اکڑ گیا تھا مگر اندر کی صورتِ حال اتنی دلچسپ تھی کہ میں مزید یہاں رہنا چاہتا تھا۔ یاسر کے جانے کے بعد گورکن شمس نے تجسس آمیز لہجے میں اقبال سے پوچھا۔ ”بالے، سوچنے کی بات ہے اگر وہ پگڑی ڈھاٹے والا یاسر نہیں ہے تو پھر کون ہے؟ اس نے عالمگیر کو تو نتھ ڈال دی ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ پیر ولایت اب اپنی صفائیاں پیش کرتا پھر رہا ہے۔“

”ولایت کی صفائیاں بس ایسے ہی ہوتی ہیں۔ پہلے بھی اس کی صفائیاں لوگوں نے کم ہی مانی تھیں۔ بس وہی مانتے ہیں جو اندھوں کی طرح اس پر بھروسا رکھتے ہیں۔ جیسا پیو ویسا پتر۔ پیو کہا کرتا تھا کہ سب کو بھسم کر دوں گا اور بھسم خود ہو گیا۔ یہ کہتا ہے کتے کی موت مرو گے، اور مرنا اس نے خود ہی ہے۔“

دونوں اپنی اپنی جگہ گم صم ہو گئے۔ جیسے ماضی قریب کے کسی واقعے کی یاد میں گم ہو گئے ہوں۔ گورکن شمس نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ”اس کا کچھ اتا پتا چلا؟“

اقبال کے چہرے پر جیسے ایک رنگ سا گزر گیا، ہاتھ ہلا کر بولا۔ ”چاچا! نہ کرو اب اس کی بات۔ دل دکھتا ہے۔ اس کو اب کہاں آنا ہے۔ آنا ہوتا تو اب تک آچکی ہوتی۔“

”وہ کہتے ہیں نا بالے کہ مرنے والوں کے لیے چین آجاتا ہے لیکن جو گم ہو جاتے ہیں ہمیشہ رلاتے رہتے ہیں۔ مجھے پتا ہے تو اسے نہیں بھول سکا اور نہ چاند گڑھی والے بھول سکے ہیں۔“

”نہیں، میں بھول چکا ہوں چاچا۔ نہیں آتی اب مجھے اس کی یاد۔ وہ میری تھی ہی نہیں، اگر ہوتی تو اس طرح میرے آنے سے پہلے پنڈ نہ چھوڑتی اور چھوڑنا ہی تھا تو کوئی پتا ٹھکانا تو بتاتی۔ کبھی کوئی خط پتر تو لکھتی کہ اس دنیا میں ہے یا نہیں۔ وہ کہتی تھی کہ میں ایک بار گئی تو پھر نہیں آؤں گی اور اس نے ایسا ہی کیا ہے چاچا، اگر وہ اتنی کٹھور دل کی ہے تو پھر میں بھی کیوں کروں اسے یاد۔۔۔ کیوں کروں؟“

وہ ایک دم ہچکیوں سے رونے لگا۔ ایک بار اس کے ضبط کا بند ٹوٹا تو یوں لگا کہ سیلاب آ گیا ہے۔ اس نے اپنا سر اپنے گھٹنوں پر ٹکایا اور روتا چلا گیا۔ شمس اس کی کمر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اسے اپنے ساتھ لگانے لگا۔ وہ بھی شمس کے گلے لگ گیا۔ جیسے ایک ہمدرد کو پانے کے بعد اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال لینا چاہتا ہو۔

پتا نہیں یہ کیا رُوداد تھی مگر اقبال جس طرح ٹوٹ کر رویا تھا، وہ بڑا متاثر کن تھا۔

میں زیادہ دیر اس سردی میں کھلے آسمان کے نیچے اوندھا لیٹ کر یہ مناظر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہاں تک آنے کا میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ میں نے آج اس بے بس ”یاسر بھائی“ کو دیکھ لیا تھا جو پورے چاند گڑھی کے لیے بلکہ اردگرد کے علاقے کے لیے بھی ”ہیرو“ کی حیثیت رکھتا تھا۔ مجھے اس کی شخصیت نے بالکل متاثر نہیں کیا تھا۔

میں ایک بجے کے لگ بھگ موٹر سائیکل پر سوار چاند گڑھی واپس پہنچ گیا۔ حسبِ معمول انیق میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ فٹ بولا۔ ”شاہ زیب بھائی! آپ نے تو مجھے بیوی بنا کر رکھ دیا۔ ہے۔ آپ رات کو نکل جاتے ہیں اور میں تارے گنتا رہتا ہوں۔“

”لیکن آ کر تمہیں ایک زبردست کہانی بھی تو سناتا ہوں ہر بار۔“ میں نے کہا۔

”چلیں پھر سنائیں، اب کی بار کی کہانی۔“

میں نے اسے پچھلے دو ڈھائی گھنٹے کی ساری رُوداد کہہ سنائی۔ وہ بھی حیرت کے دریا میں گم ہو گیا۔ بہرحال میں نے اسے تاکید کی کہ وہ حق نواز وغیرہ کو اس بارے میں بھنک نہیں پڑنے دے گا۔

☆☆☆

فضاؤں میں آج کل نشہ سا بھرا ہوا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ میں زمین پر نہیں چلتا میرے پاؤں بے ساختہ ہوا پر حرکت کرتے ہیں اور میں اُڑتا ہوں۔ ایک عجیب ترنگ تھی، ایک عجیب میٹھا میٹھا درد تھا اور یہ جو کچھ بھی تھا، سب تاجور کی وجہ سے تھا۔ اس کا تصور ہر وقت میرے دل و دماغ کو جگمگاتا رہتا تھا۔ گاؤں کی ایک سہانی صبح میرے سامنے تھی۔ ہریالی پر اوس کے ننھے منے قطرے تھے اور کھیتوں پر ہلکا ہلکا کہرا دکھائی دے رہا تھا۔ جی چاہا کہ ایسے میں کہیں سے تاجور نمودار ہو جائے۔ مجھے دیکھ کر شرارت سے بھاگ اٹھے، میں اس کے پیچھے بھاگوں۔ ہم ایک ایسے گھرے کہرے میں چھپ جائیں جہاں کوئی ہمیں دیکھ نہ سکے۔ میں اپنے ہونٹوں کو اس کے حسین چہرے کے مقابل رکھ دوں اور سب

کچھ بھول جاؤں۔
انیق کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ''کہاں کھو گئے شاہ زیب بھائی۔''
میں نے کہا۔ ''اس منظر میں کھو گیا ہوں جو اس منظر میں نہیں کھوتا ...... میرے خیال میں وہ بالکل ''کھوتا'' ہے۔''
''لیکن میں کھوتا نہیں ہوں۔''
''تو آؤ پھر ذرا چہل قدمی فرمائیں۔'' میں نے خوشگوار موڈ میں کہا۔
ہم دونوں نکل پڑے۔ ہوا کسی ایسی الھڑ دوشیزہ کی طرح تھی، جسے کسی کا ہاتھ لگا نا تو دور کی بات ہے کسی نے میلی نظر سے دیکھا تک نہ ہو۔ کنوئیں سے آنے والی شفاف نالیوں میں پانی کی ''کل کل'' سنائی دیتی تھی۔ انیق نے ایک کیکر سے دو پتلی شاخیں توڑیں۔ ہم انہیں مسواک کی طرح استعمال کرتے ہوئے کچے راستے پر آگے بڑھنے لگے۔ گاؤں کی اس جانب ہم کبھی نہیں آئے تھے۔ دراصل میں پیر ولایت کا آستانہ دیکھنا چاہ رہا تھا۔ اس نیم پختہ آستانے پر دور ہی سے ایک بڑا جھنڈا لہراتا نظر آتا تھا۔ قریبی درختوں پر لوگوں نے منتوں مرادوں والی بے شمار دھجیاں باندھ رکھی تھیں۔ آستانے کے پیچھے سیاہ دیواریں تھیں، لگتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے یہاں زبردست آتشزدگی ہوئی جس نے سب کچھ راکھ کر دیا۔
''یہ کیا ہے انیق؟'' میں نے پوچھا۔
''سنا ہے جی کہ یہ پیر ولایت کے والد پیر سانتا جی کا ڈیرا تھا۔ چھ سات سال پہلے یہاں زبردست آگ لگ گئی تھی۔''
''پھر کوئی جانی نقصان ہوا یا بچ بچاؤ ہو گیا؟''
''اس کا تو پتا نہیں جی ......'' انیق بولتے بولتے رک گیا۔ اس کی نگاہ کچھ فاصلے پر کھڑے ایک شخص پر پڑی۔ صبح کی ان اولین گھڑیوں میں یہ سادہ لوح دیہاتی بڑی عقیدت کے ساتھ اس خاکستر جگہ کے سامنے دوزانو بیٹھا تھا اور ہاتھ جوڑ کر دعا وغیرہ مانگ رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ جگہ بھی لوگوں نے اپنی منتوں مرادوں کے لیے وسیلہ بنائی ہوئی ہے۔
انیق بولا۔ ''میرا خیال ہے ان بابا جی سے کچھ پوچھنا چاہیے۔''
میں نے اثبات میں سر ہلایا۔
لمبی داڑھی والا شخص اپنی ''مناجات'' سے فارغ ہوا تو ہم اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس نے جلی ہوئی جگہ کی کچھ سیاہی بڑی عقیدت سے اپنی پیشانی پر لگائی اور سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ (پہلے تو لوگ ہم سے بات ہی نہیں کرتے تھے کیونکہ ہم دین محمد صاحب کے ملازم تھے اور دین محمد کا گاؤں والوں نے بائیکاٹ کیا ہوا تھا مگر اب صورتِ حال مختلف تھی)
''کیا بات ہے پتر؟'' داڑھی والے نے انیق سے پوچھا۔
انیق بولا۔ ''بزرگوار! ہم نے سنا ہے کہ یہ پیر ولایت کے والد پیر سانتا جی کا ڈیرا تھا۔ یہ آگ میں جل گیا تھا۔ کیا پیر جی خود بچ گئے تھے؟''
''نہیں، وہ شہید ہو گئے تھے اور ..... یہ شہادت انہوں نے خود اپنے لیے چنی تھی۔''
''خود چنی تھی؟''
''ہاں ..... انہوں نے اس جگہ بیٹھ کر ایک سو بیس دن کا چلّہ کاٹا تھا۔ ہم گناہ گاروں کے سارے گناہ اور ہماری ساری برائیاں انہوں نے اپنے سر لے لی تھیں اور پھر اللہ پاک سے دعا کی تھی کہ وہ انہیں اٹھا لے۔ آسمان سے نور کی ایک لاٹ اتری تھی اور اس نے وڈے پیر جی کے خاکی پنڈے (جسم) کو ساڑ کر سواہ کر دیا تھا..... ہمارے گناہوں سمیت۔''
انیق حیرت سے اس جلے ہوئے کھنڈر کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں اب بھی لوگ پھول وغیرہ پھینکتے تھے۔ اسی دوران میں ایک اور ضعیف شخص بھی تسبیح پھیرتا ہوا وہاں آ گیا۔ اس نے ہمیں یہ واقعہ مزید تفصیل سے سنایا۔ 120 دن کے چلّے کے بعد ایک اندھیری رات میں آسمان سے روشنی کا ایک ستون سا اترا تھا اور اس نے وڈے پیر سانتا جی کے آستانے کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ پھر سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔ وڈے پیر جی کے ساتھ ان کے دو خاص مرید بھی ''شہید'' ہوئے۔ بزرگ کا کہنا تھا کہ اس جلے ہوئے آستانے سے سات سال بعد بھی ایک طرح کی خوشبو آتی ہے۔ اس نے ہمیں سونگھنے کو کہا ..... خوشبو واقعی محسوس ہوتی تھی۔ ہماری گفتگو کے دوران میں ہی پہلوان حشمت بھی چہل قدمی کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا اور خاموشی سے بیٹھ کر سفید براق لمبی داڑھی والے بابا جی کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔
لیکن کچھ دیر بعد جب ہم پہلوان حشمت کے ساتھ ڈیرے پر واپس پہنچے تو اس نے سرگوشیوں میں انیق کو کچھ

اور ہی کہانی سنائی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''اللہ سے ڈر لگت ہے بھیا کہ منہ سے کوئی غلط سلط بات نہ نکل جاوے..... مگر جو کچھ یہ باباجی بتا رہے تھے، بہت سے لوگوں کے نزدیک یہ صحیح نا ہیں ہے۔''

''تو صحیح کیا ہے؟'' انیق نے پوچھا۔

پہلوان حشمت نے اپنی آواز کچھ مزید دھیمی کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی نور کی لاٹ شاٹ نہیں اتری تھی۔ سب منہ زبانی باتیں ہیں۔ وڈے پیر کے ڈیرے میں آگ لگی تھی اور بس جل گیا تھا وہ۔''

''آگ کیسے لگی؟'' انیق نے پوچھا۔

''اگر میرے منہ سے کچھ غلط نکلے تو اللہ مجھے معاف کرے۔ بہت سے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ وڈے پیر نے ایک لڑکی کا جن نکالنے کے بہانے اس سے زیادتی کی تھی۔ وہ لڑکی ڈسکے کی طرف کسی پٹھان گھرانے کی تھی، بڑے ڈھاڈے لوگ تھے وہ۔ وہ آدھی رات کے وقت آئے۔ انہوں نے ڈیرے کے چاروں طرف پیٹرول پھینکا اور آگ لگا کر غائب ہو گئے۔ وڈا پیر ساتنا اور اس کے دو خاص چیلے اندر ہی جل کر خاک ہو گئے تھے۔ اس وقوعے کے دو دن بعد وہ پٹھان فیملی بھی غائب ہو گئی۔''

یہ حیرت ناک انکشاف تھا۔ انیق نے حشمت سے پوچھا۔ ''یہ پیٹرول اور آگ لگانے والی بات کا پتا کیسے چلا۔ کیا کسی نے پٹھانوں کو دیکھا تھا؟''

''ہاں، کچھ نے دیکھا بھی تھا لیکن سامنے آ کر کسی نے بات نہیں کی۔ اندر خانے کی کہانی کا بہت سے لوگوں کو پتا ہے۔'' حشمت نے کہا۔ پھر محتاط نظروں سے اردگرد دیکھا، جیسے کسی کے موجود نہ ہونے کی تسلی کرنا چاہتا ہو۔ سرگوشی میں بولا۔ ''بیس بائیس سال کی خوش شکل لڑکی تھی۔ اس کے وارثوں کا خیال تھا کہ اس پر سایہ ہے۔ وہ اسے وڈے پیر ساتنا کے پاس چھوڑ گئے تھے علاج معالجے کے لیے۔ وہ جن نکالنے کا دعویٰ بھی کرتا تھا۔ مریض کو ڈنڈوں سے مارتا تھا اور جب مریض چلاوت تھا تو ساتنا کہوت تھا کہ اس کے اندر کی بدروح چلاوت ہے۔ میں نے چھ سات سال کی ایک بچی کو خود اپنی گناہ گار آنکھوں سے دیکھا ہے۔ پیر ساتنا کے چیلوں نے ڈنڈے مار مار کر اس معصوم کی جان ہی لے لی تھی۔ آج بھی وہ منظر آنکھوں کے سامنے آوت ہے تو دل کانپ جاوت ہے۔''

پہلوان حشمت نے جھرجھری سی لی اور خاموش ہو گیا۔

میں نے انیق کو ٹھوکا دیا۔ وہ میرا مطلب سمجھ کر پہلوان حشمت سے نوجوان لڑکی سے زیادتی والے واقعے کی تفصیل پوچھنے میں مصروف ہو گیا۔ پہلوان کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ نوجوان لڑکی وارثوں کی سادہ لوحی کی وجہ سے چھ سات روز... ساتنا کے ڈیرے پر ہی رہی تھی۔ پیر اسے زیادتی کا نشانہ بناتا رہا اور ساتھ ساتھ ڈراتا رہا کہ اگر اس نے اپنے گھر والوں سے اس ''عمل'' کا ذکر کیا تو وہ مزید مصیبت میں پڑ جائے گی۔ اس سے چمٹا ہوا جن اس کا حشر نشر کر ڈالے گا۔ (چمٹا ہوا جن تو اصل میں پیر ساتنا خود ہی تھا)

لڑکی کے وارث لڑکی سے ملنے آئے تو اس نے سب کچھ اپنی ماں کے گوش گزار کر دیا۔ وہ لوگ خاموشی سے لڑکی کو لے گئے لیکن اس کا جو نتیجہ نکلا وہ... ساتنا کی سوچوں سے بہت آگے تھا۔ مشتعل وارثوں نے اسے اور اس کے دو مریدوں کو ڈیرے سمیت جلا کر راکھ کر ڈالا۔ بعدازاں پیر ساتنا کے بیٹے پیر ولایت اور خاص مریدوں نے اس سارے واقعے کو ایک اور رنگ دے دیا۔ انہوں نے کہا کہ پیر صاحب نے 120 دن کا جو چلّہ کاٹا تھا، اس میں انہوں نے اپنے چاہنے والوں کے سارے گناہ اپنے سر لے لیے ہیں اور ان گناہوں سمیت خالقِ حقیقی سے جا ملے ہیں۔

انیق نے کہا۔ ''اور حشمت بھائی! وہ جو خوشبو جلے ہوئے کھنڈر میں سے آتی ہے؟''

''وہ سب جھوٹ ہے۔'' حشمت نے جھلّائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اللہ معاف کرے۔ خوشبو تو ان عظیم لوگوں کی قبروں سے آوت ہے جو اللہ کی راہ میں جان دیوت ہیں۔ ایسے پاکھنڈیوں کے مرقد میں خوشبو کا کیا کام؟ یہ تو پیر ولایت کے چیلے چانٹے ہی ہیں جو خاموشی سے وہاں عطر وغیرہ پھینک دیوت ہیں۔ کچھ خوشبو ان پھولوں کی ہووت ہے جو لوگ وہاں چڑھاوت ہیں۔''

یہ اسی روز شام کی بات ہے۔ میں تین گھنٹے مسلسل ٹریکٹر چلانے کے بعد ابھی ابھی نیچے اترا تھا۔ پانی کے ایک کھالے کے کنارے بیٹھ کر اپنے پاؤں دھونے لگا۔ اس دوران میں دین محمد کی ملازمہ نوری نظر آئی۔ وہ سرسوں کا ساگ توڑ رہی تھی۔ بغل میں دو تین کلو ساگ ہو گا۔ میرے قریب... بیٹھ کر وہ ساگ کو شفاف پانی سے دھونے لگی۔ اردگرد کماد کے کھیت تھے۔ کوئی متنفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور ہولے سے بولی۔ ''کیا حال ہے بھائی شاہ زیب؟''

میں نے اشاروں سے بتایا کہ ٹھیک ہوں۔ اس کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ کھیل گئی۔ اردگرد دیکھ کر بولی۔ ''مجھ سے اشاروں میں بات کرنے کی لوڑ نہیں۔ میں جانتی ہوں بھائی، آپ بول سکتے ہیں۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا، تاجور نے اسے سب کچھ بتا رکھا ہے۔ وہ پانی کے قریب گھاس پر دوزانو بیٹھ گئی اور بولی۔ ''باجی کی کوئی بات مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہوتی۔''

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''پھر تو تم بڑے کام کی چیز ہو نوری۔''

''وہ تو میں ہوں۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

''تو پھر کچھ کرونا۔''

''کیا مطلب جی؟''

''تین چار دن ہوگئے ہیں اس کی شکل دیکھے ہوئے، بُرا حال ہے۔'' میں نے بھی معنی خیز لہجے میں کہا۔

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو بولتے سنا ہے بھائی، تو بچی ایسے لگا ہے، جیسے کسی بے زبان جانور کو بولتے دیکھ لیا ہے۔'' اپنی بات پر وہ خود ہی ہنسنے لگی۔

میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟''

''مجھے مار پڑوا دینی ہے آپ نے، مالک سے یا پھر باجی جی سے۔''

''باجی جی تو نہیں مارے گی۔ یہ تو میں گارنٹی دیتا ہوں تمہیں۔''

وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی۔ ''پرسوں کچھ گنجائش نکل سکتی ہے۔ مالک نے ایک رات کے لیے گوجرانوالہ جانا ہے۔ کوئی تاریخ شاریخ ہے۔''

''شاباش، یہ ہوئی نا بات۔ اب بتاؤ کیا کرنا ہوگا مجھے؟''

وہ ساگ کا پانی نچوڑتے ہوئے بولی۔ ''ابھی تو بس ذرا آہستہ بولنا ہوگا۔ کسی نے سن لیا تو ابھی پورے پنڈ میں رولا پڑ جائے گا کہ گونگا بولنا شروع ہوگیا ہے۔'' وہ شرارت آمیز انداز میں ہنسی۔

''آہستہ ہی بول رہا ہوں بھئی، تم زور سے ہنس رہی ہو۔''

اگلے دو تین منٹ میں طے ہوگیا کہ میں پرسوں رات گیارہ بجے کے بعد آؤں گا۔ لوہے کے دروازے کو بہت آہستہ انگلی کے ساتھ دو تین بار بجاؤں گا۔ نوری دروازہ کھول دے گی۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر سیدھا چھت پر چلا جاؤں گا۔

وہ تاریک رات میرے لیے بڑی سنسنی خیز تھی۔ میں ایسی تاریک راتوں میں دنیا کے خطرناک ترین کام کر چکا تھا۔ یورپ کے ایسے خونخوار گینگسٹرز کا سامنا کر چکا تھا جن کا نام سن کر ہی لوگوں کے جسموں میں کپکپی پیدا ہوجاتی ہے۔ ایسے ایسے ''رسکی ایڈونچرز'' میں حصہ لے چکا تھا جن میں ہر گھڑی جان ہتھیلی پر رہتی ہے لیکن اُس وقت بھی میرا دل اتنی بے قراری سے نہیں دھڑکا تھا جیسے آج دھڑ دھڑا رہا تھا۔ یہ ایک معمولی سا کام تھا۔ خاموشی سے تاجور کے گھر میں داخل ہونا اور پھر گھر کی چھت پر اس سے ملاقات کرنا۔ لیکن یہ معمولی کام میرے لیے معمولی نہیں رہا تھا۔ جب تاجور کی بات ہوتی تھی تو پھر ہر صورتِ حال اور ہر کیفیت اپنے معنی بدل لیتی تھی۔

حسبِ پروگرام میں نے لوہے کے بیرونی دروازے پر مدھم دستک دی۔ نوری نے دروازہ کھول دیا اور میں کچی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلا گیا۔ یہاں چار فٹ اونچی کچی منڈیر تھی۔ میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ وہ اوپر آئے گی بھی یا نہیں؟ آخر قدموں کی مدھم چاپ ابھری اور وہ میرے پاس پہنچ گئی۔ لرزاں آواز میں بولی۔ ''آپ یہ سب کیوں کررہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھے کسی بڑی مصیبت میں ڈال دیں گے۔''

''میرے ہوتے کوئی مصیبت تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتی۔'' میں نے بھی مدھم سرگوشی کی۔

''آپ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی دلیر نہیں ہوتے جارہے؟''

''جو کیا ہے، تم نے کیا ہے۔''

''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔''

''اسی طرح کھڑی رہو گی تو کوئی دیکھ لے گا۔''

وہ جھجکتی ہوئی چارپائی کے ایک سرے پر بیٹھ گئی۔

''اتنا ہٹ کر بیٹھو گی تو گر جاؤ گی۔''

''ہٹ کر نہ بیٹھا جائے تو بھی تو بندہ گر جاتا ہے شاہ زیب۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

مجھے اچانک یاد آیا کہ اس نے نوری کو پورا پورا رازداں بنا رکھا ہے اور میرے ''بے زبان'' نہ ہونے کے بارے میں بھی بتا دیا ہے۔ میں نے کہا۔ ''سیانے کہتے ہیں کہ بات جب تک اپنے سینے میں رہے تب تک اپنی رہتی ہے۔ تم نے نوری کو بتا دیا ہے کہ میں گفتگو کرسکتا ہوں۔''

''اگر نہ بتایا ہوتا تو آپ اس وقت یہاں بھی نہ ہوتے ..... ویسے جناب، نوری بالکل اور طرح کی لڑکی ہے، بے فکر رہیں۔''

دفعتاً ایک مدھم آواز نے مجھے چونکا دیا.... کوئی عورت بہت باریک آواز میں رو رہی تھی۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ شاید یہ تاجور کی بیمار والدہ ہے لیکن پھر غور کرنے پر پتا چلا کہ آواز پڑوس کے گھر سے ابھر رہی ہے۔ بہت دھیمی آواز تھی مگر اتنی دلدوز کہ روح میں چھید کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس میں جدائی کا دکھ تھا اور فاصلوں سے پیدا ہونے والا کرب تھا۔

''کون ہے یہ؟'' میں نے تاجور سے پوچھا۔

''چاچی حلیمہ..... ریشمی کی ماں۔''

''ریشمی؟ یہ کون ہے؟''

''تھی ایک بدنصیب۔'' تاجور کی آواز میں بھی بے پناہ دکھ عود کر آیا۔ ''میری سب سے قریبی اور گہری سہیلی۔''

''کیا ہوا اُس کے ساتھ؟''

''وہی جو ہوا کرتا ہے، پیار کرنے والوں کے ساتھ۔'' آخری الفاظ اس نے بڑی مشکل سے ادا کیے۔

''کہیں اور شادی ہو گئی اُس کی؟''

''شادی ہوتی یا .... مر بھی جاتی تو شاید ماں باپ کو چین آجاتا..... پر وہ تو ایسی لاپتا ہوئی کہ کبھی کھوج ہی نہیں ملا۔''

ایک دم میرے ذہن میں کوندا سا لپکا۔ مجھے وہ مختصر گفتگو یاد آئی جو میں نے قبرستان میں گورکن شمس اور کریانہ فروش اقبال کے درمیان سنی تھی۔ اس میں بھی کسی لڑکی کی گمشدگی کا ذکر تھا۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔ ''تاجور! یہ ریشمی وہی تو نہیں جس کا اقبال سے ملنا جلنا تھا۔''

''ملنا جلنا نہیں شاہ زیب، وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے بغیر جینے کا سوچا بھی نہیں تھا انہوں نے...... لیکن انہیں جینا پڑا..... اسی لیے سیانے کہتے ہیں نا شاہ زیب! یہ کانٹوں بھرا راستہ ہے۔ اس پر جو بھی چلا ہے، لہولہان ہی ہوا ہے۔''

میں یہاں آیا تھا تاجور سے کچھ میٹھی میٹھی باتیں کرنے کے لیے۔ اسے پھر سے چھونے کی آرزو لے کر۔ لیکن یہاں تو ایک اور ہی سنگین موضوع چھڑ گیا تھا جس لڑکی کے گم ہونے کی بات میں نے پانچ دن پہلے اقبال کے منہ سے سنی تھی وہ تاجور کی بہت گہری سہیلی... تھی اور دوسروں کی طرح تاجور بھی اس کی جدائی کو بے طرح محسوس کرتی تھی۔

اگلے پندرہ بیس منٹ انکشاف انگیز تھے۔ اس ٹھٹھری ہوئی شب میں تاریک چھت پر مجھ سے تین فٹ کے فاصلے پر بیٹھ کر تاجور نے اقبال اور ریشمی کے بارے میں جو کچھ بتایا، وہ اس طرح تھا۔

وہ دونوں اسی گاؤں کے تھے اور لڑکپن سے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ریشمی کی صورت کی طرح اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی۔ وہ شادی بیاہ کے موقع پر گانا

گاتی تھی تو سننے والے دم بخود رہ جاتے تھے۔ ریشمی کے لیے کچھ بننے کی خاطر اقبال چند سال پہلے مسقط چلا گیا۔ مگر وہاں بھی اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ملی۔ اسی دوران میں ریشمی کے والدین کا ارادہ بدلنا شروع ہو گیا۔ چاند گڑھی میں رہنے والا پرویز نامی ایک لڑکا لاہور میں ایک بڑے ٹھیکیدار کے پاس ملازمت کرتا تھا۔ ٹھیکیدار لاہور جیسے بڑے شہر میں کوٹھیاں وغیرہ بنانے کا کام کرتا تھا۔ پرویز کے حالات بھی بدل رہے تھے۔ وہ چاند گڑھی آتا تو لوگوں کو لاہور میں اپنے ٹھاٹ باٹ کے واقعات سناتا۔ ریشمی کے والدین اس کی باتوں میں آنے لگے۔ ایک دن ایسا آیا جب انہوں نے اپنی بچی کی خوش حالی کی خاطر اس کا رشتہ پرویز سے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ریشمی کا ہر احتجاج ناکام ہوا۔ وہ بیاہ کر لاہور چلی گئی۔ چاند گڑھی سے بہت دور ہو گئی۔ ایک سال کے دوران میں وہ بس دو تین دفعہ ہی چاند گڑھی آئی۔ ہر وقت ہنسنے کھیلنے اور گیت گانے والی ریشمی بالکل گم صم نظر آتی تھی۔ وہ کچھ بتاتی نہیں تھی مگر پورا گاؤں جانتا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے پھر ایک دن گاؤں والوں پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ پرویز اسے گانے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ ہوٹلوں اور گھریلو محفلوں میں پیسے لے کر گانے گاتی ہے، اور اس کے علاوہ بھی اس کے ساتھ بہت بُرا ہو رہا ہے۔ پرویز اسے اپنے جاننے والوں کے ساتھ تعلق رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ پرویز غنڈا ٹائپ شخص تھا۔ سب اس سے ڈرتے تھے۔ ریشمی کے بوڑھے ماں باپ بھی اس سلسلے میں خاطر خواہ احتجاج نہیں کر سکے۔ کچھ لوگوں نے پولیس میں رپورٹ درج کرانے کے مشورے دیے مگر اس پر بھی عمل نہ ہو سکا۔ پرویز کا اٹھنا بیٹھنا بھی عالمگیر گروپ کے ساتھ تھا۔ پھر ایک دن وہ ریشمی کو پھر یہاں چاند گڑھی میں لے آیا۔ اس کا بچہ ضائع ہوا تھا اور وہ برسوں کی بیمار نظر آتی تھی۔ اس کے جسم پر چوٹوں کے نشان بھی تھے۔ یہ چوٹیں یقیناً اس سے ہونے والی مار پیٹ کا نتیجہ رہی ہوں گی۔ پرویز اس کا حکیمی علاج کروا رہا تھا کیونکہ اس کا ٹائیفائیڈ اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ وہ نماز روزے کی طرف بھی متوجہ ہو گئی تھی۔ کئی لوگوں نے اسے وظیفہ وغیرہ پڑھتے بھی دیکھا۔ نوجوانی میں ہی بڑی بوڑھیوں کی طرح سنجیدہ ہو گئی تھی۔ کبھی کہتی تھی میں ملنگنی بن جاؤں گی، کسی کو بتائے بغیر کسی طرف نکل جاؤں گی۔ یہ بھی پتا چلا کہ پرویز اس کے ٹھیک ہونے کا انتظار کر رہا ہے اور جب وہ ٹھیک ہو جائے گی وہ اسے پھر لاہور لے جا کر اپنی من مانی شروع کر دے گا۔ اقبال مسقط سے ناکام ہو کر واپس آ چکا تھا۔ وہ اپنی یادوں کے سہارے زندہ تھا۔ ریشمی کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتا تھا لیکن کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ ایک دفعہ اس کی پرویز سے منہ ماری ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پرویز نے اسے بری طرح پیٹ دیا۔ اس کے کچھ ہی دن بعد ریشمی اچانک گاؤں سے غائب ہو گئی۔ جاتے جاتے وہ اپنی عزیز ترین سہیلی تاجور کے نام ایک مختصر رقعہ چھوڑ گئی۔ اس نے لکھا کہ وہ اپنی مرضی سے جا رہی ہے۔ کوئی اسے تلاش نہ کرے۔ اس دنیا سے اس کا پیٹ بھر گیا ہے، اب وہ کسی اور دنیا کی تلاش میں ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اسے آنے والے وقت میں بہت تلاش کیا گیا۔ خاص طور سے اس کے والدین اور شوہر "پرویز عرف پیجا" نے بہت بھاگ دوڑ کی لیکن کوئی کھوج نہیں ملا۔ اب تک یہ صورتِ حال برقرار تھی۔

اپنی عزیز ترین سہیلی کی رُوداد بیان کرتے ہوئے تاجور کی آنکھیں کئی بار نم ہوئیں۔ آخر میں وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ "کبھی کبھی سوچتی ہوں، شاید یاسر بھائی اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکیں۔ اپنے پنڈ کے ہر بندے کا انہیں بہت خیال رہتا ہے۔ جب وہ یہاں تھے ریشمی کی گمشدگی کے بارے میں اکثر بات کرتے تھے ...."

میں نے دھیان سے تاجور کی طرف دیکھا۔ آسمان پر تاروں کی برات تھی۔ سرد ہوا شمالاً جنوباً چل رہی تھی۔ اس ہوا نے تاجور کے چہرے کی آوارہ لٹوں کو رقصاں کر دیا تھا۔ وہ انہیں بار بار سنبھالنے کی کوشش کرتی تھی، ایسے میں اس کی گوری کلائی کی چوڑیاں چھن چھن بج اٹھتی تھیں۔

وہیں تاجور کے سامنے بیٹھے بیٹھے، اس گھڑی پتا نہیں میرے دل میں کیا آئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تاجور! جو کام تم یاسر بھائی سے کروانا چاہتی ہو، وہ میں کر دوں تو؟"

"کیا مطلب؟"

"پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اگر ایک بار تم اپنی زبان سے یہ کہہ دو کہ میں تمہاری سہیلی کا کھوج لگاؤں تو یہ کھوج لگ جائے گا۔ ضرور لگ جائے گا۔"

"یعنی آپ ڈھونڈنے نکلیں گے اُسے؟"

"ہاں، لیکن اگر تم کہو تو اور میں اس میں زیادہ دیر بھی نہیں لگاؤں گا۔ وہ جہاں اور جس حال میں بھی ہے، اس کا پتا تمہیں دوں گا۔"

"کس طرح شاہ زیب! جو کام اب تک نہیں ہو سکا اور ...."

''بس اس بارے میں تم چپ رہو۔ بس ایک بار اپنے منہ سے ذرا پیار کے ساتھ اتنی بات کہہ دو .... شاہ زیب! پلیز آپ میرے لیے ریشمی کا پتا چلائیں .... بس یہ آٹھ نو الفاظ کافی ہوں گے۔''

وہ حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کر میری طرف دیکھنے لگی۔ ''کیا آپ کے پاس کوئی گیدڑ سنگھی ہے یا جادو ٹونا؟''

''دونوں چیزیں ہیں۔ اور وہ دونوں چیزیں تمہارے روپ میں میرے سامنے موجود ہیں۔''

''آپ کیا چیز ہیں شاہ زیب؟''

''اس چکر میں نہ ہی پڑو تو اچھا ہے۔ بس جو آٹھ نو لفظ میں نے کہے ہیں، وہ پیار سے کہہ دو۔''

اس نے ایک گہری سانس لی اور لرزاں ہونٹوں سے مسکرا کر بولی۔ ''ٹھیک ہے .... میں کہہ رہی ہوں۔''

''نہیں بھئی، منہ سے ادا کرو، اور پوری سنجیدگی کے ساتھ۔''

وہ جھینپے ہوئے انداز میں پھر مسکرائی اور بولی۔ ''شاہ زیب! پلیز آپ میرے لیے ریشمی کا پتا چلائیں۔''

''اس کا انعام کیا ہوگا؟'' میں نے بے باکی سے پوچھا۔

''شرافت کے دائرے میں رہ کر آپ جو مانگیں گے۔''

''وعدہ رہا، شرافت کے دائرے میں ہی رہوں گا، ڈیل فائنل۔''

''لیکن شاہ زیب ....''

''بس اب کوئی سوال جواب نہیں۔ ڈیل فائنل ہاں اگر کچھ ایڈوانس میں دینا چاہو تو ....''

''ایڈوانس ....؟''

''بھئی، ڈیل میں تھوڑا بہت ایڈوانس تو ہوتا ہے نا۔''

اس کے چہرے پر شرم کا رنگ لہرا گیا۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اٹھتے اٹھتے، جھونک میں لہرا کر پھر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ تاہم اس مرتبہ وہ بالکل میرے پہلو میں تھی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور اس کی لٹوں کو چوما۔ ''پلیز چھوڑیں، کوئی آجائے گا۔'' وہ ہراساں آواز میں بولی۔

میں نے اس کی گردن کو اپنے ہونٹوں سے چھوا۔ وہ تڑپ کر اٹھ گئی اور کئی فٹ دور جا کھڑی ہوئی۔

''اتنا تھوڑا ایڈوانس؟'' میں نے شرارت سے کہا۔

''آپ بھول رہے ہیں، آپ نے انعام کی بات کی تھی اور انعام میں ایڈوانس وغیرہ کوئی نہیں ہوتا اور اب پلیز آپ چلے جائیں۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔''

''بہت دیر ہوگئی ہے؟ یہ تو کچھ بھی نہیں ہوئی۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''بہرحال، میں چلا جاتا ہوں۔ بس ریشمی کے بارے میں دو تین مزید سوال پوچھنے ہیں۔''

وہ چند سیکنڈ تذبذب میں رہ کر بیٹھ گئی مگر اب اس دوسری چارپائی پر بیٹھی جو پانچ چھ فٹ دور تھی۔ میں بھی اب سنجیدہ ہو چکا تھا۔ میں نے تاجور سے چند سوال مزید کیے اور پھر اسے بھرپور امید دلائی کہ میں بہت جلد اسے ریشمی کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور بتاؤں گا۔

اگلے روز میں نے انیق کے ذمے لگایا کہ وہ ریشمی کے گم ہوجانے والی رُوداد کی تفصیل معلوم کرے اور یہ جانے کہ آخری بار اسے کب اور کہاں دیکھا گیا تھا۔ حسبِ توقع انیق نے اللہ دین کے جن کی طرح کام کیا اور صرف 24 گھنٹے میں مجھے ایک اہم اطلاع پہنچائی۔ اس اطلاع کے مطابق ریشمی کو آخری بار دیکھنے والے چاند گڑھی کے ہی ایک میاں بیوی تھے۔ رام پیاری اور اس کا بیمار شوہر وکرم۔ یہ کچھ عرصے پہلے کی بات تھی۔ ان دنوں وکرم کی طبیعت اتنی زیادہ خراب نہیں تھی۔ وہ سہارے کے ساتھ چل پھر سکتا تھا۔ وہ دونوں کہیں سے آرہے تھے۔ انہوں نے میرپور کے بس اڈے پر ایک ملنگ لڑکی کو دیکھا تھا۔۔۔ وہ ریشمی تھی۔ اس واقعے کی مزید تفصیل رام پیاری سے مل کر معلوم کی جاسکتی تھی۔ اس روز رات کو میں ایک بار پھر ''یاسر بھائی'' والے کاسٹیوم میں فیض پور گاؤں پہنچا۔ میرا اصل مقصد رام پیاری سے ملنا تھا۔ تاہم میں ماڈل گرل ورقاصہ جاناں کو بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ابھی تک وہیں تھی اور اسے تسلی تشفی کی ضرورت تھی۔

رات بارہ بجے کے لگ بھگ میں نے فیض پور پہنچ کر رام پیاری کی قیام گاہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے وکرم کے کھانسنے کی مدھم آواز ابھر رہی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی شاید رام پیاری بھی جاگ رہی ہوگی۔ میں نے دیکھا تھا کئی بار وہ رات رات بھر شوہر کے سرہانے بیٹھی رہتی تھی۔ میرا خیال درست نکلا۔ جلد ہی دروازے کی دوسری جانب رام پیاری کی ڈری ڈری آواز ابھری۔ ''کون ہے؟''

''یاسر۔'' میں نے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔

دروازے کی جھری میں سے دیکھنے کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح زرق برق لباس میں

تھی۔ کانوں میں جھمکے، ناک میں چھوٹی سی نتھلی، ہونٹوں پر لالی کے مدھم آثار تھے۔ اس کے شوہر کی یہ عجیب منطق تھی۔ وہ آخری دم تک اپنی شریکِ حیات کو خوب صورت اور بنا سنورا دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی رام پیاری نے دروازے کو کنڈی چڑھا دی۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد میں نے اس سے جاناں کے بارے میں پوچھا۔

اس نے اپنے نم بال اوڑھنی کے نیچے سمیٹے اور بولی۔ ''بھگوان کا شکر ہے، اب وہ تھوڑا بہت بھوجن لینے لگی ہے۔ بات شات بھی کر لیتی ہے۔ اسے آپ کا بہت انتظار تھا۔''

''کہاں ہے؟''

''اپنے کمرے میں ہی ہوگی۔''

میں نے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہا لیکن وہ پہلے ہی تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ وہ لحاف اوڑھے سو رہی تھی۔ سرہانے کی طرف لالٹین کی ہلکی روشنی تھی۔ اس کی گردن اور رخساروں پر ابھی تک تشدد کے نشان موجود تھے۔ میں نے بہت آہستہ سے اسے جگایا لیکن وہ پھر بھی ڈر گئی۔ خاص طور سے میرے ڈھاٹے نے اسے ڈرایا۔ وہ چلائی اور جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی، اس کی آنکھوں میں ہراس اور کرب کی یلغار تھی۔ ''نہیں نہیں..... مجھے کچھ نہ کہنا..... میں نے کچھ نہیں کیا۔'' اس نے کہا اور بستر سے چھلانگ لگا کر دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔

میں نے اسے بازو سے تھام لیا۔ تب تک میرا رخ لالٹین کی طرف ہو چکا تھا اور وہ مجھے زیادہ اچھی طرح دیکھ سکتی تھی۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ مزاحمت بھی ختم ہو گئی۔ ''میں یاسر ہوں۔'' میں نے اسے جھنجوڑ کر کہا۔

اسے پتا نہیں کیا ہوا کہ اس نے اپنی پیشانی میرے شانے سے لگائی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ اسی دوران میں رام پیاری بھی گھبرائی ہوئی اندر آ گئی تھی۔ میں نے اشارے سے اسے باہر جانے کے لیے کہا۔

چار پانچ منٹ بعد جاناں آنسو وغیرہ بہا کر نارمل ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں پر بس ایک ہی بات تھی۔ ''میں یہاں سے واپس کب جاؤں گی؟''

میں نے کہا۔ ''اگر دیر ہو رہی ہے جاناں..... تو اس میں تمہاری بہتری ہی ہے..... زیادہ نہیں، لیکن ایک ہفتہ انتظار تو تمہیں کرنا ہی لینا چاہیے۔''

میرے سمجھانے بجھانے سے اس کی بے قراری کم ہو گئی۔ وہ سب سے زیادہ پاشا اور تھانے دار قیصر چودھری سے خوف زدہ تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میری معلومات کے مطابق۔ قیصر زخمی ہے اور ابھی تک لاہور کے اسپتال میں ہے جبکہ پاشا یہاں سے واپس جا چکا ہے اور اگر ہوتا بھی تو میرے ہوتے تمہارے قریب نہ پھٹک سکتا۔

رام پیاری کاڑھنی کا گرم دودھ دے گئی۔ میں نے اصرار کر کے جاناں کو بھی پلایا۔ وہ رام پیاری اور وکرم کی باتیں کرنے لگی۔ وہ میاں بیوی کے پیار کو دیکھ کر ششدر تھی۔ اسے یقین نہیں ہوتا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ اس نے ایک بات بتا کر مجھے بھی حیران کر دیا۔ بولی۔ ''آج ان کی شادی کی سالگرہ تھی۔ تم یہ سن کر حیران ہو جاؤ گے کہ انہوں نے شادی کی سالگرہ اسی طرح منائی ہے جس طرح عام لوگ مناتے ہیں۔ رام پیاری نے پتی کو بھی نئے کپڑے پہنائے، خوشبو لگائی۔ اچھا کھانا پکایا۔ حلوہ پوری کی خوشبو تو تمہیں بھی آ رہی ہوگی؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ زیرِلب مسکرا کر بولی۔ ''شام کے بعد سے دونوں کمرے میں اکٹھے ہی تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی لالٹین روشن کی ہے انہوں نے۔''

مجھے رام پیاری کے گیلے بال یاد آئے۔ وہ یقیناً کچھ ہی دیر پہلے نہا کر نکلی تھی۔

جاناں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ ''وکرم کو ٹی بی ہے۔ کیا اس طرح اس کے قریب جانے سے رام پیاری کو بیماری نہیں لگے گی؟''

میں نے کہا۔ ''ٹی بی اسپتالوں میں جو ملازم دن رات مریضوں میں گھرے رہتے ہیں، وہ بھی تو بچ ہی جاتے ہیں۔ صحت، بیماری اوپر والے کے ہاتھ میں ہے اور شاید رام پیاری کو بھی اس پر یقین ہے۔''

واقعی بات سوچنے کی تھی۔ وہ بے خوف ہو کر دن رات تپ دق زدہ شوہر کی خدمت میں مصروف تھی۔ یہی مشرق ہے۔ اگر یہ ناروے یا انگلینڈ کی کوئی گوری ہوتی تو شوہر سے کم از کم بیس میٹر کا فاصلہ برقرار رکھتی اور زیادہ امکان یہی تھا کہ اب تک طلاق لے کر کسی اور کے بیڈروم کو جگمگا رہی ہوتی۔ میرے دل میں اس جوڑے کے لیے اور خاص طور سے رام پیاری کے لیے مزید ہمدردی اور انسیت پیدا ہو رہی تھی۔

میں نے رام پیاری سے علیحدگی میں ملاقات کی اور اس سے ریشمی والے واقعے کے بارے میں تفصیل سے

پوچھا۔
ریشمی کے ذکر نے رام پیاری کو بھی اداس کر دیا۔ وہ بولی۔ ''سچ یہ ہے یاسر بھائی کہ تاجور کی طرح وہ بھی بڑی اچھی لڑکی تھی۔ بڑی سندر، بہت ہمدرد، دونوں گہری سہیلیاں تھیں۔ ایسا پریم کم ہی دیکھنے میں آتا ہے لیکن دونوں بے چاریوں کے ساتھ انیائے ہوا۔ تاجور کے پلے ایک ایسا منگیتر پڑ گیا جس نے اس کا جیون عذاب بنا دیا..... اور یہ بے چاری ریشمی بدمعاش پتی کے ہتھے چڑھ گئی۔ وہ اسے دلہن بنا کر شہر لے گیا اور وہاں اس کی کمائی کھانا شروع کر دی۔'' رام پیاری کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔

جلد ہی اسے اصل موضوع پر لے آیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ میرپور کے لاری اڈے پر اس کی ملاقات ریشمی سے کب اور کیسے ہوئی۔

اس نے بتایا۔ ''یاسر بھائی، کوئی سات ماہ ہونے کو آئے ہیں۔ پر وہ منظر مجھے ابھی تک پہلے روز کی طرح یاد ہے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ وکرم کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ کسی نے مجھے کوٹلی کا بتایا اور کہا کہ وہاں ایک کشمیری سنیاسی ہے جو ہر روگ کا علاج کر سکتا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے کرائے اور خرچے کے پیسے جمع کیے اور وکرم کو وہاں لے گئی۔ جب ہم واپس آ رہے تھے تو میرپور کے اڈے پر لاری تھوڑی دیر کے لیے رکی۔ وہاں کھڑکی سے میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک عورت سے کھینچا تانی کر رہے تھے۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ یہ ریشمی تھی۔ اس نے فقیروں جیسا چولا پہنا ہوا تھا۔ سر اور پاؤں سے ننگی تھی۔ دو تین مشٹنڈے اسے اٹھا کر ایک ویگن میں ڈالنا چاہتے تھے۔ بھگوان کی کرپا سے تین چار دکاندار آ گئے اور انہوں نے غنڈوں سے مار پیٹ شروع کر دی۔ اسی دوران میں ریشمی موقع سے فائدہ اٹھا کر کہیں غائب ہو گئی۔''

''تم نے ٹھیک سے دیکھا تھا، وہ ریشمی ہی تھی؟''

''ہاں بھائی، مجھے اتنا ہی وشواش ہے جتنا یہ کہ تم میرے سامنے بیٹھے ہو۔ وہ ریشمی تھی لیکن بالکل بدلی بدلی۔ میں نے اسے لاری کی کھڑکی میں سے دیکھا۔ ہمارے درمیان کیول دو تین گز کا فاصلہ رہا ہوگا۔''

میں نے رام پیاری سے کچھ مزید معلومات حاصل کیں اور اسے بتایا کہ میں ریشمی کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری یہ بات اسے بہت پسند آئی اور اس کی آنکھیں پھر نم ہو گئیں۔ میں نے دوسرے کمرے میں جا کر وکرم کا حال احوال بھی دریافت کیا۔ وہ بستر پر نیم دراز انگیٹھی تاپ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ وہ اب پہلے سے کچھ بہتر ہے۔ کسی وقت دل میں یہ خیال آتا تھا کہ شاید وہ زندگی کی طرف لوٹ ہی آئے۔ اس کی یہ سالگرہ آخری سالگرہ ثابت نہ ہو۔ رام پیاری بھی ہمارے قریب آن کھڑی ہوئی۔ صحن میں بندھی ہوئی بکری ممیائی تو ہم تینوں کو ایک ساتھ مولوی فدا محمد کی یاد آ گئی۔ مولوی صاحب اب اس دنیا میں نہیں تھے لیکن چاند گڑھی میں انہوں نے اس غیر مسلم جوڑے کے لیے جو کچھ کیا تھا اور جس طرح ان کے سامنے ڈھال بنے تھے، وہ یادگار تھا۔

ہم نے دو چار منٹ مولوی فدا اور ان کی بیمار بچی کا ذکر کیا جس کا اسلام آباد میں علاج ہو رہا تھا۔ پھر میں میاں بیوی اور جاناں سے رخصت ہو کر بیرونی دروازے کی طرف آ گیا۔ رام پیاری مجھے باہر تک چھوڑنے آئی۔ وکرم کی طرح یقیناً اس کی بھی خواہش رہی ہوگی کہ میں کم از کم ایک بار تو انہیں اپنی صورت دکھاؤں لیکن پچھلی بار میں نے چونکہ رام پیاری کو سختی سے منع کر دیا تھا۔ لہٰذا اس مرتبہ یہ خواہش اس کی زبان پر نہیں آئی۔ پتا نہیں کہ میری نقاب پوشی کے حوالے سے وہ دل میں کیا کیا سوچتے ہوں گے۔ جاناں بھی اس سلسلے میں مسلسل الجھن میں تھی۔ میں موٹر سائیکل پر واپس چاند گڑھی روانہ ہوا۔ گمشدہ ریشمی کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک پروگرام ترتیب پا رہا تھا۔

☆☆☆

اب انیق اور میں دونوں ریشمی کا کھوج لگانے کے مشن پر تھے۔ ہم نے پہلے پیدل اور پھر دیہاتی تانگے کے ذریعے قریباً بیس میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ تب پکی سڑک سے کھٹارا بس پر بیٹھے تھے اور اب میرپور سے ہوتے ہوئے کوٹلی کے آس پاس پہنچ چکے تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ سردیوں کی خوشگوار دھوپ چمک دکھا رہی تھی۔ سڑک کی دونوں جانب حدِ نگاہ تک سرسبز ٹیلے تھے۔ کہیں کہیں مکئی اور گنے کے کھیت بھی دکھائی دیتے تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے ہم نے چاند گڑھی کے قدیم باسیوں، سونگی اور پہلوان حشمت کے ساتھ بیٹھ کر کوٹلی کے علاقے میں موجود مزاروں، آستانوں اور خانقاہوں کا ایک نقشہ تیار کیا تھا۔ اس نقشے کے مطابق کوٹلی سے آگے پہاڑی اور نیم پہاڑی علاقے میں کم و بیش دس اہم مزار اور آستانے موجود تھے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر ہم نے دلجمعی سے کوشش کی تو انہی جگہوں

میں سے کسی جگہ سے ریشمی کا کھوج کھرا مل جائے گا۔
چند دن پہلے میں نے دین محمد صاحب سے ایک دو روز کی رخصت مانگی تھی۔ اب اس مشن کے پیشِ نظر میں نے اس رخصت کی مدت میں اضافہ کر دیا تھا۔ میں نے دین محمد صاحب سے پانچ دن کی چھٹی کی درخواست کی تھی اور انہوں نے قبول کر لی تھی۔ انیق نے بتایا تھا کہ پاکستانی دستور کے مطابق ہم ان پانچ دنوں میں دو تین دن کا اضافہ اپنی طرف سے بھی (بہ امر مجبوری) کر سکتے ہیں۔
اب ہم چاند گڑھی سے کافی سے زیادہ دور آ چکے تھے، اس لیے ضروری نہیں تھا کہ میں اپنا گونگے والا روپ برقرار رکھوں۔ میں اور انیق آزادانہ باتیں کر رہے تھے اور کھا پی بھی رہے تھے۔ چاول کی پنیاں، باداموں والا گڑ، مرونڈا اور بھنے ہوئے مکئی کے بھٹے، سب کچھ اس کھٹارا لاری کے اندر ہی دستیاب تھا۔ راستے کے دلکش مناظر دل کو لبھا رہے تھے۔ اور کچھ بستیوں میں اٹکھیلیاں کرتی ہوئی زندگی کے میٹھے سُر کانوں میں رس گھول رہے تھے۔ پاکستان میں وارد ہوتے ہی مجھ پر جو عظیم سانحہ گزرا تھا، وہ ناقابلِ برداشت تھا۔ مجھے لگا تھا کہ پاکستان سے جانے کے بعد بھی میں مدتوں اس دکھ کے حصار سے نکل نہیں سکوں گا۔ لیکن عجب بات تھی۔ میں پاکستان میں ہی تھا اور میرے زخموں کا مداوا بھی ہو رہا تھا۔ شہری زندگی کے لگائے ہوئے گھاؤ..... دیہی زندگی بھر رہی تھی۔ تاجور کی من موہنی صورت میری نگاہوں میں چمکی۔ میری نظر دور ایک سرسبز پہاڑی ڈھلوان پر جم گئی۔ ایک چھوٹا سا تنہا گھر دکھائی دیا۔ میرا دل چاہا، میں ایسی ہی کسی دور دراز ڈھلوان پر کسی تنہا گھر کے اندر تاجور کے ساتھ اپنی ساری زندگی گزار دوں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کیا وہ مصیبتیں جو یورپ سے میرے ساتھ لگی ہوئی ہیں، میرا پیچھا چھوڑ دیں گی؟
پروگرام کے مطابق رات کو ہم نے اپنا پہلا پڑاؤ ایک نیم پہاڑی مقام پر کیا۔ یہاں کسی نوری سائیں کا مزار تھا اور اس نسبت سے اس جگہ کو نوری پور کہا جاتا تھا۔ یہاں ایک بڑے احاطے میں مریدوں کے رات گزارنے کا انتظام بھی تھا۔ یہاں ہم نے کئی ایک خرافات دیکھیں لیکن ایک بےہودہ عمل نے دل و دماغ کو بہت مکدر کیا۔
ایک جوان لڑکی کو درخت سے باندھا گیا تھا۔ سخت سردی میں بھی بےچاری نے گرمیوں والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ سر پاؤں سے ننگی تھی۔ ایک موٹی تازی عورت گاہے بگاہے اس کے جسم پر ٹھنڈے یخ پانی کی بالٹی انڈیل دیتی تھی۔ پانی گرنے پر لڑکی تکلیف سے چلاتی تھی اور جان بخشی کی التجائیں کرتی تھی۔ بار بار بھیگنے سے اس کا لباس جسم کا حصہ ہی بن گیا تھا اور وہ دور سے دیکھنے پر عریاں نظر آتی تھی۔ دیکھنے والے کن انکھیوں سے اسے دیکھتے تھے۔ ایک مرید نے بتایا کہ اس پر جن ہے۔ یہ صحرائی علاقے کا جن ہے اور ٹھنڈے پانی سے بہت ڈرتا ہے۔ پانی ڈال کر لڑکی کا علاج کیا جا رہا ہے۔ اس صورتِ حال پر مجھے ایک بار پھر چاند گڑھی کے پیر ساحتا کے لرزہ خیز واقعات یاد آ گئے۔ پہلوان حشمت راہی نے پورے وثوق سے کہا تھا کہ پیر ساحتا نے ایک لڑکی کی عزت تاراج کی اور اس کے پٹھان وارثوں نے غیرت میں آ کر ساحتا کو دو مریدوں سمیت خاکستر کر دیا۔ جہاں توہمات ہوں وہاں اس طرح کے سانحے ہونا بڑی بات نہیں ہوتی۔
ہم اگلے روز دوپہر تک اس مزار پر رہے اور یہاں ریشمی کا کھوج لگایا۔ اندازہ یہی ہوا کہ ریشمی یہاں موجود نہیں، کم از کم اس وقت تو نہیں۔
ہماری اگلی منزل تقریباً آٹھ کلومیٹر دور ایک اور آستانہ تھا۔ یہ بھی پہاڑی جگہ تھی۔ یہاں ایک گاؤں بھی آباد تھا۔ کئی گز لمبی ایک قبر تھی۔ قبر پر بڑا سا سائبان تھا اور سائبان پر ان گنت جھنڈے لہرا رہے تھے۔ یہاں سازوں پر بڑے جوش خروش سے کچھ گایا جا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسے قوالی کہتے ہیں۔ سامعین میں سے کچھ لوگ اپنے سر کو گول گول حرکت دے رہے تھے۔ اور عجیب کیفیت میں نظر آتے تھے۔ میرے پوچھنے پر انیق نے کہا۔ ''اسے حال چڑھنا کہتے ہیں۔''
اس جگہ پر بھی ہمیں ریشمی کا کوئی اتا پتا نہیں ملا۔ ہم نے کئی افراد سے اس بارے میں سن گن بھی لی۔ مگر اگلی صبح جب ہم وہاں سے آگے روانہ ہونے والے تھے، ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ہم نے لنگر خانے کی سیڑھیوں پر ایک شخص کو بےہوش پڑے دیکھا۔ اس کی عمر پچیس کے لگ بھگ ہو گی۔ ہٹا کٹا تھا اور براؤن رنگ کی خستہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے پر آٹھ دس روز پرانی چوٹوں کے نشان تھے۔ دو تین افراد اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے، باقی تماشا دیکھ رہے تھے۔ ایک شخص نے اس کی بوسیدہ جرسی اوپر اٹھا کر اس کی جیب ٹٹولی۔ کچھ ریزگاری کے علاوہ مڑے تڑے سگریٹ نکلے۔ وہ سونگھ کر بولا۔ ''چرس والے ہیں۔''
دوسرے نے کہا۔ ''لگتا ہے زیادہ پینے سے ہی اس کا

یہ حال ہوا ہے مگر اسے پہلے یہاں نہیں دیکھا۔"
پہلا شخص بولا۔ "رات کو ہی آیا ہے یہاں۔ کہتا تھا آگے جانا ہے مجھے، کسی گاؤں کا نام لے رہا تھا۔ پتا نہیں چاند پور کہ چاند گڑھی۔۔۔"

چاند گڑھی کے الفاظ پر میں اور انیق بری طرح چونکے۔ ہم جو آگے بڑھنے کا ارادہ کر رہے تھے وہیں پر ٹک گئے۔ کچھ دیر بعد اس شخص کو ہوش آ گیا۔ وہ لال انگارا آنکھوں سے اردگرد دیکھنے لگا۔ اسے آستانے کے خاص گھڑے میں سے پانی پلایا گیا اور کھانے کے لیے کاغذ پر حلوہ رکھ کر دیا گیا۔ وہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر کھانے لگا۔ تماشائی دائیں بائیں ہو گئے۔ میں اور انیق اس کے قریب بیٹھ گئے۔

"تم چاند گڑھی سے آئے ہو؟" انیق نے پوچھا۔
وہ انیق کو سرتاپا گھور کر غصیلے لہجے میں بولا۔ "تمہیں اس میں کوئی تکلیف ہے؟"
"نہیں، میرا مطلب تھا کہ ہم بھی وہیں سے آئے ہیں۔"
اس نے ایک بار پھر انیق کو سرتاپا گھور کر کہا۔ "لیکن میں نے تو تمہیں کبھی وہاں نہیں دیکھا۔"
"ہمیں آئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ دین محمد صاحب کے پاس کام کرتے ہیں۔ یہ میرا ساتھی گونگا شاہ زیب ہے۔ ٹریکٹر چلاتا ہے اور انجن وغیرہ مرمت کرتا ہے۔"
"تو میں لڈو بانٹوں؟ کیا کروں؟" اس نے پھر بھنے لہجے میں کہا۔
"میرا مطلب تھا کہ "حاضری" کے بعد ہم بھی واپس چاند گڑھی جا رہے ہیں اگر تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تو..... تم ہمارے ساتھ جا سکتے ہو۔"
"ہوائی جہاز ہے تمہارے پاس؟"
"تم برا نہ مانو، کوئی زبردستی نہیں ہے..... ویسے میں نام پوچھ سکتا ہوں؟"
"پوچھو۔" وہ تپے ہوئے لہجے میں بولا۔
"تو بتا دیں۔" انیق نے بھی ڈھیٹ بن کر کہا۔
"پرویز..... پیار سے پیجا پیجا کہتے ہیں لوگ، بولو..... اب کوئی ہمشیرہ ہے تمہاری، جس کا رشتہ دینا ہے پیجے کو؟"

انیق کا رنگ لال ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ اس بد دماغ شخص کے تھوبڑے پر گھونسا جڑ دے گا لیکن پھر ایک دم اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ شاید میری طرح اس نے بھی "پرویز" کے لفظ پر غور کر لیا تھا۔ ہماری معلومات کے مطابق پرویز تو ریشمی کے شوہر کا نام تھا اور وہ کئی ماہ سے اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا..... کیا یہ وہی پرویز تھا؟

انیق نے سنبھل کر کہا۔ "تمہارے دماغ کو خوامخواہ گرمی چڑھ رہی ہے۔ اگر ہم بہت برے لگ رہے ہیں تو چلے جاتے ہیں۔ ہم تو سمجھے تھے کہ تم بھی اپنے ٹائپ کے بندے ہو۔"
"کون سا ٹائپ؟" اس نے منہ ٹیڑھا کر کے پوچھا۔
"یہی مست سگریٹ والا۔" انیق نے اس کی جیب سے برآمد ہونے والے دو مڑے تڑے سگریٹس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
پرویز عرف پیجے کا چہرہ متغیر ہوا۔ کچھ دیر للچائی ہوئی نظروں سے مجھے اور انیق کو گھورتا رہا پھر بڑھی ہوئی شیو کو کھجا کر بولا۔ "کوئی مال پانی ہے تو بتاؤ؟" مال پانی سے اس کی مراد چرس ہی تھی۔
انیق بولا۔ "سب کچھ ہے بھائی میرے.... اور کھلا ڈلا ہے۔"
انیق نے مجھے اشارہ کیا۔ میں اس کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ اٹھ کر آستانے کے پچھواڑے گیا۔ یہاں لمبے بالوں والا ایک ملنگ افیم اور چرس کی پڑیاں بیچ رہا تھا۔ میں نے چار سو روپے دے کر اس سے چرس کی تین پڑیاں لیں اور واپس انیق کے پاس پہنچ گیا۔ تب تک انیق پیجے کو مزید شیشے میں اتار چکا تھا۔ دونوں تندوری روٹی پر حلوہ رکھ کر کھا رہے تھے۔ ہم ریشمی کی تلاش میں نکلے تھے۔ ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس طرح سرِراہ ہماری ملاقات ریشمی کے مبینہ شوہر سے ہو جائے گی۔ نجانے کیوں میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ ہمیں اس بندے سے کوئی اہم کھوج ضرور ملے گا۔
آدھ گھنٹے بعد ہم ٹیلوں کے درمیان چیڑ کے درختوں کے جھنڈ میں بیٹھے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن خوشگوار دھوپ نے موسم کو متوازن رکھا ہوا تھا۔ چرس بھرے سگریٹ کے زوردار سوٹے لگانے کے بعد پیجے نے بہکنا شروع کر دیا تھا۔ بہرحال میں نے انیق کو اشارے سے سمجھا دیا تھا کہ اسے زیادہ بہکنے نہیں دینا۔ کہیں پھر لمبا نہ لیٹ جائے۔ انیق اور میں بھی کش لے رہے تھے مگر ہوشیاری یہ دکھاتے تھے کہ دھواں اندر نہیں لے جاتے تھے۔

ترنگ میں آکر پیجے نے اول فول بولنا شروع کر دیا اور پھر اسی کیفیت میں نامعلوم افراد کو گالیاں دینے لگا۔ ''میں دیکھوں گا تم کو...... دیکھ لوں گا تم سب کو...... عورت دیکھ کر شیر بنے ہوئے ہو۔ تم اسے زبردستی اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ ہتھکڑیاں لگوا دوں گا۔''

''کون ہے وہ؟'' انیق نے اسے ٹٹولنے کی کوشش کی۔

وہ پھٹ پڑا۔ ''تمہاری ماں بہن نہیں ہے۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔''

میں نے انیق کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کا فائدہ ہوا۔ کچھ دیر بعد اس کا نشہ بڑھا تو وہ خود ہی انیق سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''دیکھو جس کی زنانی ہوتی ہے، اسی کی ہوتی ہے نا؟''

انیق نے اثبات میں جواب دیا۔

پیجے نے ہاتھ لہرا کر کہا۔ ''اور زنانی...... تو زنانی ہی ہوتی ہے...... زنانی کی عقل کہاں ہوتی ہے بھلا؟...... یہاں...... یہاں...... اس کی گت (چوٹی) میں۔'' اس نے اپنے ہاتھ سے گردن کے پچھلے حصے کو چھوا۔

''بالکل ایسے ہی ہے۔'' انیق نے تائید کی۔

''زنانی کو اوپر والے نے بے عقل پیدا کیا ہے۔ بڑی جلدی سے باتوں میں آجاتی ہے۔ وہ بھی حرامزادی باتوں میں آئی ہوئی ہے۔ وہ سؤر کے پتر اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ الو کی پٹھی سمجھتی ہے کہ میرے ساتھ رہے گی تو اس کی عجت خراب ہو گی، اسے پتا نہیں عجت وہاں بھی خراب ہو گی اور بدلے میں ملے گا ٹھوٹھو بھی نہیں......'' اس نے انگوٹھا دکھا کر ہمیں سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ کش لے رہا تھا اور بک رہا تھا۔ بات کچھ کچھ ہماری سمجھ میں آنا شروع ہو گئی تھی اور یہ بڑی سنسنی خیز بات تھی۔ لگ رہا تھا کہ پرویز عرف پیجا کسی طرح ریشمی کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اب وہ جو صلواتیں سنا رہا تھا، ان لوگوں کے لیے تھیں جن کے پاس ریشمی تھی اور وہ جو نیلی پیلی چوٹیں اسے لگی ہوئی تھیں یہ بھی شاید ریشمی کے ہی سلسلے میں لگی تھیں۔

انیق نے پیجے کو باور کرا دیا تھا کہ ہمارے پاس اعلیٰ کوالٹی کی چرس کا تسلی بخش اسٹاک موجود ہے...... اور اس کے علاوہ جیب بھی پوری طرح گرم ہے۔

ہم اسے قریبی گاؤں میں لے آئے۔ یہاں ایک مسافر سرائے ٹائپ جگہ تھی جہاں ''لمبی قبر'' کے عقیدت مند شب بسری کر سکتے تھے۔ یہاں اچھا کھانا بھی میسر تھا۔ کرایہ معمولی تھا۔ انیق چونکہ پیجے کو شیشے میں اتار چکا تھا اس لیے وہ ہمارے ساتھ سرائے میں قیام کو تیار ہو گیا۔ یہاں کچے فرش پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں اور میلے کچیلے تکیے رکھے تھے۔ زنانہ حصہ دوسری طرف تھا۔ دوپہر کو مرغ پلاؤ کھا کر اور دودھ پتی پی کر پیجے کا موڈ کچھ اور بہتر ہو گیا۔ اس نے ہمارے سامنے بڑ ماری کہ وہ یوں تو چاند گڑھی کا رہنے والا ہے لیکن لاہور میں ٹھیکیداری کرتا ہے۔ ریشمی کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا کہ اس کی بیمار بیوی کو ایک کرنالی نامی ملنگ بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ، پردے والی سرکار کے پاس لے گیا ہے۔

''پردے والی سرکار؟ یہ کون ہے؟'' انیق نے پوچھا۔

''پتا نہیں کون ہے۔ پر اسے ''پردے والی سرکار'' ہی کہتے ہیں۔ علاقے میں اس کو بڑا مانا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے پاس بڑی کراماتیں ہیں۔ ہوں گی کراماتیں لیکن جو میری زنانی ہے، وہ میری ہے۔ اسے واپس دینا ہو گا۔''

''تو کون نہیں دے رہا؟ پردے والی سرکار؟''

''نہیں، وہ تو کسی کے سامنے ہی نہیں آتا۔ یہ سارا کیا دھرا، اس موٹے مشٹنڈے ملنگ کرنالی کا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا جب بھی موقع ملا اس کا پیٹ پھاڑ دوں گا۔ کبھی تو ملنگی ڈیرے سے باہر نکلے گا وہ۔''

''کہاں ہے یہ ملنگی ڈیرا؟'' انیق نے سب سے اہم سوال کیا۔

''بڑے نالے سے آگے والی پہاڑیوں میں۔''

انیق نے مزید تفصیل پوچھی تو پتا چلا کہ ''بڑے نالے'' سے آگے جو جنگل شروع ہوتا ہے اس میں ''کرماں والا'' نام کا ایک گاؤں ہے۔ یہ جگہ جسے ملنگی ڈیرا کہا جاتا ہے کرماں والا گاؤں کے ساتھ ہی ہے۔

پرویز عرف پیجے کو مزید ٹٹولنے پر یہ اندازہ بھی ہوا کہ وہ اندر خانے ملنگوں سے خوف زدہ ہے۔ انہوں نے اسے بری طرح مار پیٹ کر وہاں سے بھگایا ہے اور اب وہ چرس کے دھوئیں میں غرق ہو کر اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس بات کی امید بھی نہیں تھی کہ وہ مستقبل قریب میں اس ''ملنگی ڈیرے'' کا رخ کرے گا۔ وہ یوں تو واپس چاند گڑھی جانے اور پولیس میں رپورٹ درج کرانے کی باتیں کر رہا تھا مگر پتا چلتا تھا کہ یہ خالی خولی دھمکیاں ہیں۔ پیجے کا اپنا کردار ہمارے علم میں آچکا تھا۔ تاجور نے بتایا تھا کہ پورا

گاؤں اس کے خلاف ہے۔ وہ شہر میں ریشمی کو محفلوں میں گانے پر مجبور کرتا رہا ہے اور اس کی کمائی کھاتا رہا ہے۔ بعض یہ بھی کہتے تھے کہ وہ اسے غیر مردوں سے تعلق رکھنے پر بھی مجبور کرتا تھا۔ اب وہ کس منہ سے پولیس کے پاس جاسکتا تھا۔

سچ کہتے ہیں کہ ہر مچھلی کو اس سے بڑی مچھلی کھاتی ہے۔ ''چیچا'' اپنے طور پر چاند گڑھی کا غنڈا بنا ہوا تھا اور عالمگیر کو گرو کہتا تھا۔ ریشمی کے ماں باپ سمیت کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بے بس چڑیا کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی ریشمی کو اس کے چنگل سے نکال سکتا لیکن اب اس کو ملنگی ڈیرے کے ملنگ ٹکر گئے تھے، جو اس سے زیادہ طاقتور تھے۔ ریشمی ان کے پاس تھی اور انہوں نے بددماغ چیچے کو مار بھگایا تھا۔

صبح ہم اٹھے تو چیچا غائب تھا۔ وہ رات پچھلے پہر اٹھ کر کہیں نکل گیا تھا۔ جاتے جاتے وہ انیق کی جیکٹ سے چرس کی دو پڑیاں اور ہزار بارہ سو کی نقدی بھی لے گیا تھا۔ اس سے ایسی ہی امید تھی۔ ہمیں اس کے جانے سے کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔ جانے سے پہلے وہ ہمیں ہمارا راستہ دکھا گیا تھا۔ لمبی قبر والے اس آستانے سے ایک ناہموار کچا راستہ آگے کی منزل کا سراغ دیتا تھا۔ فوجی طرز کی دو بہت پرانی جیپیں یہاں نقل و حرکت کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ ہم نے کرایہ بھرا اور اس دشوار گزار راستے پر قریباً پندرہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے کرماں والا پہنچ گئے۔

یہ بلند پہاڑوں سے گھرا ہوا گاؤں تھا۔ گاؤں کا کچھ حصہ ہموار جگہ پر اور کچھ ڈھلوان پر تھا۔ یہ ڈھلوان آگے جا کر پہاڑوں کی اونچائی میں کہیں گم ہو جاتی تھی۔ ایک پہاڑ کی اوٹ سے سفید رنگ کا ایک گنبد سا نظر آتا تھا.... وہاں جھنڈے لہرا رہے تھے۔ اس جگہ کو ملنگی ڈیرا کہتے تھے اور یہیں پر ''پردے والی سرکار'' بھی رہتی تھی۔

گاؤں میں ایک کافی بڑا بازار بھی تھا۔ دو تین مسافر سرائے تھے جہاں پردے والی سرکار کے عقیدت مند درات بسر کر سکتے تھے۔ اس بازار میں باورچی حضرات بھی موجود تھے جو نذرانے کی دیگیں وغیرہ پکاتے تھے۔ مٹھائی اور چڑھاوے کی ریشمی چادریں وغیرہ بھی یہاں کثرت سے دستیاب تھیں۔ ایک دور دراز گاؤں ہونے کے باوجود یہاں خوب چہل پہل نظر آتی تھی ..... مسافر سرائے میں ہماری ملاقات کوٹلی کے ایک نوجوان بابر سے ہوئی۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ ''چھ سات سال پہلے تک ملنگی ڈیرے کا مزار علاقے کے عام مزاروں کی طرح تھا.... مگر پھر یہاں پردے والی سرکار کا ظہور ہوا۔ پردے والی سرکار کی اونچی شان تھی اور ان کی کرامات تھیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے ملنگی ڈیرا پورے علاقے میں مشہور ہو گیا۔ اب دور دور سے لوگ یہاں آتے ہیں اور مرادیں پاتے ہیں۔''

میں نے بابر سے پوچھا۔ ''تم کیا مراد لے کر آئے ہو؟''

وہ بولا۔ ''میں مراد لے کر نہیں آیا جی۔ مراد پوری ہونے پر سرکار کا شکریہ ادا کرنے حاضر ہوا ہوں۔ نذرانہ لے کر آیا ہوں۔''

''کیسا نذرانہ؟''

''دس ہزار روپیا نقد اور اپنی بیوی کی دو چوڑیاں۔ میری چار سال کی بچی ایک سال سے بیمار تھی۔ اس کے سر کا درد کسی طرح جاتا ہی نہیں تھا۔ بہت سے ڈاکٹروں، حکیموں کو دکھایا۔ کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ پھر کسی نے پردے والی سرکار کا بتایا۔ انہوں نے چولہے کی راکھ پر دم کر کے دیا۔ اب دو مہینے ہو گئے ہیں۔ اللہ کے فضل سے بچی بالکل ٹھیک ہے۔ جیسے اسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا اور یہ کوئی میری بچی کی بات ہی نہیں ہے۔ اللہ کی بڑی مخلوق کو پردے والی سرکار سے فائدہ نصیب ہو رہا ہے۔''

اپنی بات ختم کر کے بابر نے غور سے ہم دونوں کو دیکھا اور بولا۔ ''آپ کس لیے آئے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''ہم تو بس سلام کرنے حاضر ہوئے ہیں۔ بڑی شہرت سنی تھی ملنگی ڈیرے کی۔''

بابر عقیدت بھرے لہجے میں بولا۔ ''جو کچھ سنا ہے، اس سے بہت بڑھ کر پائیں گے۔ اوپر والے نے بڑا فیض رکھا ہے سرکار جی کی ذات میں، ایسے ایسے واقعات ہیں کہ سن کر حیرت ہوتی ہے۔ کسی نے کہا تھا حکیم لقمان کے پاس موت کے علاوہ ہر چیز کا علاج تھا۔ شاید سرکار جی کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔''

مسافر سرائے کی کھڑکی کے سامنے سے کچھ دیہاتی ایک لاغر عورت کو چارپائی پر ڈالے گزرے۔ ان کا رخ بلندی کی طرف جانے والے اس راستے کی جانب تھا جو ملنگی ڈیرے پر پہنچتا تھا۔

بابر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ جو اتنا بڑا بازار آپ دیکھ رہے ہیں، چھ سات سال پہلے تک کچھ بھی نہیں تھا۔ بس تین چار بے کار سی دکانیں تھیں۔ اس گاؤں کی

آبادی بھی آج کی آبادی سے آدھی تھی اور ملنگی ڈیرے کا تو اس علاقے سے باہر کسی کو پتا ہی نہیں تھا۔ اب دیکھیں لوگ کس طرح ٹولیوں کی شکل میں آرہے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ جو نذرانہ تم پردے والی سرکار کے لیے لائے ہو، یہ کہاں استعمال ہو گا؟''

''عام لوگوں کی ''مدد امداد'' کے لیے۔ ملنگی ڈیرے پر بہت سے ایسے لوگ رہتے ہیں جنہوں نے فقیری .... لی ہوئی ہے۔ ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ یہ لوگ کبھی بھی ڈیرے سے باہر نہیں آتے۔ وہیں پر روکھی سوکھی کھاتے ہیں اور عبادت میں مصروف رہتے ہیں پھر بہت سے یتیم اور بے آسرا بچے بھی ہیں جو ملنگی ڈیرے کے پکے پکے مہمان ہیں..... ان کے لباس، خوراک اور تعلیم وغیرہ کا دھیان ملنگی ڈیرا ہی رکھتا ہے۔''

اتنے میں شور سنائی دیا۔ پتا چلا کہ دو خچروں پر دو دیگیں لاد کر لائی گئی ہیں۔ ان دیگوں میں چاول تھے جو عقیدت مندوں میں تقسیم ہونا تھے۔ لوگ بھاگ بھاگ کر ایک طویل قطار میں کھڑے ہونے لگے۔ بابر ایک کھاتا پیتا شخص لگتا تھا لیکن وہ بھی چاول لینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یہاں کا لنگر کھانا بھی برکت کا ذریعہ بنتا ہے۔''

میں اور انیق سر ہلا کر رہ گئے۔ اللہ کی برگزیدہ ہستیوں کے مزاروں اور خانقاہوں کا تقدس اپنی جگہ ہے۔ ان جگہوں پر بہت نیک و متقی لوگ بھی پائے جاتے ہیں لیکن بہت سی جگہیں ایسی بھی ہیں جہاں عیار لوگ روحانیت کی آڑ میں سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ بے شک مشرقی ممالک میں یہ پریکٹس زیادہ ہے لیکن میں نے یورپ کے پادریوں اور ان کے کلیساؤں میں بھی یہ سب کچھ ہوتے دیکھا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد میں اور انیق ایک طویل ڈھلوان پر چڑھ کر ''ملنگی ڈیرے'' پہنچے۔ یہ پتھروں میں گھری ہوئی ایک وسیع و عریض جگہ تھی۔ سفید مزار کے ساتھ ہی ایک پرانی طرز کی لمبی چوڑی عمارت تھی۔ اس کی اونچی دیواریں پتھر کی تھیں۔ مزار کے سامنے ایک وسیع احاطہ شاید حال ہی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس پر ٹین کی مخروطی چھتیں تھیں جن پر نیلا رنگ کیا گیا تھا۔ یہاں ہم نے ہلکا نیلا لباس پہنے ہوئے بہت سے مردوں کو دیکھا۔ ان میں سے اکثر کے بال لمبے تھے اور گلے میں مالائیں تھیں۔ کسی کسی نے نیلے چوغے کے اوپر کوئی صدری پہن رکھی تھی یا بوسیدہ کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ ہمیں کہیں بھی کوئی عورت دکھائی نہیں دی۔ بس دو تین بوڑھی عورتوں پر نظر پڑی جو صفائی ستھرائی کے کام میں مصروف تھیں۔

ہم عام عقیدت مندوں کی حیثیت سے اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ مزار کی سیڑھیوں کے پاس ڈھول بج رہا تھا اور کئی ملنگ یہاں رقص میں مصروف تھے۔ انیق نے کہا۔ ''اسے دھمال ڈالنا کہتے ہیں۔ شروع شروع میں ہماری اکثر پنجابی فلمیں اس دھمال کے بغیر نامکمل سمجھی جاتی تھیں.....''

شاید وہ فلموں کے حوالے سے مزید گوہر افشانی کرتا مگر اسی دوران میں بابر بھی چاول وغیرہ کھا کر یہاں پہنچ گیا۔ ہمیں دیکھ کر وہ سیدھا ہماری ہی طرف آیا۔ رقصاں ملنگوں کو دیکھ کر وہ بولا۔ ''آپ خوش قسمت ہیں۔ اچھے موقع پر حاضری کے لیے آئے ہیں۔ آج ضرور پردے والی سرکار لوگوں کے سامنے آئے گی۔ یہ ملنگوں کی دھمال اسی وقت ہوتی ہے جب سرکار نے سامنے آنا ہو۔''

''کیا مطلب؟'' انیق نے پوچھا۔ ''وہ لوگوں کو اپنی صورت دکھائیں گے؟''

''نہیں بھائی، اتنی ہم.... گناہ گاروں کی قسمت کہاں۔ ان کا ہمارے درمیان آجانا ہی بہت بڑی خوش نصیبی ہے۔ وہ اس سامنے والے چبوترے پر بیٹھیں گے اور مریدوں اور عقیدت مندوں سے خطاب کریں گے۔''

میں نے دیکھا دور احاطے کے آخری سرے پر سفید پتھر کا گول چبوترا سا نظر آرہا تھا اس چبوترے کے قریب سے اس وسیع و عریض احاطے کو لکڑی کی ایک عارضی دیوار کے ذریعے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ بابر نے بتایا کہ عورتیں اس دیوار کی دوسری جانب بیٹھتی ہیں۔

نیلے چولے اور لمبے بالوں والا ایک ادھیڑ عمر ملنگ ہمارے قریب سے گزرا۔ اس نے اپنی بغلی جیب سے کچھ نکالا تو اس کی نیلی، جالی دار ٹوپی نیچے گر گئی۔ میں نے اسے آواز دی۔ ''بابا جی۔''

وہ رک گیا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے ٹوپی اٹھا کر جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کی ہے؟''

اس نے پھر بھی جواباً کچھ نہیں کہا۔ بس اثبات میں سر ہلایا اور ٹوپی لے کر آگے بڑھ گیا۔ بابر نے کہا۔ ''جن لوگوں نے فقیری لی ہوئی ہے۔ وہ عام لوگوں سے بات نہیں کرتے، ہاں کوئی بہت شدید ضرورت ہو تو اور بات ہے۔ یہ لوگ بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں اور کچھ تو ایسے بھی ہیں جو

سرکار جی کی طرح زندگی بھر کسی کو شکل نہ دکھانے کا عہد کر لیتے ہیں۔''

بابر نے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر دور ایک شخص کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک پتھریلی دیوار سے ٹیک لگائے چمٹا بجا رہا تھا اور چمٹے کی آواز کو ڈھول کی تھاپ سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے سر پر ایک نیلی چادر، گھونگھٹ کی طرح ڈال رکھی تھی۔ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بابر نے کہا۔ ''یہ دیکھو، اس طرح کے کئی اور بھی نظر آئیں گے۔''

میں نے لکڑی کی اس طویل دیوار کو دیکھا جو اس ہال نما احاطے کو دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ تو کیا تاجور کی عزیز ترین سہیلی ''ریشمی'' اس دیوار کی دوسری جانب آکر بیٹھے گی؟ کیا وہ یہیں موجود ہو گی؟ اس قدیم عمارت کی اونچی دیواروں کے پیچھے؟ اس کو کیسے دیکھا جا سکے گا، اس سے کیسے بات کی جا سکے گی؟ یہاں کا انتظام بہت سخت دکھائی دے رہا تھا، پتا چل رہا تھا کہ انتظامیہ کی مرضی کے بغیر یہاں سے کسی کو لے جانا تو دور کی بات ہے، کسی سے ملنا بھی آسان نہیں۔

ایک گھڑیال سا بجا اور رقص کرنے والے فقیروں نے اپنے پاؤں روک لیے۔ سب لوگ وسیع و عریض چھت تلے جمع ہونے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چبوترے کے سامنے والا حصہ مریدوں اور زائرین سے بھر گیا۔ اگلی قطاروں میں نیلے چولوں والے مریدین اور چیلے تھے۔ ان کے عقب میں عام زائرین اور عقیدت مند ترتیب سے بیٹھتے جا رہے تھے۔ لکڑی کے عارضی پارٹیشن کی دوسری جانب بھی ہلکا ہلکا شور سنائی دینے لگا تھا۔ یہ عورتوں کی بھنبھناہٹ تھی۔ بالآخر خاص مریدوں کے جلو میں پردے والی سرکار نمودار ہوئی۔ سر سے پاؤں تک ایک سیاہ لبادہ تھا۔ کندھوں پر بھی ایک سفید شال تھی۔ ایک ململ کی کامدار چادر سر پر تھی اور اس نے چہرے پر گھونگھٹ سا بنا رکھا تھا۔ سب لوگ باادب انداز میں کھڑے ہو گئے اور تعظیم کے انداز میں سر جھکایا۔ پردے والی سرکار چبوترے کی سب سے اونچی نشست پر بیٹھ گئی۔ دو صحت مند مرید جن کے بال ان کے کندھوں تک پہنچ رہے تھے، دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ یہ نیلے چغوں میں تھے۔ گلے میں لکڑی اور پتھروں کی موٹی مالائیں تھیں۔ میں نے ریشمی کے شوہر پیجے کی زبانی ملنگ کرنالی کا حلیہ سنا تھا، مجھے فوراً خیال آیا کہ پردے والی سرکار کی دائیں جانب کھڑا ہونے والا فربہ شخص ملنگ کرنالی ہو سکتا ہے۔ بعد ازاں یہ خیال درست ثابت ہوا۔ پرویز عرف پیجے کے مطابق یہی شخص تھا جس کی باتوں سے متاثر ہو کر ریشمی نے فقیری لبادہ اوڑھا تھا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں چلی آئی تھی۔

بیٹری سے چلنے والا ایک لاؤڈ اسپیکر ''پردے والی سرکار'' کے سامنے رکھ دیا گیا۔ ایک ایسا ہی اسپیکر عورتوں والی جانب بھی پہنچا دیا گیا۔

''کیا عورتوں کی طرف سے بھی کوئی تقریر کرے گا؟'' انیق نے سرگوشی میں پوچھا۔

''تقریر اور زبان کے استعمال میں عورتیں مردوں سے کہیں آگے ہوتی ہیں۔'' میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

مگر عورتوں کی طرف سے کوئی تقریر نہیں ہوئی بلکہ کورس کی شکل میں ایک گیت سنائی دیا۔ یہ کوئی ''کافی'' کی طرح کا پنجابی گیت تھا جس میں انسان کے لالچ کی بات کی گئی تھی اور اس لالچ سے پیدا ہونے والی پریشانیوں کا تذکرہ تھا۔ عام لوگوں کو تلقین کی گئی تھی کہ وہ سادہ زندگی گزاریں۔ لذتوں اور دنیاوی آلائشوں سے دور رہیں۔ گیت اچھا تھا اور اس کی لے بھی بہت خوب صورت تھی مگر سادہ زندگی کے جو اصول بتائے جا رہے تھے، ان پر کم از کم یہاں کے خاص مرید تو ہرگز عمل پیرا نہیں تھے۔ پردے والی سرکار کے دائیں بائیں کھڑے دو اہم مریدوں کو ہی دیکھ لیا جاتا تو ان کا وزن دو دو من کے قریب تھا۔ خود پردے والی سرکار بھی خوش خوراک ہی نظر آتی تھی۔

کورس میں ''لیڈ'' کرنے والی لڑکی کی آواز بہت سُریلی تھی اور دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ تاجور نے بتایا تھا کہ ریشمی بڑی خاص آواز کی مالک ہے اور اس آواز نے ہی اس کی مشکلوں میں اضافہ بھی کیا ہوا ہے۔ کہیں یہ آواز ریشمی ہی کی تو نہیں تھی؟

میں نے یہ بات انیق کے کان میں کہی تو وہ بھی چونک گیا بولا۔ ''یہ ہو بھی سکتا ہے۔'' پھر اس نے قریب بیٹھے بابر سے پوچھا۔ ''بڑی پیاری آواز ہے۔''

بابر نے کہا۔ ''بالکل ایسا ہی ہے۔ اس آواز نے دھوم مچا دی ہے۔ کئی لوگ تو اس ''پاک بہن'' کی آواز کو سننے کے لیے ہی یہاں آجاتے ہیں۔''

''پاک بہن؟''

''ہاں، اس کو پاک بہن ہی کہا جاتا ہے۔ پردے والی سرکار کی خاص مریدنیوں میں سے ہے۔ کچھ عرصہ پہلے

ہی یہاں آئی ہے لیکن سب "پہلے پڑھنے والیوں" کو پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ بلھے شاہ، وارث شاہ اور ان جیسے کئی بزرگوں کے کلام پڑھے ہیں اس نے۔ خود بھی شعر بنا لیتی ہے۔ کل تو میں نے پاک بہن کی ایک کیسٹ بھی کرماں والا کے بازار میں دیکھی ہے۔

"پاک بہن کا کوئی نام بھی تو ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"نام کا تو پتا نہیں، لیکن سیالکوٹ سائڈ کی رہنے والی ہے۔ شوہر کے ظلم اور زمانے کی سختیوں سے تنگ تھی، فقیری کی طرف آگئی۔ سنا ہے کہ کچھ دن پہلے اس کا نشئی شوہر اس کا دعویدار بن کر یہاں آیا تھا۔ پردے والی سرکار نے اسے سمجھایا بجھایا اور ہدایت پر لانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانا۔ بعد میں اس نے بڑے مرید کرتالی صاحب سے بدتمیزی کی تو عام لوگوں نے اسے مار پیٹ کر یہاں سے بھگا دیا۔"

اب بات واضح ہو رہی تھی۔ وہ جادو اثر آواز جو اس ملنگی ڈیرے کے درودیوار میں گونج رہی تھی، یقیناً ریشمی ہی کی تھی۔ مجھے موسیقی اور نغمے وغیرہ سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا، مگر اس آواز میں یقیناً کوئی بات تھی۔ اس نے مجھے کشش کیا اور یہی دل گداز کشش تھی جو ہر کسی کو متاثر کر رہی تھی۔ مغربی دنیا میں تو موسیقی کے نام پر ایک طوفانِ بدتمیزی بپا ہوتا ہے، یہ آواز اس سے بہت اوپر کی چیز تھی۔

گیت ختم ہوا تو کافی دیر سناٹا چھایا رہا۔ اس کے بعد کچھ ملنگوں نے دھمال ڈالی اور اپنی بھونڈی آواز میں حق ہُو کے نعرے بلند کیے۔ اس کے بعد لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے پردے والی سرکار نے مختصر خطاب کیا۔ اس کے لب ولہجے میں پنجابی جھلک نمایاں تھی تاہم وہ اردو بول رہا تھا۔ اس کی شکل بالکل اوجھل تھی۔ اس نے جو باتیں کہیں ان میں سے کئی ایک گیت میں بھی کہی جا چکی تھیں۔ اپنی آواز سے یہ کوئی درمیانی عمر کا سنجیدہ سا شخص لگتا تھا۔

تقریر کے بعد نیلے رنگ کی ایک طویل رسی لائی گئی۔ اس میں سیکڑوں گرہیں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ رسی دو ٹکڑوں میں تھی۔ ہر ٹکڑے کی لمبائی سو فٹ کے قریب رہی ہوگی۔ ایک ٹکڑا عورتوں کی طرف پھیلا دیا گیا، دوسرا مردوں کی طرف۔ بے شمار بے تاب عقیدت مندوں نے رسی کے اس ٹکڑے کو پکڑ لیا۔ ٹکڑے کا دوسرا سرا "پردے والی سرکار" کے ہاتھ میں تھا۔ پردے والی سرکار نے کچھ پڑھا اور بار بار رسی کے ٹکڑے پر پھونکا۔

بابا نے بتایا۔ "رسی کو تھامنے والے سب مریض ہیں، جو اپنا کوئی نہ کوئی روگ لے کر یہاں آئے ہیں۔ پردے والی سرکار کے ہاتھ میں جو شفا ہے، وہ اس نیلی رسی کے ذریعے روگیوں تک پہنچے گی اور ان کی مشکلیں آسان کرے گی۔"

انیق نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "آپ بھی رسی تھام لیں، شاہ زیب بھائی۔"

"مجھے کیا روگ ہے؟"

"پریم روگ سے بڑا روگ کیا ہوگا۔" اس نے بے باکی سے کہا لیکن جب میں نے ممکا تانا تو اس نے جلدی سے ہاتھ جوڑ دیے۔

اگلے آدھ پون گھنٹے میں ہمیں یہاں ایسی کئی چیزیں دیکھنے کو ملیں جنہیں خرافات کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں نے کچھ ایسے ملنگ بھی دیکھے جو صورتوں سے ہی خطرناک نظر آتے تھے۔ انہوں نے جو کمبل یا پیوند لگی چادریں لپیٹ رکھی تھیں ان کے نیچے یقیناً آتشیں اسلحہ موجود تھا۔ ملنگی ڈیرے میں چبوترے کے پیچھے ممنوعہ علاقہ تھا جس کی طرف چغا پوش مریدوں کو جانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ میں اور انیق ایک گوشے میں بیٹھ کر تبرک کھانے کے ساتھ ساتھ باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا۔ "انیق! میں نے تو ایک ہی نتیجہ نکالا ہے، اگر ہم ریشمی سے رابطہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے کسی عورت کی مدد درکار ہوگی۔"

"اور یہاں ایسی کون سی عورت ہے جو اپنی عاقبت خطرے میں ڈال کر آپ کی مدد کو تیار ہو جائے گی؟"

"لیکن مسئلہ ایک اور بھی ہے۔ بات صرف ریشمی سے ملنے ہی کی نہیں انیق، اسے سمجھانے کی بھی ہے۔ وہ جس راہ پر چل نکلی ہے آسانی سے اسے چھوڑے گی نہیں اور جب وہ خود ہی اپنے پنجرے سے نکلنے کو تیار نہیں ہوگی، ہم اسے کیسے نکال سکیں گے؟"

"اور ماں بے چاری رو رو کر مر جائے گی اس کی۔" انیق نے کہا۔

"ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔" میں نے طویل سانس لے کر ٹھنڈی ٹھار پتھریلی دیوار سے ٹیک لگائی۔

"وہ کیا؟" انیق ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔

"تاجور اس کی قریب ترین سہیلی ہے اور یہ جتنی تاجور کی مانتی ہے اور کسی کی نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ تاجور اس کا ذہن بدلنے میں کامیاب ہو جائے۔"

انیق مسکرایا۔ "آپ کی بات میں وزن ہے لیکن ایک اندیشہ بھی ہے۔ اگر الٹا ریشمی نے تاجور کا ذہن بدل دیا اور

اس نے واپس جانے سے انکار کر دیا تو پھر آپ کیا کریں گے؟''

''پھر میں بھی اپنا ذہن بدل لوں گا۔ فقیری اختیار کر لوں گا اور چمٹا بجاؤں گا۔''

''اور میں ڈھولک پر تھاپ دوں گا۔ کیونکہ آپ کے ساتھ رہنے کے بعد اب میرا بھی داؤد بھاؤ کے پاس واپس جانے کو جی نہیں چاہتا۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ مجھ سے زیادہ تمہارا دل حشمت پہلوان سے لگ گیا ہے۔''

''ویسے شاہ زیب بھائی ..... یہ حشمت پہلوان ہے بڑے مزے کی چیز۔ ایسی باتیں کرتا ہے کہ ہنسنے کو دل چاہتا ہے اور ساتھ ساتھ رونے کو بھی۔ اردو کی ایسی ایسی ٹانگ توڑتا ہے کہ محققین کی روحیں قبروں میں تڑپ اٹھتی ہوں گی۔ ہفتے کے روز مجھ سے کہنے لگا، میں تقریباً گوجرانوالہ جارہا ہوں، منگل تلک واپسی ہووے گی۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ تقریباً کیا مطلب؟ ارشاد فرمایا۔ کسی ''تقریب'' میں جانے کو ہم کہہ سکت ہیں کہ ہم تقریباً وہاں جارہے ہیں۔ بعد میں یہ بحث شروع کردی کہ ''نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی'' والا محاورہ انگریزوں نے بنایا تھا۔ اصل محاورہ یہ تھا کہ نو سو چوہے کھا کے بلی خالق حقیقی کے پاس چلی..... اور اس قسم کے کئی ادبی شب خون انگریزوں نے مارے ہیں جن کا ہمیں آج تک پتا نہیں چلا۔ بنگال میں تو انہوں نے .....''

میں نے کہا۔ ''انیق ڈیئر! مجھے لگتا ہے کہ ہم سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کے دور میں چلے گئے ہیں۔ ہمیں پاس پاس ہی رہنا چاہیے۔ ہم تاجور کی بات کررہے تھے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ اگر ہم اسے کسی طرح یہاں لاسکیں اور اس سے کہیں کہ وہ ریشمی کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کرے تو ہو سکتا ہے کہ ہم اسے واقعی نکال لیں۔''

انیق نے کہا۔ ''شاہ زیب بھائی، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس ملنگی ڈیرے کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر خود بھی بیزار ہو چکی ہو اور اسے سمجھانے بجھانے کی زیادہ ضرورت ہی پیش نہ آئے۔''

''خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ پہلوان حشمت کے پاس بیٹھ بیٹھ کر تمہاری عقل بھی گھاس چرنے جانے لگی ہے۔ ریشمی کے بیزار ہونے کا کوئی امکان یہاں نظر نہیں آیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے اس کا بھجن تما گیت سنا ہے، کس قدر ڈوب کر گارہی تھی۔ وہ یہاں کے ماحول میں پوری طرح کھپ چکی ہے۔ جوں جوں وقت گزرے گا، وہ اس راستے پر اور آگے نکلتی چلی جائے گی۔''

میری بات نے انیق کو خاموش کرادیا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''لیکن مسئلہ تو یہ ہے شاہ زیب بھائی کہ تاجور کو یہاں لایا کیسے جاسکتا ہے۔ دین محمد صاحب تو ہرگز ہرگز اس کی اجازت نہیں دیں گے۔''

''جب ''پیار'' اجازت لے کر نہیں کیا تو پھر کئی اور کام بھی اجازت کے بغیر کرنا پڑیں گے۔'' میں نے کہا۔

''واہ کیا قولِ زریں ہے۔ اس پر تو گانا بن سکتا ہے۔ پیار کیا ہے، اجازت کیوں لیں، پیار کیا ہے کوئی اندر تو نہیں آئے۔۔۔ اجازت تو اندر آنے کے لیے لی جاتی ہے۔''

☆☆☆

دو دن بعد میں اور انیق ایک بار پھر چاند گڑھی میں تھے۔ ایک بار پھر مجھے تاجور کے ساتھ اس کے گھر کی چھت پر خفیہ ملاقات کرنا پڑی۔ اس مرتبہ یہ ملاقات مزید خطرناک تھی کیونکہ دین محمد صاحب بھی گھر میں ہی تھے۔ پچھلی دفعہ کی طرح میری مدھم دستک پر نوری نے باہر والا دروازہ کھول دیا اور میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلا آیا۔ تاجور قریباً آدھ گھنٹا تاخیر سے چھت پر پہنچی۔ وہ جلد از جلد جاننا چاہتی تھی کہ میں ریشمی کے بارے میں کیا خبر لایا ہوں۔ میں نے تفصیل سے اسے تمام رُوداد کہہ سنائی اور آخر میں کہا۔

''ریشمی سے ملنے اور اسے واپسی پر آمادہ کرنے کا بس ایک ہی طریقہ سمجھ میں آتا ہے۔ تم ہمت کرو اور کرماں والا پہنچ کر اس سے ملو۔ یہ کام تمہارے سوا اور کوئی نہیں کرسکتا۔ شاید ریشمی کی والدہ بھی ایسی کوشش میں ناکام رہے گی۔''

''مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے شاہ زیب! اباجی بھی اجازت نہیں دیں گے۔ عید والے واقعے کے بعد تو اب وہ مجھے گھر سے بھی نہیں نکلنے دیتے۔''

''لیکن اگر اسے زندہ درگور ہونے سے بچانا چاہتی ہو تو پھر کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔ ہم اسے وہاں سے نکالنے کی کوشش تب ہی کرسکتے ہیں جب وہ خود بھی آمادہ ہوگی۔''

اسی دوران میں پڑوس کے گھر سے کسی مرد کے گرجنے برسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ ریشمی کا باپ عبدالرزاق ہی تھا۔ وہ طیش کے عالم میں بیوی پر برس رہا تھا۔ اندھی ہوجائے گی۔ ٹھوکریں کھاتی پھرے گی۔ ہر وقت کا رونا دھونا نحس ہوتا ہے، سنبھال خود کو۔''

میں نے تاجور سے پوچھا تو میرا اندازہ درست نکلا۔ یہ عبدالرزاق ہی تھا۔ میں نے کہا۔ ''تاجور! تم نے بتایا تھا کہ جوانی میں رزاق چاچا کوئی کھلاڑی وغیرہ رہا ہے؟''

''ہاں .... پچیس تیس سال پہلے یہ پسرور کے ہائی اسکول میں پڑھتے تھے تو وہاں ہاکی کھیلتے تھے پھر کھیل میں ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ غریبی کی وجہ سے صحیح علاج نہ ہوسکا۔ ٹانگ کاٹنا پڑی۔ پڑھائی وغیرہ بھی اسی وقت ختم ہوگئی تھی۔ یہاں تھوڑی سی زمین ہے، خود تو کاشت نہیں کرسکتے، کسی کو دی ہوئی ہے۔ دانے وغیرہ آجاتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارے اباجی سے رزاق چاچا کی سلام دعا بھی ہوگی۔ کیا یہ کسی طرح تمہیں اجازت لے کر نہیں دے سکتے؟''

''سلام دعا تو بہت زیادہ ہے لیکن اجازت والا کام یہ نہیں کرسکیں گے۔'' تاجور کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آوارہ لٹ کو پیشانی سے ہٹا کر بولی۔ ''ایک کام کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

اس نے سرگوشیوں میں مجھے ایک پروگرام بتایا جس پر عمل کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ تاجور کی ایک پرانی سہیلی عافیہ صداقت کوٹلی میں رہتی تھی۔ وہ کافی عرصے سے تاجور سے کہہ رہی تھی کہ وہ اس کے پاس آئے۔ گرمیوں میں پروگرام بنا تھا کہ دین محمد اسے چھوڑ آئیں گے اور وہ چند دن وہاں رہے گی، لیکن پھر کسی وجہ سے یہ پروگرام رہ گیا۔ اب اگر تاجور کوشش کرتی تو دین محمد صاحب آمادہ ہوسکتے تھے۔ تاجور کی والدہ کی طبیعت آج کل بہتر تھی اور موسم بھی ٹھیک تھا۔ دوسرے یہ کہ دین محمد صاحب خود بھی چاہتے تھے کہ تاجور گاؤں کے بگڑے ہوئے حالات سے کچھ دن دور رہے۔

ٹھیک دو روز بعد تاجور اپنی سہیلی عافیہ کے پاس کوٹلی پہنچ گئی۔ ہم ایک روز پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے اور ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ حسب پروگرام رات کو سیل فون پر تاجور نے ہم سے رابطہ کیا۔ اس نے ایک اچھی اطلاع یہ دی کہ ملازمہ نوری بھی اس کے ساتھ ہی یہاں پہنچی ہے۔ اس نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ قدرت بھی ہماری مدد کررہی ہے۔ عافیہ کا شوہر صداقت بھائی دو دن پہلے کویت چلا گیا ہے۔ اب گھر میں عافیہ اور اس کی امی کے سوا اور کوئی نہیں۔''

''چاچاجی (دین محمد) واپس جاچکے ہیں؟''

''ہاں دوپہر کو ہی نکل گئے تھے۔ اب تو گاؤں پہنچنے والے ہوں گے۔''

میں نے کہا۔ ''اب کرماں والا جانے کا کیا پروگرام ہوگا؟''

''عافیہ کی امی یعنی ساس خدیجہ خاتون بڑی اچھی عورت ہیں۔ نماز روزے کی بڑی پابند ہیں۔ اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ خدیجہ خاتون ہر مہینے ایک دو دیگیں پکواتی ہیں اور اسے پاس کی خانقاہ میں بھیجتی ہیں۔ وہ خود بھی اللہ والوں کے مزاروں پر حاضری دیتی رہتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں اور عافیہ ان سے کرماں والا جانے کی اجازت مانگیں تو وہ ضرور دے دیں گی۔''

''ٹھیک ہے۔''

''اور اصل بات یہ ہے کہ وہ اس بارے میں اباجی کو بتائیں گی بھی نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ میں اور عافیہ ان سے کہہ دیں گے کہ جب اباجی مجھے لینے آئیں تو وہ ہمارے کرماں والا جانے کا بالکل ذکر نہ کریں۔''

''لیکن ایک بات ذہن میں رکھو۔ ہمیں کرماں والا میں تین چار دن لگ سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں دیکھتی ہوں کہ کس طرح پروگرام بنانا ہے۔''

اگلے روز دوپہر کو ہم کوٹلی کے بس اڈے پر ملے۔ تاجور کالے برقع میں تھی۔ پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی یہ ہوئی تھی کہ عافیہ کے بجائے تاجور کے ساتھ نوری تھی۔ نوری بھی سرتاپا ایک چادر میں تھی اور بس اس کی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ عافیہ اپنی ''امی ساس'' کے پاس گھر میں ہی رہی تھی۔

دیہاتی علاقے کی خستہ حال بسوں میں سفر کرکے مجھے بڑا مزہ آیا تھا۔ ایک اور ہی طرح کی زندگی دیکھنے کو مل رہی تھی اور اب تو سونے پر سہاگے والی بات تھی۔ تاجور بھی اس سفر میں میرے ساتھ شریک تھی۔ وہ اور نوری ہم سے اگلی نشست پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس بس میں کئی ایسے مرد و زن موجود تھے جو ''بڑے والی سرکار'' کے آستانے پر حاضری کے لیے جارہے تھے۔ اپنے اپنے روگ اور اپنی اپنی مرادیں لے کر۔ ایک انیس بیس سالہ دیہاتی نوجوان کو جگر کا کینسر تھا۔ اس بے چارے کو اس وقت کسی اچھے اسپتال میں ہونا چاہیے تھا لیکن وہ جھاڑ پھونک کے لیے ملنگی ڈیرے کا رخ کررہا تھا۔ اس نوجوان کے قریب ہی ایک ادھیڑ عمر شخص

گرم چادر میں اپنا منہ سر لپیٹے بیٹھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید اسے کوئی متعدی بیماری ہے لیکن دو گھنٹے بعد یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوا اور اس شخص کے حوالے سے ہم پر ایک ایسا انکشاف ہوا جس نے ہمیں بہت پریشان کر دیا۔

سخت ناہموار سفر کے بعد ایک جگہ بس رک گئی۔ اب اس سے آگے ہمیں پیدل یا پھر کرائے کی جیپ پر سفر کرنا تھا۔ بس سے اترتے ہوئے تاجور کو مشکل پیش آ رہی تھی۔ اس طرح کا برقع اس نے کبھی پہنا نہیں تھا۔ میں نے اسے سہارا دے کر نیچے اتارا ..... اسے چھونا میرے لیے ہر بار ہی بڑا سنسنی خیز ثابت ہوتا تھا۔ میں، انیق اور نوری، تاجور سمیت ان درختوں کی جانب چل دیے جہاں ایک بڑے سائز کی کھٹارا جیپ کھڑی تھی۔

اچانک تاجور ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ مڑ کر پیچھے دیکھ رہی تھی۔ ”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ ..... کون ہے؟“ اس نے ڈری سی آواز میں کہا اور انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

بس کی آخری دو تین سواریوں کے ساتھ ایک شخص نیچے اترا تھا اور اب لنگڑاتا ہوا سا ایک پتھر کے پیچھے اوجھل ہو رہا تھا۔ ”کیا بات ہے، تم پریشان ہو گئی ہو؟“ میں نے تاجور سے کہا۔

”مجھے شک ہو رہا ہے۔“ وہ گھبرائی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ”مم ..... مجھے لگ رہا ہے کہ شاید کچھ ٹھیک نہیں ہو رہا۔“

”کیا مطلب؟“

”کہیں ..... یہ چاچا رزاق تو نہیں۔ میرا مطلب ہے ریشمی کے ابا جی؟“

اس مرتبہ نوری بھی کچھ چونکی ہوئی نظر آئی۔ بے ساختہ بولی۔ ”مجھے بھی کچھ شک لگ رہا ہے۔“

تاجور اور نوری کو وہیں چھوڑ کر میں اور انیق تیزی سے پتھر کی اوٹ میں پہنچے۔ وہ شخص اب درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس کھڑا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ واضح طور پر ٹھٹکا اور درختوں میں گھس گیا۔ میں نے پہچان لیا یہ وہی بندہ تھا جو بس میں منہ سر لپیٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں اور انیق درختوں میں گھسے۔ وہ کسی لکڑی کے سہارے لنگڑاتا ہوا نشیب میں اتر رہا تھا۔ شاید تاجور نے ٹھیک ہی اندازہ لگایا تھا، یہ شخص کسی چکر میں تھا۔ ہم نے اس کے پاس پہنچ کر اس کا راستہ روک لیا۔

”کیا بات ہے؟“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

چادر کا پلو ابھی تک اس کے چہرے پر تھا۔ وہ جس لکڑی کے سہارے چل رہا تھا وہ دراصل ایک ہاکی تھی۔ چاند گڑھی میں تاجور نے مجھے بتایا تھا کہ چاچا رزاق اپنے لڑکپن کے زمانے میں پسرور قصبے کے ہائی اسکول میں پڑھتے تھے اور ہاکی کھیلتے تھے۔ اسی کھیل میں زخمی ہونے کے بعد انہیں اپنی ایک ٹانگ سے محروم ہونا پڑا تھا۔

میں نے کہا۔ ”خود کو چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں چاچا رزاق، ہم نے تمہیں پہچان لیا ہے۔“

وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئے۔ اسی دوران میں تاجور اور نوری بھی موقع پر پہنچ گئیں۔ اب تاجور نے بھی تصدیق کر لی تھی کہ یہ چاچا رزاق ہی ہیں۔ وہ ڈری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ انیق نے کہا۔ ”چاچا! لگتا ہے کہ تم چاند گڑھی ہی سے پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہو۔ اس کا کیا مطلب ہے؟“

”مم ..... میں نے کسی کا پیچھا نہیں کیا۔ میں تو..... مزار پر حاضری کے لیے..... جا رہا ہوں۔“

”اگر ایسی بات تھی تو ہم سے منہ چھپا کر کیوں بیٹھے تھے اور اب ہمیں دیکھ کر بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟“ انیق نے کہا۔

”بب ..... بس، ویسے ہی۔ میں اکیلا رہنا چاہتا تھا۔ میں نے تمہیں بس میں دیکھا، اس لیے پچھلی سیٹوں پر جا کر بیٹھ گیا۔“

صاف ظاہر تھا کہ چاچا رزاق صاف گوئی سے کام نہیں لے رہے۔

میں نے کہا۔ ”چاچا جی! جو کچھ بھی ہے، اب تو پتا چل ہی گیا ہے اس لیے آپ ہمارے ساتھ چلیں۔“

چاچا رزاق کے چہرے پر شدید تذبذب دکھائی دیا۔ بہرحال جب تاجور نے بھی کہا تو وہ ہمارے ساتھ چلنے کو رضامند ہو گئے۔ مجھے شک گزر رہا تھا کہ پچھلے دو تین دن میں چاچا رزاق کی ملاقات اپنے چرسی داماد پرویز عرف پیجے سے ہو چکی ہے اور اسی سے چاچا کو ملنگی ڈیرے کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ وہ چاند گڑھی سے ملنگی ڈیرے کے لیے روانہ ہوئے تھے اور اتفاقاً کوٹلی سے آگے اسی بس میں سوار ہو گئے جس میں ہم سفر کر رہے تھے۔

ہم نے آگے کا سفر پیدل کرنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن اب چونکہ ہمارے ساتھ چاچا رزاق بھی تھے اور وہ اپنی لکڑی کی ٹانگ کے ساتھ آسانی سے سفر نہیں کر سکتے تھے اس لیے ہم نے ایک ..... جیپ کرالی۔ ویسے بھی سردیوں کی شام تیزی سے ٹھٹھری ہوئی دھوپ پر جھپٹ رہی تھی اس

لیے جیپ کا سفر مناسب تھا۔

سورج مغربی چوٹیوں میں اوجھل ہو چکا تھا جب ہم کرماں والا گاؤں پہنچ گئے۔ راستے میں چاچا رزاق سے کسی طرح کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ جیپ ڈرائیور مقامی شخص تھا اور اس کی موجودگی میں کسی طرح کی بات مناسب بھی نہیں تھی۔ وہ ملنگی ڈیرے والوں کا مخبر ہو سکتا تھا۔ بس انیق نے ایک دفعہ میرے کان میں سرگوشی کی تھی۔ اس نے وہی کہا تھا جس کا اندیشہ ہم سب کے ذہن میں موجود تھا۔ وہ بولا۔ ”چاند گڑھی والوں کے لیے آپ گونگے ہیں لیکن آج کم از کم چاچا رزاق کو تو پتا چل ہی گیا ہے کہ آپ بول سکتے ہیں اور تاجور کے ساتھ تو فر فر بول سکتے ہیں۔“

”ہاں، یہ مسئلہ تو بالکل ہو گیا ہے۔“

”فلموں میں تو ایسے کردار کو قتل کر دیا جاتا ہے کہ راز کھلنے نہ پائے۔ اب چاچا جیسے نیک اور مصیبت زدہ بندے کو قتل کرنے کی ہمت کم از کم مجھ میں تو نہیں۔ ویسے بھی میں نے اپنا کوٹا مقرر کیا ہوا ہے۔ ایک مہینے میں پچیس افراد سے زیادہ موت کے گھاٹ نہیں اتارتا اور پچیس ہو چکے ہیں۔“

”میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں لیکن میرے ابھی چوبیس ہوئے ہیں، تم بے کار کی بک بک بند کر دو تو اچھا ہے۔“

کرماں والا گاؤں میں دیے روشن ہو گئے تھے۔ بازار میں بھی جگہ جگہ گیس لیمپس اور لالٹین دکھائی دے رہی تھیں۔ اوپر ملنگی ڈیرے تک جانے والے طویل راستے پر بھی کہیں کہیں متحرک روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہم نے مسافر سرائے میں دو کمرے حاصل کرنا چاہے لیکن ایک ہی ملا۔ اس میں دونوں خواتین یعنی تاجور اور نوری کو ٹھہرا دیا گیا۔ میں، انیق اور چاچا رزاق ایک ہال کمرے میں دیگر زائرین کے ساتھ ٹھہر گئے۔ گوشت آلو اور تندوری روٹی کے ساتھ رات کا کھانا نمٹانے کے بعد ہم نے قہوے کی پیالیاں پکڑیں اور لحاف لپیٹ کر بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے تو چاچا رزاق نے مجھ سے وہی سوال کیا جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ وہ بولے۔ ”بس میں، میں نے تم چاروں کو دیکھا تو حیران ہوا۔ پر اس سے کہیں زیادہ حیرانی اس وقت ہوئی جب میں نے تم کو باتیں کرتے سنا ... یہ سب کیا ہے شاہ زیب! اگر تم بول سکتے ہو تو پھر گاؤں میں گونگا بن کر رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم نے .... دین محمد جیسے نیک بھلے مانس بندے کو بھی دھوکے میں رکھا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”چاچا جی! میں اس سارے معاملے میں شرمندہ ہوں لیکن یہ کسی بری نیت سے نہیں تھا۔ اس کے پیچھے ایک مجبوری تھی۔ میں بہت جلد آپ کو اس بارے میں بتاؤں گا اور آپ مانیں گے۔“

کچھ دیر اس بارے میں بات ہوئی پھر موضوع بدل گیا۔ میں نے کہا۔ ”چاچا جی! کیا آپ واقعی اتفاق سے یہاں کرماں والا گاؤں کی طرف نکل آئے ہیں۔“

”اور یہی بات، میں تم چاروں سے بھی پوچھ سکتا ہوں؟“

میں نے گہری سانس لی۔ ”چاچا جی! میرا خیال ہے کہ اب ہمیں ایک دوسرے سے کچھ چھپانا نہیں چاہیے۔ اصل بات مان لینی چاہیے جس طرح آپ کی ملاقات پرویز سے ہو گئی ہے، اسی طرح ہماری بھی ہو چکی ہے۔“

چاچا رزاق کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔ ”اگر تم یہاں میری دمی رانی کی خاطر آئے ہو تو یہ میرے لیے بڑی امید والی بات ہے۔ میں تمہاری بڑی قدر کرتا ہوں تم نے پنڈ میں جس طرح دین محمد کے بچے کو کنوئیں میں سے نکالا، وہ بڑا ہمت اور دلیری والا کام تھا اور اس سے پہلے جس طرح تم نے سیالکوٹی کے حملے کے وقت تاجور کی جان بچائی، وہ بھی کوئی بھولنے والی بات نہیں۔ اللہ کرے کہ تمہاری یہ ہمت اور دلیری میری کرماں ماری دمی کے کام بھی آ سکے۔“ چاچے رزاق کی آواز بھرّا گئی اور وہ اپنی گرم چادر کے پلو سے آنکھیں پونچھنے لگے۔

”آپ سے پرویز کی ملاقات کب ہوئی؟“ میں نے پوچھا۔

”تین دن پہلے، چاند گڑھی میں۔ وہ نشے میں تھا۔ چوٹیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ پتا نہیں کیا کیا بک رہا تھا۔ یہاں کے ملنگوں کو گالیاں دے رہا تھا اور ساتھ ساتھ ہمیں بھی ۔ اب تو یہ منڈا حد سے گزر گیا ہے۔ وہ کرماں ماری صرف اور صرف اس کے کرتوتوں کی وجہ سے دنیا سے منہ موڑ کر ان ملنگوں میں جا بیٹھی ہے۔“

”آپ حوصلہ کرو چاچا، اگر تمہاری بیٹی واقعی اس ملنگی ڈیرے پر ہے تو پھر ہم اسے انشاء اللہ یہاں سے لے کے جائیں گے۔“

”تمہاری ملاقات پیجے سے کہاں ہوئی تھی؟“ چاچا رزاق نے آنسو پونچھ کر کہا۔

”یہاں سے کافی پیچھے۔ تو گزے کی قبر کے نام سے کوئی آستانہ ہے۔ وہاں چرس کے نشے میں بے ہوش پڑا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

’’کیا کہتا تھا؟‘‘

’’وہی کچھ جو آپ سے کہہ رہا تھا۔ لگتا ہے کہ اس نے اپنے طور پر ریشمی کو واپس لے جانے کی کوشش کی مگر ملنگوں نے اسے ڈرا دھمکا کر اور مار پیٹ کر بھگا دیا۔‘‘

’’کیا یہ ملنگ ہمارے ساتھ بھی یہی کریں گے؟‘‘ چاچا رزاق نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔

’’وہ کیا کریں گے، یہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلا کام تو یہ ہے کہ ریشمی سے کسی کا رابطہ ہو اور اس کی مرضی کا پتا چلے، ہم اسی لیے حیلے بہانے سے دین محمد صاحب کی بیٹی تاجور بی بی کو یہاں لے کر آئے ہیں۔‘‘

چاچا رزاق کی آنکھوں میں دبا دبا جوش نظر آیا، بولے۔ ’’تم لوگوں نے یہ بڑا سمجھ والا کام کیا ہے۔ میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی ریشمی کا ذہن بدل کر اسے یہاں سے نکال سکتا ہے تو وہ صرف تاجور ہے۔۔۔ لیکن ریشمی کا پتا کیسے چلے گا کہ وہ ڈیرے پر کس جگہ ہے اور ان دونوں کی ملاقات کیسے ہوگی؟‘‘

’’یہ سب کچھ ہم نے سوچ لیا ہے چاچاجی، آپ فکرمند نہ ہوں۔‘‘ انیق نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ’’بس ہم کو آپ سے ایک ہی درخواست کرنی ہے۔‘‘

’’کہو پتر، مجھے حکم دو۔‘‘

’’نہیں جی، آپ ہمارے بڑے ہیں، آپ کچھ ہی گئے ہوں گے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، آپ کی بیٹی کے لیے کر رہے ہیں جو ہمارے لیے بہن کی طرح ہے۔ اس کے بدلے ہماری بس ایک ہی درخواست ہے۔ یہاں آپ نے جو کچھ دیکھا ہے اسے صرف اور صرف اپنے تک رکھیں۔‘‘

چاچا رزاق نے بلاتوقف کہا۔ ’’میں اس کے لیے بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ تم مجھ سے جس طرح کا وعدہ چاہو لے سکتے ہو۔ بس میری بھی ایک ہی آرزو ہے بلکہ شاید یہ زندگی کی آخری آرزو ہے کہ میں اپنی ریشمی کو پھر سے ہنستا کھیلتا ہوا دیکھ سکوں۔‘‘

’’بالکل ایسا ہی ہوگا۔‘‘ میں نے کہا۔ میں کچھ مزید بھی کہنا چاہتا تھا مگر خاموش ہو گیا۔ سرائے کا ایک ملازم چھوٹی سی ٹرے لیے ہمارے آس پاس گھوم رہا تھا۔ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ وہ نئے آنے والوں پر نگاہ رکھے ہوئے ہو۔

باہر بارش ہونے لگی تھی، سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ چوٹیوں پر بجلی چمک رہی تھی۔ ڈھلوانوں پر پانی گرنے کا شور تھا۔ برسات کی اس رات میں ساتھ والے کمرے میں تاجور موجود تھی۔ جی چاہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر نکلوں اور بارش میں بھیگتے ہوئے اس جنگل میں گم ہو جاؤں۔ ایک پہاڑ کی چوٹی پر وہی تنہا خوب صورت مکان میری نگاہِ تصور میں اتر آیا جو میں نے کھٹارا بس میں سفر کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ مکان ہو، یہ موسم ہو اور تاجور ہو، پھر آخری سانس تک زندگی سے کوئی شکوہ نہ رہے۔

میری نظر اس ہاکی پر پڑی جس کے سہارے چاچا رزاق چلتے تھے۔ یہ ہاکی چاچا نے سرائے کی چوبی دیوار کے ساتھ کھڑی کی ہوئی تھی۔ کافی پرانی لیکن مضبوط ہاکی تھی۔ میں نے چاچا سے پوچھا۔ ’’آپ اسکول کے زمانے میں کھیلتے رہے ہیں؟‘‘

’’صرف کھیلتا ہی نہیں رہا، بہت اچھا کھیلتا رہا ہوں۔ میں گول کیپر تھا اور اپنی ٹیم کا کپتان بھی تھا۔ ماسٹر اشفاق کہا کرتے تھے ۔۔۔۔ تو بہت اوپر جائے گا رزاقے ۔۔۔۔ مجھے بھی ایسے ہی لگا کرتا تھا۔ بے شک میرا تعلق ایک چھوٹے سے قصبے سے تھا مگر ارادے چھوٹے نہیں تھے۔ میں گوجرانوالہ اور پھر لاہور تک جانا چاہتا تھا مگر پھر ایک دن سب کچھ چکنا چور ہو گیا۔ ایک میچ میں میری ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس زمانے میں آج جیسے علاج کی سہولتیں کہاں تھیں، مجھے علاج کے لیے کسی بڑے شہر میں بھیجا جانا چاہیے تھا لیکن جنہوں نے بھیجنا تھا، انہوں نے غفلت کی۔ میں گاؤں میں ایک ہڈی جوڑنے والے سے برا بھلا علاج کراتا رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن لاہور کے میو اسپتال میں میری ٹانگ کاٹ دی گئی۔‘‘

چاچا رزاق جیسے ماضی کے ان تلخ روز و شب میں کھو سے گئے تھے، ان کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں کچھ اور گہری ہو گئیں۔ چھوٹی جگہ کا ایک بڑا کھلاڑی پرواز سے پہلے ہی اپنے پر کٹوا بیٹھا تھا اور اب ایک کمزور اپاہج شخص کی حیثیت سے اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔

سخت سردی کی وجہ سے بوڑھے چاچا رزاق کی معذور ٹانگ میں رات بھر درد ہوتا رہا۔ صبح تو وہ اوپر ملنگی ڈیرے پر نہ جا سکے۔ تاہم میں انیق، تاجور اوپر چلے گئے۔ نوری، چاچا رزاق کی دیکھ بھال کے لیے نیچے ہی رہی۔ ملنگی ڈیرے پر وہی چند دن پہلے والی گہما گہمی تھی۔ حلوے مانڈے کی خوشبو، گھنگروؤں کی چھن چھن، چمٹے بجاتے اور رقص کرتے ہوئے مست حال ملنگ۔ تاجور خواتین والے حصے کی طرف چلی گئی۔ میں اور انیق اِدھر اُدھر گھومتے رہے اور جائزہ لیتے رہے۔ گہری لال آنکھوں والے دو ہٹے کٹے ملنگ مین دروازے کے قریب ٹہل رہے تھے۔ اب میں

پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ ان کے پیوند لگے کمبلوں کے نیچے آتشیں اسلحہ موجود ہے۔

تاجور کی واپسی قریباً دو گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ سیاہ برقع میں تھی۔ بس اس کی پیشانی اور آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ بالکل جیسے سیاہ بادل میں سے چاند کا ایک تابندہ حصہ چمک رہا ہو۔ انیق لنگر حاصل کرنے کے لیے ایک قطار میں کھڑا تھا۔ وہ سیدھی میری طرف آئی۔ وہ اندر سے جو تبرک لے کر آئی تھی، وہ کھیر کی شکل میں تھا اور مٹی کی چھوٹی تھالی میں تھا جسے ٹھوٹھی کہا جاتا ہے۔ ایسی ہی ایک ٹھوٹھی میرے ہاتھ میں بھی تھی۔ ہم دونوں وہیں پتھر کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر کھانے لگے۔

تاجور کی آنکھوں میں دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔ میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ ''کچھ کامیابی ہوئی؟''

''بالکل ہوئی۔۔۔ میں ریشمی سے مل کر آ رہی ہوں۔ ہم نے باتیں کی ہیں، وہ تو حیران ہو گئی مجھے دیکھ کر۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔''

''وہ ٹھیک تو ہے؟''

''ہاں، لیکن پہلے سے بڑی کمزور ہو گئی ہے۔۔۔۔ رنگ بھی سانولا ہو گیا ہے۔ بالکل گم صم سی لگتی ہے۔ باتیں کسی اور سے کر رہی ہوتی ہے دھیان کہیں اور ہوتا ہے۔''

''تم نے کیا بتایا اسے کہ کیسے آئی ہو؟''

''میں نے صاف کہہ دیا ہے کہ میں اس سے ملنے اور اسے لینے کے لیے یہاں آئی ہوں۔ اس کے اباجی بھی ساتھ ہیں۔ یہ سن کر اس کا رنگ پیلا پڑ گیا، کہنے لگی ۔۔۔ اب یہ نہیں ہو سکتا تاجور، اب میرا جینا مرنا یہاں پر ہی ہے۔ میں سارے ورقے پھاڑ کر یہاں آئی ہوں ۔۔۔۔ میں نے اس بارے میں زیادہ بحث نہیں کی۔ ابھی اس کو بس بات چیت میں رواں کیا ہے ۔۔۔۔ اور ہاں ۔۔۔۔ آپ کا اندازہ درست تھا۔ مزار کے سامنے عورتیں مل کر جو شعر گاتی ہیں ان میں اکیلی آواز ریشمی کی ہی ہوتی ہے، اس کی آواز کی یہاں بڑی قدر کی جا رہی ہے۔''

سرخ آنکھوں والا ایک مجاور ہمیں گھورتا ہوا ہمارے پاس سے گزرا۔ تاجور تھوڑا گڑبڑا گئی۔ میں نے کہا۔ ''خود کو نارمل رکھو۔ جیسے ہم ۔۔۔۔ میاں بیوی ہوں ۔۔۔۔ سلام کے لیے آئے ہوں۔''

''سلام کے لیے تو ٹھیک ہے، لیکن یہ دوسری بات ٹھیک نہیں۔'' وہ لمبی سانس لے کر بولی۔

''بھئی، فرض کر رہے ہیں ہم ۔۔۔۔ فرض کر رہے ہیں کہ میاں بیوی ہیں، فرض کر رہے ہیں کہ ابھی تک ہماری کوئی اولاد نہیں ہوئی ۔۔۔۔ فرض کر رہے ہیں کہ میری والدہ یعنی تمہاری ساس، پوتے پوتی کے لیے بہت بے چین ہیں۔۔۔''

''تو پھر آپ یہ بھی فرض کر لیں کہ میں نے آپ کو دھکا دیا ہے اور آپ سیڑھیوں سے لڑھکتے ہوئے نیچے گرے ہیں۔'' وہ ذرا مسکرا کر بولی۔

''نہیں، یہ فرض نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مزار ہے۔ ایسی جگہوں پر ایسی نازیبا باتیں فرض نہیں کرتے، یہاں پر دعا وغیرہ مانگتے ہیں۔''

''دعا بھی مانگی ہے کہ ہم جس مقصد کے لیے آئے ہیں، وہ اللہ کی مدد سے پورا ہو۔''

''اور میں جس مقصد کے لیے آیا ہوں؟''

''کیا مطلب؟''

''بھئی، میں تو تمہارے لیے آیا ہوں نا، تمہاری خاطر ۔۔۔۔ ایک آدھ بول میرے لیے بھی کہہ دینا تھا۔''

''آپ کے لیے ہدایت کی دعا مانگی ہے۔''

''ماشاء اللہ ۔۔۔۔ اور اپنے لیے؟''

''اپنے لیے آسانی کی۔''

''کس بات کی آسانی؟''

''جس الجھن اور مشکل میں آپ نے مجھے ڈال دیا ہے، اس میں سے نکلنے کی آسانی۔''

''تم محبت کو مشکل کہہ رہی ہو؟''

''سیانے کہتے ہیں کہ اس سے بڑی مشکل کوئی اور ہے ہی نہیں۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لی پھر ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''شاہ زیب! ریشمی سے مل کر خوشی بھی ہوئی ہے اور پریشانی بھی بڑھی ہے۔ وہ یہاں کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ ہماری بات مانے گی بھی یا نہیں ۔۔۔۔ میرے خیال میں اس کا سب سے بڑا خوف اس کا شوہر پیچا ہی ہے۔ اس خبیث کی وجہ سے وہ یہاں ہے۔''

''تو اسے پکڑوا دیتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ بیوی پر ظلم توڑتا رہا ہے۔ اسے گانے اور پیشہ کرنے پر مجبور کرتا رہا ہے۔ اس کے خلاف بڑا مضبوط کیس بن سکتا ہے۔ تین چار سال کے لیے آرام سے جیل میں چلا جائے گا۔ لاہور میں میرا ایک خالہ زاد کافی بڑا ایڈووکیٹ ہے۔ وہ یہ کام آسانی سے کر لے گا۔''

''لیکن اس کا خوف تو پھر بھی ریشمی کے سر پر سوار رہے گا نا۔''

اسی دوران میں انیق لنگر کے چاول لے کر ہماری طرف آ گیا اور ہم خاموش ہو گئے۔ انیق نے بتایا کہ لنگر خانے کے پچھواڑے ملنگوں نے ایک لڑکے کو بری طرح مارا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ درخت پر چڑھ کر عورتوں والے حصے میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

رات کو مسافر خانے میں ایک سریلے گیت کی مدھم آواز سنائی دی۔ یہ آواز تقریباً ایک فرلانگ اوپر ملنگی ڈیرے میں سے آ رہی تھی۔ مجھے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ یہ ریشمی ہی کی آواز ہے۔ سرائے میں لیٹے ہوئے کئی افراد اٹھ کر بیٹھ گئے اور بڑے دھیان اور احترام سے یہ آواز سننے لگے۔ شعر سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن یہ کوئی مناجات قسم کی چیز تھی۔ کچھ دیر بعد آواز تھم گئی اور پہاڑی سناٹے نے اس ٹھٹھری ہوئی شب کو پوری طرح ڈھانپ لیا۔

انیق تلی ہوئی مچھلی کھا کر سو گیا تھا۔ میں اٹھا اور سرائے سے باہر آ گیا۔ میں نے سیل فون پر لاہور میں داؤد بھاؤ سے رابطے کی کوشش کی اور کامیاب رہا۔ سگنل کمزور تھے۔ میں کچھ اور آگے نکل گیا اور ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر تفصیلی بات کی۔ داؤد بھاؤ اپنے اسی زیرِ زمین ٹھکانے پر تھا جس کے اوپر ایک ہائی فائی اسنوکر کلب کی سرگرمیاں جاری رہتی تھیں۔ مجھ سے بات کر کے داؤد بھاؤ خوش ہو گیا۔ ''کیسا چل رہا ہے؟'' اس نے اپنے مخصوص پاٹ دار لہجے میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''سب ٹھیک ہے اور سب سے پہلے تو آپ کے پٹھے کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں بھاؤ، انیق میری توقع سے بڑھ کر میری مدد کر رہا ہے۔ بڑا تنچل پیس عنایت فرمایا ہے آپ نے۔''

''تم خود بھی تو تنچل ہو۔ تمہارے جانے کے بعد بھی یہاں کلب میں تمہارے چرچے ہیں..... اور تو اور لودھی جیسا کھر دماغ باکسر بھی تمہاری تعریف کرنے پر مجبور ہے۔''

میں نے سنا پس منظر میں تماشائیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شاید رِنگ میں اب بھی کوئی باکسنگ مقابلہ جاری تھا۔ میں نے کہا۔ ''داؤد بھاؤ! اس وقت آپ کو ایک ضروری کام کے لیے فون کیا ہے۔''

''میرے خیال میں اس لڑکی کے سلسلے میں ہو گا جو تمہارے دل کو لگی ہوئی ہے۔ اگر سیدھی طرح ہاتھ نہیں آ رہی تو بتاؤ... ایک سو ایک دوسرے طریقے بھی ہیں۔''

''یہی کام تو کرنا نہیں ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تو پھر؟''

''بس ایک بندے کو پھڑکانا ہے..... جو اس بے چاری کی زندگی کا دشمن بنا ہوا ہے۔''

''نام بتاؤ اس کا..... اور بتاؤ رہتا کہاں ہے؟''

''نام ہے پرویز عرف پیجا اور ملے گا چاندنی کلب میں۔ وہاں اس کی بیوی گانا وغیرہ گاتی رہی ہے۔''

''تو پرابلم..... ہو جائے گا..... کہو تو آج رات ہی ہو جائے گا..... لیکن صرف پھڑکانا ہے یا تڑپانا بھی ہے۔''

''نہیں صرف پھڑکا دیں..... ڈیڈ باڈی بے شک کسی سڑک پر پھینک دیں۔ تصویر خود بخود ہی اخبار میں آ جائے گی۔''

''کوئی مزہ نہیں آیا۔'' داؤد بھاؤ بولا۔ ''تمہارا فون آیا تھا تو میں سمجھا تھا کہ کوئی بڑا کام ہو گا۔''

''بڑا کام بھی آنے والا ہے داؤد بھاؤ۔ پتا چلا ہے کہ لالہ وریام مجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ اپنے بھائی کی موت اسے ابھی تک ہضم نہیں ہوئی۔''

''موت بھی ہضم نہیں ہوئی اور اس کی موت سے کوئی سبق بھی نہیں سیکھا اس نے..... انیق نے بتایا تھا کہ آج کل وہ سیالکوٹ کے علاقے میں کہیں پایا جا رہا ہے اور وہاں بھی زمین پر کلے گاڑ کر کاشت کاروں کی بددعائیں لینے کا پروگرام بنا رہا ہے۔''

''بالکل ایسا ہی ہے داؤد بھاؤ، کچھ دیہات خالی کرانے کے لیے اس نے ایک ڈکیت سیالکوٹی کی مدد بھی لے رکھی ہے۔ سیالکوٹی اپنے گینگ کے ساتھ ان دیہات کے لوگوں کو مسلسل خوف زدہ کر رہا ہے۔ بہت سے لوگ نقل مکانی کر رہے ہیں..... یعنی مائیگریشن۔ اور ایک بات کا پتا مجھے اچھی طرح چل چکا ہے بھاؤ، یہ شکیل دار اب بھی ان لوگوں میں سے نہیں جو آسانی سے ہار مان لیتے ہیں۔ یہ اندر خانے ضرور بہت برا سوچ رہا ہو گا۔ مجھے ولید اور چاچا حفیظ کی طرف سے فکر رہتی ہے۔''

اچانک شور شرابا سنائی دینے لگا۔ شراب کی بوتلیں اور گلاس ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ پھر کوئی لڑکی سُریلے انداز میں چلائی۔ یقیناً یہ پکی عمر کے داؤد بھاؤ کی سترہ اٹھارہ سالہ رکھیل روبی ہی رہی ہو گی۔ ''کیا ہوا داؤد بھاؤ؟'' میں نے

پوچھا۔

''کچھ نہیں یار، لودھی ایک لڑکے سے جھگڑ پڑا ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔'' اس نے اطمینان سے کہا پھر بولا۔ ''باقی تمہارا کام ہو جائے گا..... آج ہی رات ہو جائے گا۔ تصویر بھی چھپ جائے گی..... اوکے؟''

''تھینک یو۔'' میں نے کہا۔

سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کام ہو جانے کی بات داؤد بھاؤ نے یوں کی تھی جیسے میں نے اسے بندہ مارنے کے لیے نہ کہا ہو۔ پانی یا بجلی کا بل ٹھیک کرانے کے لیے کہا ہو۔ مجھے یقین تھا کہ ویسا ہی ہوگا جیسا اس نے کہا ہے۔

ریشمی کے شوہر پیجے کو میں نے بیس چوبیس گھنٹے میں ہی پہچان لیا تھا۔ وہ پرلے درجے کا کرخت مزاج اور بدکردار شخص تھا جس کے درست ہونے کے امکانات دور دور نہیں تھے۔ ریشمی اور اس کے بوڑھے والدین کی زندگیاں اسی صورت بدترین عذاب سے بچ سکتی تھیں اگر پیجا ہمیشہ کے لیے ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ وہ ایک ظالم شوہر ایک بے رحم داماد اور ایک قابلِ نفرت انسان کی ساری خصوصیات پر پورا اترتا تھا۔

کرماں والا کے بازار میں اخبار اگلے روز پہنچتا تھا۔ منگل کا اخبار وہاں بدھ کو پہنچا اور مجھ سے پہلے انیق نے دیکھا۔ میں نے ابھی تک انیق کو نہیں بتایا تھا کہ داؤد بھاؤ سے فون پر میری کیا بات ہوئی ہے۔ ہم مسافر سرائے کے دالان میں بیٹھے پیالیوں میں چائے پی رہے تھے۔ تاجور ہمارے لیے مقامی طرز کے شکر پارے پلیٹ میں رکھ کر لائی تھی۔ ابھی میں نے پہلا شکر پارہ ہی اٹھایا تھا کہ انیق اخبار پکڑے اندر داخل ہوا اور بلند آواز میں بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! یہ دیکھیے، یہ کیا خبر ہے؟''

اس نے اخبار میری طرف بڑھایا اور اندرونی صفحے کی دو کالمی خبر پر انگلی رکھی۔ خبر سے پہلے میری نظر تصویر پر پڑی۔۔۔ اور یہ ریشمی کے بددماغ شوہر پرویز عرف پیجے کی تصویر تھی۔ خبر کی سرخی تھی۔ ''چوراہے میں گولیوں سے چھلنی لاش''

ذیلی سرخی تھی۔ ''مقتول پرویز ایک ٹھیکیدار کے پاس ملازم تھا۔ نامعلوم افراد نے قتل کر دیا۔''

خبر کی تفصیل اس طرح تھی۔ ''کل رات ایک بجے کے لگ بھگ مقتول پرویز نشے کی حالت میں موٹر سائیکل پر جا رہا تھا۔ نامعلوم کار سواروں نے اسے ٹکر مار کر گرایا اور گولیاں مار کر فرار ہو گئے۔ پرویز نے موقع پر ہی دم توڑ دیا۔ یاد رہے کہ پیجے کا ملنا جلنا مشکوک کردار کی عورتوں سے تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک اس کی مبینہ بیوی گلوکاری کرتی تھی اور ایک مقامی ہوٹل میں ڈنر کے وقت لائیو پرفارمنس دیتی تھی۔''

انیق خبر پڑھ رہا تھا اور چاچا رزاق کے ساتھ ساتھ تاجور بھی حیرت سے آنکھیں پھاڑے سن رہی تھی۔ چاچا رزاق نے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ اخبار تھاما اور غور سے پیجے کی تصویر دیکھنے لگے۔ پیجے کے چہرے کا ایک حصہ خون میں لتھڑا نظر آتا تھا۔ آنکھیں تارے لگی ہوئی تھیں۔ پھر چاچا نے اخبار ایک طرف رکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ روتے ہوئے بولے۔ ''اس نے بڑا دکھ دیا ہے میری دھی کو۔ بہت رلایا ہے اسے۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ مجھے پتا تھا ایک دن اس نے ایسے ہی مرنا ہے۔ ایسے ہی کسی گندی نالی میں گرے گا یہ۔۔۔''

☆☆☆

اس سہ پہر جب میں، انیق اور تاجور اوپر ملنگی ڈیرے پر گئے تو وہ اخبار بھی ہمارے ساتھ تھا۔ تاجور نے اسے تہ کر کے اپنے برقع میں چھپایا ہوا تھا۔ پہلے کی طرح ہم مردانہ حصے میں رہے اور تاجور زنانہ حصے میں چلی گئی۔

انیق اُڑتی چڑیا کے پر گنتا تھا۔ وہ گاہے بگاہے غور سے میری طرف دیکھنے لگتا تھا۔ آخر بول ہی اٹھا۔ ''شاہ زیب بھائی! اس پیجے کی موت کی ٹائمنگ بڑی زبردست ہوئی ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''ویسے ہی بات کر رہا تھا۔'' اس نے کہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد میری آنکھوں میں دیکھ کر گویا ہوا۔ ''یہ کل آپ نے جو داؤد بھاؤ کو فون کیا وہ کس سلسلے میں تھا؟''

کوشش کے باوجود میں اپنے ہونٹوں تک پہنچنے والی مسکراہٹ نہ روک سکا۔ انیق کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ میں نے کہا۔ ''تمہاری سونگھنے کی حس بڑی تیز ہے۔ ایک نمبر کے ٹوگیر ہو تم۔''

''یعنی میرا اندازہ درست ہے۔'' وہ چمک کر بولا۔ ''پرویز عرف پیجے کو آپ کی نظر لگی ہے۔''

''وہ تھا ہی اس قابل۔'' میں نے کہا۔

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات تو میں نے بھی محسوس کی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے بارے میں کتے کی ٹیڑھی دم والی مثال دی جاتی ہے۔ اب اللہ کرے اس دم کے کاٹے جانے کی خبر ریشمی کی زندگی کے

لیے مبارک ثابت ہو۔"

"ضرور ہوگی۔" میں نے کہا۔

ہم ملنگی ڈیرے کے طول و عرض میں گھومتے پھرتے رہے۔ یہ جگہ تقریباً پہاڑ کی چوٹی پر تھی۔ دو طرف گہری کھائیاں تھیں جن میں اترنا آسان نہیں تھا۔ تیسری طرف داخلی راستہ تھا۔ یہاں کڑا پہرا رہتا تھا۔ بہرحال ہم نے کسی شخص کے ہاتھ میں رائفل وغیرہ نہیں دیکھی۔ یہ لوگ آتشیں اسلحہ اپنے پیوند لگے کمبلوں یا صدریوں میں چھپا کر رکھتے تھے۔ داخلی دروازے کے قریب ایک بلند جگہ پر ہمیں ایک پوسٹ نما جگہ بھی نظر آئی۔ میرا اور انیق کا مشترکہ خیال تھا کہ یہاں کم از کم دو پہریدار کسی دور مار رائفل کے ساتھ موجود ہوں گے۔ بہرحال عملی طور پر ہمیں وہاں بھی کوئی رائفل دکھائی نہیں دی۔ ڈیرے کی چوتھی طرف نشیب میں لکڑی کا ایک جھولتا ہوا پل تھا۔ اس پل کو پار کر کے ساتھ والے پہاڑ پر جایا جاسکتا تھا۔ یہاں بھی کڑی نگرانی موجود تھی۔

اس روز تاجور کو زنانے حصے سے واپس آنے میں کافی تاخیر ہوئی۔ وہ ڈھائی بجے کے لگ بھگ گئی تھی۔ اندھیرا پھیل گیا۔ گیس لیمپس اور لالٹینیں جل اٹھیں لیکن وہ لوٹی نہیں۔ ہمیں تشویش ہونے لگی۔ مگر اسی دوران میں اس کا برقع نظر آگیا۔ وہ سیڑھیاں اترتی ہماری طرف آرہی تھی۔ اس کی ہموار متوازن چال یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ وہ مطمئن لوٹ رہی ہے۔ تاجور کو دیکھتے ہی انیق اِدھر اُدھر ہو جایا کرتا تھا تاکہ ہمیں آسانی سے بات کرنے کا موقع ملے۔ اس مرتبہ بھی وہ کھسک گیا۔

"اتنی دیر؟" میں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"دیر ہوئی لیکن درست ہوئی۔" وہ پتھریلی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

"میں نے ریشمی کو اخبار دکھایا۔ پہلے گم صم ہوگئی، پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ لیکن یہ پرویز کے مرنے کا دکھ نہیں تھا۔ اسے وہ سارے زخم یاد آگئے تھے جو اس بندے کی وجہ سے اسے لگے ہیں۔ مجھ سے کہنے لگی۔ "مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ ایک دن اس بندے کا یہی آخر ہونا ہے۔ وہاں ریشمی کی ساتھی عورت ایک اور اخبار بھی ڈھونڈ لائی۔ اس میں بھی پرویز والی خبر موجود تھی۔ ہم دیر تک اس بارے میں بات کرتے رہیں۔۔۔"

"کوئی کام کی بات بھی کی یا نہیں؟ میرا مطلب ہے اس کی واپسی کی بات؟"

تاجور نے ایک گہری سانس لی اور اس گہری سانس کے سبب برقع کے اندر اس کے جسم نے بڑے دلکش انداز میں حرکت کی۔ وہ بولی۔ "شاہ زیب! وہ اتنی جلدی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکتی۔ اس سے بار بار ملنا بھی آسان نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کے لیے کافی سارا وقت چاہیے ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ دو تین مہینے۔ کوئی اسے سمجھانے والا ہو اور وہ پکا ارادہ کر کے لگا رہے تو شاید اس کا ذہن بدل جائے۔"

"لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے تاجور کہ دو تین مہینے میں وہ یہاں کے رنگ میں کچھ اور رنگ جائے۔"

"ہاں، ہونے کو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ملنگوں اور مجاوروں نے یہاں مشہور کر رکھا ہے کہ مزار میں لیٹی ہوئی ہستی کی آواز ریشمی کی آواز میں بدل گئی ہے۔ اسی وجہ سے اس آواز میں درد ہے اور لوگ ملنگی ڈیرے کی طرف کھچے چلے آتے ہیں۔۔۔"

"مزار میں لیٹی ہوئی؟ تمہارا مطلب ہے یہ مزار کسی عورت کا ہے؟"

"ہاں، یہی تو انکشاف ہوا ہے آج۔ اسے مستاں مائی کا مزار کہتے ہیں۔ وہ دو تین سو سال پہلے یہاں دفن ہوئی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ اس میں جادو تھا۔ وہ خود ہی شعر جوڑتی تھی اور پڑھتی تھی۔ راہ گیر اس کی آواز سن کر رک جاتے تھے اور پرندے بھی آس پاس جمع ہو جاتے تھے۔ کچھ اسی طرح کی باتیں ہیں۔"

"ایسی کہانیاں تو ایسے مزاروں، مقبروں کے بارے میں گھڑ ہی لی جاتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"پر شاہ زیب! اب جو کہانی گھڑی گئی ہے، وہ ریشمی کے لیے بڑی خطرناک ہے۔ بڑے مجاور اور پردے والی سرکار کہہ رہی ہے کہ ریشمی کے گلے میں مستاں مائی کی آواز ہے۔ اس لیے ریشمی کا درجہ بہت اونچا ہے۔ اسے ملنگی ڈیرے کے زنانے حصے میں رہنے کے لیے بڑی خاص جگہ دی گئی ہے۔ میں آج دیکھ کر آرہی ہوں۔ وہاں ہر وقت انگیٹھیاں جلتی ہیں، نرم گدے ہیں، فانوس کی طرح کے بڑے بڑے لیمپ ہیں اور بجلی کی روشنی بھی ہے۔ انگیٹھیوں میں کوئی خوشبو بھی پھینکی جاتی ہے جس کی وجہ سے ہر طرف مہک سی رہتی ہے۔ دو تین نوکرانیاں رات دن ریشمی کے آس پاس رہتی ہیں۔ وہ تو۔۔۔۔" تاجور کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

"بات تو پوری کرو۔" میں نے کہا۔

"وہ تو مجھے بھی یہ مشورہ دے رہی ہے کہ میں یہاں

آجاؤں، باہر کی دنیا میں کچھ نہیں رکھا، بس دکھ اور تکلیفیں ہیں۔''

''یعنی لینے کے دینے۔'' میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ ''چلو بھئی چلو۔ مٹی ڈالو اس ریشمی پر۔ صبح نکل چلتے ہیں۔ پہلے ٹائم والی بس پکڑ لیں گے کوٹلی کے لیے۔''

سیاہ نقاب کے اوپر تاجور کی آنکھیں مسکرائیں۔ وہ بولی۔ ''فرض کر لیں کہ میں ریشمی کی باتوں میں آجاتی ہوں اور فرض کر لیں کہ میں زنانے حصے میں جاتی ہوں اور پھر واپس نہیں آتی .... اور فرض کر لیں کہ آپ کو اکیلے واپس جانا پڑتا تو پھر ....؟''

''تو پھر یہ بھی فرض کر لو کہ میں نے آٹھ دس ملنگ مار ڈالنے ہیں اور اپنی کنپٹی پر خود ہی پستول رکھ کر گولی چلا لینی ہے۔''

''اتنا غصہ؟''

''نہیں اتنا پیار .... جب تم اس طرح کی بات کرتی ہو تو جی چاہتا ہے کہ ....'' میں نے دانت پیس کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا جی چاہتا ہے؟''

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اگر بتا دوں تو..... تم اپنا رنگ لال گلابی کر لو گی اور ہو سکتا ہے کہ اگلے آٹھ دس روز تک مجھ سے بات ہی نہ کرو۔''

''اتنے بُرے ارادے ہیں۔'' وہ مجھے گھور کر بولی۔

میں نے نفی میں سر ہلا کر پہلو بدلا اور سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''مذاق کر رہا ہوں تاجور .... تم سے جتنا پیار کرتا ہوں، اتنا ہی احترام بھی کرتا ہوں تمہارا۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ تمہیں دیکھنے سے پہلے بھی تم سے اجازت لوں، سچ بہت چاہتا ہوں تمہیں۔''

''کہتے ہیں زیادہ پیار اچھا نہیں ہوتا اور وہ بھی ایک ایسے شخص سے جسے آپ اچھی طرح جانتے بھی نہ ہوں۔''

''یعنی تم کہنا چاہ رہی ہو کہ ..... تم مجھے ٹھیک سے جانتی نہیں ہو؟''

''ہاں شاہ زیب ..... کبھی کبھی ایسا ہی لگتا ہے مجھے شاید ..... آپ نے اپنے بارے میں بہت کچھ مجھ سے چھپا رکھا ہے۔''

''یہ غلط فہمی ہے تمہاری۔''

شاید میں کچھ اور بھی کہتا مگر دو ملنگوں کو بھاگتے دیکھ کر چونک گیا۔ یوں لگا جیسے وہ کسی کے پیچھے لپک رہے ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک محرابی دروازے میں داخل ہو کر اوجھل ہو گئے۔ اردگرد موجود کئی اور مرد و زن نے بھی ان بھاگتے ہوئے ملنگوں کو دیکھا تھا اور اب سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ایک ملنگ تیز تیز قدموں سے چلتا اسی محرابی دروازے کی طرف بڑھا۔ ایک عورت نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ''کیا ہوا سائیں جی؟''

''کچھ نہیں، ایک جیب کترا تھا۔'' ملنگ نے مختصر جواب دیا اور محرابی دروازے میں اوجھل ہو گیا۔

اس کا جواب اور انداز تسلی بخش نہیں تھا۔ بہر حال اس کے بعد بھاگ دوڑ کا کوئی اور منظر نظر نہیں آیا۔ اردگرد موجود لوگ پھر اپنے اپنے حال میں مگن ہو گئے۔ کچھ دیر بعد میں یونہی ٹہلتا ہوا ایک منڈیر کے پاس پہنچا۔ میں انیق کو دیکھنا چاہ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ انیق تو نظر نہیں آیا لیکن میری نگاہ دور نیچے گہرائی میں گئی۔ قریباً تین چار سو فٹ نیچے ملنگی ڈیرے کا ایک زیریں حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک منظر مجھے چند سیکنڈ کے لیے دکھائی دیا اور بری طرح چونکا گیا۔ مجھے تین چار ملنگ دکھائی دیے جو ایک نوجوان کو مارتے اور گھسیٹتے ہوئے ایک جانب لے جا رہے تھے۔ میں کافی بلندی سے دیکھ رہا تھا پھر بھی مجھے اندازہ ہوا کہ نوجوان بری طرح لہولہان ہے۔ وہ شاید ملنگوں سے جان بخشی چاہتا تھا مگر وہ کچھ نہیں سن رہے تھے۔ گہرائی اتنی زیادہ تھی کہ نوجوان کے چلانے کی آواز اور ملنگوں کے دہاڑنے کی صدائیں مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ وہ لوگ زخمی نوجوان کو گھسیٹتے ہوئے ایک دروازے میں اوجھل ہو گئے۔ یہ سارا منظر بمشکل تین چار سیکنڈ پر مشتمل تھا۔

''کیا ہوا شاہ زیب؟'' سیڑھیوں پر بیٹھی تاجور نے میرے تاثرات دیکھ کر کہا۔

''کچھ نہیں، یونہی جائزہ لے رہا تھا۔ بہت زیادہ گہرائی ہے اس طرف۔''

اس سے پہلے کہ تاجور کوئی مزید سوال پوچھتی، ایک طرف سے انیق آتا دکھائی دیا۔ وہ مناسب وقت پر آیا تھا۔ میں نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بادل گھرے ہو رہے ہیں، کسی بھی وقت بارش ہونے لگے گی۔ تم انیق کے ساتھ نیچے سرائے میں جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔''

''کیوں؟ کہاں جانا ہے؟'' وہ فکرمندی سے بولی۔

''ایک واقف بندہ نظر آیا ہے، اسے دیکھ کر آتا ہوں۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

تاجور نے تھوڑی سی بحث کی لیکن پھر وہ انیق کے ساتھ مغربی جانب کی سیڑھیاں اتر کر سرائے کی طرف روانہ

ہوگئی۔ نوجوان کی بے چارگی کا منظر مسلسل میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ یہاں کوئی گڑبڑ چل رہی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو دو ملنگ بھاگتے ہوئے ہمارے سامنے سے گزرے تھے، وہ بھی غالباً اسی نوجوان کے پیچھے تھے۔ کیا پتا یہ وہی نوجوان ہو جسے پرسوں مارا بھی گیا تھا۔

جونہی انیق اور تاجور میری نظروں سے اوجھل ہوئے، میں عام انداز سے چلتا ہوا مشرقی ڈھلوان کی طرف اترنے لگا۔ ایک جگہ پتھروں پر لکھا ہوا نظر آیا..... آگے جانا منع ہے۔ مگر میں اس وارننگ کو نظرانداز کرتا آگے بڑھتا رہا۔ تیس چالیس قدم آگے جاکر مجھے طویل سیڑھیاں نظر آئیں جو گہرائی کی طرف جارہی تھیں۔ اچانک ایک تنومند ملنگ نے میرا راستہ روک لیا، اس کے ہاتھ میں مضبوط لاٹھی تھی۔ اپنے نیلے چولے کے اوپر اس نے پیوند لگا کمبل اوڑھ رکھا تھا۔

''اِدھر کہاں آگئے ہو؟'' وہ مجھے دیکھ کر کرخت لہجے میں بولا۔ سردی کے سبب اس کے منہ سے بھاپ نکل رہی تھی۔

''میں پردے والی سرکار سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''ان کی چمی لینی ہے۔ میرا مطلب ہے ان کے پاؤں چومنے ہیں۔''

''کیا بکواس کرتے ہو؟ کون ہو تم؟ تم نے وہاں اوپر لکھا ہوا نہیں دیکھا، اِدھر آنا منع ہے۔''

''عام لوگوں کا آنا منع ہے۔ میں تو عاشق ہوں سرکار جی کا۔''

ملنگ کو میرے بارے میں شک ہوگیا تھا۔ اس نے فوراً کمبل اٹھایا۔ میری توقع کے عین مطابق کمبل کے نیچے چینی ساخت کی چھوٹی رائفل موجود تھی۔ وہ پھنکارا۔ ''شناختی کارڈ ہے تمہارے پاس؟''

''نہیں کارڈ تو نہیں، لیکن اگر آپ کو برا لگ رہا ہے تو واپس چلا جاتا ہوں۔''

''اب اتنی دور آگئے ہو تو آسانی سے واپس کیسے جا سکو گے۔'' وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

مجھے لگا کہ وہ اپنے کسی ساتھی کو آواز دینا چاہ رہا ہے۔ میں حرکت میں آیا اور میرا حرکت میں آنا اس کے لیے بڑا جان لیوا ثابت ہوا۔ میں نے اس کی چربی دار گردن پر اسی جگہ ہاتھ رسید کیا تھا جس کی ضرب ریڑھ کی ہڈی تک پہنچتی تھی اور جسم و دماغ کا رابطہ معطل ہوجاتا تھا۔ تنومند ملنگ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح سیڑھیوں پر گرا۔ اس کی لاٹھی ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

ملنگ اور لاٹھی کے گرنے کی آوازوں نے ایک اور شخص کو میری طرف کھینچ لیا۔ یہ بھی ایک ملنگ تھا مگر چھریرے جسم کا اور زیادہ پھرتیلا۔ اس نے ساتھی کی گری ہوئی لاٹھی اٹھائی اور پوری طاقت سے میرے سر کے دو ٹکڑے کرنے چاہے۔ میں نے اس کے دو وار بڑے اطمینان سے بچائے اور تیسرے وار سے پہلے ہی اسے دبوچ کر پشت کے بل گرا دیا۔ گرتے ہوئے ملنگ کا سر بڑے زور سے پتھریلی سیڑھیوں سے ٹکرایا تھا۔ میں نے ایک بار مزید اس کے سر اور سیڑھی کا ملاپ کرایا۔ وہ بھی بے سدھ ہوگیا۔ میں دونوں کو گھسیٹ کر پاس ہی ایک پتھریلی کوٹھری میں لے آیا۔ جو ہونا تھا، وہ ہوچکا تھا۔ اب پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھنا ہی مناسب تھا۔ میں نے دونوں ملنگوں کا جائزہ لیا۔ ایک ملنگ کا قد کاٹھ مجھ سے مطابقت رکھتا تھا۔

قریباً دس منٹ بعد میں لمبے نیلے چولے اور کمبل میں ملبوس سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ میرے پاؤں ننگے تھے اور ہاتھ میں بانس کی لمبی لاٹھی تھی۔ میں نے اپنے سر پر ملنگ کی نیلی چادر اس طرح ڈال لی تھی کہ لمبا گھونگھٹ بن گیا تھا۔ یہ دھاری دار چادر تھی اور گھونگھٹ کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ گھونگھٹ والے پردہ دار ملنگوں کی موجودگی یہاں ثابت ہوچکی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ کوئی مجھ پر خصوصی توجہ نہیں دے گا۔ دونوں بے ہوش ملنگوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر میں نے ان کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیے تھے اور انہیں گھنے جھاڑ جھنکاڑ میں ڈال دیا تھا۔ امید نہیں تھی کہ وہ دو تین گھنٹے تک میرے لیے کوئی مشکل پیدا کرسکیں گے۔

سو کے قریب سیڑھیاں اترنے کے بعد میں ملنگی ڈیرے کے خاص حصے میں پہنچ گیا۔ یہاں ملنگوں کے علاوہ جواں سال ملنگنیاں بھی نظر آئیں۔ میں ایک وسیع ہال میں داخل ہوا۔ یہ پتھر کا ایک قدرتی چیمبر تھا۔ یہاں لذیذ کھانوں کی خوشبو رچی بسی تھی۔ میں نے وہ محرابی دروازہ پہچان لیا تھا جس میں زخمی نوجوان کو گھسیٹ کر لے جایا گیا تھا۔ میں درست سمت میں جارہا تھا۔ جب ایک دروازے میں سے گزرنے لگا تو ایک پہریدار نے کہا۔ ''کہاں جارہے ہو مہارک؟''

میں نے گھونگھٹ ہٹائے بغیر پہریدار کے کان میں سرگوشی کی۔ ''کرنالی صاحب نے بلایا ہے۔ ایک بری خبر ہے۔''

''کیا؟''

''واپسی پر بتاتا ہوں۔'' میں نے پھر سرگوشی کی۔ سرگوشی میں آواز کا پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ لہٰذا لگا کہ کام چل گیا ہے مگر جب میں آگے بڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ پہریدار کی نگاہیں میرے پاؤں پر جمی ہوئی ہیں۔ میرے پاؤں صاف ستھرے تھے جبکہ ملنگوں کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ پہریدار چونک چکا ہے مگر اس سے پہلے کہ وہ کسی طرح کا ردِعمل ظاہر کرتا، میں راہداریوں کی بھول بھلیوں میں داخل ہو چکا تھا۔ یہاں جگہ جگہ گیس لیمپس روشن تھے۔ ایک دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے، مجھے عجیب سی آوازیں سنائی دیں۔ جیسے جانور یا ایک سے زیادہ جانور کسی چیز پر جھپٹ رہے ہوں اور چھینا جھپٹی بھی کر رہے ہوں۔ ایک جگہ بڑی سی سلاخ دار کھڑکی کے سامنے کئی ملنگ جمع تھے اور ڈرے ڈرے انداز میں کچھ دیکھ رہے تھے۔ میں بھی ان کے درمیان جا کھڑا ہوا۔ اپنے گھونگھٹ کے اندر سے میں نے جو کچھ دیکھا وہ دل کی دھڑکنیں روکنے والا تھا۔ میں نے سیاہ دھبوں والے تین جسیم چیتے دیکھے۔ ان کی تھوتھنیاں خون سے سرخ تھیں اور وہ گوشت کے چند لوتھڑوں کو اِدھر اُدھر کھینچ رہے تھے..... وہ ایک انسانی جسم کے لوتھڑے تھے۔ جا بجا کپڑے کی دھجیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ یہ ایک سیاہ پتلون اور کریم کلر سویٹر کی دھجیاں تھیں۔ قمیص وغیرہ کی دھجیاں بھی ہوں گی لیکن انہیں علیحدہ سے شناخت کرنا مشکل تھا۔ مجھے پہچاننے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی، یہ وہی بدقسمت نوجوان تھا جسے کچھ دیر پہلے ہٹے کٹے ملنگ گھسیٹ کر یہاں لائے تھے۔

کھڑکی سے چند فٹ کے فاصلے پر موجود لیوپارڈ چیتے نے نوجوان کے جسم کا ایک نازک حصہ اپنے خونی جبڑوں میں دبا رکھا تھا۔ دوسرے چیتے نے اس کی خون آلود کلائی دبوچ رکھی تھی۔ اس کٹی ہوئی کلائی پر ابھی تک رسٹ واچ بندھی ہوئی تھی۔ میں چند سیکنڈ کے لیے اس دلدوز منظر میں کھو کر رہ گیا۔ تب ایک دم مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ طویل راہداری کے موڑ پر وہی پہریدار نظر آیا جس نے مجھے روکا تھا۔ وہ لپکتا ہوا میری جانب بڑھ رہا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنی چاہی لیکن اس سے پہلے ہی ایک سفاک سرگوشی میرے کانوں میں گونجی۔ ''اپنی جگہ سے ایک انچ بھی حرکت کرو گے تو آٹھ گولیوں کا برسٹ پورے کا پورا تمہارے دل میں اتار دوں گا۔''

تب میں نے محسوس کیا کہ میری بائیں بغل کے نیچے رائفل کے بیرل کا بے رحم دباؤ موجود ہے۔ پچھلے پانچ چھ سالہ تجربے نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ کہاں پھرتی دکھانا ٹھیک ہوتا ہے اور کہاں نہیں۔ یہ ہرگز پھرتی دکھانے کا موقع نہیں تھا۔

سرگوشی کرنے والے نے مجھے الٹے قدموں پیچھے آنے کے لیے کہا۔ میں چند قدم پیچھے ہٹا، اسی دوران میں پہریدار بھی ہانپتا کانپتا وہاں پہنچ گیا۔ اب اس کے ہاتھ میں رائفل بھی نظر آرہی تھی۔ یہ دوسری رائفل بھی میرے سر سے آن لگی۔ دونوں رائفل برداروں کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسلحے کے استعمال میں زبردست مہارت رکھتے ہیں۔ اس منظر نے ہمارے اردگرد ایک دم ہلچل مچا دی تھی۔ چیتوں کی خون آشامی کا لرزہ خیز منظر دیکھنے والے بھی اب کھڑکی سے نگاہیں ہٹا کر ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خوف جما ہوا تھا۔ پھر جب انہیں یہ احساس ہوا کہ یہاں کسی بھی وقت فائرنگ ہو سکتی ہے تو وہ کونے کھدروں میں سمٹنے لگے۔

دو مزید رائفل بردار وہاں پہنچ گئے۔ رائفلوں کا رخ میری طرف ہی تھا۔ ایک نے رائفل کی نال سے دھاری دار چادر میرے چہرے سے ہٹائی۔ دوسرے نے کڑک کر کہا۔ ''ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔''

میں نے ہاتھ اٹھا دیے۔ جو رائفل میری بائیں بغل کے نیچے لگی ہوئی تھی اس نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ اس رائفل کی موجودگی میں مزاحمت کرنا خودکشی کے برابر تھا۔ اس کے باوجود میں موقع کی تلاش میں تھا..... یہ موقع مجھے تب ہی مل سکتا تھا جب وہ جذباتی ہو کر مجھ سے مار پیٹ کی کوشش کرتے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ میرا پستول اور موبائل فون بڑی احتیاط سے میری قمیص کے نیچے سے نکال لیا گیا اور مجھے ایک راہداری سے گزار کر ایک لاک اپ نما جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ یہ جگہ سرمئی رنگ کے پتھروں کو تراش خراش کر بنائی گئی تھی یا پھر خود ہی وجود میں آگئی تھی۔ اس لاک اپ یا کوٹھڑی کی ایک جانب لوہے کی موٹی موٹی زنگ آلود سلاخیں تھیں۔ نیچے چاول کی چھال بچھی ہوئی تھی۔ کونے میں دو تین بوسیدہ کمبل اور میلے چیکٹ تکیے رکھے تھے۔

مجھے لاک اپ میں دھکیلنے کے بعد دروازے کو ایک

بھاری قفل لگا دیا گیا۔ سرخ آنکھوں والا ایک گیم شحیم ملنگ مجھے اپنی سرخ انگارا آنکھوں سے گھورے جا رہا تھا، میں نے پہچان لیا یہ وہی ڈشکرا تھا جس نے پرسوں تاجور کو اور مجھے سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھا تھا اور ہمیں مسلسل تاڑتا رہا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کڑے لہجے میں بولا۔ ''تیرے ساتھ والی زنانی کہاں ہے؟''

''کون سی زنانی؟''

''جو تیرے ساتھ یہاں لور لور پھر رہی تھی۔ ماں بہن تو نہیں تھی تیری .... معشوق ہو گی یا گھر والی ہو گی۔ چلو کوئی بات نہیں۔ ابھی پتا چلا لیتے ہیں۔''

وہ تیز قدموں سے چلتا ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ باقی افراد مجھے کڑی نظروں سے گھورتے رہے اور آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے۔ یہ سب لمبے نیلے چغوں اور کندھوں تک جاتے ہوئے بالوں والے ملنگ اور مجاور تھے۔ ان میں سے اکثر کی صورتوں پر پھٹکار برس رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک کے سوا سب افراد تتر بتر ہو گئے۔

میں یخ بستہ لاک اپ کی پتھریلی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ تاجور اور دیگر ساتھیوں کی طرف سے پریشانی لاحق ہو رہی تھی۔ بہرحال اس بات کی امید تھی کہ اگر وہ لوگ پکڑے گئے تو ان کو بھی یہاں ہی لایا جائے گا۔ یہ جگہ یقیناً ایسے کاموں کے لیے ہی استعمال ہوتی تھی۔ شاید یہاں پکڑے جانے والوں پر تشدد وغیرہ بھی کیا جاتا ہو۔ چند زنجیریں ایک دیوار میں پیوست تھیں، اس کے علاوہ ایذا رسانی کی کچھ نشانیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

میری نگاہوں کے سامنے وہ ہولناک منظر بھی گھوم رہا تھا جو تھوڑی دیر پہلے میں نے یہاں سے کچھ فاصلے پر دیکھا تھا۔ بھوکے چیتوں کی پھنکاریں اور ان کے درمیان انسانی گوشت کے لڑھکتے ہوئے ٹکڑے۔ کٹی ہوئی کلائی پر رسٹ واچ کا منظر جیسے ذہن میں پیوست ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ وہی بدقسمت نوجوان تھا جسے دو دن پہلے بھی مارا پیٹا گیا تھا۔ انیق نے مزار کے سامنے یہ منظر دیکھا تھا اور بتایا تھا کہ ملنگوں نے ایک ایسے لڑکے کی درگت بنائی ہے جو زنانے حصے میں تاک جھانک کر رہا تھا۔

ایک میٹھا میٹھا سا درد میرے جسم میں لہریں لینے لگا۔ یہ خطرات کی آمد کا درد تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہاں کچھ سنسنی خیز واقعات پیش آنے والے ہیں اور سنسنی خیزی میرے لیے کبھی کبھی روح کی غذا کا کام دیا کرتی تھی۔ [illegible] ہوا جس کے اندیشے لاحق تھے۔ قریباً ایک گھنٹا سخت کشمکش میں گزارنے کے بعد مجھے نسوانی آوازیں سنائی دیں۔ یہ تاجور کی صدا تھی اور میں اسے ہزاروں صداؤں میں سے پہچان سکتا تھا۔ وہ ملنگوں پر برس رہی تھی۔ ''چھوڑو مجھے .... میں کہتی ہوں مجھے ہاتھ نہ لگاؤ، چھوڑ دو۔''

تین افراد اسے گھسیٹتے ہوئے لاک اپ کے سامنے لائے۔ ان تین افراد میں ایک ملنگ اور دو ملنگنیاں تھیں۔ ایک ہٹی کٹی ملنگنی نے تاجور کو اپنے بازوؤں میں جکڑ رکھا تھا، دوسری نے دائیں ہاتھ سے اس کے بال جکڑ رکھے تھے۔ بائیں ہاتھ میں موبائل فون تھا۔ یہ تاجور کا ہی تھا مگر تاجور بھی کوئی عام شہری لڑکی نہیں تھی۔ خالص دودھ مکھن کی پلی ہوئی دیہاتی مٹیار تھی۔ وہ ملنگنیوں کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہی تھی۔

بالآخر ملنگ نے لاک اپ کا دروازہ کھولا اور دونوں ملنگنیوں نے تاجور کو زوردار دھکا دے کر اندر پھینک دیا۔ اندر نیم تاریکی تھی۔ وہ سیدھی مجھ پر گری۔ میں چت ہو گیا اور وہ مجھ پر سوار سی ہو گئی۔ تاہم ایسا صرف دو تین سیکنڈ کے لیے ہوا۔ وہ تڑپ کر مجھ سے جدا ہوئی اور دروازے کی طرف جھپٹی۔ دونوں ہاتھوں سے سلاخوں کو جھنجوڑنے لگی اور ملنگوں پر چلانے لگی۔ میں ملنگوں والے لباس میں تھا اور نیم تاریکی کی وجہ سے وہ مجھے بالکل نہیں پہچان پائی تھی۔ اس صورتِ حال کو برقرار رکھنے کے لیے میں نے گھونگھٹ نما چادر اپنے سر پر لے لی۔ اب وہ پکار رہی تھی۔ ''شاہ زیب .... شاہ زیب .... کہاں ہیں آپ.... بچاؤ .... کوئی میری مدد کرو۔''

یقیناً وہ اتنا تو جانتی تھی کہ میں بھی کسی مشکل میں پھنس کر یہاں پہنچ چکا ہوں مگر کہاں ہوں، یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ کافی دیر پکارتی رہی لیکن کسی نے اس کی آواز پر کان نہیں دھرا۔ اس کا گلا رندھ گیا۔ میں نے اپنے دائیں ہاتھ سے اپنے گلے کے ونڈ پائپ یعنی سانس کی نالی کو دبایا۔ ایسا کرنے سے آواز بالکل بیٹھ جاتی ہے اور بدل جاتی ہے۔ ریڈیو، ٹی وی وغیرہ کے صداکار یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ میں نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بچہ جی، اس طرح رونے چلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ کسی نے کچھ نہیں سننا۔''

اس نے گھوم کر ڈری ڈری نظروں سے مجھے دیکھا۔

''آ.... آپ کون ہیں؟'' وہ ہکلائی۔

میں نے اس کا گال سہلایا۔ ''تمہاری ہی طرح کا ایک مجبور۔ کل تک جس کی عزت تھی۔ آج وہ بے وقار ہو گیا ہے۔ بے گناہی کے جرم میں یہاں پھنسا دیا گیا ہے۔''

وہ میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ لوگ مجھے کیوں پکڑ کر لائے ہیں یہاں؟''

میں نے کہا۔ ''بچہ جی، ہمیں تو خود اپنا پتا نہیں، تمہارا کیا بتائیں۔''

وہ مجھے سر تا پا گھور رہی تھی۔ جیسے سمجھ نہ پا رہی ہو کہ میں کیا چیز ہوں۔ یہ بات تو وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ یہاں کچھ ایسے ملنگ بھی موجود ہیں جو خود کو سر تا پا کپڑوں میں چھپائے رکھتے ہیں۔ وہ لرزاں آواز میں بولی۔ ''کیا یہ لوگ میرے علاوہ بھی یہاں کسی کو لے کر آئے ہیں؟''

''ہاں، لمبا سا لڑکا تھا۔ کھڑی ناک والا۔ خاکی رنگ کی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی، اوپر کالی جیکٹ تھی۔''

وہ تڑپ کر بولی۔ ''ہاں ہاں.... اب.... کہاں ہے وہ؟''

''وہ تمہارے ساتھ تھا؟'' میں نے بیٹھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''جی ہاں، وہ میرے ساتھ یہاں آئے تھے، سلام کرنے کے لیے۔''

''کیا لگتا ہے تمہارا؟''

''مم.... منگیتر۔'' وہ ہکلائی۔

''بچہ جی۔ وہ تو بڑا بزدل نکلا۔ پہلے تو ذرا اکڑا۔ لیکن جب ان لوگوں نے ڈنڈوں سے مار لگائی تو رونے لگ پڑا۔ معافیاں مانگنے لگا۔ تمہارا پتا بھی ان لوگوں کو اسی نے بتایا ہے۔ تمہارے ساتھ دو اور بندے بھی ہیں نا، ایک جوان ہے دوسرا بڑی عمر کا، لنگڑا کر چلتا ہے؟''

تاجور کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے۔ ''نہیں.... ایسا نہیں ہوسکتا۔ آ.... آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ وہ ایسے نہیں ہیں۔ اب.... اب کہاں ہیں وہ؟''

''تمہیں بتایا ہے نا بچہ، اسے لے گئے ہیں یہاں سے.... اب اسے یہاں کی بڑی ملنگنی کے حوالے کر دیں گے۔ وہ اس کی.... عزت لوٹے گی.... اور ہوسکتا ہے کہ اسے پکا پکا اپنا رکھیلا بنا لے۔ رکھیلا سمجھتی ہو نا تم؟ جیسے مردوں کی رکھیل ہوتی ہے، عورتوں کا رکھیلا۔''

تاجور حیرت سے منہ کھولے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے الجھن آمیز شک بھی تھا۔ اس نے ایک بار پھر مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولی۔ ''آپ کون ہیں، مجھے آپ سے.... ڈر لگ رہا ہے۔''

''بابا مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' میں نے اس کا فقرہ دہرایا۔ ''کتنا خوب صورت جملہ ہے بچہ۔ ہم ویسے تو فلم نہیں دیکھتے لیکن پچھلی جمعرات کو ہم نے ''سرکار جی'' کے کہنے پر رشی کپور کی ''بوبی'' دیکھی تھی۔ اس میں وہ بے ہودہ سا گانا ہے، ہم تم ایک کمرے میں بند ہوں۔ رشی کپور کہتا ہے، آگے ہو گھور اندھیرا، پیچھے کوئی ڈاکو لٹیرا۔ وہ کہتی ہے، بابا مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

تاجور اب بری طرح چونک چکی تھی۔ اس نے ایک دم ہاتھ بڑھا کر میرے چہرے سے گھونگھٹ الٹ دیا۔ وہ کچھ دیر سکتہ زدہ سی کھڑی رہی پھر بیٹھ گئی اور چہرہ ہاتھوں میں چھپا کے رونے لگی۔

''اتنی بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں ہم اور آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔'' وہ کراہ کر بولی۔ وہ دو تین منٹ تک سسکیاں لیتی رہی، پھر کچھ نارمل نظر آنے لگی۔

میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور پورے اعتماد سے کہا۔ ''تاجور! میں جب ساتھ ہوں تو پھر کوئی خطرہ، خطرہ نہیں ہے۔ ہم ایسے خطروں کو چٹکیوں سے اڑا دیں گے۔''

وہ ایک بار پھر میرا حلیہ دیکھ کر بولی۔ ''آپ یہ کیا بنے ہوئے ہیں اور آپ کو یہاں بند کیوں کیا ہے انہوں نے؟''

''یہ تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ وہ دیکھو باہر بیٹھا پہریدار کیسے گھور رہا ہے ہمیں۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''کچھ پتا بھی ہے آپ کو کہ کیا ہوا ہے وہاں سرائے میں؟ یہ لوگ مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آئے تھے، انیق کو ان پر شک ہو گیا۔ اس نے انہیں روکا، سرائے کے برآمدے میں انہوں نے انیق کے ساتھ لڑائی شروع کر دی۔ مجھے اور چاچا رزاق کو موقع مل گیا۔ ہم پچھلے دروازے سے بھاگ نکلے۔ آگے جا کر پتا ہی نہیں چلا۔ اندھیرے میں چاچا کسی اور طرف نکل گئے میں کسی اور طرف۔ ایک چھت پر سے ایک ملنگنی نے مجھے دیکھ لیا اور شور مچا دیا۔ یہ لوگ مجھے پکڑ کر یہاں لے آئے؟''

میں نے اس کا چہرہ اور ہاتھ پاؤں دیکھے۔ کوئی چوٹ وغیرہ نہیں تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''کوئی مار پیٹ تو نہیں کی تمہارے ساتھ؟''

''نہیں، بس ملنگنیاں کھینچا تانی کر رہی تھیں۔ ایک دو دفعہ میرے سر کے بال بھی نوچے ہیں۔'' اس نے اپنے ٹوٹے ہوئے بالوں کو سر سے جھاڑتے ہوئے کہا۔

''گھبراؤ نہیں تاجور، ان چند بالوں کے بدلے میں

ان کو پورا پورا گنجا نہ کر دیا تو نام نہیں۔"
"کک..... کیا کریں گے آپ؟"
"وہی جو پہلے کرتا آیا ہوں۔ جادو ٹونا..... تم سے کہا ہے نا کہ تمہاری صورت میں میرے پاس ایک جادو ٹونا ہے، جو بڑی سے بڑی مصیبت کو دھواں بنا کر اڑا سکتا ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔
"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔" وہ روہانسی ہوگئی۔
"لیکن میری سمجھ میں کچھ کچھ آرہا ہے۔ انیق اور چاچا رزاق ابھی تک یہاں نہیں پہنچے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ ابھی تک ان لوگوں کے ہاتھ نہیں آئے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی طرف سے ہی کوئی مدد آجائے اور اگر نہ بھی آئی تو کچھ نہ کچھ ہم ضرور کرلیں گے۔ مجھے یقین ہے، اور اس یقین کی وجہ یہ ہے کہ تم میرے ساتھ ہو۔"
وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ویسے جو میں کہہ رہا تھا، وہ حقیقت تھی۔ فی الوقت میں بالکل نہتا تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ کوئی مشکل پڑی تو مجھے کس طرح اپنا اور تاجور کا دفاع کرنا ہے۔ لیکن ایک بات کا مجھے پکا یقین تھا اگر کوئی ایسی صورت ہوتی کہ یہ لوگ ہم پر اور خاص طور سے تاجور پر ہاتھ ڈالتے اور وہ خطرے میں ہوتی تو میں کچھ نہ کچھ ضرور کر گزرتا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ میرے ہوتے ہوئے وہ کسی آفت سے دوچار ہوتی۔ اچانک مجھے نوری کا خیال آیا، میں نے پوچھا۔ "نوری کہاں ہے؟"
تاجور نے کہا۔ "وہ شاید وقتی طور پر تو بچ گئی ہے۔ اسے اس کے علاقے کی کوئی عورت مل گئی تھی۔ اس کے ساتھ پاس کے کسی گاؤں تک گئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ رات بھی وہیں رہے۔"
کوئی آدھ گھنٹے بعد سرخ آنکھوں والا گرانڈیل ملنگ اپنے لمبے بالوں کو جھلاتا ہوا آہنی سلاخوں کے سامنے نمودار ہوا۔ ایک رائفل بردار کمبل پوش اس کے عقب میں تھا۔ ملنگ نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورا اور پھنکارا۔ "تم جو کوئی بھی ہو لیکن اپنے لیے بڑی مشکل پیدا کرلی ہے تم نے۔ وہاں اوپر سیڑھیوں پر تم نے دو بندوں کو زخمی کر کے باندھا ہے۔ ان میں سے ایک ابھی تک ہوش میں نہیں آیا۔ اسے کچھ ہوگیا تو تمہارے ساتھ بھی وہی کچھ ہوگا جو اس لاہوری لونڈے کے ساتھ ہوا ہے۔"
میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اسی لڑکے کا حوالہ دے رہا ہے جس کے جسمانی اعضا میں نے ایک قریبی کمرے میں بکھرے دیکھے تھے۔
"میں نے جو کچھ کیا ہے اپنے دفاع میں کیا ہے۔" میں نے کہا۔
"اپنے دفاع میں ہی تم نے بشارت خان کو ننگا کیا، اور اپنے دفاع میں اس کے کپڑے پہن کر یہاں اندر کے حصے میں گھس آئے..... زبردست..... بہت اچھے..... اب ذرا اپنے "دفاع" میں یہ بھی بتا دو کہ تمہارے دونوں بھگوڑے ساتھی کہاں ہوں گے اور کیسے پکڑے جاسکتے ہیں؟"
"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟"
"تم کہہ سکتے ہو۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا اور سلاخوں کے اندر سے میرا موبائل مجھے تھما دیا۔
"کیا کروں؟"
اس نے تاجور کی پروا کیے بغیر ایک ننگی گالی دی اور بولا۔ "ان کو فون کرو اور یہاں بلاؤ ان کو۔ ورنہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوگا وہ نہ بتانے کے قابل ہے اور نہ سننے کے۔"
"فون ان کے پاس نہیں ہے۔ ہم دونوں کے پاس ہی تھا۔"
اس نے اچانک سلاخوں کے درمیانی خلا میں بازو ڈال کر مجھے گھونسا مارنا چاہا۔ یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی مگر میں نے جان بوجھ کر گھونسا کھایا تاکہ اس کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہو۔
وہ کچھ دیر تک مجھ سے فون کرنے کے بارے میں تکرار کرتا رہا، پھر جھپٹ کر موبائل فون میرے ہاتھ سے لیا اور پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔
پریشان کن حالات کے باوجود مجھے بھوک محسوس ہورہی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ میں ان حالات کو پریشان کن سمجھ ہی نہیں رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب کچھ دیر بعد ایک اخبار میں لپیٹ کر کھانا ہم تک پہنچایا گیا تو مجھے اس کی خوشبو اچھی لگی۔ یہ کھانا تندوری روٹی اور بڑے گوشت کے کبابوں پر مشتمل تھا۔ ساتھ میں چٹنی تھی۔ میرے بہت اصرار کے باوجود تاجور ایک لقمہ بھی نہیں لے سکی۔ میں نے تین چار کباب اس کے لیے رہنے دیے کہ شاید رات کو وہ کسی وقت بھوک محسوس کرے۔
رات سرد اور گم صم تھی۔ بس دور کہیں ڈھول بجنے اور چمٹا کھڑکھڑانے کی مدھم آواز سنائی دیتی تھی یا پھر کسی وقت ملنگوں کے کسی گروہ کا نعرۂ مستانہ بلند ہوتا تھا۔ کوٹھری یعنی

لاک اپ کے باہر دو مسلح پہریدار چوکس حالت میں موجود تھے۔ انہوں نے ہمیں ایک لالٹین دے دی تھی، مگر کچھ دیر بعد میں نے تاجور کے کہنے پر اسے بجھا دیا تھا۔ روشنی میں ہمیں ہر وقت یہی لگتا تھا کہ پہریدار ہمیں گھور رہے ہیں، تاریکی میں سکون کا احساس ہوا۔ ہم بوسیدہ کمبل لینا نہیں چاہتے تھے مگر سردی کے سبب لینا پڑے۔ ہم اپنے درمیان تین چار فٹ کا فاصلہ رکھ کر لیٹ گئے۔ تاجور مسلسل یہ سوال کر رہی تھی کہ ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے اور اگر نہ نکل سکے تو ہمارے ساتھ کیا ہوگا؟

وہ سرگوشی میں بولی۔ ''شاہ زیب! آپ نے تو کہا تھا کہ ان لوگوں نے آپ کو اوپر لنگر خانے کے قریب سے پکڑا ہے، مگر وہ لال آنکھوں والا ملنگ کچھ اور کہہ رہا تھا۔''

''کیا کہہ رہا تھا؟''

''یہی کہ آپ خود نیچے اترے ہیں اور دو ملنگوں کو زخمی کر کے ....''

''بکواس کر رہا تھا۔ اس طرح کے کئی جھوٹ یہ لوگ بولیں گے۔ کیا تم ان پر بھی یقین کر لوگی۔''

''لیکن یہ کپڑے آپ نے کیسے پہنے؟''

''میں نے نہیں پہنے، انہوں نے پہنائے ہیں اور تم اپنے ننھے منے ذہن کو زیادہ تکلیف نہ دو۔ سوچنے کے لیے اور کرنے کے لیے میں جو موجود ہوں یہاں۔ کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں؟''

وہ جذباتی لہجے میں بولی تو اس کی آواز بھرا گئی۔ ''بھروسا ہے تبھی تو آپ کے کہنے پر اتنی دور چلی آئی ہوں۔''

''اور مجھے یقین ہے تاجور کہ... میں تمہارے بھروسے کو ٹوٹنے نہیں دوں گا کبھی نہیں۔''

''مم.... میرا دل بہت زیادہ دھڑک رہا ہے۔''

''اس کو سمجھاؤ کہ ذرا آرام کرے .... اور تم بھی سو جاؤ۔ میں ہوں نا جاگنے کے لیے۔''

رات دھیرے دھیرے آگے کو سرکتی رہی۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ دھیمی آواز میں باتیں کرتی رہی۔ شاید اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی سوچ بار بار اس دائرے میں گھوم رہی تھی کہ انیق اور چاچا رزاق کہاں گئے ہوں گے .... اور یہ کہ اگر وہ جلد ملنگی ڈیرے سے نکل کر واپس کوٹلی نہ جا سکی تو وہاں کیا صورتِ حال بنے گی؟

اچانک کہیں پاس ہی ایک سرسراہٹ سی سنائی دی۔ پھر ایک ''تیز باریک چنگھاڑ سی'' خاموشی کا سینہ چیرتی چلی گئی۔ میں ایک لحظ میں پہچان گیا۔ یہ چیتے کی آواز تھی۔ تاجور جلدی سے میری طرف کھسک آئی اور میرا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔ تب چیتے کی تیز آواز دوسری مرتبہ ابھری۔ یہ شاید دوسرا چیتا تھا۔

تاجور لرزاں آواز میں بولی۔ ''یہ کیا ہے شاہ زیب؟''

وہ اتنی پاس تھی کہ میں نے اس کی کمر کو تسلی آمیز انداز میں تھپکا۔ ''کچھ نہیں .... کوئی جانور ہے شاید۔''

''کون سا جانور ہے یہ .... اور .... یہاں کیا کر رہا ہے؟'' وہ پھر ہکلائی۔

''جو بھی ہے تاجور.... لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں اس سے کوئی خطرہ نہیں۔''

چیتے اب مسلسل چلا رہے تھے۔ شاید دو نر آپس میں لڑ رہے تھے یا پھر یہ نر اور مادہ کی اٹھکیلیاں تھیں۔

تاجور نے سرگوشی کی۔ ''شاہ زیب! ایسی آواز تو .... چیتوں کی ہوتی ہے .... میں نے چڑیا گھر میں ایک دو بار سنی ہے۔''

''شاید چیتے ہی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''جس طرح کچھ لوگ رکھوالی کے لیے کتے وغیرہ رکھتے ہیں .... کچھ لوگ دوسرے جانور بھی رکھتے ہیں۔ یہاں پاس ہی ایک لکڑی کا پل ہے۔ میرا خیال ہے یہ جانور اس پل کی رکھوالی کے لیے رات کو چھوڑ دیے جاتے ہوں گے۔ دن کے وقت تو ایسی کوئی آواز سنائی نہیں دی۔''

چیتوں کی آوازیں تو کچھ دیر بعد تھم گئیں، لیکن تاجور کا خوف برقرار رہا۔ اس نے میرا بازو مسلسل اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے رکھا۔ اس کے ناخن میرے بازو کے بالائی حصے میں پیوست ہو رہے تھے۔ وہ اتنی قریب تھی کہ میں اس کی سانس کا لمس تک محسوس کر سکتا تھا۔

میں اس سے تسلی تشفی کے بول بولتا رہا۔ دھیرے دھیرے اس کا خوف کم ہو گیا۔ اس نے میرا بازو تو چھوڑ دیا لیکن میرا اور اپنا درمیانی فاصلہ بڑھانے کی ہمت نہیں کی۔ وہ ابھی تک اسی لباس میں تھی جس میں ہم تین دن پہلے کوٹلی سے روانہ ہوئے تھے۔ برقع کا زیریں حصہ ابھی تک اس کے جسم پر تھا لیکن بالائی حصہ ملنگنیوں کی کھینچا تانی میں کہیں گر گیا تھا۔ اس کی چوڑیوں کی کھنک مجھے اپنے بالکل قریب سنائی دے رہی تھی اور بدن کی مہک اپنی سب سے الگ پہچان رکھتی تھی۔ چند سال پہلے پیرس کے ایک نامور ترین

عطار سے میرا واسطہ پڑا تھا۔ اس نے انڈر ورلڈ کے ایک بندے سے اپنی جان بچانے کے لیے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا اور اسی سلسلے میں کچھ تحائف پیش کیے تھے۔ ان میں ایک نایاب پرفیوم بھی تھا۔ مجھ سمیت جس نے بھی اس پرفیوم کا تجربہ کیا، اسے بے مثال قرار دیا تھا لیکن مجھے وہ پرفیوم بھی اس قدرتی ..... کنواری مہک کے سامنے ہیچ محسوس ہوتا تھا جو چاند گڑھی کی اس الھڑ کے پیکر سے پھوٹتی تھی۔ اس میں کچی مٹی، گیلے پتوں، ادھ کھلے شگوفوں اور گندم کی بالیوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔

کوئی اور صورتِ حال ہوتی تو اس خاموش تاریکی میں تاجور کا یہ قرب میرے لہو میں چنگاریاں بھرنے لگتا لیکن اب معاملہ کچھ اور طرح کا تھا۔ پھر بھی یہ سچویشن مجھے بھلی لگی۔ کل کیا ہونا تھا، اس کا کچھ پتا نہیں تھا لیکن آج جو کچھ تھا، دلچسپ اور سنسنی خیز تھا۔

میں نے ذرا مزہ لینے کے لیے کہا۔ ''ویسے تو تاجور! اس بات کی اطلاع پرویز کے ذریعے چاند گڑھی تک بھی پہنچ چکی ہوگی کہ ریشمی ملنگی ڈیرے میں پھنسی ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ خبر یاسر بھائی تک بھی پہنچ جائے اور وہ مدد کے لیے کچھ کرے۔''

تاجور نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہونے کو ہو بھی سکتا ہے۔ مدد کے لیے تو وہ ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہی ہے چند دنوں میں انہوں نے عالمگیر اور اسحاق وغیرہ کا زور کس طرح توڑا۔ عالمگیر اور تحصیل دار کو آپس میں ہی لڑایا اور جیل پہنچا دیا۔''

''ہاں، یہ بات تو ہے۔'' میں نے تائید کی۔

اچانک یوں لگا جیسے کوٹھڑی کی عقبی دیوار کے ساتھ کسی نے اپنا جسم زور سے رگڑا ہو۔ اس کے فوراً بعد چیتے کی لرزہ خیز پھنکار سنائی دی۔ اس مرتبہ آواز اتنی نزدیک تھی کہ تاجور بے ساختہ چلا کر مجھ سے لپٹ گئی۔ چند سیکنڈ کے لیے میں بھی پریشان ہوا لیکن اس بات کی تسلی تھی کہ جانور جتنا قریب بھی ہے لیکن کوٹھڑی کی پتھریلی دیوار کی دوسری جانب ہے۔

کچھ دیر بعد آواز فاصلے پر چلی گئی لیکن تاجور کا فاصلہ وہی رہا۔ اس نے اپنا چہرہ میرے سینے میں چھپا رکھا تھا۔ اس کے جسم کا دلکش گداز میرے جسم میں منتقل ہو رہا تھا پھر وہ جیسے چونک کر مجھ سے جدا ہوئی اور کراہی۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے شاہ زیب! ہم کہاں پھنس گئے ہیں؟''

''حوصلہ رکھو۔ سب ٹھیک ہوگا۔'' میں نے کہا۔

میں ایک بار پھر اس کی ڈھارس بندھانے لگا۔ اس کا خوف کم کرنے کے لیے میں نے لالٹین پھر روشن کر دی اور بہت اصرار کر کے اسے دو کباب کھلائے۔ اسی دوران میں راہداری کی طرف کچھ آہٹیں ہوئیں پھر کوٹھڑی کا آہنی دروازہ کھلا۔ ملنگ پہریدار اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ پھر انہوں نے کسی کو ننگی گالی دی اور زوردار دھکے سے کوٹھڑی میں پھینک دیا۔ اندر آنے والا اوندھے منہ گرا، یہ چاچا رزاق تھے۔ میں نے لپک کر انہیں اٹھایا اور بٹھایا۔ ان کے ہونٹوں سے خون رس رہا تھا اور چہرے پر چوٹوں کے گہرے نشان تھے۔ چاچا کا پورا جسم خشک کیچڑ سے لتھڑا ہوا تھا۔ چاچا کی بیساکھی کیننی ہاکی ان کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ کوٹھڑی سے باہر ایک ڈشکرے ملنگ کے ہاتھ میں تھی۔ شاید اس ہاکی کو بھی ہتھیار قرار دیا گیا تھا اور باہر ہی روک لیا گیا تھا۔

دروازہ مقفل کر کے پہریدار جس طرح آئے تھے اسی طرح دندناتے ہوئے واپس چلے گئے۔ تاجور سسکنے لگی۔ میں نے چاچا کو پانی پلایا۔ وہ لرز رہے تھے اور کراہ رہے تھے۔ چند منٹ بعد ان کی طبیعت ذرا بحال ہوئی۔ تو میں نے اچھی طرح ان کا جائزہ لیا۔ کوئی بڑی چوٹ تو نہیں آئی تھی لیکن پورے جسم پر ضربات موجود تھیں۔ ان کا گریبان بھی ناف تک پھٹا ہوا تھا۔ ایک ضعیف شخص سے اس طرح کا سلوک ان لوگوں کی کم ظرفی کو ظاہر کرتا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''چاچا..... انیق کا کچھ پتا ہے؟''

''وہ بھی پکڑا گیا۔'' چاچا نے افسردگی سے کہا۔ ''بلکہ شاید مجھ سے پہلے ہی پکڑا گیا تھا۔''

''لیکن یہ لوگ اسے یہاں لے کر نہیں آئے۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' چاچا نے کراہ کر کہا۔

چاچا نے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ وہ چھپے نہیں تھے بلکہ بھاگنے کی کوشش میں ایک گڑھے کے اندر گر گئے تھے۔ اس گڑھے میں کیچڑ بھری تھی۔ وہ وہیں دبک کر بیٹھے رہے، بس ان کا سر ہی کیچڑ سے باہر رہا۔ لمبی گھاس نے انہیں چھپائے رکھا۔ لیکن یہ پناہ گاہ تادیر انہیں بچا نہ سکی۔ جلد ہی ٹارچوں کی روشنی میں انہیں دیکھ لیا گیا اور کھینچ کر باہر نکال لیا گیا۔ یہی وقت تھا جب ایک ملنگ کی باتوں سے یہ پتا چلا کہ انیق کو بھی ڈھونڈا جا چکا ہے۔

اب نیا سوال پیدا ہو رہا تھا کہ انیق کو یہاں کیوں نہیں پہنچایا گیا۔ کہیں وہ زیادہ زخمی تو نہیں تھا یا پھر اسے علیحدہ رکھ کر پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔

اگلے روز صبح سویرے ایک اور عجیب واقعہ ہوا۔ ہم نے سلاخوں میں سے دیکھا کہ تین چار پہریدار ایک شخص کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ایک طرف لے جارہے تھے اور یہ کوئی اور نہیں وہی لال انگارا آنکھوں والا ملنگ رنگا نامی تھا۔ پتا نہیں کہ اس کا کیا قصور تھا۔ وہ تو ہمیں پکڑنے اور اس کوٹھڑی تک پہنچانے میں پیش پیش تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہماری حیرت میں اضافہ ہوگیا' جب ہمیں کسی قریبی کمرے سے کراہنے اور چلّانے کی آوازیں آئیں۔ مجھے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔ یہ اسی رنگا نامی ملنگ کی آوازیں تھیں۔

''لگتا ہے کہ اسے چھڑی یا بید سے پیٹا جارہا ہے۔'' چاچا رزاق نے کہا۔

''مگر کیوں؟'' تاجور نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

اس ''کیوں'' کا جواب ہمیں تب تو نہیں ملا، مگر اگلے روز دوپہر کو مل گیا۔ اگلے روز دوپہر تک کا وقت ہم نے جس شدید کشمکش اور تفکر میں گزارا' وہ کچھ ہمیں ہی معلوم تھا۔ ہر گھڑی یہی لگ رہا تھا جیسے ہم ملنگی ڈیرے میں نہیں، کسی دور دراز جزیرے میں پھنس گئے ہیں اور وہاں ہر گھڑی انوکھے واقعات رونما ہورہے ہیں۔ میرے لیے کوئی اور پریشانی تو اتنی اہم نہیں تھی مگر انیق کے سلسلے میں، میں بھی فکرمند تھا۔ اسے پکڑے گئے دو دن سے زیادہ ہوچکے تھے مگر اس کے بارے میں کچھ خبر نہیں تھی۔ جو پہریدار ہمیں اس خ بستہ کوٹھڑی میں کھانا پہنچا رہے تھے، میں نے ان سے پوچھنے کی کوشش کی تھی لیکن وہاں سے جھڑکی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔ اس دوران میں ایک موقع پر جب تاجور سوئی ہوئی تھی، لکڑی کے پل کی جانب سے ایک بار پھر پالتو چیتوں کی لرزہ خیز آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے چاچا رزاق کو اس بارے میں بتایا۔ یہ موضوع چھڑا تو پھر اس خونی واقعے کا ذکر بھی ہوا جس میں ان جانوروں نے ایک جوان لڑکے کی جان لی تھی۔ چاچا ششدر رہ گئے۔

خدا خدا کر کے یہ کفر ٹوٹا اور تیسرے روز دوپہر کے بعد ہمیں انیق کی شکل نظر آئی۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ بہتر لباس میں تھا۔ اس نے سفید شلوار قمیص پہن کر سیاہ رنگ کی گرم چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی کھینچا تانی بھی نہیں ہوئی اور کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اسے ہمارے پاس اندر پہنچا دیا گیا۔ اس کے بائیں ہاتھ اور ایک رخسار پر چوٹ کا نشان تھا۔ ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ میرے گلے لگ گیا۔ اس کے بعد چاچا رزاق سے ملا۔

رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد ہم چاول کی چھال پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ انیق کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس کچھ نہایت اہم قسم کی اطلاعات ہیں۔ اس نے تھوڑی سی تمہید باندھنے کے بعد کہا۔ ''شاہ زیب بھائی! ہم ایک بڑی مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔ چوبیس گھنٹے پہلے تک ہم چاروں کی زندگیاں اتنے شدید خطرے میں تھیں کہ آپ تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اب بھی یہ خطرہ کم نہیں ہوا.... ہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ٹلا ہوا ہے۔ کتنی دیر تک ٹلا رہتا ہے؟ یہ ہمارے رویے پر ہے۔''

''کیسا رویہ؟''

''ہم مجاوروں کی بات مانتے ہیں یا نہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ ہمارے پاس ''نہیں'' کی گنجائش بہت کم ہے۔'' اس کی آواز گمبھیر تر ہوگئی۔

میں نے تاجور کی طرف دیکھا، اس کا رنگ زرد ہورہا تھا۔ کوئی اور جگہ بھی نہیں تھی جہاں ہم بیٹھ کر بات کرسکتے۔ ہمارے لیے سب کچھ یہی کوٹھڑی تھی۔ سلاخوں کی دوسری جانب دونوں مسلح پہریدار حسب معمول موجود تھے اور عقابی نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ جیسے اس بات کا اندیشہ موجود ہو کہ ہم دھواں بن کر یہاں سے اڑ جائیں گے۔ میں نے تاجور کو اشارہ کیا۔ وہ اس لمبوتری کوٹھڑی کے آخری کونے میں جا کر بیٹھ گئی۔ ہم سرگوشیوں میں بات کرنے لگے۔ انیق نے کہا۔ ''پرسوں جب آپ ڈیرے کے اس خاص حصے میں آئے آپ نے کیا دیکھا؟''

میں نے بدقسمت لڑکے کے حصے بخرے ہونے والا واقعہ بیان کردیا۔

وہ بولا۔ ''اس واقعے نے ڈیرے کے ملنگوں میں تھرتھلی مچا رکھی ہے۔ اس لڑکے کا نام اسامہ تھا۔ وہ لاہور کے ایک بڑے پولیس افسر کا بیٹا، یا شاید چھوٹا بھائی تھا۔ جس طرح ہم ریشمی کے لیے یہاں آئے ہیں، وہ بھی کسی لڑکی کے لیے یہاں آیا تھا۔ ان ملنگوں نے اسے مار ڈالا ہے اور ہمارے لیے بدترین بات یہ ہوئی ہے کہ ہم اس قتل کے گواہ بن گئے ہیں۔''

''یہ بات تو بے شک ہے۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''اصل میں گواہ تو آپ ہی تھے اور وہ بھی اتفاقاً بنے۔ مگر اس کے بعد ان لوگوں سے حماقت ہوئی اور انہوں نے تاجور اور چاچا کو بھی گواہوں میں شامل کردیا۔ میری بات سمجھ رہے ہیں نا آپ؟ جب آپ تینوں کو ایک ہی

کوٹھری میں بند کیا گیا تو دوسرے لفظوں میں آپ تینوں اس قتل سے باخبر ہو گئے۔"

"اور یہ حماقت کس نے کی؟"

"اسی.... لال آنکھوں والے ملنگ رنگا نے۔ اس بات پر اسے کافی ذلت بھی اٹھانی پڑی ہے۔" انیق نے کہا۔

میری نگاہوں میں وہی کل صبح والا منظر گھوم گیا۔ گرانڈیل رنگا کو گھسیٹ کر کہیں بند کیا گیا تھا اور بیدو غیرہ بھی مارے گئے تھے۔

انیق بولا۔ "اب ایک طرح سے ہم چاروں ہی اس قتل کے گواہ ہیں، اور ہماری وجہ سے قتل کے ذمے دار پھانسی کے پھندے تک پہنچ سکتے ہیں۔"

صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا.... اور جو بات انیق کہنا چاہ رہا تھا وہ بھی سمجھ میں آ رہی تھی۔ ایک اعلیٰ پولیس آفیسر کا بیٹا یا بھائی یہاں ہولناک طریقے سے قتل ہوا تھا اور باہر کے لوگوں میں سے ہمارے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ایسا ہو چکا ہے۔

انیق نے کہا۔ "شاہ زیب بھائی! پرسوں رات تک تو یہی لگ رہا تھا کہ یہ لوگ ہم چاروں کو بھی مار کر یہیں کہیں گاڑ دیں گے اور قیامت تک کسی کو ہمارا کھوج نہیں ملے گا۔ لیکن پھر سچویشن بدلی۔ میں نے کوشش کی، اللہ نے بھی مدد کی اور حالات میں کچھ تبدیلی آئی۔ لیکن یہ تبدیلی کب تک رہے گی اس کا دارومدار اسی بات پر ہے کہ ہم کیا فیصلہ کرتے ہیں۔"

"کوئی شرط رکھی ہے انہوں نے؟"

"شرط نہیں جی، شرائط ہیں، اور بہت کڑی۔ لیکن اگر ٹھنڈے دل سے سوچا جائے تو ہمیں جان کے فوری خطرے سے بچنے کے لیے یہ سب کچھ مان لینا چاہیے بلکہ اگر سچی بات پوچھیں تو میں تو دلی طور پر مان بھی چکا ہوں۔ اب آپ تینوں کا کیا فیصلہ ہوتا ہے یہ پتا نہیں۔"

"تم تجسس بڑھا رہے ہو، کھل کر بات کرو انیق۔"

انیق نے ایک نظر تاجور کی طرف دیکھا، پھر آواز مزید دھیمی کر کے کہا۔ "ہمیں پردے والی سرکار کا مرید بن کر یہاں رہنا ہوگا۔ ایک خاص چاردیواری میں، ہم وہاں سے نکل نہیں سکیں گے۔"

"کب تک؟" چاچا رزاق نے پوچھا۔

"اس سوال کا جواب ذرا سخت ہے۔ میں آپ کو بتانے کے بجائے کچھ دکھانا چاہوں گا۔"

"کیا مطلب تمہارا؟"

"میں نے بڑے مجاور کرنالی صاحب سے اجازت لے لی ہے۔ ہم اس لاک اپ سے باہر چلیں گے لیکن تھوڑی سی پابندی آپ کو سہنا پڑے گی۔ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ آپ کے ہاتھ پشت پر باندھیں گے۔ واپس آ کر کھول دیں گے۔"

"کون کون جائے گا؟"

"آپ چلے جائیں اور ساتھ چاچا رزاق کو لے لیں۔"

"لیکن میں تاجور کو یہاں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"اس کے لیے بالکل فکرمند نہ ہوں۔ میں آپ کو پوری گارنٹی دیتا ہوں۔" اس نے بھرپور اعتماد کے ساتھ کہا۔

"نہیں، میں اس سلسلے میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔" میرا لہجہ حتمی تھا۔

انیق نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔ "ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا ہوں۔" اس نے باہر جا کر کچھ دیر پہریداروں کے لیڈر سے کھسر پھسر کی پھر واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ راضی ہو گئے ہیں۔ دوسری اچھی خبر یہ تھی کہ صرف میرے ہاتھ پشت پر جکڑے جانے تھے، چاچا رزاق اور تاجور کو رعایت مل گئی تھی۔ انیق وہ ہاکی بھی پہریداروں سے واپس لے آیا جس کے سہارے چاچا رزاق چلتے تھے۔

میرے ہاتھ پشت کی طرف موڑ کر ان میں خاص طرح کی ہتھکڑیاں پہنائی گئیں۔ یہ لوہے کے بجائے توت یا کسی اور مضبوط لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ پہریدار نے یہ کڑیاں کوٹھری میں پہنچائیں اور انیق نے معذرت کے ساتھ مجھے پہنا دیں۔ اوپر گرم چادر کی بکل مار لی گئی تاکہ عام لوگ میرے بندھے ہاتھ نہ دیکھ سکیں، ہم انیق سمیت باہر نکل آئے۔ چار مسلح افراد کی معیت میں ہم کوٹھری سے نکلنے کے بعد ایک طویل راہداری میں سے گزرے۔ دو آہنی دروازوں میں سے گزرنے کے بعد چوکور شکل کے ایک وسیع چیمبر میں پہنچ گئے۔ چھت کوئی سات فٹ بلند تھی۔ ٹیڑھی میڑھی پتھریلی دیواروں سے پتا چلتا تھا کہ یہ قدرتی جگہ ہے۔ بس دو چار جگہ آہنی گرلیں اور شیشے وغیرہ لگا کر اسے ہال کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس میں حجرہ نما کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان حجروں میں آرام دہ گدوں اور فرنیچر سمیت تقریباً تمام ضروریاتِ زندگی نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف نہانے کے لیے وسیع تالاب تھا جس میں کسی گرم چشمے کا بھاپ دیتا ہوا پانی داخل ہوتا تھا۔ یہاں ہمیں کچھ ایسے مردو

زن نظر آئے جنہوں نے اچھے قیمتی لباس پہن رکھے تھے لیکن ایک تعجب خیز بات تھی، وہ سب کے سب لنگڑا کر چل رہے تھے۔ ہر ایک کی بائیں ٹانگ میں ہلکا سا لنگ موجود تھا۔ یہ لوگ یہاں کھا پی رہے تھے۔ کچھ عبادت میں مصروف تھے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں ہی تھیں، تاجور ایک دم سہم سی گئی۔ چاچا رزاق بھی حیرت زدہ نظر آنے لگے ''میرا سر چکرا رہا ہے۔'' تاجور کراہی۔

ہم نے اسے تالاب کے کنارے ایک آرام دہ گدے پر بٹھا دیا۔ انیق نے اسے پانی پلایا۔ وہ ستون سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگئی۔ اس کے زرد چہرے پر سوال ہی سوال تھے۔ میں انیق اور چاچا رزاق تھوڑے فاصلے پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے کہا۔ ''یہ سب کیا ہے انیق؟''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''شاہ زیب بھائی! کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ ان خطرناک لوگوں سے اپنی زندگی بچانے کے لیے ہمیں اپنی آزادی کھونا پڑے گی۔ ہمیں یہیں رہنا پڑے گا۔''

''اس جیل میں؟''

''ہاں، اب سب کچھ آپ کے سامنے ہی ہے۔ بے شک ہے تو یہ جیل ہی لیکن بہت آرام دہ۔ زندگی کی ہر سہولت ہمیں یہاں ملے گی۔''

''کب تک رہنا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے کہا تھا نا کہ اس سوال کا جواب ذرا سخت ہے۔ اب آپ خود ہی سمجھ لیں، مگر یہ بھی ہے کہ امید پر دنیا قائم ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مستقبل قریب یا مستقبل بعید میں کوئی تبدیلی آجائے۔''

''یہ .... یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔'' چاچا رزاق جھلا کر بولے۔ ''تم یہ کہہ رہے ہو کہ ہمیں یہاں بند کر دیا جائے گا ... ؟ چند مہینوں کے لیے یا پھر چند سالوں کے لیے؟'' آخری الفاظ کہتے کہتے ان کی آواز بیٹھ گئی۔

''فی الحال تو زندگی بچانے کا اس کے سوا اور کوئی راستہ نظر نہیں آرہا۔'' انیق نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔

''ہمارا قصور کیا ہے؟ ہم نے کیا گناہ کیا ہے؟'' چاچا کی آواز بلند ہوگئی۔

میں نے انہیں دھیمی آواز میں بولنے کو کہا کیونکہ چند قدم دور کھڑے پہریدار چونک کر ہمیں دیکھنے لگے تھے۔

میرے ذہن میں ایک سوال بری طرح کلبلا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''یہاں سارے لوگ لنگڑا کر چل رہے ہیں۔ یہ کیوں؟''

وہ بجھے بجھے سے لہجے میں بولا۔ ''اس کا جواب وہی ہے جو آپ کے ذہن میں بھی آرہا ہے۔ ان کو ایسا کر دیا گیا ہے۔''

''یعنی --- ٹانگ کا نقص جان بوجھ کر پیدا کیا گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ انیق نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں سناٹے میں تھا۔ چاچا رزاق کا رنگ بھی مزید پھیکا پڑ گیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے..... کہ اگر ہم یہاں رہتے ہیں تو .... ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہو گا؟''

''میں ابھی اس بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ بڑے مجاور آپ کو رعایت دینے پر تیار ہو جائیں۔''

''آپ سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''یعنی آپ تینوں کو۔''

''کیا مطلب ہے انیق۔ کیا تمہارا معاملہ الگ سے ہے؟''

وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''ابھی تو الگ سے ہی ہے۔ مگر ہوسکتا ہے کہ کچھ عرصے بعد آپ سے بھی کچھ رعایتیں ہو جائیں اور آپ کو وہاں اوپر ''سائے'' میں جگہ دے دی جائے۔''

''سایہ؟ یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

انیق ہمیں چند قدم چلا کر اس چیمبر کی بڑی بڑی آہنی کھڑکیوں میں سے ایک کھڑکی کے پاس لے آیا۔ میں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ دوسری جانب ایک سرسبز ڈھلوان پر بڑی خوب صورت جگہ نظر آرہی تھی۔ یہاں کھلا آسمان تھا۔ پھول پودے تھے۔ چھوٹے چھوٹے دو تین آبشار دکھائی دے رہے تھے۔ پھل دار درختوں کے نیچے لکڑی اور پتھروں کے خوب صورت گھر بنے ہوئے تھے۔ ان گھروں میں برقی روشنی نظر آرہی تھی جو یقیناً جنریٹرز کی مدد سے حاصل کی گئی تھی۔ غالباً وہاں ٹی وی اور فریج جیسی سہولتیں بھی موجود تھیں۔ مرد و زن وہاں آزادانہ پھر رہے تھے۔ غور سے دیکھا تو ایک دو ایسی شکلیں بھی نظر آئیں جو اوپر مزار پر مست ملنگ تھیں۔ وہاں ان لوگوں نے پھٹے پرانے کمبل اوڑھ رکھے تھے مگر یہاں بڑے آرام دہ لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ چند بچے بھی ہنستے کھیلتے دکھائی دیے۔

انیق بولا۔ ''اس جگہ کو یہاں سایہ کہتے ہیں۔ یعنی یہ جگہ پردے والی سرکار کے قریب ان کے سائے میں ہے۔''

''تو تم یہاں نہیں ..... اوپر وہاں رہو گے؟'' چاچا رزاق نے چبھتے ہوئے آزردہ لہجے میں کہا۔

''ہاں چاچا! عارضی طور پر تو یہی انتظام ہورہا ہے۔ میں آپ کو بتا رہا ہوں تاکہ اگر زندگی بچ گئی تو ہم بعد میں کسی وقت ''اچھے'' کی امید بھی کرسکتے ہیں۔ باقی یہاں سے نکلنے والی بات ابھی دماغ سے نکال دیں۔ میں نے پچھلے دو تین دن میں یہاں بہت کچھ سمجھا ہے۔ آپ بھی بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہاں اس چیمبر میں بھی آپ کو کوئی دقت نہیں ہونے والی۔ آپ کی ہر ضرورت پوری ہوگی۔ گاہے بگاہے آپ ریشمی سے بھی مل سکیں گے۔''

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''آپ کے لیے بھی کسی طرح کا کوئی پرابلم نہیں ہوگا شاہ زیب بھائی۔ وہ بندہ بشارت بھی ہوش میں آگیا ہے جو آپ کی چوٹ کی وجہ سے بے ہوش ہوا تھا۔ میں نے کرنالی صاحب سے اس سلسلے میں خاص طور سے بات کی ہے۔ آپ کو ان دو بندوں کی وجہ سے کسی طرح کی پوچھ گچھ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ تاجور کے سلسلے میں بھی آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ وہ آپ کے ساتھ آپ کی آنکھوں کے سامنے یہاں رہے گی۔ چاہے تو وہ چاچا رزاق کے ساتھ رہ سکتی ہے اور اگر .... چاہے تو اسے آپ کے ساتھ رہنے کی اجازت بھی مل سکتی ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے انیق کا لہجہ معنی خیز ہوگیا۔

چاچا رزاق نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔ یہ سب کیسے ہوسکتا ہے؟ ہم سب کے پیچھے ہمارے گھروالے ہیں۔ اب تاجور بیٹی کو ہی لو۔ دین محمد اور اس کی گھروالی چند دن بھی اس کے بغیر نہیں نکال سکتے اور .....''

''چاچا! بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔'' انیق نے ذرا سختی سے چاچا کا جملہ کاٹا۔ ''یہاں کچھ بھی ہماری مرضی سے نہیں ہورہا۔ یہ ہمیں کرنا پڑ رہا ہے اور کرنا پڑے گا۔ خدا کا شکر کرو کہ جانیں بچانے کے لیے ایک راستہ نکل رہا ہے ہمارے لیے .....''

''اس سے تو نہ بچیں جانیں۔ ماردیں یہ لوگ ہمیں۔ ہمارا قصور ہے تو کردیں ہمیں ذبح۔'' چاچا رزاق کے لہجے میں شدید تپش تھی۔

میں نے ایک بار پھر چاچا کو آہستہ بولنے کے لیے کہا۔ مجھے لگتا تھا کہ ریشمی کے حوالے سے پے در پے صدموں کے بعد اب چاچا رزاق زندگی سے عاجز آتے جارہے ہیں۔ جیسے طویل بیماری سے تنگ آکر کوئی بھلا مانس شخص خودکشی کا سوچنے لگے۔

انیق نے کہا۔ ''چاچا! تمہیں ٹھنڈے دماغ سے سوچنا چاہیے۔ اگر دیکھا جائے تو یہاں ہمارے دو بڑے ''جرم'' ہیں۔ پہلا تو یہ کہ ہم لڑکے کے قتل کے گواہ بن چکے ہیں اور دوسرا یہ کہ ہم یہاں ایک نہایت غلط ارادے سے آئے تھے۔ کم از کم ان ملنگوں کے نزدیک تو یہ نہایت غلط ہی ہے۔ ہم یہاں اس لیے پہنچے تھے کہ ریشمی کو یہاں سے نکال سکیں اور ریشمی اب ان لوگوں کے لیے بڑی اہمیت اختیار کرگئی ہے۔ ان دونوں جرائم کے باوجود اگر یہ لوگ ہماری جان بخشی کے لیے تیار ہوگئے ہیں تو ہمیں شکر کرنا چاہیے۔ میں ایک بار پھر کہوں گا، زندگی بچ گئی تو پھر آگے جاکر ہوسکتا ہے، کوئی بہتر راستہ بھی نکل آئے۔''

اچانک میں چونک گیا۔ آہنی کھڑکی کی دوسری جانب مجھے ایک عجیب منظر نظر آیا۔ ایک خوب صورت پالکی دکھائی دی۔ اس پر ریشمی پردے پڑے تھے۔ پالکی یا ڈولی کی دونوں جانب دو دو طویل بانس تھے۔ ان بانسوں کو کم و بیش ڈیڑھ درجن لڑکیوں نے کندھوں کا سہارا دے رکھا تھا۔ یہ جواں سال لڑکیاں نیلے چولوں میں تھیں اور سروں پر چادریں تھیں۔ تقریباً سبھی لڑکیوں کے گلے میں لکڑی کے موٹے دانوں کی مالائیں نظر آرہی تھیں۔ پالکی کے بوجھ سے لڑکیوں کے جسم شاخوں کی طرح لچک رہے تھے۔

انہوں نے جھک کر پالکی ایک آبشار کے قریب رکھی۔ پردے اٹھے اور ایک طویل قامت شخص باہر نکل آیا۔ وہ سرتاپا ایک کامدار سفید لبادے میں ملبوس تھا۔ اس کے چہرے پر بھی ایک چمکیلی سفید چادر کا طویل گھونگھٹ تھا۔ اس کے اردگرد موجود لڑکیاں بالکل مؤدب کھڑی تھیں۔ ہم نے پہچان لیا۔ یہ وہی پردے والی سرکار تھی۔ پھر پالکی میں سے ایک اور سواری برآمد ہوئی۔ یہ لڑکی تھی۔ وہ ٹخنوں تک جاتے ہوئے ایک نیلے سلکی لبادے میں تھی۔ پالکی سے اترتے ہوئے اس کا کامدار آنچل ایک جھٹکے کے لیے اس کے سر سے ڈھلکا۔ وہ خوش شکل تھی۔ چاچا رزاق میرے پہلو میں کھڑے تھے۔ وہ بے ساختہ کربناک انداز میں چلّائے۔ ''ریشمی ..... ریشمی ..... میری بچی۔''

یہ سب کچھ دو چار سیکنڈ کے اندر ہی ہوگیا تھا۔ قریب کھڑے ایک پہریدار نے لپک کر چاچا رزاق کو دبوچ لیا اور ان کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ دوسرے پہریدار نے پھرتی سے کھڑکی کے طویل پٹ بند کردیے۔ کھڑکی سے پالکی کا فاصلہ کافی زیادہ تھا۔ یقیناً چاچا رزاق کی پکار اس کی بیٹی

تک یا دیگر لوگوں تک نہیں پہنچی تھی۔

چاچا نے تڑپ کر اپنے ہونٹوں کو پہریدار کی مضبوط گرفت سے آزاد کرایا اور ایک بار پھر سینے کی پوری قوت سے پکارے۔ ''ریشمی ..... میری ریشمی .....'' ان کی آواز میں وہی کرب تھا جو ایک ایسے بدنصیب باپ کی آواز میں ہو سکتا ہے جس نے ایک طویل عرصے بعد اپنی گمشدہ جوان بچی کو دیکھا ہو۔ پہریدار نے چاچا رزاق کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ ڈگمگا کر گرے۔ گرتے ہوئے ان کی ہاکی گھوم کر پہریدار کے منہ پر لگی۔ وہ جیسے بھنّا اٹھا۔ اس کے منہ سے گندی گالیاں، بے ساختہ ایک بوچھاڑ کی طرح نکلیں اور وہ چاچا رزاق پر پل پڑا۔ یہ نظارہ تکلیف دہ تھا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے لیکن ٹانگیں تو آزاد تھیں اور میں ان ٹانگوں سے ہی ان ڈشکرے پہریداروں میں سے دو چار کی ہڈیاں توڑ سکتا تھا۔ میری بھرپور ٹھوکر پہریدار کے جبڑے پر لگی اور وہ اچھل کر دیوار سے ٹکرایا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر میری جانب دیکھا جیسے مجھ سے ایسی جرأت کی توقع اس نے نہ کی ہو۔ پھر وہ چنگھاڑ کر میری طرف آیا۔ اس بار میں نے ایڑی سے اس کی ناف کو نشانہ بنایا اور وہ دہرا ہو کر چاچا رزاق کے پہلو میں گرا۔ تکلیف کی شدت سے اس کا رنگ ہلدی ہو گیا تھا۔ دوسرے پہریدار نے عقب سے میرے سر پر رائفل کے دستے کا وار کیا، وہ میری بے خبری میں مجھے چوٹ لگانا چاہتا تھا لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ روشنی اس کے عقب میں تھی اور سامنے دیوار پر اس کا سایہ بڑی وضاحت سے پڑ رہا تھا۔ میں نے جھک کر یہ وار بہ آسانی بچایا اور اس کے سینے پر سر کے عقبی حصے سے ضرب لگائی۔ وہ کربناک آواز کے ساتھ پشت کے بل گرم پانی کے حوض میں گرا۔ اس سے پہلے کہ پہلا پہریدار پھر مجھ پر جھپٹتا کئی دیگر ''ملنگ پہریدار'' اندر آگئے اور انہوں نے لڑنے والے دونوں پہریداروں کو سنبھال لیا۔ اس سلسلے میں انیق نے بھی کردار ادا کیا اور اس لڑائی کو بڑھنے سے روک لیا۔ اس نے گرے ہوئے چاچا رزاق کو سہارا دے کر اٹھایا اور ان کے ہونٹوں سے بہنے والے خون کو روکا جو اُن کی سفید داڑھی کو بھی رنگین کر چکا تھا۔ تاجور پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔ طیش میں آنے والے دونوں پہریداروں کو ان کے ساتھی باہر لے گئے تھے۔ تاہم ان میں سے ایک دو ایسے بھی تھے جو خونی نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔

☆☆☆

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں، چاچا رزاق اور تاجور ایک بار پھر لاک اپ میں موجود تھے۔ میرے ہاتھ لکڑی کی ہتھکڑی سے آزاد کیے جا چکے تھے۔ چاچا رزاق کے ہونٹوں سے گاہے بگاہے خون رسنے لگتا تھا۔ پالکی والے مناظر دیکھ کر ان کی حالت عجیب ہو چکی تھی۔ اب اس بات میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ ہم نے شاندار پالکی سے اترنے والے جس طویل قامت شخص کو دیکھا وہ ''پردے والی سرکار'' کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ پالکی میں خوب صورت آواز والی ریشمی کے ساتھ سوار تھا۔ اس کے کیا معنی تھے؟ وہ اپنی شکل کیوں نہیں دکھاتا تھا؟ اس ملنگی ڈیرے پر درپردہ کیا ہو رہا تھا؟ یہ اور ان جیسے بے شمار سوال ذہن میں اٹھ رہے تھے۔ چاچا رزاق نے میری آنکھوں میں دیکھا اور سرسراتی آواز میں بولے۔ ''میں تمہیں ایک بات بتا دوں شاہ زیب! تمہارا یہ ساتھی منڈا ان لوگوں کے ساتھ مل چکا ہے۔ یہ دھوکا دے رہا ہے تمہیں اور ہم سب کو۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ ہم یہاں پھنسے ہی اس کی وجہ سے ہیں۔''

''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہو چاچا؟''

''اس لیے کہ میں کاکا نہیں ہوں۔ دنیا دیکھی ہے میں نے۔ یہ کہہ رہا ہے کہ ہم یہاں رہیں اور اپنا پیچھا بھول جائیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور ..... میں پکی بات کروں گا۔ یہ تم کو بھی چوڑ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا کہہ رہا تھا کہ تم چاہو اور تاجور چاہے تو تم یہاں اکٹھے بھی رہ سکتے ہو۔ کیا مطلب تھا اس بات کا؟ کیا وہ بھول گیا ہے کہ تم دونوں دین محمد کے ملازم ہو۔ ہو یا نہیں؟''

تاجور چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ چاچا رزاق لاعلمی کی وجہ سے ایسی باتیں کر رہے تھے۔ انیق کے حوالے سے بھی انہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ اس بات سے بھی بے خبر تھے کہ جب انیق نے اس لاک اپ میں پہلی بار ہمیں اپنی شکل دکھائی تھی تو اس نے اپنی آنکھ کے ایک خفیف اشارے سے ہی مجھے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ وہ یہاں لمبے عرصے تک رہنے کی جو باتیں کر رہا تھا وہ صرف دکھاوے کی تھیں۔ اس کے ذہن میں کوئی تیز رفتار پلان تھا اور اس پلان کے تحت ہم کسی بھی وقت یہاں سے نکل سکتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں عنقریب یہاں ایک زلزلہ برپا ہونے والا تھا۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

سلیقہ شعار

بابر نعیم

سلیقہ شعاری اور صفائی پسندی ہر عورت کی فطرت کا خاصہ نہیں ہوتی... بعض عورتیں حد درجہ بے ترتیب اور پھوہڑ ہوتی ہیں... مگر اس عورت میں سلیقہ شعاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کے گھر کا ہر کونا چمک رہا تھا... دمک رہا تھا... مگر اچانک ہی اس کے سادہ و خوب صورت سے گھر میں بھونچال سا آگیا...

سلیقہ شعار بیوی کے نقش قدم پر چلنے والے شوہر کی فاش غلطی کا خمیازہ...

لیونگ روم کے وسط میں کھڑی سراغ رساں کیتھی نے ستائشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ کمرا بالکل بے داغ تھا۔ تمام فرنیچر اپنی اپنی جگہ اور درست طریقے سے رکھا ہوا تھا۔ کہیں بھی ریت یا گرد کی کوئی جھلک تک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ فرش پر بچھا ہوا قالین بھی تازہ ویکیوم کیا ہوا تھا۔ کمرے میں روم فریشنر کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

اس صفائی ستھرائی اور سلیقہ شعاری کی ذمے دار خاتون کاؤچ کے سامنے فرش پر ہاتھ پیر پھیلائے پڑی ہوئی تھی۔ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔

سراغ رساں کیتھی کا ساتھی گبسن ایک ڈیجیٹل کیمرے سے لاش کی مختلف زاویوں سے تصویریں اتار رہا تھا۔

''یہ میری بیوی لوسیل ہے۔'' ہیری کنگ نے بتایا۔ ''کسی نے زبردستی گھر میں گھس کر اسے قتل کر دیا

ہے۔'' اس کی نظریں کمرے میں چاروں طرف دوڑنے لگیں اور وہ اپنے ہاتھوں کو موڑنے لگا۔ اس نے اپنے پاجامے کے اوپر باتھ روب پہنی ہوئی تھی اور پیروں میں موزے اور سلیپر تھے۔

اس کے برعکس اس کی مردہ بیوی نے مکمل لباس پہنا ہوا تھا۔

''اس وقت تم کہاں تھے؟'' کیتھی نے پوچھا۔

''میں اوپر بیڈروم میں تھا۔'' ہیری کنگ نے بتایا۔ ''میں جلدی سونے کا عادی ہوں۔ لوسیل رات کو دیر تک جاگنے کی عادی ہے... میرا مطلب ہے... عادی تھی... وہ نصف شب سے پہلے کبھی بستر پر نہیں آتی تھی۔''

سراغ رساں کیتھی نے اپنی توجہ لاش پر سے اطراف کی چیزوں کی جانب مبذول کرلی۔ مقتولہ کی بے عیب صفائی ستھرائی اور سلیقہ شعاری نے کیتھی کے لیے یہ تعین کرنا آسان کردیا کہ اس واردات کے دوران مقتولہ کی طرف سے کسی قسم کی کوئی مزاحمت یا جدوجہد نہیں ہوئی تھی۔

کیتھی، ہیری کنگ کی جانب گھوم گئی۔ ''تمہیں کس بات نے اوپری منزل سے یہاں نیچے آنے پر راغب کیا تھا؟ کیا تمہیں کچھ سنائی دیا تھا؟ کوئی چیخ وغیرہ؟ یا کسی قسم کی آواز یا شوروغل؟''

''ہاں۔'' ہیری کنگ نے کہا۔ ''میں نے لوسیل کی چیخ سنی تھی۔ یہ ایک گھٹی ہوئی آواز تھی لیکن اس حد تک بلند تھی کہ میری سوتے میں آنکھ کھل گئی تھی۔ میں اس کا سبب جاننے کے لیے فوراً ہی نیچے آگیا تھا۔''

''اور تمہیں یہاں کوئی دکھائی نہیں دیا؟''

''نہیں۔ جس کسی نے بھی یہ کام کیا ہے اس نے یقیناً میرے آنے کی آواز سن لی ہوگی اور وہ عقبی دروازے کے راستے بھاگ کھڑا ہوا۔'' ہیری کنگ نے بتایا۔

''تم یہ بات کیوں کر کہہ سکتے ہو؟''

''اس لیے کہ داخلی دروازے کا تالا بدستور بند ہے اور اس کی چٹخنی بھی لگی ہوئی ہے۔''

''اچھا۔'' کیتھی نے کہا اور پھر کچن میں چلی گئی۔ عقبی دروازہ جو کچن میں کھلتا تھا، تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔

''کیا اس دروازے میں تالا نہیں لگا ہوا تھا؟''

''اصول کے مطابق تو یہ کھلا نہیں رہتا۔'' ہیری کنگ نے کہا۔ ''لیکن غالباً لوسیل نے بلی کو باہر نکالنے کے لیے اسے کھولا ہوگا اور وہ جو کوئی بھی تھا، دروازے کے باہر چھپا ہوا [illegible] ہوگا۔''

''تمہاری بیوی یا تمہارا کوئی دشمن؟''

''میرے علم میں تو ہمارا کوئی دشمن نہیں ہے۔'' ہیری کنگ نے جواب دیا۔

''قاتل کو یہ کیونکر پتا تھا کہ وہ عقبی راستے کے ذریعے اندر آسکتا ہے؟'' کیتھی نے یہ سوال ہیری کنگ کے علاوہ اپنے آپ سے بھی کیا۔

''وہ کچھ عرصے تک مکان کی نگرانی کرتا رہا ہوگا اور لوسیل کے معمول سے واقفیت حاصل کرلی ہوگی کہ وہ سونے سے پیشتر بلی کو کچن کے راستے عقبی دروازے سے باہر نکالنے کی عادی ہے۔'' ہیری کنگ نے ندامت کی ہنسی ہنستے ہوئے بتایا۔ ''اس کے اس معمول میں کبھی فرق نہیں آتا تھا۔''

کیتھی کے حلق سے ایک غراہٹ سی بلند ہوئی اور وہ عقبی دروازے کے تالے کا بغور جائزہ لینے لگی۔ تالا توڑنے یا دروازہ زبردستی کھولنے کی کوئی علامت نظر نہیں آرہی تھی۔ پھر وہ کچن میں نظریں دوڑانے لگی۔ کچن بھی بے داغ اور بالکل صاف ستھرا دکھائی دے رہا تھا۔

''تمہاری بیوی گھر کو نہایت صاف ستھرا رکھتی تھی۔'' کیتھی نے کہا۔

''وہ اضطراری طور پر یہ سب کچھ کرنے کی عادی تھی۔'' ہیری کنگ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

پھر کیتھی نے اوپری زینے کی جانب نگاہ گھمائی اور بولی۔ ''کیا تمہارے بیڈروم کا دروازہ کھلا ہوا تھا؟ اگر دروازہ بند ہوتا تو یہاں نیچے سے کسی کی آواز وہاں تک سنائی دینا مشکل لگ رہا ہے۔''

''میں بیڈروم کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھتا ہوں۔ جب لوسیل سونے کے لیے بیڈ پر آتی تھی تو پھر وہ دروازہ بند کردیا کرتی تھی۔'' ہیری کنگ نے جواب دیا۔

''کیا ہم وہاں چل کر دیکھ سکتے ہیں؟'' کیتھی نے کہا۔

ہیری کنگ سراغ رساں کیتھی اور اس کے نائب گبسن کو ساتھ لے کر اوپری منزل پر آگیا۔

بیڈروم ہال کے آخر میں باتھ روم کے پیچھے بنا ہوا تھا۔ بیڈروم کا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا۔ ہیری کنگ دروازے کے باہر رک گیا اور ان دونوں کو پہلے اندر جانے دیا۔

کیتھی کو یہ دیکھ کر کوئی حیرانی نہیں ہوئی کہ بیڈروم بھی پورے گھر کے مانند صاف ستھرا اور بے داغ تھا۔ ہیری

کنگ کی پتلون تہ کی ہوئی کرسی کی پشت پر رکھی ہوئی تھی اور جوتے بھی نیچے دکھائی دے رہے تھے۔ اس بے داغ کمرے میں بس یہی دو چیزیں اپنی مقررہ جگہوں سے الگ رکھی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

کمرے میں موجود الماری کا پٹ بھی قدرے کھلا ہوا تھا اور اس میں تمام کپڑے میچنگ ہینگرز میں قرینے سے اور قطار میں لٹکے ہوئے تھے۔

کیتھی نے یہ بات بھی نوٹ کی کہ وہ چادر اور کمبل جو ہیری کنگ نے سوتے وقت اوڑھے ہوئے تھے اور جنہیں اس نے عجلت میں اتار کر بے ترتیبی سے پھینکا ہوا تھا جبکہ کنگ سائز بیڈ بالکل صاف ستھرا اور قرینے سے بچھا ہوا تھا۔

”کیا اپنی بیوی کی لاش دریافت کرنے کے بعد تم واپس یہاں اوپر آئے تھے؟“ کیتھی نے سوال کیا۔

ہیری کنگ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”نہیں، یقینا نہیں۔ میں تم لوگوں کے آنے تک اسی کے پاس رہنا چاہتا تھا اور وہیں رکا رہا۔“

کیتھی نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ پھر اپنے ساتھی گبسن کا بازو پکڑ کر اسے ایک طرف لے گئی۔

”یہاں کوئی زبردستی نہیں گھسا تھا۔“ کیتھی نے گبسن سے آہستگی سے کہا۔

”تم یہ بات کس طرح کہہ سکتی ہو؟“

”اس لیے کہ ہیری کنگ کا کہنا ہے کہ لاش دریافت کرنے کے بعد وہ یہاں بیڈروم میں واپس نہیں آیا تھا لیکن اس نے ابھی بھی اپنی باتھ روب اور پیروں میں موزے پہنے ہوئے ہیں۔ اگر وہ اپنی بیوی کی چیخ سن کر سوتے سے بیدار ہوا تھا اور بقول اس کے فوراً ہی دوڑتا ہوا نیچے آگیا تھا تو پھر بھلا اسے اپنی باتھ روب اور موزے پہننے کا موقع کب ملا ہوگا؟ کیا سوتے ہوئے کوئی باتھ روب اور موزے پہنے رہتا ہے؟“

یہ کہہ کر کیتھی واپس ہیری کنگ کی جانب بڑھ گئی اور اس سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”میں تمہیں اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں حراست میں لے رہی ہوں۔ تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ تم خاموشی اختیار کیے رہو۔“

ہیری کنگ بھونچکا رہ گیا۔

تب گبسن نے آگے بڑھ کر ہیری کنگ کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی۔

*

وائٹ ہاؤس

جمال دستی

رنگ و نسل کی تفریق نے انسان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا ہے... اپنے وطن سے دور زندگی کے روز و شب گزارنے والے ایک شریف النفس لکھاری کا ماجرا... حالات و واقعات نے سراغرساں بنا دیا۔

اجنبی شہر میں اچانک ہی اس کا سابقہ ایک لاش سے پڑ گیا تھا

''اس کا نام... اس کا نام... جو قلم میں ہے... وہی نام ہے جو... جو قلم وائٹ ہاؤس میں ہے...'' اور پھر اس نے میری بانہوں میں دم توڑ دیا۔

اس کا نام الفانسو اور وزکو تھا اور وہ ایک میکسیکن تھا۔ لیکن وہ ایک عرصے سے یہاں ایمسٹرڈیم میں رہ رہا تھا۔ میں اسے زیادہ اچھے طریقے سے نہیں جانتا تھا۔ وہ کبھی کبھار کسی کہانی کے لیے مجھے گرما گرم مواد فروخت کر دیا کرتا تھا اور اس کے عوض وہ مجھ سے شراب کے پیسے لے لیتا تھا۔ وہ

شراب کا رسیا تھا۔
گزشتہ تین برسوں کے دوران اسے صرف تین بار ہی میرے کمرے میں آنے کا اتفاق ہوا تھا۔
میں نے آرام سے اس کا سر قالین پر رکھ دیا۔ میرے کمرے کا دروازہ ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ مجھے ہال تک پہنچنے میں صرف چند قدم اٹھانا پڑے۔ اسی فلور پر موجود باقی پانچوں کمروں کے دروازے بند تھے۔ یہ ہال امریکن واک ان الماری جتنا چھوٹا تھا۔
میرے کمرے کے بیج رنگ کے قالین پر تازہ چمکدار خون پھیلا ہوا تھا۔ الفانسو کے زخم سے اس وقت بھی خون ابل رہا تھا جب اس کی موت واقع ہوئی۔ اسے جس کسی نے بھی چاقو گھونپا تھا وہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔
ابھی دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے جب اس نے میرا دروازہ زور زور سے بجایا تھا اور جب میں نے دروازہ کھولا تو وہ میرے بازوؤں میں گر پڑا تھا۔ لفٹ کی انڈیکیٹر لائٹ بتا رہی تھی کہ لفٹ پہلی منزل پر تھی۔ یہ ایک سست رفتار لفٹ تھی اور میں پانچویں منزل پر تھا جو کہ سب سے اوپری فلور تھا۔ میں دوڑتا، خون پر چھلانگیں لگا کر بچتا ہوا زینے تک پہنچا اور کان لگا کر سننے کی کوشش کرنے لگا۔
زینہ صرف ایک رخ پر اوپر نیچے کو جاتا تھا۔ مجھے کچھ سنائی نہیں دیا۔ زینے پر قالین نہیں تھا اس لیے اگر کوئی سیڑھیاں اترتا تو اس کے قدموں کی آواز ضرور سنائی دیتی تھی۔
میں سیڑھیاں پھلانگتا ایک منزل نیچے پہنچا اور دروازہ کھول کر ہال میں داخل ہو گیا۔ یہ ہال بھی ہماری اوپری منزل کے ہال سے مشابہ تھا... بس یہاں خون دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نہ ہی یہاں کوئی شخص نظر آرہا تھا۔ پھر میں تیزی سے سیڑھیاں اتر کر سب سے نچلی منزل پر جا پہنچا اور چھوٹی سی لابی کا دروازہ کھول کر وہاں داخل ہو گیا۔
کاؤنٹر پر سنہری بالوں والی ایک دلکش لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جس کی عمر پچیس چھبیس سال رہی ہوگی۔ مجھے چونکہ نام یاد رکھنے کی عادت تھی اس لیے میں اس کا نام لے کر اس سے مخاطب ہوا۔ ''جولی، گزشتہ پانچ منٹ میں کیا کوئی یہاں آیا تھا؟''
''نہیں مسٹر وائٹ'' جولی نے جواب دیا۔ ایمسٹرڈیم میں ہر شخص کی طرح جولی بھی بیشتر امریکیوں کے مقابلے میں بہتر انگریزی بولتی تھی۔
''پولیس کو فون کرو۔'' میں نے کہا۔ ''ایک قتل ہو گیا ہے۔''
جولی نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ پھر اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات امڈ آئے۔ اسے یہ احساس ہونے میں کچھ وقت لگا کہ میں کوئی مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ ''کیا آپ سنجیدہ ہیں، مسٹر وائٹ؟'' اس نے کہا۔
''پولیس کو فون کر دو۔ میں اوپر اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔''
میری گرل فرینڈ میریلن کمرے میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ چھوٹے سے ڈبل بیڈ پر ٹانگیں سکیڑے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ اس حد تک پھیکا پڑ چکا تھا کہ مجھے خوف آگیا۔
میں کوشش کر رہا تھا کہ خون پر میرا پاؤں نہ پڑنے پائے۔ میں خون سے بچتا بچاتا باتھ روم میں چلا گیا اور ایک چھوٹے تولیے کو پانی سے بھگو دیا پھر میں بیڈ پر میریلن کے پاس چلا گیا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گیلے تولیے سے اس کا منہ پونچھنے لگا۔ میں نے سنا تھا کہ اگر کسی فرد کو صدمہ پہنچے تو اس کے ساتھ یہی کرنا چاہیے۔ لیکن مجھے اس بات کا کوئی ذاتی تجربہ نہیں تھا کیونکہ میرے ساتھ کبھی اس قسم کا کوئی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس وقت مجھے سب سے بہتر بس یہی سجھائی دیا تھا۔
زیادہ دیر نہیں گزری کہ میرے کانوں میں یورپین سائرن کی باریک چبھتی ہوئی آواز آنے لگی۔ یہ امریکن پولیس کار کے سریلے سائرن کی آواز نہیں تھی جو یہاں کبھی نہیں سنائی دیتی تھی۔
پولیس مین نہایت عمدہ انگلش بول رہا تھا۔ اس نے ایک سستا بزنس سوٹ پہنا ہوا تھا۔ جب اس نے الفانسو کی لاش دیکھی تو اس کا چہرہ بھی اتنا ہی پھیکا پڑ گیا جیسا میریلن کا چہرہ پڑا تھا۔ میں نے اسے ہم دونوں کے پاسپورٹ دیتے ہوئے وہ تھوڑا بہت بتا دیا جو مجھے معلوم تھا۔ اس نے زیادہ سوالات نہیں پوچھے۔ اس نے اپنے سیل فون پر چند جملے کہے، اس افسوسناک واقعہ پر معذرت کی اور اپنی پشت پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کسی بااختیار افسر کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔
☆☆☆
کسی بھی پولیس مین نے ایسی کوئی بات نہیں کی جیسا کہ وہ فلموں میں کہا کرتے ہیں۔ نہ ہی انہوں نے ہمیں یہ بتایا کہ ہم شہر چھوڑ کر نہیں جا سکتے ہیں۔ اور نہ ہی یہ سوال کیا کہ ہم یہاں ایمسٹرڈیم میں کیا کر رہے ہیں یا یہ کہ کیا ہمارے پاس کوئی ایسا جواز تھا کہ ہم الفانسو کو قتل کرنا چاہتے تھے!
میرا پورا لباس خون آلودہ تھا۔ لیکن اگر وہ مجھ پر قتل کا شبہ کر رہے تھے تو انہوں نے اس کا بالکل بھی اظہار نہیں کیا۔
میں نے انہیں بتایا کہ انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون اخبار کا

ایک رپورٹر ہوں۔ میں نے انہیں الفانسو کے بارے میں بھی وہ سب کچھ بتا دیا جو میں جانتا تھا اور جو زیادہ کچھ نہیں تھا۔ میں نے یہ وضاحت بھی کر دی کہ میں قاتل کی تلاش میں کس طرح دوڑتا ہوا ہال میں گیا تھا، کس طرح سیڑھیاں پھلانگ کر نیچے پہنچا تھا۔

میں نے ان سے کہا کہ ظاہری حالات سے یہی لگتا ہے کہ قاتل اب بھی اسی ہوٹل میں موجود ہے اور غالباً یہاں کسی کمرے میں مقیم ہے اور غالباً اسی فلور کے کسی ایک کمرے میں موجود ہونا چاہیے۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے رہے جیسے میری بصیرت کی داد دے رہے ہوں۔ لیکن انہوں نے زیادہ بات نہیں کی۔

میں نے انہیں الفانسو کے آخری الفاظ بتا دیے۔

تب انہوں نے قدرے دلچسپی ظاہر کی۔ ''کیا الفانسو سینما کا زیادہ رسیا تھا؟'' ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ ہم نے کبھی فلموں کے بارے میں باتیں نہیں کی تھیں۔ وہ اپنی بیشتر راتیں پینے پلانے میں گزارتا تھا۔''

''کیا تمہیں کسی ایسی امریکن فلم کے بارے میں معلومات ہیں جس کا نام 'وائٹ ہاؤس' ہو؟''

''نہیں۔ میرے خیال میں تو اس نام کی کوئی فلم نہیں ہے۔ میرے خیال کے مطابق وائٹ ہاؤس کے بارے میں جو واحد فلم بنی ہے اس کا نام 'انڈی پینڈنس ڈے' تھا جس میں وائٹ ہاؤس کو اڑا دیا جاتا ہے۔''

اس حوالے پر کوئی بھی امریکی ہوتا تو وہ مسکرا دیتا۔ لیکن اس پولیس افسر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ولندیزی چیزوں کو بھک سے اڑانے کو بالکل پسند نہیں کرتے۔

☆☆☆

پولیس مین جا چکے تھے۔ وہ لاش کو بھی لے گئے تھے۔ البتہ خون ابھی بھی میرے قالین پر موجود تھا اور میں اپنا خون آلودہ لباس اتار پھینکنا چاہتا تھا۔ میں اپنے مکمل لباس میں... شاور کے نیچے چلا گیا اور ٹھنڈے پانی کا فوارہ کھول دیا۔

مجھے تکلیف کا احساس کم ہونے لگا۔ میں اپنے خون میں بھیگے ہوئے کپڑوں کو ایک ایک کر کے اتارتا رہا۔ میں انہیں اس وقت تک پانی میں نچوڑتا رہا جب تک پانی کی گلابی رنگت صاف نہیں ہو گئی۔ میں نے اپنے جوتوں پر سے بھی خون دھونے کی کوشش کی لیکن مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ برباد نہ ہو جائیں۔ میرے پاس جوتوں کا وہی اکلوتا جوڑا تھا۔

پھر جب میں نے جہاں تک ہو سکتا تھا، خون کے دھبوں سے نجات حاصل کر لی تو پھر گرم پانی کا فوارہ بھی کھول دیا اور اسٹیم باتھ لینے لگا۔ پھر چند منٹ بعد میریلن بھی فوارے کے نیچے آ گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو تسلی دینے کی خاطر آپس میں کچھ دیر تک چپٹے رہے۔ باتھ روم کے فرش پر ہر طرف پانی ہی پانی ہو رہا تھا اور پھر جلد ہی گرم پانی ختم ہو گیا۔

تب مجھے اپنے امریکن موٹیلو یاد آ گئے جہاں بڑے بڑے سائز کے نرم روئیں دار تولیے اور لامحدود گرم پانی ہوا کرتا ہے اور ان کی قیمت بھی اس کرائے سے کم ہوتی ہے جو میں اس ہوٹل کے اس چھوٹے سے کمرے کی ادا کر رہا تھا۔

پولیس آلۂ قتل کے لیے میرے کمرے کی تلاشی لے چکی تھی۔ انہوں نے پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔ انہیں کوئی بھی چیز نہیں ملی تھی۔

☆☆☆

شاور لینے کے بعد میں نے اپنا نصف لباس پہن لیا۔

تب اس کہانی کو قلمبند کرنے کا خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں کرائم رپورٹر تو نہیں ہوں۔

کالج سے فراغت کے بعد میں یورپ چلا آیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں امریکا سے دور رہنا چاہتا تھا۔ میں سیاہ فام ہوں لیکن میری پیدائش پر ایک سفید فام جوڑے نے مجھے گود لے لیا تھا۔ اتفاق سے میرے والدین کا نام بھی وائٹ تھا۔ انہوں نے میرا نام میلکم وائٹ رکھ دیا تھا۔

''یہ نام میلکم ایکس کے نام پر رکھا گیا ہے؟'' ہر کوئی مجھ سے یہی پوچھتا تھا لیکن ممی اور ڈیڈی نے یہ نام رکھنے کی وجہ کبھی نہیں بتائی تھی۔

بہرحال امریکا میں سیاہ فام یا سفید فام ہر کوئی میری جلد کی رنگت کے بارے میں طنز کیا کرتا تھا۔ میرے لیے یہ زیادہ پریشانی کی بات نہیں تھی۔ البتہ ایمسٹرڈیم اس معاملے میں کلر بلائنڈ تھا۔ یہاں رنگ اور نسل کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ یہ شہر اسی لیے مجھے پسند تھا۔

کالج کے زمانے کا میرا ایک پرانا دوست انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون میں جونیئر ایڈیٹر تھا۔ اس نے مجھے اخبار میں کچھ لکھنے کے لیے میری حوصلہ افزائی کی۔ میں نے بھی یہی خیال کیا کہ جب تک میں یہ فیصلہ نہیں کر لیتا کہ مجھے زندگی میں کیا کرنا ہے اس وقت تک اپنی گزر اوقات کے لیے لکھنا لکھانا ایک اچھا ذریعۂ آمدنی رہے گا اور یہ بیس برس پہلے کی بات ہے۔

میں فیچرز اور انسانی دلچسپی کے مضامین تحریر کرتا ہوں۔ ان میں سے بیشتر سیاحوں کی دلچسپی کے لیے ہوتے ہیں۔ میں

نے اسٹار وارز کی آخری فلم کے بارے میں بھی چند کہانیاں لکھی تھیں۔ میں خود کو فلموں کا شوقین سمجھتا ہوں لیکن میں نے کبھی 'وائٹ ہاؤس' ٹائٹل کے نام کی کسی فلم کے بارے میں نہیں سنا تھا۔ مجھے 'مرڈر ان دی وائٹ ہاؤس' نامی فلم تو یاد تھی لیکن بہت بعد میں جب میں نے انٹرنیٹ مووی ڈیٹا بیس پر دیکھا تو اس فلم کا نام 'مرڈر ایٹ 1600' تھا۔ یہ وائٹ ہاؤس کا پتا ہے۔ 1600، پین سلوانیا ایونیو!

کیا 1600 کا کوئی مطلب تھا؟ ہمارے اس فلور پر بنے ہوئے چھ کمروں کے نمبر 501 سے 506 تک تھے۔ میرا کمرا لفٹ سے باہر نکلتے ہی داہنی جانب تھا۔ ان نمبروں کا بھی 1600 سے کوئی ربط نہیں بنتا تھا۔

بہر حال کسی صورت اس میں کسی قسم کی کوئی احمقانہ بات نہیں تھی۔ بے چارے الفانسو کو احساس تھا کہ وہ مر رہا ہے۔ وہ کوئی کلیو چھوڑنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ وہ مجھے کوئی نام بتانا چاہ رہا تھا... وہ نام جو بظاہر اسے صحیح طور پر یاد نہیں آرہا تھا۔

میں ماضی میں چلا گیا۔ میں ان نصف درجن ملاقاتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جن میں الفانسو نے مجھے کوئی ٹپ دی تھی۔ لیکن مجھے یاد نہیں تھا کہ اس نے کسی کا نام لیا تھا یا کسی کا نام غلط لیا تھا۔ امریکن ناموں میں اسے ہمیشہ پریشانی ہوتی تھی۔

وہ مر رہا تھا اور جانتا تھا کہ اسے کس نے قتل کیا ہے، لیکن اسے وہ نام یاد نہیں آرہا تھا۔ البتہ اسے علم تھا کہ وہ کسی فلم میں کسی کا نام تھا... کسی کردار کا یا کسی اداکار کا۔ اور فلم کا نام اس نے 'وائٹ ہاؤس' بتایا تھا۔

بات صرف اتنی تھی کہ 'وائٹ ہاؤس' نام کی کوئی فلم نہیں تھی۔ میں نے یقینی طور پر انٹرنیٹ مووی ڈیٹا بیس کو بھی چیک کرلیا تھا۔ ایسی بے شمار فلمیں تھیں جن میں لفظ 'وائٹ ہاؤس' شامل رہا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی فلم ایسی نہیں تھی جسے الفانسو کو دیکھنے کا اتفاق رہا ہو۔

'دی وائٹ ہاؤس' نام کا ایک امریکن ٹی وی اسپیشل پروگرام رہا تھا لیکن بات پھر وہی تھی کہ ایک میکسیکن جو ایمسٹرڈیم میں رہ رہا تھا اس پروگرام کے بارے میں کیوں کر واقف ہوسکتا تھا۔

جو بات بار بار میرے ذہن میں کچوکے لگا رہی تھی وہ یہ تھی کہ الفانسو جو پیغام دینا چاہ رہا تھا وہ غیر مبہم نہیں تھا۔ وہ مجھے نام بتانا چاہ رہا تھا اور وہ یہ نام جہاں تک ممکن ہوسکتا تھا واضح اور صاف طور پر بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔

قدرتی طور پر میں اس معاملے کو یونہی تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

☆☆☆

ہوٹل کی فرنٹ ڈیسک پر ڈیوٹی دینے والی جولی میری مدد کے لیے بہ خوشی تیار ہوگئی۔

اس بات کا ایک اچھا امکان تھا کہ قاتل نے میری منزل یعنی پانچویں فلور پر کمرا لیا ہوا ہو۔ اس کی وضاحت آسان طریقے سے کی جاسکتی تھی۔ اس نے الفانسو کو کاریڈور یا ہال جو بھی کہہ سکتے ہیں اس میں چاقو گھونپا تھا اور پھر پلٹ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور کمرے کا دروازہ بند کرلیا تھا۔

جس وقت پولیس نے پوچھ گچھ شروع کی تو اس وقت تک اس نے نہ صرف خود کو صاف ستھرا کرلیا ہوگا بلکہ چاقو سے بھی نجات حاصل کرلی ہوگی۔ یقیناً اس بات کا امکان بھی تھا کہ قاتل کا کمرا کسی نچلی منزل پر رہا ہو لیکن اس بات کا اتفاق کم ہی تھا۔ اس لیے کہ مجھے زینے پر کہیں بھی خون کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیا تھا ماسوائے ان نشانات کے جو میں نے اس وقت چھوڑے تھے جب میں زینے پر سے دوڑتا ہوا نیچے گیا تھا۔

میرے فلور پر چار دیگر افراد قیام پذیر تھے اور صرف ایک کمرا خالی تھا۔ میں ان کے بارے میں باری باری بتاؤں گا لیکن سب سے پہلے خالی کمرے کی بات کرتے ہیں جس کا نمبر 506 ہے۔ جولی اور میں نے اکٹھے اس کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ وہاں کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ اس سے پہلے پولیس بھی اس کا جائزہ لے چکی تھی۔ اس وقت بھی جولی ان کے ہمراہ تھی۔ انہیں بھی کچھ نہیں ملا تھا۔

اس ہوٹل کے دیگر کمروں کی طرح اس کمرے کا دروازہ بھی ہمیشہ لاک رہتا تھا اور صرف چابی کی مدد سے کھولا جاسکتا تھا۔

☆☆☆

مشتبہ افراد کی تعداد چار تھی۔

مجھے اپنا حوصلہ بڑھانے میں چوبیس گھنٹے لگ گے۔ بالآخر میں نے ان سب سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یقیناً پولیس اس سے پہلے ہی ان سے تفتیش کر چکی تھی لیکن میں ایک اخباری رپورٹر تھا جس کی بنا پر مجھے ان سے سوالات کرنے کا استحقاق حاصل تھا۔ گو کہ اس قسم کی کہانی میں انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون والوں کو فروخت نہیں کرسکتا تھا کیونکہ قتل و غارت ان کا پسندیدہ موضوع نہیں تھا۔

اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے جب میں نے کمرا

نمبر 502 کے دروازے پر دستک دی۔ کسی نے جواب نہیں دیا۔ میں نے تصور میں خود کو تمام کمروں کے دروازوں پر دستک دیتے ہوئے اور کسی کو کسی کمرے میں نہ پاتے ہوئے دیکھا۔ تب میں نے سوچا کہ میں اپنی یہ احمقانہ کوشش ترک کر دوں اور اس جرم کو حل کرنے کا معاملہ پولیس پر چھوڑ دوں۔

لیکن میں یہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پھر میں نے کمرا نمبر 503 پر دستک دی۔ یہ ان کمروں میں سے ایک تھا جو لفٹ کے سامنے بنے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں مقیم شخص کا نام جیمز ایلڈن تھا۔ وہ کمرے میں موجود تھا۔ اس نے مجھے اندر بلا لیا۔ اس کے کمرے میں کھڑکیاں تھیں جبکہ میرے کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ مجھے نیچے سڑک پر سے گزرنے والی ٹریفک کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے جب اسے یہ بتایا کہ میں ایک اخباری رپورٹر ہوں تو اسے یہ آئیڈیا اچھا لگا کہ اس کا نام اخبار میں آئے گا۔

وہ برطانیہ کا رہنے والا ایک کیم شحیم آدمی تھا اور تعطیلات گزارنے ایمسٹرڈیم آیا ہوا تھا۔ مجھے شائبہ تھا کہ وہ عیش و عشرت کے لیے یہاں آیا تھا۔ گو اس نے خود سے یہ بات نہیں بتائی۔ عیاشی کو ایمسٹرڈیم میں قانونی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ مزید چند روز یہاں قیام کرے گا۔ اسے امریکیوں کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ ”ان کے پاس پیسا بہت ہے لیکن ان کا کوئی ذوق نہیں ہے۔“ اس نے ہمارے متعلق یہ تبصرہ کیا۔ اس نے میرے امریکی تلفظ کا مذاق بھی اڑایا۔

”پولیس بھی سوالات کرنے کے لیے آئی تھی۔ ہے نا؟“ اس نے کہا اور بتایا کہ اس وقت وہ باہر گیا ہوا تھا اور کافی دیر سے واپس آیا تھا۔ ہاں، اس نے اپنے کمرے کی چابی فرنٹ ڈیسک پر چھوڑ دی تھی۔ فرنٹ ڈیسک پر موجود لڑکی اس بات کی تصدیق کر سکتی تھی۔

کمرا نمبر 504 کا مقیم فیلکس ایک پستہ قد آدمی تھا جسے نہ تو جوان کہہ سکتے تھے اور نہ ہی بوڑھا۔ اس نے اپنے سیاہ بال سر پر جمائے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ لب و لہجے سے ہنگری کا باشندہ لگ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا تعلق بڈاپسٹ سے ہے۔ بڈاپسٹ کو اس نے ہنگرین تلفظ میں بڈاپیش ادا کیا۔ وہ ایک کاروباری شخصیت تھی اور اسی سلسلے میں ایمسٹرڈیم آیا تھا۔

”اور تمہارا کاروبار کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس کا جواب مبہم تھا۔ ”میں چیزیں خریدتا ہوں۔ بعض اوقات میں چیزیں بیچتا ہوں۔ میں... ہاہاہا... میں بزنس مین ہوں۔“ یہ ان چاروں میں واحد فرد تھا جس نے یہ اعتراف کیا کہ وہ الفانسو کو جانتا تھا۔ ”میں گاہے بگاہے اس کو شراب خرید کر دیا کرتا تھا۔ گو ہم ایک دوسرے کے... دوست نہیں تھے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ وہ بار بار مسکرا رہا تھا۔

ہاں، جب قتل کا واقعہ ہوا تو اس وقت وہ اپنے کمرے میں موجود تھا۔ لیکن اس نے کچھ سنا نہیں تھا۔ وہ اس وقت ٹیلی ویژن دیکھ رہا تھا۔ اسے قتل کے بارے میں اس وقت تک پتا نہیں چلا تھا جب تک پولیس نے اس کے دروازے پر دستک نہیں دی تھی۔

میں سوچنے لگا کہ یہ میں کیا کر رہا ہوں؟ کیا میں یہ توقع کر رہا ہوں کہ قاتل اعتراف جرم کر لے گا؟ میں اس معاملے کو یہیں چھوڑ دوں اور اپنے کمرے میں واپس چلا جاؤں اور میریلن سے پوچھوں کہ کیا وہ باہر ڈنر پر چلنے کے لیے خود کو تیار محسوس کر رہی ہے؟ اس واقعے نے اسے ابھی تک دہلایا ہوا تھا۔ اور تب مجھے احساس ہوا کہ کچھ ایسی ہی کیفیت میری بھی تھی۔

میں اجنبیوں کے دروازوں پر دستک دیتا پھر رہا ہوں۔ میں عام طور پر یہ انداز کبھی نہیں اپناتا... پھر میں ایسا کیوں کر رہا ہوں؟

جب میں کمرا نمبر 504 سے نکل کر واپس ہال میں آیا تو عین اس وقت ایک شخص کمرا نمبر 502 کے دروازے میں اپنا کارڈ سلائڈ کر رہا تھا۔

آہ! قسمت یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ میں کم از کم ایک اور مشتبہ فرد سے سوالات پوچھ سکتا ہوں۔

فلپ ریمبو ایک فرانسیسی یہودی تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ ساٹھ سال کی تھی۔ اس کا جسم دبلا پتلا، قد لانبا اور کمر قدرے جھکی ہوئی تھی۔ بالوں کی رنگت خاکستری تھی اور دبلے پتلے چہرے سے ذہانت ٹپک رہی تھی۔ اس کے کمرے میں کتابیں اتنی زیادہ تھیں کہ خود اس کے لیے کمرے میں سمانے کی جگہ کم پڑ رہی تھی۔

مجھے کرسی کی پیشکش کرنے کے لیے اسے فرش پر سے کتابیں ہٹانی پڑیں۔ وہ اس کمرے میں کئی برسوں سے رہ رہا تھا اور کمرے کا ماہانہ کرایہ ادا کرتا تھا۔

وہ انٹرپول کے لیے کام کرتا تھا اور ہم جنس پرستوں کی حالیہ قتل کی لہر کے بارے میں تحقیقات کر رہا تھا۔ ایمسٹرڈیم ہمیشہ دنیا کے انتہائی روادار شہروں میں سے ایک میں شمار ہوتا تھا لیکن گزشتہ چند برسوں میں یہاں کئی ایک ہم جنس پرست

قتل ہو چکے تھے۔
"شاکنگ!" اس نے کہا۔ اس کے لہجے سے یہ عیاں ہو رہا تھا کہ وہ حقیقت میں صدمے سے دوچار تھا۔ "ایمسٹرڈیم رہنے کے لیے نہایت ہی عمدہ جگہ ہے۔ لیکن انسانی دلوں میں سیاہی پھیل رہی ہے۔"
اس سے قبل ہماری گفتگو کے دوران اس نے خود سے معلومات فراہم کردی تھیں کہ وہ خدا کی ذات پر کوئی یقین نہیں رکھتا۔
میں کئی منٹ تک ہال میں کھڑا خود سے یہ بحث کرتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ چونکہ میں ایک کے سوا تمام مشتبہ افراد سے بات کر چکا ہوں اس لیے مجھے اس معاملے کو اب ختم کردینا چاہیے۔
تب میں نے کمرا نمبر 505 کا دروازہ کھٹکھٹایا۔
مجھے دروازہ کھٹکھٹانے پر خوشی ہوئی کیونکہ جس شخصیت نے دروازہ کھولا وہ دراز قامت، سنہری زلفوں والی ایک نہایت حسین وجمیل دوشیزہ تھی جس کا تعلق سویڈن سے تھا۔ وہ کسی فلمی اداکارہ سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ اس کا نام انگرڈ پیٹرسن تھا۔ ایمسٹرڈیم میں اس کی آمد کسی کام کی وجہ سے نہیں تھی لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ وہ کوئی سیاح نہیں ہے۔ اس بات پر وہ قدرے خفا بھی لگ رہی تھی۔ جب میں نے اس سے ایمسٹرڈیم آنے کی وجہ جاننا چاہی تو اس نے بس اتنا کہا کہ اسے یہ جگہ پسند ہے۔
میں نے اس سے پوچھا کہ گزشتہ رات قتل کے وقت وہ کہاں تھی تو اس نے جواب دیا۔ "میں سونے کے لیے جلدی بیڈ پر چلی گئی تھی۔" یہ بات اس نے اس انداز سے کہی جیسے کوئی عام سی بات کہی جاتی ہے۔ اس نے میرے سوال کی گہرائی پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔
"مجھے پولیس کی آمد بھی اچھی نہیں لگی تھی۔" اس نے خود ہی سے کہا۔ "اور مجھے وہ لوگ بھی پسند نہیں ہیں جو بہت زیادہ سوالات کرتے ہوں۔"
میرے لیے اتنا اشارہ کافی تھا۔

☆☆☆

اس رات میں اور میریلن اٹھکیلیاں کرتے رہے۔ پھر میں ایک گہری اور بےخواب نیند سو گیا۔
جب صبح میں نیند سے بیدار ہوا تو گزشتہ تمام واقعات کی کڑیاں ملانے اور وجوہات پر غور کرنے پر میرے شعور نے مجھے قاتل کے نام سے آگاہ کردیا اور یہ بات بھی مجھے بہت بعد میں، جب مقدمہ عدالت میں زیر سماعت تھا، اخبارات کے ذریعے پتا چلی کہ قتل کا محرک کیا تھا۔
الفانسو کو پتا چلا تھا کہ کسی نے کسی بڑی رقم کا غبن کیا ہے۔ اس نے اس فرد کو معمولی معصومیت سے بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ فرد غیظ وغضب میں مبتلا ہو کر اسے چاقو گھونپ دے گا۔ کیونکہ یہ ایک نہایت غیر پیشہ ورانہ قدم تھا۔ وہ تو بس تھوڑی سی شراب کی قیمت طلب کر رہا تھا۔
جب میں نے پولیس کو یہ بتایا کہ قاتل کون ہے، تب وہ ثبوت تلاش کرنے کے قابل ہوئے۔ خون کے دھبے دھونا اور انہیں بالکل ہی صاف کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اور ڈی این اے اس کا بہترین ثبوت ہے۔
الفانسو میکسیکن تھا۔ اس کی سوچ اسپینش تھی۔ میں اسپینی زیادہ نہیں بول سکتا تھا۔ لہٰذا جب وہ مجھ سے بات کرتا تھا تو اسے اپنے خیالات کا انگریزی میں ترجمہ کرنا پڑتا تھا۔ اس کی انگریزی اتنی بری نہیں تھی لیکن یہ اس کی اولین زبان نہیں تھی۔
اسے اس فرد کا نام معلوم تھا جس نے اسے چاقو گھونپا تھا۔ وہ میرے پاس مدد کے لیے آیا تھا۔ میرا کمرا ہال کے عین مقابل تھا اور اس نے وہ نام ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اسے وہ نام یاد نہیں آرہا تھا۔
جیسا کہ ناموں کو یاد رکھنے کے بارے میں بہت سے لوگوں کی یادداشت کام نہیں کرتی، اسی طرح الفانسو نے نام یاد نہ آنے پر اسے ایک ایسے نام سے جوڑنے کی کوشش کی تھی جس کا نام اسے اچھی طرح سے یاد تھا اور یہ نام اس نام کے مانند تھا۔
وہ فلم غالباً اس نے اپنے بچپن میں دیکھی ہوگی۔ وہ فلم جس کے بارے میں ہر کوئی جانتا ہے اور اس نے مجھے فلم کا نام بتا دیا تھا۔ اسے علم تھا کہ اس طرح میں قاتل کا نام جان لوں گا۔
الفانسو سے بس ایک غلطی ہوگئی تھی۔ اس نے فلم کے نام کا اسپینی زبان سے انگریزی زبان میں ترجمہ کردیا تھا۔ انگریزی میں اس نے وائٹ ہاؤس بتایا تھا جبکہ اسپینی زبان میں وائٹ ہاؤس کو کاسابلانکا کہتے ہیں۔
کاسابلانکا (Casablanca) 1942ء کی مقبول ترین امریکی رومانٹک ڈراما فلم جس کے اداکار ہمفرے بوگارٹ اور انگرڈ برگمین تھے۔
الفانسو کا اشارہ کمرا نمبر 505 کی مکین انگرڈ پیٹرسن کی جانب تھا جو اس کی قاتل تھی۔

مطلبی

سیریناراض

جنگیں فتوحات کا ہی نہیں... تباہی و بربادی... فسادات... اور انسانی جانوں کے بے دریغ قتلِ عام کا نام ہے... جذبات و احساسات کے زیرِاثر زندگی گزارنے کا خواب ہر شخص کی آنکھ میں سجا ہوتا ہے... وہاں کے لوگ بھی اس خواب سے سرشار تعبیر کے لیے کوشاں تھے... مگر جنگ جیتنے کے جنون میں مبتلا فاتح یہ کب دیکھتے ہیں کہ کس کی آس ٹوٹی ہے... کس کے دل کے ٹکڑے ہوتے ہیں... محبت اور چاہت بھرے دلوں کی ڈوبتی ابھرتی کسک... وہ آخری دم تک انتظار... بے اعتنائی... اور فراموشی کے ہتھیاروں سے گھائل ہوتے رہے...

دل کی آنکھوں سے پڑھی جانے والی دل گداز تحریر کے پیچ و خم

’’وہ گولڈ ویل بہترین انسان تھا۔‘‘ جیری شیکی نے کہا۔ ’’اور وہ اس میڈل کا حق دار ہے، اس نے جو کچھ کیا، وہ کوئی اور نہیں کرسکتا۔‘‘

میں اور جیری، واشنگٹن ڈی سی میں واقع آرمی نیوی کلب کے ڈائننگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہماری میز کھڑکی کے بالکل ساتھ تھی جہاں سے باہر کی عمارتوں کی روشنیاں بالکل صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ٹیڈ گولڈ ویل ہمارا ایک سابق ساتھی تھا اور ہم برلن میں ایک ساتھ تعینات

تھے جن دنوں دیوار برلن گرنے کا واقعہ ہوا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ بوتل میں بچی ہوئی بیئر اپنے گلاس میں انڈیلی اور فیصلہ کرلیا کہ خود کچھ کہنے کے بجائے جیری کو بولنے کا موقع دوں گا۔ ویسے اگر میں اس کے برعکس سوچتا تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔

''اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ اچھا کیوں تھا۔ وہ ہمیشہ نتائج حاصل کیا کرتا تھا اور یہ بہت سادہ سی حقیقت ہے۔''

''ہمیشہ...؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''ہمیشہ تو نہیں لیکن جو کام ہم کرتے ہیں اس میں کوئی بھی مکمل نہیں ہوتا۔'' جیری نے اپنا سر ہلایا اور گلاس میں مشروب ڈالنے کے بعد بولا۔ ''اس طرح کی موت واقعی دردناک ہے۔ جب میں نے یہ خبر سنی تو اس پر یقین نہیں آیا اور اب بھی نہیں ہے اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ...''

جیری اور میرا بہت پرانا ساتھ تھا لیکن اتنے سال گزر جانے کے بعد اس کے حلیے اور رکھ رکھاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس کے سرخ اور سنہری بال فوجی انداز میں کٹے ہوئے تھے۔ چہرہ گول اور سرخ وسفید رنگت، جیری کو میں نے کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ جب میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی تو وہ ایک خوش لباس نوجوان تھا جس نے اینا پولس سے گریجویشن کرنے کے بعد ٹیمپل ہوف میں ملازمت اختیار کرلی تھی جو برلن کا سب سے بڑا ہوائی اڈا تھا اور ان دنوں ہمارے زیادہ تر خفیہ آپریشن وہیں سے ہوتے تھے۔ ایک طویل عرصہ ملازمت میں گزارنے کے بعد اب وہ نیشنل سیکیورٹی آفیسر کے طور پر پینٹاگون میں تعینات تھا اور کہا جاتا تھا کہ اوپر والے اس پر بہت بھروسا کرتے ہیں۔

میرا نام ایلیکس کلینز ہے اور میں نے ریٹائرمنٹ کے بعد سارانیک میں رہائش اختیار کرلی ہے جو نیویارک کے شمال میں ایک پُرسکون قصبہ ہے۔ جہاں میں علاقے کے کلبوں اور ریستوران کو برف سپلائی کرتا ہوں۔ میں نے بیس سال انٹیلی جنس آفیسر کے طور پر گزارے جو اب بھولی بسری یاد بن چکے ہیں اور میں بمشکل ہی ان کے بارے میں سوچتا ہوں۔ ایک مدت کے بعد آرمی نیوی کلب کا یہ میرا پہلا دورہ تھا اور میں جیری کے کہنے پر واشنگٹن آیا تھا۔ کلب کے اینگل لاؤنج میں ملاقات کے دوران میں ہم ایک گھنٹے تک پرانی یادوں میں کھوئے رہے اور ان دوستوں کو یاد کرتے رہے جن کے ساتھ ہم نے ان برسوں میں کام کیا تھا۔

لیکن جیری سے ملنے کے بعد میں حیران تھا کہ مجھے ہفتے کی شام کیوں بلایا ہے۔ اس نے نہ صرف یہ میرے آنے جانے کے اخراجات بھی برداشت کیے بلکہ کلب میں ایک رات کے قیام کا بندوبست بھی کردیا تھا لیکن جب اس نے ٹیڈ گولڈویل کا تذکرہ کیا تو میں سمجھ گیا کہ اس کے ذہن میں کوئی خاص بات ہے۔ گولڈویل کی موت صرف دس روز قبل واقع ہوئی تھی، جیری نے افسوس کے عالم میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تقریب آج سے دو ہفتے بعد ہونے والی ہے۔'' اس کا اشارہ تقسیم اعزازات کی اس تقریب کی جانب تھا جس میں گولڈویل کو یہ امتیازی انٹیلی جنس میڈل دیا جاتا، یہ اعلیٰ ترین اعزاز تھا جو ابھی تک ہمارے کسی ساتھی کو نہیں ملا تھا۔

''وہ اس اعزاز کا مستحق تھا۔'' جیری نے کہا۔ ''وہ ہر کام کو مکمل طور پر انجام دیتا تھا۔''

''اس پر بحث نہیں کی جاسکتی۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مجھے ہمیشہ سے ٹیڈ گولڈویل کے بارے میں تحفظات تھے اور اس کے بارے میں کوئی ایسی بات تھی جو مجھے ہمیشہ پریشان کرتی رہی، ممکن ہے کہ اس کی وجہ اس کی آنکھوں میں نظر آنے والی اجنبیت ہو یا یہ کہ اس نے اپنے بارے میں بہت کم بتایا تھا حالانکہ ہم سب اپنے راز چھپانے میں پکے تھے اور ہمیں ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

''اس میں ایک اور خوبی بھی تھی۔ وہ بڑی روانی سے جرمن بولتا تھا۔ ہمیں ہمیشہ ہی ایسے لوگوں کو تلاش کرنے میں مشکل پیش آئی جو مختلف زبانیں بول سکتے ہوں۔ اس نے کالج میں کئی زبانیں پڑھی تھیں۔ ایک اور بات وہ صرف ذہین ہی نہیں بلکہ مہم جو بھی تھا۔''

میں نے اس پر کچھ نہیں کہا لیکن دل میں یہ خیال ضرور آیا کہ ہم سب ہی مہم جو تھے اور ہم میں سے کسی کی بھی اتنی قدر نہ ہوتی اگر ہم اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر دیوار کے اس طرف نہ جاتے۔ اگر آپ نڈر نہیں یا معمولی سا بھی سست ہیں تو یہ کام نہیں کرسکتے۔ اگر اپنی بات کروں تو اس وقت مجھے یقین تھا کہ ہمیشہ زندہ رہوں گا۔ اپنے ساتھی کے ہمراہ کام کرتے ہوئے میں نے مشرقی برلن میں جاسوس بھرتی کیے جو زیادہ تر سیاست داں اور فوجی افسر تھے۔ یہ ایک ایسا کام تھا جس میں آہنی پردے کے پار مسلسل چکر لگانا پڑتے تھے اور لوگوں کو اس انداز میں بلیک میل کرنا ہوتا تھا کہ انہیں کوئی غلط کام کرنے کا احساس ہی نہ ہو... بلکہ

انہیں یہ باور کرانا ہوتا تھا کہ اپنے ملک سے دھوکا کرنا دنیا میں سب سے زیادہ فطری بات ہے۔

میں نے کہا۔ ''یہ مت بھولو کہ گولڈویل پیٹ کا بھاری شخص تھا۔''

''ہاں، میں سمجھتا ہوں۔''

جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ جیری ہمارے کام کے منفی پہلوؤں مثلاً دھوکا، جھوٹ اور چالبازی کے بارے میں گفتگو کرنا نہیں چاہتا جیسے وہ سب ہمارے فرض کا حصہ ہوں لیکن ہم مستقل اپنے آپ کو باور کراتے رہے کہ ہم نے جو کچھ کیا، وہ ایک اچھے مقصد کے لیے تھا۔

''کیا تم ابھی تک کنوارے ہو؟'' جیری نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

''میری منگنی ہوگئی ہے لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میں گولڈویل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ عورتیں اس پر مرتی تھیں جب وہ بن سنور کر سامنے آتا تو ان کے لیے اپنا دل سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ جیری کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ گولڈویل ایک ہرجائی شخص تھا اور اپنی جامہ زیبی و چرب زبانی سے لڑکیوں کو متاثر کر لیتا تھا۔ اسی لیے ایک کے بعد دوسری لڑکی اس کی محبت کا دم بھرنے لگتی تھی۔

''وہ کبھی عورتوں کی کمپنی کے بغیر نہیں رہا اور وہ بے وقوف عورتیں اسے ڈھونڈتی رہتی تھیں۔''

کیا کبھی اس نے شادی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی؟'' میں نے پوچھا۔

''کہانی کا یہی حصہ میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ مرنے سے پہلے اس نے منگنی کر لی تھی۔ وہ گزشتہ مہینے کرسمس پارٹی میں شرکت کے لیے یہاں آیا تو اس کی منگیتر بھی ساتھ تھی۔ وہ واقعی خوب صورت تھی اور نیویارک کی ریئل اسٹیٹ فرم میں بروکر کے طور پر کام کر رہی تھی۔''

یہ کہہ کر جیری نے ہاتھ کے اشارے سے ویٹر کو بلایا اور نیچی آواز میں بولا۔ ''جب میں کہتا ہوں کہ گولڈویل بہترین تھا تو میرا اشارہ اشٹاسی والے واقعے کی طرف ہوتا ہے۔''

مجھے واقعی معلوم نہیں تھا کہ جیری کس بارے میں بات کر رہا ہے۔ جس واقعے کا اس نے ذکر کیا، وہ سرد جنگ کے زمانے میں سب سے بڑی خفیہ کارروائی تھی۔ 1986ء کے آخر میں گولڈویل کسی طرح، مشرقی جرمنی کی سیکرٹ پولیس کی خفیہ فائلوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

بل ادا کرنے کے بعد جیری نے ایگل لاؤنج جانے والے راستے کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو کلینز۔ اس نے یہ کام کس طرح کیا ہوگا؟''

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا۔ جیری ایک افسر سے باتیں کرنے کے لیے رک گیا۔ اس دوران میں نے اس کے سوال کا جواب تلاش کرنا شروع کیا۔ میں بھی سب لوگوں کی طرح حیران تھا کہ گولڈویل کے ذرائع کیا تھے۔ جب جیری دوبارہ میری طرف متوجہ ہوا تو میں نے کہا۔ ''اس نے کبھی مجھے رازدار نہیں بنایا۔''

''ممکن ہے کہ تمہارے علاوہ کسی اور شخص کو یہ معلوم ہو۔ اسی لیے میں پوچھ رہا ہوں۔''

''کوئی نہیں جانتا کہ وہ وہاں کس طرح پہنچا۔ فارمیشن اسٹارسی میں حفاظتی انتظامات انتہائی سخت تھے۔'' یہ مشرقی برلن کی ایک غیر معروف سڑک تھی جہاں اشٹاسی کا ہیڈکوارٹر اور جیل واقع تھی۔ ان دنوں اس جگہ کا نام سنتے ہی مشرقی برلن میں رہنے والے بدقسمت لوگوں یا پھر گولڈویل اور مجھ جیسے لوگوں کی کپکپی چھوٹ جاتی تھی جنہیں اپنے کام کی وجہ سے مشرقی برلن آنا پڑ گیا تھا جو کوئی بھی وہاں قدم رکھنے کی کوشش کرتا، اس کا آخری ٹھکانا اشٹاسی کی جیل ہی ہوتی۔

''کم آن کلینز۔ تمہارا ضرور کوئی خیال ہوگا۔'' جیری نے بارٹینڈر کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ ''ہمیں یہ معلوم تھا کہ مشرقی جرمنی میں رہنے والے سب لوگ ایک دوسرے کی جاسوسی کرتے ہیں۔ یہ گولڈویل ہی تھا جس نے انکشاف کیا کہ اشٹاسی پولیس بھی مغربی جرمنی کی جاسوسی کر رہی تھی اور وہاں ان کے ایجنٹ موجود تھے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی ہوں گے۔ اس وقت تک کوئی بھی یہ بات نہیں جانتا تھا۔

''میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ ان کے کچھ لوگ تو یہاں امریکا میں بھی کام کر رہے تھے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی کو یہ بات معلوم ہوگی۔''

میں نے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرے لیے بھی نئی اطلاع ہے۔''

''ہاں، ہم نے پوری کوشش کی کہ اسے اپنے تک ہی رکھیں۔ ضروری نہیں کہ ہر خبر اخبار کی زینت بنے۔''

میں اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ رکھ سکا۔ جیری کے

تبصرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ انٹیلی جنس والے اخبارات سے کتنے چوکنا تھے۔

ہم نے اپنے لیے مشروب کا آرڈر دیا پھر میں بولا۔ ''وہاں تمہاری موجودگی ہمارے لیے گھبراہٹ کا سبب بن سکتی تھی۔ یاد ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے کتوں کی مدد سے میڈبرگ میں ہمارا پیچھا کیا تھا۔ اس دورے سے واپس آنے کے بعد میں بہت خوش ہوا تھا۔''

''ہمارے بھی لوگ جانتے تھے کہ انہیں محتاط رہ کر کام کرنا ہے لیکن جب گولڈویل یہ اطلاع لے کر آیا کہ مغربی جرمنی کی حکومت میں اسٹاسی کے ایجنٹ موجود ہیں تو سب لوگ ششدر رہ گئے۔'' جیری نے بیئر کا گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''ان کا ایک آدمی چانسلر کے دفتر میں بھی تھا۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ گولڈویل کی اطلاع بے ہودہ ہے اور ان لوگوں نے ہی اسے یہ غلط معلومات دی ہیں لیکن بعد میں اس کا ایک ایک حرف سچ ثابت ہوا۔''

''ان کا ایک ایجنٹ جرمنی کے نیوز میگزین کا ایڈیٹر بھی تھا۔''

جیری بناوٹی انداز میں بولا۔ ''مجھے وہ یاد ہے، ہم نے جلد ہی اسے پکڑ لیا تھا اور یہ صرف ایک شخص کی وجہ سے ہی ممکن ہوسکا۔''

''گولڈویل۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

اگلے بیس منٹ تک ہم اسی کی باتیں کرتے رہے پھر جیری نے اپنی گھڑی دیکھی اور اسٹول سے کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ''کل صبح ساڑھے آٹھ بجے ناشتے پر ملو، ہمیں کچھ مزید باتیں کرنی ہیں۔''

اگلے دن اس نے مجھے ناشتے کی میز پر ایک فولڈر پکڑایا اور بولا۔ ''یہ تمہارے لیے ہے۔''

میں نے سرسری انداز میں اس کی ورق گردانی شروع کر دی تو وہ بولا۔ ''اس میں سب کچھ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً گولڈویل کہاں پیدا ہوا، اس نے کس اسکول میں تعلیم حاصل کی، وغیرہ وغیرہ۔ اس کے والدین پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ منگیتر کا نام مریم میکلن ہے۔ اگر تم اس سے بات کرنا چاہو تو اس کا پتا اور ٹیلی فون نمبر بھی اس فائل میں موجود ہے۔ نیویارک سٹی کے اس سراغ رساں کا نام فرازی ہے۔ گولڈویل اپنے پندرھویں منزل کے اپارٹمنٹ کی بالکونی سے گر کر مر گیا تھا۔ صرف ایک اخبار ٹائمز نے یہ خبر شائع کی اور اس نے بھی اسے آدھے کالم سے زیادہ جگہ نہیں دی۔ رپورٹر کا نام لینگفی ہے اور اس نے اپنی رپورٹ میں یہ نہیں بتایا کہ مرنے سے پہلے گولڈویل کے ساتھ کون تھا۔''

''مجھے کیا کرنا ہوگا جیری؟''

''ہم چاہتے ہیں کہ تم جائے وقوعہ کا جائزہ لو اور معلوم کرو کہ حقیقت میں کیا ہوا تھا۔ پولیس والوں کے کہنے کے مطابق اس نے بالکونی سے چھلانگ لگائی۔ وہ اسے خودکشی کا نام دے رہے ہیں لیکن یہ درست نہیں... ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ تم کیا معلوم کرتے ہو؟''

''میں ہی کیوں؟''

''کیونکہ تم ان معاملات میں بہت اچھے ہو اور تمہیں اس نوعیت کے کیس حل کرنے کا خوب تجربہ ہے اور مرنے والے کو بھی جانتے ہو جبکہ ایسے لوگ بہت کم ہیں جنہیں وہ یاد ہو۔''

''کیا وجہ ہے کہ تم پولیس کا نقطۂ نظر تسلیم نہیں کر رہے؟''

''جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب میری گولڈویل سے بات ہوئی تھی۔ وہ بہت خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا اور شادی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ کوئی موڈی انسان نہیں تھا کہ کسی کیفیت سے مغلوب ہو کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا۔ اس کی کوئی بُری عادت نہیں تھی۔ وہ بہت کم شراب پیتا اور منشیات سے دور رہتا تھا۔ اس کی جسمانی صحت بھی ٹھیک تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ روزانہ سینٹرل پارک میں دوڑ لگاتا ہے۔ ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے یہ یقین کرنا بہت مشکل ہے کہ اس نے خودکشی کی ہوگی۔''

میں نے فولڈر کے صفحات پر ایک اور نظر ڈالی۔ جیری مجھے ترغیب دے رہا تھا اور میرے لیے اس سے متفق ہونا بہت مشکل لگ رہا تھا۔

میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔ ''تم جانتے ہو، میرا ایک کاروبار ہے اور اسے میں ہی دیکھتا ہوں۔''

''لیکن اس سیزن میں تو برف کی مانگ کم ہو جاتی ہے۔''

میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اچھا دیکھوں گا کہ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔''

☆☆☆

سراغ رساں لیفٹیننٹ لیری فرازی ایک دُبلا پتلا، سیاہ بالوں، مونچھوں اور سیدھی ناک والا شخص تھا۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ ''تینوں باتیں ہوسکتی

ہیں۔ اس نے چھلانگ لگائی، گر گیا یا اسے دھکا دیا گیا۔ لیکن اس کیس میں یہ بالکل واضح ہے کہ اس نے بالکونی سے چھلانگ لگائی تھی۔''

وہ بدھ کا دن تھا۔ اس سے ایک دن پہلے میں جیری سے مل چکا تھا۔ اس وقت ہم ایک دفتر میں موجود تھے، میں نے فرازی کو اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ میں ان تمام ٹکڑوں کو جوڑنے کی کوشش کر رہا ہوں جن کا تعلق گولڈویل کی موت سے ہے۔

''اس نے خودکشی کرنے سے پہلے کوئی تحریر چھوڑی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہر کوئی ایسا نہیں کرتا۔'' اس نے مجھ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا کہنا ہے کہ گولڈویل ایک انٹیلی جنس آفیسر تھا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ''پہلے ہم سمجھے کہ وہ کوئی تجزیہ کار ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ گورنمنٹ سے ریٹائر ہوا ہے جب ہم نے چیک کیا تو اس کے بارے میں کوئی واضح ثبوت نہیں ملا۔''

''تمہیں یقین ہے کہ اس نے چھلانگ لگائی تھی؟''

''اس کی موت اسی طرح ہوئی تھی۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ میں اکیلا تھا۔ اس عمارت میں ایک چوکیدار بھی ہے اور عمارت کے سب لوگوں کے بارے میں جانتا ہے۔''

میں اتنی آسانی سے قائل ہونے والا نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ''اسے زندگی کی تمام آسائشیں میسر تھیں۔ لیفٹیننٹ اور وہ آسانی سے ڈرنے والا نہیں تھا۔ بیرون ملک اس نے کئی مشکل کارنامے سرانجام دیے۔ وہ ایسا شخص نہیں تھا کہ یوں بالکونی سے چھلانگ لگا دیتا۔''

''تم سرد جنگ کے زمانے کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے سر ہلایا تو وہ بولا۔ ''ایسا ہوتا ہے لیکن میں تمہاری دلچسپی سمجھ سکتا ہوں۔ ہم نے اس کا تمام سامان چیک کیا تھا اور جب تم نے اپنے آنے کا بتایا تو میں نے تمہارے لیے یہ دوبارہ حاصل کی۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنی ڈاک میں سے کوئی چیز نکالی اور اسے میری طرف کھسکا دیا۔ وہ ایک خوب صورت سنہرے بالوں والی عورت کی تصویر تھی جس نے نیلے رنگ کا اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ کمر پر تھے اور وہ بے حجابانہ مسکرا رہی تھی۔ تصویر کی پشت پر مارچ 1987ء کی تاریخ درج تھی۔ یہ تصویر شاید برلن میں اتاری گئی تھی۔

''یہ ہمیں اس کی قمیص کی جیب سے ملی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ اس کی جیبوں میں زیادہ چیزیں نہیں تھیں سوائے ایک جیبی کنگھے، ایک قلم اور تھوڑے سے کھلے پیسے۔ اس نے جینز پہن رکھی تھی۔ کیا تم وہ چیزیں دیکھنا چاہو گے؟''

میں نے کہا۔ ''میں اس کا اپارٹمنٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''ہم نے بڑی احتیاط سے وہاں کا جائزہ لیا ہے۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ تم کیا تلاش کر لو گے لیکن ہم وہاں جا سکتے ہیں۔ وہ صرف دو بلاک کے فاصلے پر ہے۔ ٹھہرو میں چابی لے لوں۔''

راستے میں اس نے کہا۔ ''مجھے شبہ ہے کہ تمہیں وہاں کوئی غیر معمولی چیز مل سکے گی۔ وہ شخص بظاہر ایک نارمل زندگی گزار رہا تھا۔''

''اسی لیے کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ میں بھی ایک دفعہ اس جگہ کو دیکھ لوں۔'' میں یہ نہیں کہہ سکا کہ تقسیم اعزازات کی تقریب میں ڈائریکٹر یہ نہیں کہنا چاہے گا کہ تمغہ حاصل کرنے والے نے چند ہفتے قبل خودکشی کر لی ہے۔

گولڈویل کی عمارت نسبتاً نئی تھی۔ جسے سفید شیشوں سے بنایا گیا تھا اور سامنے والے حصے پر ماربل لگا ہوا تھا۔ باوردی چوکیدار نے فرازی کو پہچان کر مسکراتے ہوئے سیلیوٹ کیا۔ تعارف کروانے کے بعد فرازی نے کہا۔ ''جس وقت گولڈویل کی موت واقع ہوئی، اینجل ہی ڈیوٹی پر تھا۔ اینجل، مسٹر کلینز کو بتاؤ جو تم نے ہمیں بتایا تھا۔''

''یقیناً، مسٹر گولڈویل ہمیشہ کی طرح اس روز صبح کو ٹریک سوٹ اور دوڑنے والے جوتوں سمیت نیچے آئے۔ وہ تقریباً روزانہ ہی دوڑ لگایا کرتے تھے۔ وہ دس بجے گئے اور دو گھنٹے بعد اخبار ہاتھ میں لیے واپس آئے۔ وہ اکثر شام میں جیکٹ اور ٹائی کے ساتھ باہر جایا کرتے تھے بس میں نے اس دن یہی دیکھا۔''

''اس سے کوئی ملنے آیا تھا؟'' فرازی نے پوچھا۔

''ہاں، دو بجے کے قریب ایک عورت اس سے ملنے آئی تھی۔ اس کی عمر پچیس چھبیس سال ہوگی۔ وہ یہاں پہلی بار آئی تھی۔''

''تم نے اس کا نام معلوم کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''کیٹرلا۔ ایسا ہی کوئی نام تھا۔'' اینجل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ میں نے گولڈویل کو فون کر کے بتایا کہ کیٹرلا نام کی ایک عورت اس سے ملنے آئی ہے تو یوں لگا جیسے وہ اسے نہیں جانتا۔''

''اس عورت نے اپنا پورا نام نہیں بتایا۔''

''ہاں لیکن مجھے یاد نہیں رہا۔ شاید اس کا آخری نام ایچ سے شروع ہوتا تھا۔ میں نے وہ بھی مسٹر گولڈویل کو بتا دیا۔ پہلے تو وہ اسے نہیں پہچان سکے پھر بولے کہ اسے اوپر بھیج دو۔''

لفٹ میں فرازی نے کہا۔ ''تم سمجھتے ہو کہ اس عورت کا چھلانگ لگانے کے واقعے سے کوئی تعلق بنتا ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''وہ صرف ایک گھنٹا یہاں رکی تھی۔'' فرازی نے کہا۔ ''جبکہ گولڈویل اس کے جانے کے چار گھنٹے بعد تقریباً ساڑھے سات بجے بالکونی میں گیا تھا۔''

لفٹ پندرھویں منزل پر پہنچی تو میں نے فرازی کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ اپارٹمنٹ کا تالا کھولتے ہوئے فرازی نے کہا۔ ''تم دیکھو گے کہ وہ کتنی اچھی جگہ پر رہتا تھا۔''

ہم گولڈویل کے لیونگ روم میں داخل ہوئے جہاں دو دیواروں کے ساتھ ایک بڑا سا ایل ٹائپ صوفہ رکھا ہوا تھا۔ شیشے کی ایک میز پر دو عدد اخبارات بھی نظر آرہے تھے۔ ہمارے بائیں جانب دو آرام کرسیاں رکھی ہوئی تھیں جن کا شمار نوادرات میں کیا جاسکتا تھا۔ فرش پر ایک ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ فرازی نے غلط نہیں کہا تھا۔ واقعی یہ ایک عمدہ جگہ تھی۔

ہم اس بالکونی کی طرف گئے جہاں سے گولڈویل نے چھلانگ لگائی تھی۔ اس کی ریلنگ چار فٹ اونچی تھی۔

''ہمارا اندازہ ہے کہ اس نے کرسی پر چڑھ کر چھلانگ لگائی ہوگی۔'' فرازی نے کہا۔ ''ورنہ ریلنگ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔''

''میں تمہاری بات سمجھ گیا۔'' میں نے کہا۔ پھر ہم دوسرے کمروں میں گئے لیکن وہاں ہمیں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ یہاں تک کہ کچن میں بھی ہر چیز ترتیب سے رکھی ہوئی تھی۔

''اس نے ایک کمرے کو اپنا دفتر بنا رکھا تھا۔'' فرازی نے کہا۔ میں نے اس کمرے کا بغور جائزہ لیا۔ وہاں ایک کمپیوٹر، ایک کتابوں کی الماری، کچھ فائل کیبنٹ تھے۔ فرازی نے بتایا۔ ''ان کیبنٹ میں زیادہ تر ٹیکس کے کاغذات اور کاروباری خط و کتابت کی فائلیں ہیں۔''

میں نے سرسری طور پر ان فائلوں اور کاغذات کو دیکھا لیکن ان میں بھی مجھے کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔

اوپری خانے میں البم کی ایک طویل قطار تھی جن پر الگ الگ لیبل چسپاں تھے۔ ان میں تاریخ اور دیگر تفصیلات درج تھیں۔

''ان میں زیادہ تر پرانی تصویریں ہیں۔ میں دیکھ چکا ہوں۔'' فرازی نے کہا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر ان میں سے دو البم اٹھائے اور انہیں کھول کر دیکھا۔ فرازی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ان میں سب پرانی تصویریں تھیں اور یہ ایک طرح سے گولڈویل کا ذاتی ریکارڈ تھا جسے دیکھنے سے پتا چلتا تھا کہ وہ کہاں کہاں گیا اور اس نے مختلف ملکوں میں کیا کارنامے انجام دیے۔

پھر میں نے میز کے برابر میں رکھے ایک چھوٹے شیلف میں 1987ء کی البم دیکھی۔ یہ وہی سال تھا جس کی ایک تصویر گولڈویل کی قمیص سے برآمد ہوئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ کیا اس نے البم سے وہ تصویر نکالی اور البم کو شیلف میں ہی چھوڑ دیا۔

اس البم میں تصویروں کے علاوہ جرمن اخبارات کے کچھ تراشے بھی موجود تھے۔ ان میں سے کچھ نے اسٹاسی کی فائلوں تک گولڈویل کی رسائی کے بارے میں خبریں بھی شائع کی تھیں لیکن کسی جگہ اس کا نام نہیں آیا تھا۔ جس سے پتا چلتا تھا کہ گولڈویل واقعی ایک اچھا ایجنٹ تھا۔

بالکل آخری صفحے پر ایک تہ کیا ہوا خط پلاسٹک کے کور میں رکھا ہوا تھا۔ یہ کسی عورت کی جانب سے تھا اور اس پر 12 جون 1987ء کی تاریخ پڑی ہوئی تھی۔ فرازی نے پوچھا کہ کیا میں جرمن پڑھ سکتا ہوں۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ خط میں لکھا تھا۔ ''ڈیئر تھاڈیوس! تم تک پہنچنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ اس لیے تمہیں یہ خط لکھ رہی ہوں۔ منگل اور گزشتہ روز دو سراغ رساں ہمارے دفتر میں آئے تھے۔ انہوں نے فائلیں دیکھیں اور سوالات کرتے رہے۔ میں نے کہا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں لیکن ان میں سے ایک میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ اسے کچھ شبہ ہوگیا ہو۔ میں بہت زیادہ خوف زدہ ہوں۔ تم نے کہا تھا کہ اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو مجھے مغربی برلن لے جاؤ گے۔ پلیز اب آجاؤ۔ میں تمہیں بہت یاد کررہی ہوں۔ تمہارے فون کا انتظار رہے گا۔ تمہاری میرین!''

کرسی پر بیٹھ کر میں نے ان اخباری تراشوں کو غور سے پڑھنا شروع کیا۔ ایک خبر 23 جون کی تھی جس میں میرین نامی ایک عورت کی گرفتاری کا انکشاف کیا گیا تھا۔ اس خبر کی سرخی تھی۔ ''پولیس نے گورنمنٹ سیکریٹری کو گرفتار

کرلیا۔" میں مزید آدھ گھنٹا تک فولڈرز اور البمز دیکھتا رہا لیکن وہ خط میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ بالآخر میں نے فرازی سے کہا کہ میں نے کافی کچھ دیکھ لیا ہے۔

"کچھ پیش رفت ہوئی؟" جیری نے فون پر مجھ سے پوچھا۔

"شاید لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم میرے لیے کچھ باتیں معلوم کرو۔"

جب میں نے اسے بتایا کہ کیا چاہتا ہوں تو اس نے کہا۔ "کیا یہ ہمارے منصوبے کے لیے ضروری ہے؟"

مجھے اسی جواب کی توقع تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، جیری نے کہا۔ "میں دیکھوں گا کہ کیا کرسکتا ہوں۔ تم نے آخری آٹھ دنوں کا ریکارڈ چیک کرنے کی بات کی تھی؟"

"ہاں، وہ تمام فضائی کمپنیاں جن کے جہاز امریکا اور جرمنی کے درمیان پرواز کرتے ہیں۔ یہ اتنا مشکل نہیں ہوگا۔"

جب میں مریم میکلین سے ملا تو اس نے گولڈویل کی موت پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے جب یہ خبر سنی تو مجھے شدید صدمہ ہوا۔ اس کی موت کو دو ہفتے ہوگئے ہیں لیکن میں ابھی تک اس کیفیت سے باہر نہیں آسکی ہوں۔ مجھے تو رات کو ٹھیک طرح سے نیند بھی نہیں آتی۔"

جیسا کہ جیری نے بتایا تھا کہ گولڈویل کی منگیتر رئیل اسٹیٹ بروکر تھی اور ایک فرم کے لیے کام کرتی تھی جس کے دفاتر ایک کثیر المنزلہ عمارت میں تھے۔ وہ واقعی پُرکشش، لمبی اور دبلی پتلی تھی۔ اس کے بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ آنکھیں سیاہ، لمبا چہرہ اور وہ دھیمی آواز میں بات کرتی تھی۔ اس نے اپنی کرسی سے اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور جب میں کھڑکی کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا تو وہ بولی۔

"میں نے اس روز ٹیڈ کو سہ پہر میں فون کیا تھا۔ اس شام ہمیں اس کے پسندیدہ ریستوران میں ڈنر کے لیے جانا تھا اور وہ اس کا انتظار کررہا تھا۔"

جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا کبھی اس نے ٹیڈ کو افسردہ دیکھا تو وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "کچھ باتوں میں وہ دوسرے مردوں سے مختلف تھا۔ وہ بہت خوش مزاج اور ہنسی مذاق کرنے والا شخص تھا لیکن کبھی وہ افسردہ ہوجاتا تھا۔ میں نے کبھی کسی کو اتنا دل شکستہ نہیں دیکھا اور میں نے محسوس کیا کہ ان لمحات میں اسے میری بہت زیادہ ضرورت ہوتی تھی۔"

میں نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

"اس کیفیت میں وہ پینا شروع کردیتا تھا جبکہ عام حالات میں اس نے ایک یا دو سے زیادہ وائن کے گلاس نہیں لیے لیکن جب اس پر یہ کیفیت طاری ہوتی تو وہ ووڈکا کی پوری بوتل پی جاتا۔ وہ سارا دن کمرے کے پردے گرا کر تنہا بیٹھا رہتا۔ خلاؤں میں گھورتا۔ شراب پیتا اور اپنے آپ سے باتیں کیا کرتا۔"

"وہ باتیں کس کے بارے میں ہوتی تھیں؟"

"وہ زیادہ تر بے ربط باتیں کیا کرتا۔ کبھی کبھی وہ کچھ لوگوں کے نام بھی لیتا۔ کبھی یوں لگتا جیسے وہ کسی سے باتیں کررہا ہو اور کبھی وہ چلّانے لگتا۔"

"پھر تم کیا کرتی تھیں؟"

"میں کیا کرسکتی تھی۔ میں نے ہمیشہ ان لمحات میں اس کے پاس رہنے کی کوشش کی۔ اسے کھانا کھلاتی اور پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتی۔ ایک دفعہ میں نے کسی ڈاکٹر کو دکھانے کی تجویز پیش کی جس پر وہ ناراض ہوگیا اور مجھ پر چلّانے لگا۔ اس نے کچھ اس طرح کی بات کی کہ ہمارے پیشے کے لوگ ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتے۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ "وہ کس پیشے کی بات کررہا تھا؟"

میں جانتا تھا کہ ایک پیشہ ایسا بھی ہے جس میں آپ کبھی ریٹائر نہیں ہوتے اور نہ ہی کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرتے ہیں بلکہ اپنے راز قبر میں لے کر چلے جاتے ہیں۔

ہنسنا منع ہے

ٹیچر۔ "15 پھلوں کے نام بتاؤ۔"

سردار۔ "مالٹا، سیب، آم......"

ٹیچر۔ "شاباش 3 ہوگئے 12 رہ گئے۔"

سردار۔ "ایک درجن کیلے!"

☆☆☆

شوہر۔ "میں نے دوست کو کھانے پر بلایا ہے۔"

بیوی۔ "تم پاگل تو نہیں ہوگئے؟ پورے گھر میں گند پڑا ہے برتن بھی دھونے والے ہیں اور میں اب کچھ پکا بھی نہیں سکتی۔"

شوہر۔ "یہ سب دکھانے کے لیے ہی تو بلا رہا ہوں، کیونکہ وہ بے وقوف شادی کرنے کا سوچ رہا ہے۔"

سجاد علی شگری کا تجزیہ گلگت بلتستان سے

''البتہ یہ کیفیت تین چار دن رہتی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ ہمیشہ کی طرح خوش مزاج اور ہنسی مذاق کرنے والا بن جاتا۔'' اس نے ٹشو سے اپنی آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے کہا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس سے کافی سوالات کر چکا ہوں۔ اس لیے جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جب دروازے پر پہنچا تو وہ بولی۔ ''میں صرف یہی کہہ سکتی ہوں کہ یہ خبر میرے لیے بہت بڑا شاک تھی۔ ہم مئی میں شادی کرنے کا پروگرام بنا چکے تھے اور وہ شادی کرنے کے خیال سے بہت خوش تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ زندگی میں وہ بیوی کی کمی محسوس کرتا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں ہی خوش تھے بلکہ میں نے تو اپنی شادی کا جوڑا بھی منتخب کر لیا تھا۔''

''ایک بات اور؟'' میں نے اس کے دفتر میں آویزاں کینوس کے ٹکڑے کی جانب اشارہ کیا جس پر ایمبرائیڈری کا کام ہوا تھا۔ ایسا ہی ایک پیس میں ٹیڈ کے لیونگ روم میں بھی دیکھ چکا تھا۔ ''کیا تم نے ہی ٹیڈ کے اپارٹمنٹ میں اسی طرح کا نیلے اور سفید رنگ کا نیڈل پوائنٹ آویزاں کیا تھا؟''

وہ پہلی بار مسکرائی۔ ''یہ میرا مشغلہ ہے۔ اس سے مجھے سکون ملتا ہے۔ میں تکیوں اور چادروں پر بھی یہ کام کرتی ہوں اور ان پر دلچسپ کہاوتیں اور مقولے تحریر کرتی ہوں۔''

''اس کا کیا مطلب ہے، جب کسی کو دھوکا دینا شروع کریں تو ہم کیسا الجھا جال بنتے ہیں۔''

''میں نے یہ عبارت کہیں پڑھی تھی۔ میں نے اسے فریم کر کے ٹیڈ کو اس کی سالگرہ پر تحفے میں دے دیا۔ مجھے ابھی اس کا ردِعمل یاد ہے۔ وہ بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر جب میں دوسری بار اس سے ملنے گئی تو اس نے وہ نیڈل پوائنٹ دیوار پر آویزاں کر دیا تھا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، اس نے ایسا کیوں کیا؟''

''یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ مجھے یاد آ رہا ہے۔ اس نے ایک دفعہ کہا تھا کہ یہ مقولہ اس کے لیے خاص معنی رکھتا ہے۔''

''اس نے دوسرے ملکوں میں بھی کام کیا تھا۔ اس نے کبھی وہاں کی کوئی بات کی؟''

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''صرف یہ کہا کرتا تھا کہ وہ اس کی زندگی کا ایک بند باب ہے۔''

واپس آیا تو ٹیلی فون پر جیری کا پیغام ملا۔ ''جیسیلا جوف میسٹر نامی ایک خاتون نے بیس جنوری کو لفت ہنسا کی پرواز کے ذریعے جان ایف کینیڈی ائرپورٹ سے برلن کے لیے سفر کیا تھا۔''

اگلی صبح میں نے اپنے لیے برلن کے لیے جمعے کی شام کی پرواز کے لیے بکنگ کروالی۔

وہ اتوار کی ایک خاموش صبح تھی اور میں برلن کے علاقے ہینگو ڈروف میں فونٹانیس ٹراسی پر واقع ایک عمارت کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے پہلے ہی ہوٹل سے فون کر کے جیسیلا کو بتا دیا تھا کہ میں اس سے اس کے حالیہ امریکی دورے کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بہت دیر تک خاموش رہی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، میں نے مزید کہا کہ کئی سال پہلے تھاڈیوس گولڈویل کے ساتھ کام کر چکا ہوں۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ضرور متجسس ہو گئی تھی۔

''میں سارا دن گھر پر ہی رہوں گی۔'' اس نے رسمی لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''تم کسی وقت بھی آ سکتے ہو۔''

جس عورت نے دروازہ کھولا، اس کی عمر پچیس برس کے قریب ہو گی۔ وہ دراز قد اور پُرکشش تھی۔ میں نے اپنا تعارف کروایا اور اس کے پیچھے چلتا ہوا کچن تک آ گیا اس نے بتایا کہ وہ چائے کے لیے پانی گرم کر رہی تھی۔

ایک منٹ توقف کرنے کے بعد وہ بولی۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں مسٹر گولڈویل سے ملنے گئی تھی؟''

''مجھے کسی نے بتایا تھا۔'' میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''تم نے کس لیے نیویارک تک کا طویل سفر کیا؟''

وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''کچھ ایسی باتیں تھیں جو میں اسے بتانا چاہ رہی تھی۔''

جیسیلا نے اپنے اور میرے لیے چائے بنائی۔ گھبراہٹ کے باوجود وہ ایک اچھی میزبان ہونے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ میں نے ہینگر پر ٹنگی ہوئی سفید یونیفارم دیکھی تو وہ بولی۔ ''میں یونیورسٹی کلینک میں نرس ہوں۔''

اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ میں ٹیڈ گولڈویل کی بیٹی سے باتیں کر رہا تھا۔ ''تم نے جو باتیں اس سے کہیں وہ یقیناً اہم ہوں گی۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ اہم ہی تھیں۔''

کچن میں آتی سورج کی روشنی میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کی شکل اپنے باپ سے کتنی ملتی ہے۔ اسی کی طرح سنہرے بال، چوڑی پیشانی اور نیلی گول آنکھیں، میں سوچ رہا تھا کہ گولڈویل کو یہ محسوس کرنے میں کتنی دیر لگی ہو گی کہ غیر متوقع طور پر اس

کے اپارٹمنٹ میں آنے والی عورت اس کی بیٹی ہے۔
''میں وہاں کیوں گئی تھی۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''میں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کس طرح زندگی گزار رہا ہے۔ مجھے کچھ اور باتیں بھی معلوم کرنا تھیں۔'' پھر وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''گولڈ ویل میرا باپ ہے۔''
میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہیں وہ سب کچھ معلوم ہوگیا جو تم جاننا چاہ رہی تھیں؟''
''میں جو توقع کر رہی تھی۔ وہ اس سے بھی زیادہ پریشان کن نکلا۔''
''اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔
''وہ یقیناً ایک اچھی زندگی گزار رہا ہے۔ اسے امریکی حکومت سے معقول پنشن مل رہی ہے کیا ایسا نہیں ہے؟''
میں نے کہا۔ ''یہ سچ ہے۔''
''تم میرے باپ کو صرف ایک ساتھی کی حیثیت سے جانتے ہو لیکن تمہیں وہ سب کچھ معلوم نہیں جتنا میں اس کے بارے میں جانتی ہوں۔''
''تم اسے کس طرح جان سکتی ہو جبکہ پہلی بار اس سے مل رہی تھیں؟''
اس نے اپنا سر ہلایا اور بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم کیا سوچ رہے ہو یہی نا کہ میں اسے نہیں جانتی تھی لیکن مجھے اس کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا جو میری ماں نے مجھے بتایا تھا گو کہ میں اپنے باپ سے پہلے کبھی نہیں ملی لیکن میری ماں ہر وقت اسی کی باتیں کیا کرتی تھی۔''
جیسیلا کی ماں وہی عورت تھی جس کی تصویر گولڈ ویل کی جیب سے ملی تھی۔ اس نے یہ تصویر البم سے نکالی ہوگی اور اسے دیر تک دیکھتا رہا ہوگا جب اسے معلوم ہوا کہ اس نے بیوی اور بیٹی کے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا ہے تو اس نے فیصلہ کرلیا کہ یہ سب جان لینے کے بعد وہ زندہ نہیں رہ سکتا اور جذبات سے مغلوب ہوکر اس نے بالکونی سے چھلانگ لگادی۔
''میں اسے یہی بتانے گئی تھی کہ اس کے بارے میں میرے کیا خیالات ہیں اور یہ سب کچھ میں نے اپنی ماں کی خاطر کیا۔''
''تمہاری ماں کہاں ہے؟''
''وہ مر چکی ہے مسٹر کلیٹر۔ اس کے انتقال کو کئی سال ہو چکے ہیں لیکن کیا تم جانتے ہو کہ اس نے مجھے کیا بتایا تھا۔ مرنے سے ایک دن پہلے اس نے مجھ سے گولڈ ویل کی باتیں کیں۔''

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ ''اس نے کہا۔ ''وہ میری زندگی میں آنے والا واحد مرد تھا۔ یہ بات اس نے بستر مرگ پر کہی تھی۔''
میں نے چائے کا گھونٹ لیا اور اس کی بات غور سے سننے لگا۔
''بہرحال میری ماں نے اس کے لیے بہت کچھ کیا لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ اس نے اسے دھوکا دیا اور ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا۔''
یہ کہہ کر جیسیلا ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی پھر اس نے آہستگی سے کہنا شروع کیا۔ ''وہ 1986ء میں ملے تھے ان کی ملاقات مشرقی برلن کے ایک کیفے میں ہوئی تھی۔ اس وقت وہ پچیس سال کی تھی۔ اچانک ہی وہ غیر ملکی اس کی میز پر آیا اور بولا کہ وہ بہت اچھی لگ رہی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی پوچھا کہ اس نے اتنا عمدہ اسکرٹ کہاں سے خریدا ہے۔ قدرتی طور پر میری ماں اس تعریف سے خوش ہوگئی۔''
میں اس صورت حال کا تصور کرسکتا تھا۔ گولڈ ویل کو خواتین کی تعریف کرنے کا ہنر آتا تھا اور اس ضمن میں وہ اپنے تمام حربے آزماتا تھا۔
''اگلے ہفتے وہ پھر اسی کیفے میں آیا۔ اس زمانے میں مشرقی جرمنی کے لوگوں کو غیر ملکیوں سے راہ و رسم رکھنے کی ممانعت تھی لیکن میری ماں بہت ہی بھولی تھی۔ ایک مرحلے پر اس نے اسے اپنی ملازمت کے بارے میں بھی بتادیا کہ وہ اسٹاسی کے ہیڈ کوارٹر میں سیکریٹری ہے۔''
ساری بات میری سمجھ میں آگئی کہ کس طرح گولڈ ویل نے ان فائلوں تک رسائی حاصل کی ہوگی۔
''ان کے درمیان افیئر شروع ہوگیا مسٹر کلیٹر۔'' وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''وہ ایک ساتھ باہر جانے لگے۔ گولڈ ویل باقاعدگی سے مشرقی برلن آنے لگا اور اس کے لیے تحائف بھی لے کر آتا۔ گو کہ میری ماں بھی اسے اپنے گھر لے کر نہیں گئی لیکن میرے باپ کے پاس شہر میں اپنی جگہ تھی جہاں وہ وقت گزارتے تھے۔''
اس کی یہ بات درست تھی۔ مشرقی برلن میں ہمارے کئی سیف ہاؤس اور اسٹور تھے کیونکہ پیسے سے سب کچھ خریدا جاسکتا ہے۔
''اسے میری ماں کی چاہت نہیں تھی۔ وہ صرف معلومات چاہتا تھا اور میری ماں احمقوں کی طرح اسے وہ تمام معلومات فراہم کرتی رہی جو اس نے مانگیں۔ میری ماں

نے اس کی خاطر اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی۔ جب اسے مطلوبہ معلومات مل گئیں۔ گولڈ ویل نے میری ماں کو جھانسا دیا کہ وہ مغربی جرمنی جانے میں اس کی مدد کرے گا۔ وہ خود ایک بہتر زندگی گزارنے کی خواہش مند تھی لہٰذا اس کی باتوں میں آگئی۔ اس وقت تک وہ حاملہ ہو چکی تھی اور چاہتی تھی کہ اس کا بچہ یعنی میں آزاد اور پُرسکون فضا میں سانس لے سکیں۔"

"کیا وہ جانتا تھا کہ تمہاری ماں حاملہ ہے؟"

"ماں نے اسے بتا دیا تھا۔" جیسیلا لمحے بھر کو رکی پھر بولی۔ "لیکن تم جانتے ہو کہ کیا ہوا؟"

میں جانتا تھا۔ مجھے وہ خط اور اخباری تراشے یاد آگئے جو گولڈ ویل کے اپارٹمنٹ سے ملے تھے۔

"اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس کا انتظار ہی کرتی رہی لیکن وہ نہیں آیا۔ اس نے میری ماں کو تنہا چھوڑ دیا پھر اسٹاسی پولیس نے اسے گرفتار کرلیا۔"

مجھے جیری کے وہ ریمارکس یاد آئے جو اس نے گولڈ ویل کی ہرجائی فطرت کے بارے میں کہے تھے۔ وہ کبھی کسی ایک کا ہو کے نہیں رہا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو شاید اب تک مریم کی جگہ کوئی دوسری لڑکی اس کی زندگی میں آچکی ہوتی۔

"میری ماں سے کبھی ختم نہ ہونے والی تفتیش شروع ہو گئی۔ اسے رات بھر جگایا جاتا۔ دوسرے قیدیوں سے ملنے یا بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک طویل عرصے تک وہ ایک ایسی زیرِ زمین کوٹھری میں قید رہی جہاں پانی چھوڑ دیا جاتا تھا۔"

مجھے وہ سب کہانیاں یاد آگئیں جو ان زیرِ زمین کوٹھریوں کے بارے میں سنی گئی تھیں۔ ان میں پانی بھرا ہوتا تھا اور جو خوش قسمت وہاں سے زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے، وہ انہیں آبدوز کے نام سے یاد کرتے تھے۔

میں نے کہا۔ "لیکن اس کے بعد تو دیوارِ برلن گرا دی گئی تھی۔"

"یہ نومبر 1989ء کی بات ہے۔ وہ سیاسی قیدی تھی۔ اس لیے فوراً ہی رہا کر دی گئی۔ سب سے پہلے اس نے مجھے تلاش کیا۔ متعلقہ حکام نے میرا خاندانی نام تبدیل نہیں کیا تھا لہٰذا میں اسے آسانی سے مل گئی۔ لیکن جیل میں گزارے ہوئے ڈھائی سالوں نے اسے تباہ کر دیا تھا اور وہ جسمانی سے زیادہ نفسیاتی مریضہ بن گئی تھی۔ اسے زندگی گزارنے کے لیے بہت معمولی کام کرنا پڑ رہے تھے۔"

"اور تم نے اپنے باپ کو یہ سب باتیں بتا دیں؟"

"جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ اسے امریکا میں ایک ہیرو کی طرح دیکھا جاتا تھا جو کچھ میری ماں نے کیا، اس کا سارا کریڈٹ وہ لے گیا۔ میں حیران ہوں کہ وہ اس طرح کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔"

مجھے مریم میکللین کی بات یاد آگئی کہ اس پر کبھی کبھی افسردگی کا دورہ پڑتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ اس کا احساسِ پشیمانی تھا لیکن اس کا دورانیہ بہت مختصر ہوا کرتا تھا۔

"تمہارا باپ مر چکا ہے جیسیلا۔" میں نے کہا۔ "تمہارے رخصت ہونے کے چار گھنٹے بعد اس نے بالکونی سے چھلانگ لگا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔"

میں اس کے ردِعمل کے لیے تیار تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اب اسے ساری عمر اس احساس کے ساتھ زندہ رہنا تھا کہ اپنے باپ کی خودکشی میں اس کا بھی حصہ ہے جب وہ اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی تو میں نے محسوس کیا کہ اب میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ اسے تنہا چھوڑ دیا جائے رخصت ہونے سے پہلے میں نے اسے اپنا پتا دیا اور کہا کہ وہ کسی بھی وقت مجھے فون کر سکتی ہے۔

☆☆☆

"ہوں۔ تو اس کی ایک بیٹی بھی ہے۔" جیری نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں یہ نہیں جانتا تھا بلکہ ہم میں سے کسی کو بھی یہ بات معلوم نہیں تھی۔ وہ اپنے معاملات خفیہ رکھنے میں بہت ہوشیار تھا۔"

وہ منگل کی سہ پہر تھی اور میں واپسی میں آٹھ گھنٹے کے لیے واشنگٹن میں رک گیا تھا تا کہ جیری سے دوبارہ ملاقات کرسکوں۔ ہم کلب کے ایگل لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"کیا بات ہے کلیٹز؟ کوئی چیز تمہیں پریشان کر رہی ہے؟"

"کچھ نہیں، سر میں ہلکا سا درد ہے۔ ویسے میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

جیری ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میرے سر میں اس وقت سے ہی شدید درد تھا جب میں اتوار کی شام جیسیلا کے اپارٹمنٹ سے واپس آیا تھا۔ میں نے ہوٹل کے بار سے ڈبل وہسکی بھی لی لیکن اس ایجنٹ کی یاد کو ذہن سے نہ نکال سکا جسے میں نے بھرتی کیا تھا۔ میں اسے کبھی بھی نہیں بھول پایا تھا جو

کہ مشرقی جرمنی کی پولیس میں نچلے درجے کا اہلکار تھا۔

"کیا تم میری بات سن رہے ہو کلینز؟"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔"

"اس وقت میرے ذہن میں تقریب اعزازات ہے۔" جیری نے کہا۔ "وہاں ڈائریکٹر بھی ہوگا اور وہ میڈل دینے سے پہلے کچھ کہنا چاہے گا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ گولڈویل نے اپنی زندگی کا خود خاتمہ کیا لیکن اگر یہ اسی طرح ہوا ہے..."

"یہ ایسے ہی ہوا ہے جیری۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اس کے سوا اور کوئی بات نہیں۔"

"اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اس کا میڈل منسوخ نہیں کیا جاسکتا۔ اس پر کئی سوالات اٹھیں گے۔ وہاں دوسرے لوگ بھی ہوں گے جو ڈائریکٹر سے اپنے تمغے وصول کریں گے۔ اس صورت حال میں ہم کیا کریں گے۔"

اسی وقت اس کے دو ساتھی لاؤنج میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک جیری کو دیکھ کر اس کی طرف بڑھا تو وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "معاف کرنا مجھے اس سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔" پھر وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارا چہرہ کیوں زرد ہو رہا ہے۔ لگتا ہے کہ تم رات کو ٹھیک طرح سے نہیں سو سکے۔"

جیری کے جانے کے بعد میں نے پھر اس شخص کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا جسے میں نے اپنے کام کے سلسلے میں بھرتی کیا تھا۔ وہ ایک شادی شدہ شخص تھا اور اس کی تین بیٹیاں بھی تھیں لیکن اپنے دفتر کے ٹیلی فون سے کئی غیر محتاط فون کالز کرنے کی وجہ سے وہ ہماری نیشنل سیکیورٹی ایجنسی کے جاسوس کی نظر میں آ گیا تھا۔ میری اس سے ملاقات مشرقی برلن کے ایک پارک میں ہوئی جہاں ہم دونوں گھنے درختوں کے نیچے ایک بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا کسی لڑکی سے معاشقہ چل رہا ہے لیکن میں نے اس کوئی موقع نہیں دیا۔

وہ یا تو ہمارے لیے کام کرنے پر تیار ہو جائے ورنہ دوسری صورت میں اس کی بیوی اور بیٹیوں کو اس کی محبوبہ کے بارے میں بتا دیا جائے گا جب وہ سر ہلا کر نہیں نہیں کی گردان کرتا رہا تو میں نے اسے دھمکی دی کہ اس کی بیوی کو وہ تمام ٹیلی فون کال سنوا دی جائیں گی جو وہ اپنی محبوبہ کو کرتا رہا ہے۔ بالآخر ہچکچاتے ہوئے ہمارے لیے کام کرنے پر تیار ہو گیا۔ وہ کبھی بھی ہمیں کوئی قیمتی معلومات فراہم نہ کر سکا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا شاید وہ دہری زندگی کا دباؤ برداشت نہ کر سکا۔

اس کے بعد میں نے اس سے کام لینا چھوڑ دیا لیکن اسے کبھی بھلا نہ سکا کیونکہ میں نے اس کے کہے پر یقین کر لیا تھا جب اس نے کہا کہ وہ صرف دو مرتبہ اس لڑکی سے ملا۔ اس کے علاوہ بھی کسی دوسری عورت سے اس کا تعلق نہیں رہا۔ مجھے یاد آیا کہ گولڈویل نے بھی ایک دفعہ اسی قسم کا دعویٰ کیا تھا۔

"ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ ایک نیک مقصد کے لیے ہے۔" اس نے یہ بات ایک ڈنر کے موقع پر کہی جو کہ ہمارے ہیڈ کوارٹر سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ جہاں ہم کبھی جمع ہوتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ گولڈویل نے اس عورت کو بھی اپنے فرض کی تکمیل کے لیے استعمال کیا اس پر مجھے گولڈویل کے لیونگ روم میں آویزاں وہ ڈیکوریشن پیس اور اس پر لکھا ہوا مقولہ یاد آ گیا جس میں نیکیلے جال کے الفاظ استعمال کیے گئے جب میں نے اس کا موازنہ مشرقی برلن کے ایک نچلے درجے کے اہلکار سے کیا تو احساس ہوا کہ ہم سب نے اپنے مقصد کے لیے ایسے جال استعمال کیے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میرا ایجنٹ نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو گیا جبکہ گولڈویل کی بیوی پولیس کے ہتھے چڑھ گئی اور اسے جیل میں شدید ذہنی اور جسمانی اذیت کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتیجے میں وہ نفسیاتی مریضہ بن کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی اور جب گولڈویل کی بیٹی نے اسے ان حالات سے آگاہ کیا تو احساس جرم سے مغلوب ہو کر اس نے خودکشی کر لی لیکن گولڈویل کے 'نیک مقصد' کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کیا وہ واقعی مجرم تھا؟

میرا سر درد کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے پانی کے ساتھ اسپرین کی دو گولیاں نگلیں اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ جیری ابھی تک اپنے دوست سے باتیں کر رہا تھا۔ یوں لگا جیسے وہ بھی اپنا کام نکل جانے کے بعد مجھے بھول گیا ہے۔ شاید یہی اس دنیا کا دستور ہے۔ یہاں سب اپنی غرض کے غلام اور مطلبی ہیں۔ مطلب نکل جانے کے بعد کسی کو یاد نہیں رہتا کہ جسے انہوں نے اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا ہے، اس سے ان کا کیا تعلق تھا۔ گولڈویل میں اور جیری۔ ہم سب ایک جیسے ہیں مطلبی کہیں کے۔

میں نے دور سے ہی جیری کو ہاتھ ہلایا اور لاؤنج سے باہر نکل گیا۔

آوارہ گرد

قسط 21

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اداتہ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

تلاشِ غنیم جاری تھی۔

باوجود اس کے کہ مجھے اطمینان تھا کہ وزیر جان کو بس ہم تھوڑی ہی دیر میں چھاپنے والے تھے، لیکن پتا نہیں کیوں اس کی تلاش میں میری بے چینی اور جوش آسمان کو چھو رہا تھا۔ حالانکہ میں اپنے اصل مشن میں کامیاب ہو چکا تھا، جس کا ثبوت وہ بلیک کوبرا فائل تھی جو میرے سینے سے چپکی ہوئی تھی، مگر وزیر جان کو جلد از جلد تلاش کرنے کا ایک جنون میرے سر پہ سوار تھا۔ میری اس کیفیت کو اول خیر بخش رہا تھا، تاہم وہ اور شکیلہ خاموش تھے، جبکہ میں اور میجر باجوہ آپس میں وزیر جان کے متعلق ہی گفتگو کر رہے تھے۔

صبح کاذب کی روشنی چہار سو پھیلنے لگی تھی۔ مفرور وزیر جان کی تلاش میں ابھی ہمیں چند ہی سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ اچانک اس کے قدموں کے نشان ایک مقام پر گڈمڈ سے ہو گئے۔ جیپ رک گئی، ہم سب نیچے اُتر آئے اور بہ غور زمین پر کچھ دیکھنے لگے۔

”گاڑی کے ٹائروں کے نشانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مقام پر اس کا کوئی ساتھی اسے لینے آ پہنچا تھا، گو... گو...“ میجر ریاض باجوہ نے جلدی سے کہا اور ہم سب دوبارہ جیپ میں سوار ہو گئے۔

میری بے چینی اور جوش ایک مرتبہ پھر سوا ہونے لگا۔ وزیر جان کا کسی گاڑی میں فرار ہونے کے انکشاف نے میری اُمیدیں ماند کر دی تھیں۔ میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”لیکن میجر صاحب! سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کے ساتھی کو اتنا موقع کیسے ملا کہ وہ پاور کے ایجنٹوں کے حملے کے دوران ایک عدد گاڑی لے کر خاموشی سے فرار ہو گیا؟ اس پر مستزاد وہ وزیر جان کو لینے ٹھیک اسی مقام پر بھی پہنچ گیا؟“

میری بات پر وہ بہ دستور جیپ کی ونڈ اسکرین کے پار اپنی نظریں جمائے ہوئے بولے۔ ”یہ کوئی ناممکن سی بات نہیں ہے۔ اسٹیشن فور میں یقیناً اسی طرح کا کوئی دوسرا خفیہ راستہ بھی ہوگا، موقع ملتے ہی اس کا ساتھی نکل بھاگا۔ ٹرانسمیٹر یا اسی طرح کے کسی رابطے پر ہی ان دونوں کا اتصال ممکن ہوا ہوگا۔“

”حیرت ہے، پھر چوہدری ممتاز نے ایسے کسی موقع سے کیوں فائدہ نہیں اُٹھایا تھا؟“

میرے منہ سے فوراً نکلا تو میجر صاحب زہریلی مسکراہٹ سے بولے۔ ”اس کا آسان سا جواب ہے کہ اُسے موقع ہی نہ ملا اور پھر ہم نے بھی تو اُسے ایسے کسی موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لیے کہاں چھوڑا تھا۔ وہ جلد ہی ہمارے نرغے میں آ گیا تھا۔“

ابھی ہم نے بہ مشکل تین چار کلومیٹر کا ہی راستہ طے کیا ہوگا کہ ہمیں دور ہی سے کسی آبادی کے آثار نظر آنے لگے۔ جس کے قریب سے ایک ایسی ذیلی سڑک گزرتی تھی جو سیدھا ملتان روڈ سے ملتی تھی۔ ہم اس سڑک پر پہنچے تو میجر باجوہ نے ڈرائیور کو جیپ روکنے کا حکم دیا۔ ایک بار پھر جیپ سے اُتر کر ہم مذکورہ گاڑی کے ٹائروں کے نشانات کا تعین کرنے لگے۔ تب اس کی سمت کا اندازہ ہوا۔

وزیر جان جس گاڑی میں اپنے کسی ساتھی کے ساتھ فرار ہوا تھا وہ ملتان روڈ کے رُخ پر مڑ گئی تھی۔

پختہ سڑک پر آتے ہی میجر باجوہ نے ڈرائیور کو جیپ دوڑانے کی ہدایت کر دی۔ ساتھ ہی وہ اپنے وائرلیس سیٹ پر کسی ساتھی کو کچھ ہدایات بھی دینے لگے۔

یہ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ آنے جانے والی گاڑیاں ہمیں بہت قریب سے کراس کر رہی تھیں۔ مگر ڈرائیور بڑی مہارت سے جیپ کو طوفانی رفتار سے دوڑا رہا تھا... اگر میجر باجوہ درست سمت پر سوچ رہے تھے تو شکار ہم سے اب بھی زیادہ دور نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اور پھر جلد ہی میرا یہ خیال درست ثابت ہوا۔

ملتان روڈ کا الحاق ابھی چند کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ صبح کاذب کا وقت ہونے کے باعث اس روڈ پر ٹریفک کی آوک جاوک بھی نہ ہونے کے برابر تھی، ہم سے آگے جانے والی گاڑیوں میں ایک تو مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی بس تھی جو یقیناً کسی قریبی بستی سے صبح تڑکے روانہ ہوئی ہوگی، جبکہ باقی دو چار گاڑیوں میں سے ایک بھوسے سے لدا پھندا ٹرک تھا اور دوسرا ٹریکٹر۔

لیکن انہیں کراس کرتے ہی ہمیں ایک کار ضرور دکھائی دے گئی جس کی رفتار خاصی حد تک ”مشکوک“ تھی۔

اس کار کو دیکھ کر میجر باجوہ نے فوراً ڈرائیور کو بھی جیپ کی رفتار بڑھانے کا کہہ دیا۔

مشکوک کار کا تعاقب شروع ہو گیا تھا اور درمیانی فاصلہ لحظہ بہ لحظہ کم پڑتا جا رہا تھا۔ میجر باجوہ نے ڈرائیور کو دو تین بار ہارن دینے کا بھی کہا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ اگر وہ مطلوبہ کار نہ تھی تو اپنے پیچھے آنے والی رینجرز والوں کی مخصوص جیپ دیکھ کر اپنی کار روک دے، مگر ایسا نہیں ہوا۔ آگے والی کار کے ڈرائیور نے رفتار مزید بڑھا دی۔ ہمیں ایک دھچکا لگا۔ کار میں صرف ایک ہی فرد تھا، اور وہی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے

ہوئے تھا۔ جبکہ مطلوبہ شخص یہی لگتا تھا۔ کیونکہ وہ ہمارے بار بار ہارن دینے پر بھی نہیں رک رہا تھا۔ ورنہ اگر کوئی عام آدمی ہوتا تو وہ اپنے پیچھے آنے والی پولیس یا رینجرز کی گاڑی کو دیکھتے ہی فوراً گاڑی روک دیتا۔

لیکن اس نے کار کی رفتار بجائے کم کرنے کے اور بڑھالی تھی۔ اب صورتِ حال بڑی عجیب سی ہو گئی تھی۔ مشکوک کار بھی یہی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن ہماری توقع کے خلاف اس میں ایک ہی آدمی سوار تھا اور وہ بھی صرف ڈرائیور۔ اس کے ساتھ وزیر جان کو بھی ہونا چاہیے تھا۔

''سمجھ میں نہیں آرہا، اگر یہ ہماری مطلوبہ گاڑی نہیں ہے تو پھر یہ اپنی کار روک کیوں نہیں رہا ہے؟'' میجر باجوہ نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے اپنے ہونٹ پُرسوچ انداز میں بھینچ لیے۔

''ہوسکتا ہے یہ ہمارا مطلوبہ شخص نہ ہو کوئی اور ہو۔ اور کسی خوف کے باعث کار نہیں روک رہا ہو۔'' میں نے خیال ظاہر کیا تو اس بار اول خیر بھی بولا۔

''رینجرز کی گاڑی اپنے تعاقب میں آتے دیکھ کر ہو سکتا ہے کہ وزیر جان سیٹوں کے درمیان کہیں سکڑسمٹ کر بیٹھ گیا ہو؟'' اس کا نقطہ بھی قابلِ غور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میجر نے اپنے ایک ساتھی کو آگے جانے والی کار کا ایک ٹائر فلیٹ کرنے کا کہا۔ اس نے فوراً اس ہدایت پر عمل کیا اور ایک ہی گولی نے کام کر دکھایا۔ ایک دھماکے سے کار کا ٹائر برسٹ ہوا اور وہ دائیں بائیں ڈولنے لگی۔ ہمیں بھی اپنی جیپ کی رفتار کم کرنا پڑی جبکہ کار ڈولتی ہوئی تھوڑا آگے جا کر رک گئی۔ ہماری جیپ قریب پہنچ کر رک گئی اور ہم سب گنیں تانے نیچے اُتر آئے۔ میجر باجوہ کے دو ساتھی بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ کار کی سمت بڑھے اور ڈرائیور کو کھینچ کر باہر نکال لیا۔ سب سے پہلے اس کی جامہ تلاشی لی گئی، اس کی جیب سے کچھ ایسی چیزیں برآمد ہوئیں جن سے ثابت ہو گیا تھا کہ وہ اسپیکٹرم کا ہی کارندہ ہے۔ ایک کارڈ سے یہ بات واضح ہوئی تھی جو اسپیکٹرم کے مخصوص مونوگرام کا تھا۔ ایک پستول بھی برآمد ہوا تھا۔

میں نے اور اول خیر نے کار کی بھی تلاشی لی۔ سیٹوں سے لے کر کار کی ڈگی بھی دیکھ ڈالی مگر وزیر جان کا پتا نہیں تھا۔ اس عجیب صورتِ حال نے ہمیں اُلجھا سا دیا تھا۔ شواہد یہی بتا رہے تھے کہ وزیر جان کو اپنے اس کار والے ساتھی کے ساتھ موجود ہونا تھا، مگر وہ یہاں سے بھی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھا۔

پاور کے دونوں اہلکاروں نے کارندے کو دبوچ رکھا تھا پھر اسی طرح میجر باجوہ کے سامنے پیش کر دیا۔ میں بہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

''وزیر جان کو کہاں اور کس مقام پر تم نے اُتارا ہے؟'' انہوں نے بارعب اور کڑک دار آواز میں اس سے دریافت کیا تو وہ بولا۔

''مجھے باس کے بارے میں نہیں معلوم۔ میں تو اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا تھا۔''

''تم لوگ ختم ہو چکے ہو۔ اور تمہارا باس وزیر جان بھی نہیں بچ سکتا اب۔ اسی لیے سچ بتا دو ورنہ میں تمہارے منہ سے سچ اُگلوانے کے لیے کسی بھی طریقے سے گریز نہیں کروں گا۔'' میجر ریاض باجوہ نے اُسے گھورتے ہوئے کہا تو وہ بجائے ان کی بات کا جواب دینے کے ڈھٹائی سے بولا۔

''آپ لوگوں کی یہ ماورائے قانون کارروائی کسی بھی طرح ایک آزاد ریاست کے زمرے میں نہیں آتی۔ جہاں ہر کسی کو یکساں حقوق حاصل ہیں۔''

مجھے اس کی چالاکی پر غصہ آنے لگا، اس کی گفتگو سے مجھے یہی اندازہ ہوا کہ یہ وزیر جان کا کوئی قریبی ساتھی ہی تھا۔ میجر باجوہ نے اسی طرح بارعب انداز میں کہا۔

''اب تم لوگوں کا یہ حربہ نہیں چل سکتا۔ اس لیے کہ تم لوگ نوادرات کی آڑ میں یہاں کیا گل کھلا رہے ہو، اس کا ثبوت وہ بلیک کوبرا فائل کی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہے۔ اب تم اپنا اور ہمارا وقت ضائع کیے بغیر سچ بتا دو۔''

میری بہ غور تکتی نظروں نے تاڑ لیا کہ وہ غیر معمولی اعتماد کا مظاہرہ کر رہا تھا، بولا۔ ''اُس بلیک کوبرا فائل کو بنیاد بنا کر اگر اس بین الاقوامی شہرت کے حامل ادارے کے خلاف کارروائی کی گئی ہے تو یہ تمہاری ایک خطرناک بھول کے سوا کچھ نہیں۔''

''سر! یہ جان بوجھ کر ہمارا وقت ضائع کر رہا ہے۔ اسے میرے حوالے کریں، میں ابھی اس کے منہ سے اُگلوا لیتا ہوں۔'' میں نے اس چالاک کارندے کو پُرطیش نظروں سے گھورتے ہوئے کہا تو میجر صاحب نے مجھے مخصوص اشارہ کر دیا۔

میں جیسے پہلے ہی اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ دانت پیستے ہوئے آگے بڑھا اور اپنے ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی۔ گرفت خاصی مضبوط تھی، جس سے اس کی آنکھیں حلقوم سے باہر اُبل پڑنے کے قریب ہو گئیں۔

''تم لوگوں کا یہ ڈراما ختم ہو چکا ہے۔ تمہارا وہ بھارتی اہلکار سندر داس بھی ہماری گرفت میں ہے، اور کیتھا ایجنٹ

ممتاز خان بھی۔ اب بس ہمیں اپنے جواب کا انتظار ہے، بولو، کہاں چھوڑ کر آئے ہو اپنے اسٹیشن چیف کو؟ خبردار! اب کوئی غیر متعلقہ جملہ منہ سے ہرگز مت نکالنا۔''

میری بات پر اس نے ایک بار پھر اپنی وہی بکواس کرنا چاہی تو میں نے اس کے جبڑے پر گھونسا رسید کر دیا۔ وہ اپنے حلق سے کراہ خارج کرتا ہوا چند قدم پیچھے کی جانب لڑکھڑا گیا۔ مگر میں نے فوراً آگے بڑھ کر اسے پھر دبوچ لیا۔ میرے ایک ہی گھونسے نے اس کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں پھر غرا کے بولا۔

''جواب دو گے یا تمہیں اسی طرح تختہ مشق بناتا رہوں۔''

''تم... تم میرے ساتھ غیر قانونی حرکت کر رہے ہو۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

میں نے اس بار ایک مُکا اس کی ناک پہ بھی جڑ دیا۔ وہ بری طرح چیخ مار کے گرا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ڈرامے کر رہا تھا، ورنہ اسپیکٹرم کے کارندے اتنے نازک جاں نہیں تھے کہ تھرڈ ڈگری کی اس مار پر درد اور تکلیف کے مارے چیخنے چلانے لگتے۔ اس نے اپنے مضروب چہرے پہ ہاتھ رکھ کر خود کو زمین پر گرا دیا۔ میں دانت پیس کر اس پر جھکا مگر اس نے بجلی کی سی پھرتی سے مٹی اپنی مٹھیوں میں دبا کر میرے چہرے پر اُچھال دی۔ جو میری آنکھوں سمیت تھوڑی بہت منہ اور ناک میں گھس گئی۔ میں عارضی طور پر دیکھنے سے قاصر ہو گیا اور کھانسنے لگا۔ اسی وقت مجھے اس کارندے کی کریہہ انگیز چیخیں سنائی دیں، شاید کسی ساتھی نے اس پاداش میں اسے کُٹ لگا دی تھی جبکہ مجھے اول خیر نے سنبھالا اور شکیلہ جلدی سے جیپ کے اندر موجود پانی کی بوتل لے آئی اور میرے منہ پہ پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔ میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوا، مگر میری آنکھوں میں جلن اور نتھنوں میں خارش سی ہو رہی تھی۔ مجھے چھینکیں بھی آ گئیں۔ کچھ حالت سنبھلی تو دیکھا میجر باجوہ کے دونوں ساتھیوں نے کارندے کو دبوچ رکھا تھا۔

بالآخر طے پایا کہ اسے ہیڈ کوارٹر لے جا کر ہی منہ کھلوایا جائے۔ میں اس ناکامی پر بری طرح جھلایا ہوا تھا۔ وزیر جان کے اس طرح ہاتھ آتے آتے چکنی مچھلی کی طرح نکل جانے پر مجھے تلملاہٹ سی ہو رہی تھی۔ مگر اسپیکٹرم کے کارندے پر اس طرح سرِعام تشدد کرنا پاور والوں کے لیے مناسب نہ تھا۔ لہٰذا کوئی چارہ نہ پا کر مجھے بھی خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ البتہ روانہ ہوتے وقت میں نے باجوہ صاحب سے کہا۔

''سر! اس طرح تو یہ بدبخت اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ وقت ضائع ہونے کی صورت میں وزیر جان بہت دور نکل چکا ہو گا۔''

''بے فکر رہو شہزی! وہ اب ویسے بھی نہیں بچ سکتا۔'' میجر باجوہ نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''وہ اب بے خانماں و برباد ہو چکا ہے۔ میں اس کی ذاتی رہائش گاہ کینال لاج کو بھی سیل کرانے کے احکامات جاری کیے دیتا ہوں۔ چلو اب۔''

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ خدا نے ہمیں آج اسپیکٹرم کے خلاف ایک بڑی کامیابی سے ہمکنار کیا تھا۔ چوہدری ممتاز کا اس طرح گرفت میں آنا اور سب سے اہم بات کہ وہ اہم فائل ہمارے قبضے میں آ چکی تھی جو اسپیکٹرم کی پوری لوکل کمانڈ سمیت، چوہدری ممتاز خان اور وزیر جان کے گلے کا پھندا بننے والی تھی، یہی نہیں بلیو ٹلسی کا ایک اہم اور ٹاپ ایجنٹ سندر داس بھی ہماری گرفت میں آ چکا تھا۔ اب صرف وزیر جان ہی باقی رہ گیا تھا۔ اس کے کئی کارندے بھی پاور والوں کے ہتھے چڑھ چکے تھے، کچھ مارے گئے تھے۔

بہرحال ہمارا واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اسپیکٹرم کے کارندے کو بھی رسن بستہ کر دیا گیا تھا۔

ہیڈ کوارٹر پہنچنے کے بعد میں نے میجر باجوہ سے ان عوامل پر تبادلہ خیال کرنا ضروری سمجھا کہ اس کامیاب آپریشن کے بعد اس کے مثبت یا منفی اثرات عابدہ اور میرے گمشدہ باپ پر کس حد تک مرتب ہو سکتے تھے؟

اس پر وہ مجھے سرِدست کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دے سکے اور کہا کہ جب تک ان کا ایک اہم مہرہ وزیر جان قابو میں نہیں آ جاتا، کچھ کہنا قبل از وقت ہو گا۔

ابھی تک قرائن اور مختلف شواہد سے یہی نظر آتا تھا کہ اسپیکٹرم کی لوکل قیادت میں بے شک ممتاز خان کی بھی حیثیت اپنی جگہ اہم جانی جاتی تھی، لیکن کلیدی حیثیت ہمیشہ وزیر جان کو ہی حاصل رہی تھی، لوکل کمانڈ کی حد تک ہی نہیں بلکہ اسپیکٹرم کی عالمی قیادت تک یہ باتیں محض قیاس پر ہی مبنی نہیں تھیں، گرفتار شدہ افراد نے بھی یہی کچھ اُگلا تھا۔ بلکہ کئی ایک نے تو یہاں تک بھی بتایا کہ اسپیکٹرم میں لولوش کے بعد وزیر جان کو ''ماسٹر'' تسلیم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس خدشے کا بھی احتمال تھا کہ ممکن ہے وزیر جان بیرون ملک فرار ہونے کی بھی کوشش کر سکتا تھا۔ یا پھر کوئی دوسرا قدم اُٹھانے کی کوشش کرتا۔

ہم تینوں واپس اپنے کوارٹر میں آ گئے۔ میں بہت

تھکن محسوس کر رہا تھا۔ شکیلہ ناشتا بنانے میں مصروف ہوگئی تھی۔ میں نے نہا دھو کر عام کپڑے پہنے اور بیڈ پر دراز ہو گیا۔ مجھے شدید تھکا ہوا پا کر اول خیر نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔

میں نے اپنا سیل اور ای میل وغیرہ چیک کیا، پھر آنسہ خالدہ سے رابطہ کرنا چاہا، مگر نہ اس کی کوئی ای میل آئی تھی نہ ہی اور کوئی میسج۔ اُس سے رابطہ بھی نہ ہو سکا۔ عابدہ کے بارے میں وہی مجھے پل پل کی خبر سے آگاہ کرتی تھی، نیز سرمد بابا اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے، لہٰذا اب عابدہ کے سلسلے میں آنسہ خالدہ ہی میری آخری اُمید تھی۔ میں اُسے سرمد بابا کی موت کی اطلاع دے چکا تھا۔

عابدہ کے متعلق سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔ جاگا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ مجھے جاگتا پا کر شکیلہ چہرے پہ مسکراہٹ لیے کمرے میں آگئی۔

''اچھا کیا تم نے آرام کر لیا۔ بہت تھکے ہوئے تھے تم اسی لیے میں نے ناشتے پر جگایا نہیں خیر، کھانا تیار ہے۔''

''ہاں یار! لگا دو کھانا۔'' میں نے کہا پھر اول خیر کا پوچھا۔

''وہ پہلے ہی کھانے کی میز پر براجمان ہو چکا ہے۔'' شکیلہ نے کہا۔

میں کچن سے ملحقہ بڑے سے لاؤنج میں آگیا جہاں ایک طرف ڈائننگ ٹیبل بچھی ہوئی تھی۔ اول خیر انہماک سے اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔

''خیریت ہے، ایسی کیا خاص خبر ہے بھئی۔''

''یہ اپنے خان صاحب کے متعلق خبر تھی۔''

''تمہارا مطلب ہے زبیر خان سے متعلق؟'' میں نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں!'' اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اخبار میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''لوکا کے! تم بھی پڑھ لو۔ زبیر خان پر پچھلے دنوں فالج کا حملہ ہوا تھا، اب اسپتال سے گھر آگیا ہے۔ اپنی کھلاں والی حویلی میں۔'' میں اس کی بات پر چونکا۔ کھلاں والی سے مجھے کچھ اور بھی یاد آگیا تھا۔ ایک بہت اہم بات، جو ہوٹل میں عبید سے ملاقات پر میں نے اس کے منہ سے سنی تھی۔ جب اس نے مجھے سندر داس کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا کہ وزیر جان، لولووش کی طرف سے اُسے اسپیکٹرم کا ''ہینڈلر ایجنٹ'' کا عہدہ تفویض کرنے کے بعد، کھلاں والی میں زیر تعمیر ایک نئے زیرو ہاؤس میں منتقل کر دے گا۔ میں اس پر چونکے بنا نہ رہا تھا، مگر اس وقت حالات ایسے تھے کہ میں اس سے مزید کچھ نہیں پوچھ سکا تھا۔ اور جلدی بھی کیا تھی، مگر مجھے پتا نہیں تھا کہ عبید کی اتنی ہی لکھی ہوئی تھی۔ تاہم اب زبیر خان سے متعلق خبر پر اس کی آبائی حویلی کا خیال آیا تو مجھے یاد آگیا...

میں نے اخبار اس کے ہاتھ سے لیا اور خبر تفصیل سے پڑھی، جس کے مطابق زبیر خان پر فالج کا شدید حملہ ہوا تھا۔ ایمرجنسی میں اُسے لاہور کے ایک بڑے پرائیویٹ اسپتال لے جایا گیا تھا۔ وہاں وہ دس بارہ دن داخل رہا تھا اور اب واپس اپنے آبائی گاؤں ''کھلاں والی'' آگیا تھا۔ انسان کی زندگی میں تو یہ سب چیزیں چلتی رہتی ہیں، کبھی خوشی کبھی غم۔ مگر میری سوئی اسپیکٹرم کے اس نئے زیرو ہاؤس پر اٹک کر رہ گئی تھی کہ آخر یہ کیا معاملہ تھا؟ کس نے کھلاں والی کی زمین وزیر جان کو بیچی تھی؟ اور کس کی اجازت سے؟

نیلی اور جاں درکھنا والے معاملے کے بعد سے میری دوبارہ زبیر خان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی فون پر کوئی بات ہوئی تھی۔ جبکہ میں یہ بھی نہیں بھولا تھا کہ نیلم والے معاملے کے دوران ہی یہ بھانڈا پھوٹا تھا کہ وزیر جان کھلاں والی کی جاگیر یا اس کی زمین کا ٹکڑا خریدنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ بلکہ وہ ہر قیمت پر ایسا کرنا چاہتا تھا۔ اور مجھے یہ اس کے کسی اور مخفی منصوبے کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ جس کے نتیجے میں وزیر جان نے اپنی چہیتی بیوی سعیدہ کو نیلم کے ساتھ خفیہ ساز باز میں لگا رکھا تھا۔

''او خیر کا کے! تو اس خبر کو سن کے کہاں کھو گیا۔ خیریت تو ہے؟'' معاً اول خیر نے مجھے ٹہوکا دیا۔ میرے اندر ایک فلم سی چل رہی تھی۔ میں ذرا چونکا اور سر جھٹک کر بولا۔

''کچھ نہیں یار! زبیر خان کے ذکر پر ایسے ہی کچھ یاد آگیا تھا۔ پھر آرام سے بات کرتے ہیں۔''

اس اثنا میں شکیلہ کھانا ٹیبل پر لگا چکی تھی۔ کھانے کے دوران میں نے وہ بات ان دونوں سے بھی شیئر کر دی۔

''اب کیا فائدہ اس کے بارے میں سوچنے کا۔'' اول خیر بولا۔ ''اسپیکٹرم کا سیاپا ہی مک گیا۔ اب یہ وزیر جان بچا ہے، وہ بھی کب تک بچے گا، بلیک کوبرا فائل کی صورت میں اس کے خلاف پاور والوں کے ہاتھ ٹھوس ثبوت لگ چکے ہیں۔''

''پھر بھی یار آخر پتا تو چلے کہ کھلاں والی میں کون سی جگہ ان لوگوں نے اپنے نئے زیرو ہاؤس کی داغ بیل ڈالی تھی اور کس کے بل بوتے پر؟'' میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا تو اول خیر کے بجائے شکیلہ سنجیدگی سے بولی۔

"ہم کھلاں والی زبیر خان کی خیریت پوچھنے کے بہانے بھی جا سکتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر ہمیں خود بھی ماحول کا اندازہ ہو جائے گا۔"

"مشورہ تو اچھا ہے شکیلہ کا، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ زبیر خان کسی کو پہچاننے کے قابل ہوگا بھی یا نہیں؟ میرا مطلب ہے وہ ہمیں پہچان پائے گا؟" اول خیر نے کہا۔

"ہم ایک فارمیلٹی کے طور پر جائیں گے وہاں۔ زبیر خان سے ہاتھ ملانے نہیں جا رہے ہیں ہم۔" شکیلہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"زبیر خان کو وہاں جا کر سہرا ڈالنے کا میں بھی نہیں کہہ رہا ہوں۔" اول خیر نے جلبلا کر کہا۔

"شہزی کا وہاں جانے کا جو مقصد ہے وہ میں سمجھ چکا ہوں، تمہیں یہ بات سمجھنے میں ابھی تھوڑی دیر لگے گی۔" دونوں میں بحث شروع ہو چکی تھی۔

میرا دھیان عابدہ کی طرف لگا ہوا تھا۔ آنسہ خالدہ سے بات ہو جاتی تو کچھ تسلی ہو جاتی۔ مجھے بہ دستور سنجیدہ اور خاموش پا کر دونوں خاموش ہو گئے پھر شکیلہ نے میری اس خاموشی کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"شہزی! آنسہ خالدہ نے دوبارہ کوئی رابطہ نہیں کیا۔ ہمیں عابدہ کے بارے میں بھی کوئی سنجیدہ اسٹیپ اُٹھانا ہوگا۔ کیونکہ سرمد بابا کے انتقال کے بعد معاملہ اور ہو چکا ہے۔"

"میں نے دو ایک بار کوشش کی تھی آنسہ خالدہ سے رابطہ کرنے کی، میں خود بھی اس سے سرمد بابا کی موت کے بعد تبادلہ خیال کرنا چاہتا ہوں۔ مگر رابطہ نہ ہو سکا تھا۔" میں نے کہا تو شکیلہ نے مجھے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"تم اُسے اس سلسلے میں ایک ای میل یا میسج ہی کر دو۔"

بے دلی سے کھانا ختم کر کے میں ٹیبل سے اُٹھنے ہی لگا تھا کہ آنسہ خالدہ کی کال آ گئی، میں نے فوراً جھپٹ کر اپنا سیل لیا اور کان سے لگا لیا۔

"ہائے مسٹر شہزاد! کیسے ہو۔ تم شاید مجھے کال کر رہے تھے؟" دوسری طرف سے اس کی آواز اُبھری۔ میں نے فوراً کہا۔

"جی ہاں! مگر آنسرنگ مشین میں تمہارا ریکارڈ شدہ میسج سنائی دیا تھا کہ تم اس وقت بزی تھیں۔" میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ نجانے اب عابدہ سے متعلق کون سا نیا سانحہ میرے علم میں آنے والا تھا؟

"مسٹر شہزاد! سیٹھ منظور وڑائچ کے انتقال کی خبر سے مجھے بھی شاک پہنچا ہے۔" وہ بولی۔ "عابدہ کا کیس عدالت میں پیش ہونے والا ہے۔ اور اس میں سیٹھ منظور وڑائچ کا پیش ہونا لازمی تھا۔" اس نے وہی کہا جس کا مجھے اندازہ تھا۔

"آپ نے لائر سے اس سلسلے میں کوئی مشورہ تو لیا ہوگا۔ میں نے اسی لیے آپ کو سب سے پہلے اس افسوس ناک خبر سے مطلع کیا تھا۔"

"اُس سے بات کرنے کے بعد ہی میں نے تمہیں فون کیا ہے۔" وہ بولی۔ میں دھڑکتے دل سے اس کی بات سننے لگا۔ "لائر کی کچھ مصروفیات اور عدم دستیابی کے باعث میرا اس سے دیر سے رابطہ ہوا تھا، بہرحال اس نے یہی مشورہ دیا ہے کہ سرمد بابا کی ہلاکت سے عابدہ کا کیس کمزور پڑ سکتا ہے، کیونکہ یہاں کورٹ کے ریکارڈ میں ہمارے لائر نے کیس کے متعلق جواب ڈیٹ دے رکھی ہے اس کے مطابق منظور وڑائچ ہی عابدہ کے سرپرست تھے، اور وہ اُنہی کے ایما پر ہی ان کی ڈاٹر اِن لاء کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ لیکن تم فکر نہ کرو اور جلد سے جلد کسی تیز رفتار کوریئر سروس سے منظور وڑائچ کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کی ایک کاپی میرے ایڈریس پر بھیج دو۔ بلکہ آج ہی بھیج دو۔"

آنسہ کی بات نے میری تشویش بڑھا دی۔ "میں آج ہی یہ کام کر لوں گا مس خالدہ! لیکن اب کیس سے متعلق نئی صورتِ حال کیا ہوگی؟ لائر کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟ آئی مین کوئی اُمید؟"

"مسٹر شہزاد! سب سے بڑی اُمید تو یہ ہے کہ ہماری کوششوں، بہ شمول مسٹر منظور وڑائچ، ہم نے یہ کیس سی آئی اے کی اسپیشل کورٹ میں نہیں جانے دیا، اور اسے نیو یارک سٹی کی لبرل اینڈ اورسیز سوسائٹیز کی عدالت میں دائر کروانے میں کامیاب ہوئے۔ جبکہ باسکل ہولارڈ اب بھی عابدہ کے کیس کو سی آئی اے کی اینٹی ٹیرر کورٹ میں گھسیٹنے کی کوشش میں مصروف ہے، اس سے اس کے عابدہ سے متعلق خطرناک عزائم کا اندازہ ... ہوتا ہے، کیونکہ مذکورہ عدالت میں کیس چلانے کا مطلب امریکا کی خطرناک جیلوں میں سے کسی ایک جیل کی ہوا کھانا تھا۔"

میں آنسہ کی بات پر لرز کر رہ گیا۔ میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ الفاظ میرا ساتھ دینے سے قاصر رہے۔ میری زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی۔ نجانے کتنے پل اسی طرح دم بہ خودی خاموشی میں بیت گئے۔ پھر اُس کی دوبارہ آواز اُبھری۔

"اسی لیے میں اس خدشے کا اظہار کر رہی تھی کہ کیس

کمزور ہونے کی صورت میں کہیں عابدہ کا کیس اینٹی ٹیرر کورٹ میں نہ منتقل کر دیا جائے۔ ڈو یو ہیئر می مسٹر شہزاد؟''
اس نے لمحہ بھر توقف کے بعد آخر میں پوچھا۔

شاید اُس نے میری طویل اور یک ٹک خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے کہ کہیں کال ڈراپ تو نہیں ہو گئی، سوالیہ کہا۔ میں اس سے باتیں کرتے ہوئے نشست گاہ میں آ گیا تھا، اول خیر اور شکیلہ بھی ذرا دیر بعد وہاں آ گئے تھے۔

چونکہ میرے سیل فون کا وائیڈ اسپیکر آن تھا، اسی لیے شکیلہ اور اول خیر بھی میری اور آنسہ کے درمیان ہونے والی دوطرفہ گفتگو کو بہ آسانی سن رہے تھے اور میری کیفیات کو بھی محسوس کر رہے تھے۔ ایسے ہی میں اول خیر نے حوصلہ دینے کے انداز میں میرا کاندھا ہولے سے تھپتھپایا تب میں نے اپنی ہمت مجتمع کرتے ہوئے جواب دیا۔

''جج... جی میں سن رہا ہوں۔ میں اسی لیے آپ سے دریافت کرنا چاہ رہا تھا کہ اب ایسی صورتِ حال میں کیا کیا جاسکتا ہے؟ لائر نے کوئی مشورہ تو دیا ہوگا آپ کو؟''

''میں اسی طرف آ رہی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''میں پہلے بھی تم سے کہہ چکی ہوں مسٹر شہزاد کہ میں اسٹیٹ فارورڈ لڑکی ہوں اور ٹو دی پوائنٹ بات کرتی ہوں۔ تمہیں کسی جھوٹی تسلی میں رکھنا چاہتی ہوں نہ ہی بلند بانگ دعوے کر کے تمہیں کسی مغالطے میں رکھنا میرا مقصد ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میری ساری توجہ تمہاری گرل فرینڈ عابدہ کو سی آئی اے، بالخصوص باسکل ہولارڈ کے چنگل سے چھڑانے میں مرکوز ہے۔ اور میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہی، وہی کچھ کر رہی ہوں جو میرا ''ایم'' ہے۔ مقصد کی بات کی طرف آتے ہیں تو اب بھی ایک حل ہے کہ مسٹر منظور وڑائچ کی ڈاٹر ان لاء (بہو) کو ہی امریکا آنا پڑے گا۔''

میں اس کی بات پر سن ہو کے رہ گیا تھا۔ عارفہ میرے یا عابدہ کے ساتھ کتنی ''مخلص'' تھی، یہ میرے سوا کون جانتا تھا۔ کیونکہ اس حرافہ اور ذلیل عورت نے ہی اپنی گردن... بچانے کے لیے بے چاری عابدہ کو وہاں پھنسوا دیا تھا۔ اب عارفہ سے عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کسی مدد کی اُمید رکھنا بالکل ایسا ہی تھا جیسے بھیڑوں کی رکھوالی کے لیے بھیڑیوں کو چھوڑ دیا جائے۔ کسی سیانے کا قول ہے کہ کبھی بھی اپنے وکیل اور ڈاکٹر سے بھی کوئی بات مت چھپاؤ، آنسہ خالدہ کوئی وکیل یا ڈاکٹر تو نہیں تھی، مگر ایک سچی ہمدرد ضرور تھی۔ اسی لیے میں نے بھی اس سے کچھ چھپانا مناسب نہ سمجھا اور عارفہ کے متعلق سب سچ سچ بتا دیا۔ جسے سن کر چند ثانیوں کے لیے اُسے بھی ایک چپ سی لگ گئی۔ پھر میں نے ہی اس سکوت کو توڑا۔

''اب آپ خود ہی اندازہ کر لیں مس خالدہ! ایسی صورت میں کیا کیا جاسکتا ہے۔''

''پھر تو یہ واقعی ایک گمبھیر مسئلہ بن سکتا ہے مسٹر شہزاد! کیونکہ مسٹر منظور وڑائچ کے بعد اب ایک آخری اُمید عارفہ ہی بچی تھی اور اسی کی گواہی اس لبرل اور ویمنز سوسائٹیز کی کورٹ میں عابدہ کے لیے سود مند ثابت ہو سکتی تھی۔'' آنسہ خالدہ کے لہجے میں پُرمتانت سی تفکیر کو محسوس کر کے میں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''کوئی دوسری راہ یا کوئی ایسی صورت جس میں عارفہ کی گواہی کی ضرورت ہی نہ پڑے؟''

''ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے مسٹر شہزاد؟'' وہ بولی۔ ''شاید پریشانیوں نے تمہارے اعصاب اور ذہن پر خاصا منفی اثر ڈالا ہے۔''

میں اس کی بات پر چپ سا ہو گیا۔ وہ ایسا کچھ غلط بھی تو نہیں کہہ رہی تھی۔ عابدہ کی پریشانی نے تو میرا دماغ ہی ماؤف کر دیا تھا۔ مجھے خاموش پا کر آنسہ خالدہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''آئم ٹیریبلی سوری۔ تم نے میرے اس ریمارکس کا برا تو نہیں منایا مسٹر شہزاد؟''

''قطعاً نہیں مس خالدہ! آپ نے میرے بارے میں بالکل ٹھیک ہی تو ریمارکس پاس کیے ہیں۔ عابدہ کی پریشانی نے واقعی مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا ہے۔ سوچتا ہوں اللہ کے سوا آپ کا سہارا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ آپ جیسی میلوں دور بیٹھی ہمدرد کو میں کیا نام دوں، ماسوائے اس کے کہ آپ کو اپنے اور عابدہ کے لیے ایک فرشتہ ہی کہوں۔''

''پلیز شہزاد! سوری ٹو سے۔ میرا مقصد تمہیں ایموشنل یا دکھی کرنا نہیں تھا۔'' آنسہ بولی۔ ''مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم اور عابدہ کس کرب سے گزر رہے ہو۔ اینی وے میں ایک مشورہ دوں گی۔ اگر تمہارے اور عارفہ کے درمیان ایسا کوئی ہاٹ ایشو نہیں ہے تو تم اُسے کسی طرح اپنے لیے کونونس کرنے کی کوشش تو کرو۔ ممکن ہے بات بن جائے۔ مگر جو بھی کرو ذرا جلدی کرنا۔ اور مجھے بتا دینا تاکہ ہمارا لائر کیس کو نئے انداز سے تیار کر کے کورٹ سے پیشی کی تاریخ لینے کی کوشش کرے۔ اور ہاں! سیٹھ منظور وڑائچ کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ پہلی فرصت میں بھیج دو۔''

عابدہ کی پریشانی میں مجھے اپنے متعلق اس سے کوئی بات پوچھنے کا یارا تک نہ رہا تھا، مگر اول خیر نے جب محسوس کیا کہ میرے اور آنسہ کے درمیان گفتگو اختتام پذیر ہونے والی

ہے تو اس نے فوراً تیکھی آواز میں مجھ سے کچھ کہا۔ یہ وہ استفساریہ جملے تھے، جس میں مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، لیکن میرے ان دونوں ساتھیوں کو اس کی پوری فکر و تشویش تھی، ناچار میں نے اختتامی کلمات کے دوران ہی اس کا بھی مختصراً ذکر کیا تو اس نے اس سلسلے میں مجھے صرف ای میل کے ذریعے ہی معلومات کا تبادلہ کروانے کی تاکید کی تھی۔ اس طرح کی حساس گفتگو اور معلومات کی ترسیل بہم پہنچانے کے لیے آنسہ خالدہ نے اپنی ایک دوسری فیک (fake) میل آئی ڈی sweet@_laday کے نام سے بنا رکھی تھی۔ جو بہ ظاہر ایک فحش ویب کیم سائٹ کی تھی۔ تا کہ اس کی ای میل وغیرہ وہاں امریکی خفیہ اداروں میں ٹریس نہ کی جا رہی ہو۔ جبکہ اپنے اصل نام کی رئیل آئی ڈی جوں کی توں تھی۔

میں نے اثبات میں جواب دے دیا اور ''بیسٹ وشز'' کے ساتھ آنسہ خالدہ نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اول خیر نے مجھے جو چند جملے لکھ کر دکھائے تھے، وہ آنسہ خالدہ سے دریافت کرنا تھا کہ میرے سلسلے میں سی آئی اے کا ایک خصوصی اسالٹ ونگ جس کی باگیں ٹائیگر ٹیگ کے نام سے باسکل ہولارڈ کے ہاتھوں میں تھیں، اپنے خفیہ آپریشن کے لیے وہ کسی بھی وقت پاکستان وارد ہونے والے تھے، اس سلسلے میں تازہ رپورٹس کیا تھیں؟ وغیرہ۔ اگرچہ اول خیر کے ان لفظوں کو میں نے اشاروں کنایوں میں ہی بدل کر آنسہ خالدہ سے پوچھا تھا اور اس نے بھی مجھے اسی انداز میں مختصر ترین جواب دے دیا تھا۔

میں نے فون بے دلی سے ایک طرف صوفے پر پھینک کر، تھکے تھکے سے انداز میں اپنا سر صوفے کی پشت سے ٹکا کر ذرا دیر کے لیے آنکھیں موند لیں۔ چند سیکنڈ اسی طرح گزرے تو اچانک مجھے اپنی شل سماعتوں میں اول خیر کی مخصوص آواز سنائی دی۔

''او خیر کا کے! تو پھر قنوطی ہو رہا ہے؟'' میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور پھیکی سی مسکراہٹ سے ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

''نہیں یار! بھلا تمہارے اور شکیلہ جیسے غم خوار اور جاں نثار ساتھیوں کے ہوتے ہوئے میں مایوس کیسے ہو سکتا ہوں۔ بس ذرا اس نئی صورت حال نے پریشان سا کر ڈالا ہے۔ بھی خواہوں سے مدد لینا کسی حد تک آسان ہوتا ہے مگر بات جب دشمنوں سے مدد لینے کی ہو۔ اور وہ بھی ایسے مار آستین دشمنوں سے جو بغل میں چھری چھپائے ہوئے ہوں تو بات اور ہو جاتی ہے۔''

''حیرت ہے، آنسہ خالدہ کو تم نے عارفہ کے سلسلے میں اچھا خاصا بریف بھی کر دیا تھا، باوجود اس کے وہ مصر ہے کہ ہمیں عارفہ کو اپنے حق میں کنونس کرنا ہوگا۔ اسے کوئی دوسرا حل بھی تو بتانا چاہیے تھا؟'' شکیلہ نے کہا۔

''عابدہ بہن والے کیس میں سرمد بابا مرحوم کے بعد وہ حرافہ عارفہ ہی ایک اہم شخصیت باقی بچی ہے، جو کمزور پڑتے اس کیس میں جان ڈال سکتی ہے۔'' اول خیر نے کہا۔

''تم بتاؤ شکیلہ! اس سلسلے میں کیا واقعی ہمیں عارفہ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے ہوں گے؟'' میں نے ان کی بحث سے بچنے کے لیے فوراً مداخلت کر ڈالی۔ ورنہ تو عارفہ جیسی حرافہ اور مار آستین ناگن کو کون سی بین رام کر سکتی تھی؟ اس پر میں خود بھی غور کر رہا تھا۔

''اس ناگن کو دودھ بھی پلا دو گے، تب بھی اس سے بدلے میں زہر ہی ملے گا۔ ہمیں آنسہ خالدہ سے ہی اس سلسلے میں مدد لینا ہوگی۔'' شکیلہ نے سنجیدگی سے کہا تو اول خیر متانت سے بولا۔

''آنسہ خالدہ ہزاروں میل دور بیٹھی عابدہ بہن اور ہمارے لیے جو کچھ کر رہی ہے، وہ بلاشبہ اس کا ایک اچھا عمل ہے، اور وہ کم نہیں کر رہی، لیکن جو ہمارے کرنے کا کام ہے وہ ہمیں ہی کرنا ہوگا۔ اس پر یہ اضافی بوجھ ڈالنے کا کوئی فائدہ نہیں، کیس کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہمارے مجبور کرنے پر کوئی قدم اٹھا بھی لے گی تو وہ کمزور بھی ثابت ہو سکتا ہے، اور اس کا فائدہ باسکل ہولارڈ کو ہوگا، جو پہلے ہی عابدہ بہن پر دانت نکوسے ہوئے ہے اور اسے عالمی دہشت گردوں کی ساتھی قرار دینے پر تلا بیٹھا ہے، نجانے وہ مردود اس طرح کی ناپاک حرکت کر کے اپنے کون سے مذموم مقصد کی تکمیل چاہتا ہے، تاہم لگتا یہی ہے کہ یہ معاملہ صرف لولووش یا اسپیکٹرم کی دشمنی کا ہی نہیں ہے، اس سے آگے کا بھی ہے۔''

اول خیر کی اس بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ''تم کیا کہنا چاہتے ہو اول خیر؟ ذرا کھل کر بولو۔''

''میرا ایک اندازہ ہے، جو میں نے باسکل ہولارڈ کی ان تفصیلات کی روشنی میں قائم کرنے کی کوشش کی ہے، جو آنسہ خالدہ نے تمہیں اپنی فیک میل ایڈریس سے بھیجی تھیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ''نائن الیون'' کے سانحے کے پیچھے امریکی یا یہودی لابی کے جو ناپاک مقاصد رہے ہوں گے، اس کی راہ ہموار کرنے کے لیے ہی سی آئی اے کا یہ مذکورہ ونگ ٹائیگر ٹیگ، باسکل ہولارڈ کی سرکردگی میں مصروف کار ہے، جو ایک خفیہ ٹاسک کے تحت نائن الیون کا سارا ملبا دنیائے مسلم پر ڈالنا...

چاہتے ہیں، اس کے لیے وہ ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ انہیں دہشت گرد بھی قرار دیے جانے کی پوری کوشش کی جارہی ہے۔ آج کے حالات اس کی بہ عین عکاس ہیں۔'' مجھے اول خیر کی ان باتوں نے ششدر کردیا تھا۔ بے شک یہ باتیں میرے علم میں بھی تھیں جو میں نے ملکی اور غیر ملکی غیر جانبدار مبصرین کے تجزیوں اور نچوڑ سے حاصل کی تھیں۔ لیکن اب تک اول خیر کے بارے میں میرا خیال یہی تھا کہ اس کا ذہن دیسی مار کا تھا اور سوچ بھی اس کی یہیں تک محدود ہوگی، لیکن جس طرح اس نے ان سب باتوں کا احاطہ کیا تھا، وہ قابلِ دید تھیں۔

''تم تو اتنے یقین سے یہ سب کہہ رہے ہو جیسے تمہیں الہام ہوگیا ہو۔'' شکیلہ نے شاید اس کی عالمی بصیرت سے جل کر کہا، تو اول خیر بولا۔

''بی بی! اگر تم ٹی وی پر صرف معاشرے کی عکاسی کے نام پر چلائے جانے والے برگر فیملیز سے اَٹے پڑے، نت نئے ڈیزائن والے ملبوسات اور جدید فیشن کی نمائش کرتے ڈرامے دیکھنے کے بجائے سنجیدگی سے عالمی اخبارات، رسائل اور ڈاکومنٹری کا مطالعہ کرو تو تم بھی بہ آسانی ان سب باتوں کا تجزیہ کرسکتی ہو۔''

میرے حساب سے اول خیر نے اس بار شکیلہ کو زور دار چوٹ دی تھی، میں نے کچھ دیر تک دانستہ خاموشی اختیار کررکھی تھی کہ دیکھوں شکیلہ اسے کیا جواب دیتی ہے؟ درحقیقت میرے نزدیک ان دونوں کے درمیان اس طرح کی بحث ذہنی جمناسٹک کے مترادف تھی۔ بشرطیکہ پٹری سے نہ اُترتی۔ میرا خیال تھا شکیلہ زچ ہوجائے گی۔ لیکن میں نے دیکھا وہ بڑے اعتماد سے مُسکراتے ہوئے بولی۔

''خوشی ہوئی مجھے تمہاری اس بصیرت کے متعلق جان کر۔ ورنہ تو میں اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ تم دماغ کم اور اسلحہ کا زیادہ استعمال کرتے ہو۔ باقی تمہاری اطلاع کے لیے بتادوں کہ جس طرح کی تم بصیرت رکھتے ہو، وہ اب پرانی ہوچکی ہے، نائن الیون کے درپردہ امریکا یا اس کے اندر گھسی بیٹھی مستحکم دشمن لابی کے اصل مقاصد کیا تھے، اس سے اب ملکی سطح پر ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی آگاہی ہوچکی ہے۔ اگرچہ یہ پوری ڈکلیئر نہیں ہوگی، ہاں اب ایک سرد جنگ ضرور چھڑ چکی ہے، ان دو گروہوں کے درمیان، جو اپنے اپنے طور پر اس عالمی واقعے کو سچ یا جھوٹ قرار دینے پر تُلے ہوئے ہیں، اور اس کی دلالت میں اپنے اپنے طور پر ثبوت پیش کرنے کے لیے کوشاں بھی رہتے ہیں، ایک وہ گروہ جو اس واقعے کو ایک گھناؤنی سازش اور خود ساختہ قرار دینے کی جدوجہد میں ہے، اس کی نمائندہ تم آنسہ خالدہ کو بھی کہہ سکتے ہو، اور دوسرا وہ گروہ ہے جو اسے واقعی ایک ناپاک سازش کے تحت مسلم دنیا پر تھوپنا چاہتا ہے، اس کا نمائندہ تمہیں امریکی نژاد یہودی باسکل ہولارڈ کی شکل میں بہ آسانی نظر آسکتا ہے۔ بلکہ اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو درحقیقت یہی لابی اس واقعے میں زیادہ ملوث محسوس ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ باسکل ہولارڈ کا گروہ اسے سچ ثابت کرنے کے لیے ہر طرح کے اُوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا اسی سبب تمہارے ذہن میں ابھی تھوڑی دیر پہلے بے اختیار یہ خیال آیا تھا کہ عابدہ کا معاملہ لولووش اور اسپیکٹرم سے آگے کا ہے۔''

میں بے اختیار فخریہ انداز میں مسکرایا۔ میرے دونوں ساتھی ذہنی فراست میں کم نہیں تھے۔ میں نے تالی بجا کر دونوں کی حوصلہ افزائی کرنا ضروری سمجھا اور سنجیدگی سے موجودہ مسئلے کی طرف آتے ہوئے بولا۔

''تم دونوں کی باتوں کی روشنی میں آخری فیصلہ یہی طے پاتا ہے کہ عارفہ والا معاملہ ہمیں ہی دیکھنا ہوگا اور اس میں تاخیر کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے لیے مجھے خود عارفہ سے ایک ملاقات کرنا ہوگی۔''

میں ان دونوں کی سنتا ضرور تھا، مگر آخری اور حتمی فیصلہ میرا ہی ہوتا تھا۔ جو عموماً انہی کے مشوروں کی روشنی میں ہی ہوتا تھا۔ ان دونوں نے اگرچہ میرے فیصلے پر اثباتی انداز کی خاموشی تو اختیار کرلی تھی لیکن ان کے چہرے پر جھلکنے والے اضطراب کا خود میں بھی شکار تھا۔ آخر اس اہم، حساس اور نازک ترین معاملے میں عارفہ جیسی ناگن کو کیسے رام کیا جاسکتا تھا؟ یہ کوئی ایسا معاملہ بھی نہ تھا کہ عارفہ کی کنپٹی پر گن رکھ کر زور زبردستی سے کروالیا جاتا۔ اس میں مکمل طور پر عارفہ کی دیانتداری اور خلوص کی ضرورت تھی، اور اس جیسی ناگن سے ایسی توقع رکھنے کو میں دنیا کا احمقانہ ترین کام سمجھتا، جسے مجھے بہرحال کرنا تھا۔

اُصولی طور پر اگر دیکھا جاتا تو اخلاقی طور پر عارفہ کو خود ہی اپنی محسنہ عابدہ کی مدد کے سلسلے میں پہل کرنی چاہیے تھی، مگر وہ بھی ایسا نہیں کرتی، اس ناگن کو جھکانے کے لیے میرے ذہن میں ایک خیال کلک ہوا تھا۔ ''ڈیل۔''

''لیکن ہم عارفہ کو کس طرح اس پر راضی کریں گے؟ وہ ہم پر پہلے ہی اُدھار کھائے بیٹھی ہے۔'' حتمی فیصلہ کرنے کے بعد شکیلہ نے اس کے مضمرات پر روشنی ڈالتے ہوئے

کہا۔

''ڈیل ....'' میں گمبھیر لہجے میں مختصراً بولا۔

''ڈیل۔''

''ہاں! مجھے عارفہ سے ایک ڈیل کرنا ہوگی، ایک سودا۔'' میں نے پُرغور سے انداز میں کہا۔ ''وہ زہریلی ناگن ایک کاروباری ذہن بھی رکھتی ہے اور اس کی کمزوری اس کی لالچی فطرت ہے۔ میں اس کی اسی کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کروں گا۔''

''او خیر کا کے! کہیں تم اڑیسہ کمپنی کے شیئرز تو اس کے حوالے نہیں کرنا چاہتے؟''

میری توقع کے عین مطابق اول خیر نے بالکل درست اندازہ لگایا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں اس سے متعلق بہ خوبی آگاہ تھے۔ میں نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی تو شکیلہ نے فوراً ایک تکلیف دہ حیرت سے کہا۔ ''شہزی! تت... تو کیا تم اڑیسہ کمپنی کے شیئرز اس کے حوالے کردو گے؟''

''ہاں! عابدہ کی رہائی کی خاطر اور اسے مصیبت کی اس گھڑی سے نکالنے کے لیے میں اس جیسے لاکھوں مالیت کے شیئرز بھی اس ناگن کے حوالے کرسکتا ہوں۔'' میں نے مضبوط اور مستحکم لہجے میں کہا۔ ''یوں بھی اُصولی طور پر میں نے کبھی بھی خود کو ان شیئرز کا مالک نہیں سمجھا، آج سوچتا ہوں تو مجھے خدا کی اس مصلحت پر حیرت محسوس ہوتی ہے کہ شاید اسی دن کے لیے سرمد بابا ان شیئرز کی پاور آف اٹارنی اور خودمختاری میرے سپرد کر گئے تھے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے شہزی کہ عابدہ بہن کے سامنے ان شیئرز کی کوئی حیثیت نہیں ہوسکتی، بلکہ دنیا کی ساری دولت ہی ہیچ ہے، مگر اس کا کیا ثبوت ہوگا کہ اس ڈیل کے نتیجے میں عارفہ وہی کرے گی جو ہم چاہیں گے؟ وہ ہمیں دھوکا بھی دے سکتی ہے اور اس کا نتیجہ عابدہ کے لیے خدانہ خواستہ بہت خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔''

شکیلہ نے کہا تو اس کے اس خدشے کی توثیق اول خیر نے بھی کر ڈالی، وہ پُرتشویش لہجے میں بولا۔ ''کوئی بعید نہیں کہ وہ وہاں جاکر ہمارے دشمنوں سے ہم سے زیادہ منفعت والی ڈیل کرلے اور عابدہ بہن... نن... نہیں... نہیں شہزی کا کے! ہمیں اس سلسلے میں بہت سوچ سمجھ کو کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔ کہیں یہ ڈیل یا یہ سودا ہمارے لیے آ بیل مجھے مار والا نہ ثابت ہوجائے۔ اگر ہم یہ مقدمہ ہار گئے تو ہمیں اس کے بہت ہی خطرناک نتائج بھگتنا پڑجائیں گے۔''

اول خیر خاصا متوحش سا نظر آنے لگا تھا اور اس سے زیادہ میں خود بھی انہی اندیشناک وسوسوں اور خدشات کا شکار تھا۔ لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ لہٰذا میں نے کہا۔

''دوستو! انسان کی زندگی تو خود ایک رسک سے عبارت ہے، اس کا کیا بھروسا، مگر ایک اُمید کے سہارے ہم اس زندگی کو گزارتے ہیں۔ ہمیں یہ رسک بہرحال اُٹھانا ہی پڑے گا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں، ہاں یہ سوچا جاسکتا ہے کہ اس ڈیل کے تحفظات کیا ہونے چاہئیں، وہ ہم عارفہ سے ڈسکس کرکے اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے کا کے! میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا...'' اول خیر نے فوراً کہا۔ شکیلہ نے ایک اور بات کی طرف ہماری توجہ مبذول کروائی۔

''یہ ڈیل تو ہوتی رہے گی۔ پہلے ہمیں سرمد بابا کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ آنسہ خالدہ کو امریکا روانہ کرنا ہوگا۔ وہ کہاں ہے ہمارے پاس؟'' شکیلہ کی بات پر میں نے کہا۔

''اس سلسلے میں پہلے میرا ارادہ یہی تھا کہ متعلقہ اسپتال سے نکلوالیں گے مگر وہ شاید ڈپلی کیٹ ہوتا، جبکہ اوریجنل سرٹیفکیٹ عارفہ کے پاس ہی تھا، کیونکہ اسپتال سے سرمد بابا کی ڈیڈ باڈی اُسی نے وصول کی تھی، اس سلسلے میں بھی اس سے بات کرلیں گے۔''

''ویسے کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ تمہارے قانونی طور پر شیئرز کے مالک بننے کے بعد عارفہ اس قدر آرام سے بیٹھی رہی، اس کی نیندیں حرام ہوجانی چاہئیں، مگر اس نے اس سلسلے میں اب تک تم سے کوئی رابطہ بھی نہیں کیا؟''

شکیلہ نے اپنے تئیں ایک اہم بات کی تھی۔ میں نے کہا۔ ''وہ شاید اپنی اس شکست پر حد سے زیادہ مایوسی کا شکار ہوگئی ہے، کیونکہ مجھ سے تو اُسے قطعاً یہ اُمید نہ ہوگی کہ میں بڑے آرام سے اُسے پلیٹ میں سجا کر شیئرز پیش کردوں گا۔''

بہرحال چائے کا ایک ایک کپ پی کر میں اور اول خیر کوارٹر سے روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگے، اس دوران میں نے عارفہ کو ایک عدد فون کھڑکانا ضروری سمجھا، رابطہ ہوتے ہی اس نے میری آواز پہچان کر تحیّر آمیز لہجے میں کہا جس میں طنز کا ایک مکارانہ تیر بھی پوشیدہ تھا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ سارے شیئرز چالاکی سے ہتھیانے کے بعد تمہیں مجھ کو فون کرنے کی ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔''

''ہاں! اُصولاً تو بات کی ابتدا آپ کو کرنی چاہیے تھی،

اور میں تو آپ کے فون کا انتظار ہی کرتا رہ گیا۔'' میں نے بھی کمالِ مکاری سے دانستہ گیند اس کی کورٹ میں اُچھال دی، تو وہ اس بار واقعی حیرت سے بولی۔

''اچھا! تمہیں واقعی میرے فون کا انتظار تھا؟ مگر کیوں؟'' وہ ایک تجسس آمیز اُلجھن کا شکار ہوگئی۔

''میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ شیئرز واپس لینے کے لیے مجھے کسی بھاری ڈیل کی آفر کریں گی۔'' میں نے لہجے کو معنی خیز بناتے ہوئے کہا تو چند ثانیے کے لیے اُسے ایک چپ سی لگ گئی، شاید اسے مجھ سے ایسی کسی ''معنی خیز'' بات کی توقع نہ تھی۔ گویا میرے خلوص اور نیک نیتی سے میرے دُشمن بھی اچھی طرح واقف تھے اس کا مجھے آج پتا چلا تھا۔

''کیا ہوا؟'' اس کی طویل پڑتی خاموشی پر میں نے اُسے مختصر الفاظ کا ٹھوکا دیا۔

''کک... کچھ نہیں، وہ دراصل میں تمہاری طرف سے مایوس ہوگئی تھی، اُمید نہیں تھی مجھے کہ تم کبھی مجھ سے کسی قسم کا رابطہ کر سکتے ہو۔''

''غلط'' میں نے کہا۔ ''جب تک عابدہ خیریت سے واپس نہیں آجاتی، میرا آپ سے ویسے بھی رابطہ نہیں ٹوٹ سکتا۔ کمال ہے یہ خوش فہمی آپ کو کب اور کیسے ہوگئی؟'' وہ چنڈال میرے دُکھی لہجے میں پوشیدہ ایک خاص قسم کی تہدید کو بھانپ کر بولی۔

''دھمکی مت دو مجھے، میں شیئرز اور ڈیل کے حوالے سے بات کررہی تھی۔''

میں نے بھی کم از کم اس وقت اس بات کو طول دینا مناسب خیال نہیں کیا اور اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ''شیئرز واپس حاصل کرنے کے لیے آپ مجھ سے کیا ڈیل کرنا پسند کریں گی؟''

''مجھے یقین نہیں آرہا۔'' اس پر جیسے شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ ''تم... تم اگر واقعی مجھ سے شیئرز کے بدلے میں کوئی ڈیل کرنا چاہتے ہو تو... اسی وقت ساری باتیں بھلا کر میرے پاس آجاؤ۔ مجھے یقین ہے، اگر بات اس نہج پر آہی گئی ہے تو ہمارے درمیان بھی بغیر کسی ڈیڈ لاک کے کوئی نہ کوئی ڈیل کامیاب ہو ہی جائے گی۔''

اُس کا چلتر کسی جادو کی طرح سر چڑھ کے بولنے لگا۔ اس کے لب و لہجے سے مترشح لالچ، دولت اور حرص و طمع کی بے پناہ بھوک نے میرے اندر کے مضطرب اندھیاروں میں اُمید کی ٹمٹماتی لو کو فزوں تر کردیا تھا۔ اور مجھے اس سے کسی کامیاب ڈیل کی توقع ہونے لگی تھی۔

''ڈیٹس گڈ، آئی ول بی دیئر۔'' یہ کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کردیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی میں اور اول خیر عارفہ کی رہائش گاہ کی طرف محوِ سفر تھے۔ کار کے اس مختصر سے سفر کے دوران میں ہم نے اس منصوبے پر بھی تبادلۂ خیال کیا تھا جو خالصتاً اول خیر کے زرخیز ذہن کی پیداوار تھا، جس کے مطابق ہم نے عارفہ یا سیٹھ نوید احمد سانچے والا کو ''تھرڈ پرسن'' بنا کے ان میں سے کسی ایک یا دونوں کے ساتھ رنگون جا کر اڑیسہ کمپنی کے سلسلے میں سودے بازی کرنا تھی اور کسی طرح لولووش کی بیوی انجیلا کو اغوا کر کے، باسکل ہولارڈ پر عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں دباؤ ڈالنا تھا۔ مگر قدرت نے یہاں ہمارا کام قدرے آسان کردیا تھا، اور کسی لمبے چوڑے بکھیڑے میں پڑنے سے بھی بچالیا تھا۔ لہٰذا ہم نے اس منصوبے کو ''پلان بی'' کا نام دے کر سرِدست پسِ پشت ڈال دیا تھا کہ پہلے یہ قانونی طریقہ اختیار کر کے دیکھ لیا جائے، جو نسبتاً سہل اور اُمید افزا بھی تھا۔

عارفہ کی رہائش گاہ سے ابھی ہم ایک آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہی تھے کہ میرا سیل فون گنگنایا۔ سیل فون پر ایک اجنبی نمبر دیکھ کر میری پیشانی پر شکنیں سی نمودار ہوگئیں۔ اسکرین پر ابھرنے والے نمبرز کے ابتدائی ڈیجیٹ سے اندازہ ہوا کہ کال بیرونِ ملک سے تھی، پہلا خیال میرا آنسہ خالدہ کی طرف ہی گیا تھا، وہ کسی بھی نمبر سے مجھے کال کرسکتی تھی، اگرچہ اس کا نام بھی ڈسپلے میں نمایاں ہوتا تھا، لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تھا، کال باہر کی ہوتی مگر نمبر لوکل بھی شو ہوتا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل سے فون کان سے لگا کر ہیلو کہا تو دوسری جانب ایک بھاری مردانہ آواز سن کر میں چونکا۔ یہ آواز میرے لیے سراسر اجنبی تھی۔ لہجہ ہندی اردو تھا۔

''شہزاد احمد خان؟'' مجھ سے استفسار یہ کہا گیا تو میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے پوچھ لیا۔

''یس! آپ کون۔'' میرے استفسار پر دوسری جانب خاموشی طاری رہی، اس کے بعد وہی گمبھیر سی بھاری آواز ٹکرائی۔

''مسٹر شہزاد... ولد... تاج دین شاہ فرنٹیئر پوسٹ واچ مین! یہی ولدیت ہے ناں تمہاری؟'' میں جیسے سُن ہو کر رہ گیا۔ بھلا میں اس نام اور اس کے اس عظیم حوالے کو کیسے بھلا سکتا تھا۔ یہی تو میری اور میرے خاندان کی شناخت تھی۔ باپ کے ذکر نے میرے اندر ایک کھلبلی سی مچادی تھی، اول خیر نے میری کیفیت اور کال کی ''نوعیت'' بھانپ کر کار کی رفتار

حد درجہ آہستہ کردی تھی۔

کال کرنے والے اس اجنبی نے مجھے میری ولدیت سمیت مخاطب کیا تھا۔ وہ یقیناً مجھ سے میرے کھوئے ہوئے باپ سے متعلق ہی گفتگو کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اثبات میں جواب دیا۔

''ہاں... ہاں... یہی میری ولدیت ہے، تاج دین شاہ میرا باپ تھا۔ تت... تم کون ہو؟ کیا تم میرے باپ کے بارے میں جانتے ہو؟''

''اُسے تو ہم نجانے کتنے عرصے سے جانتے آرہے ہیں۔ اور وہ ہمارا ہی مہمان ہے۔'' دوسری جانب عجیب سے لہجے میں کہا گیا تو یکایک میرے ٹھٹکے ہوئے وجود میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی، اور میں نے اپنے ایک ہاتھ سے اول خیر کو مخصوص اشارہ کرتے ہوئے اپنے سیل کا وائیڈ اسپیکر آن کردیا، تاکہ اول خیر بھی گفتگو سُن سکے۔ اس نے میرا اشارہ بھانپتے ہی کار سڑک کے کنارے روک دی تھی۔

''تم آخر ہو کون؟ دوست یا دُشمن؟'' میں نے بالآخر اپنی دگرگوں سی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے گہری متانت سے پوچھا۔

''ہم نہ دوست تھے نہ دُشمن، لیکن ہماری دُشمنی سے ہمارے دوست بھی پناہ مانگتے ہیں۔ تم نے ہمارے ساتھ دُشمنی کرکے سراسر گھاٹے کا ہی سودا کیا ہے۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولا اور میں نے اس کی آواز پہچاننے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے، دل ہی دل میں یہ اندازہ قائم کرنے کی کوشش کی کہ آخر یہ کون میرا نیا دُشمن پیدا ہوگیا تھا؟ تاہم میں اس کے مزید بولنے کا منتظر رہا، اور وہ تھوڑے توقف کے بعد بولا۔

''بس! کچھ لو اور کچھ دو کے تحت بات ختم ہوجائے تو یہ ہمارے بیچ ایک بہترین معاہدہ قرار پاسکتا ہے۔'' اس کے ٹھہرے اور دبے دبے سے لہجے میں مجھے مکاری کی جھلک نمایاں طور پر محسوس ہوئی تھی۔ میں نے جواباً اسی انداز میں مختصراً کہا۔

''میں سُن رہا ہوں۔''

''ہمارے آدمی کے ساتھ تم نے اچھا نہیں کیا۔ خیر! جب معاہدے کی ہی بات ہورہی ہے تو ہم بھی دوستانہ طریقہ ہی اپنائیں گے۔''

''تمہارا آدمی؟ کون؟'' میں نے اُلجھ کر سوالیہ کہا۔

''سندر داس سکینہ۔'' اس نے بالآخر بتایا اور میری سماعت کے قریب جیسے بم پھٹ گیا ہو۔ سب سے پہلا خیال اس شخص کے متعلق میرے ذہن میں کلک ہوا تھا، وہ بلیو ٹلسی کے چیف کرنل سی جی بھجوانی کا تھا۔ میں نے اب تک خود کو کافی سنبھال لیا تھا اور تیزی سے کام کرتے ذہن میں جو پہلا خیال اُبھرا، اس کے تحت میں نے انجان بن کر کہا۔

''سندر داس سکینہ؟ کون ہے یہ؟ اور میرا بھلا اس سے کیا تعلق؟ اور تم نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کروایا۔'' یہ کہتے ہوئے میں اب تک اس بات کا اندازہ قائم کرچکا تھا کہ وزیر جان نے گویا چھوٹتے ہی بلیو ٹلسی کے چیف کرنل سی جی بھجوانی سے رابطہ کرکے اُسے بڑی صراحت کے ساتھ میرے اور میری تازہ کار ''مہم جوئی'' کے بارے میں آگاہ کردیا ہوگا، بعدازاں دونوں کے درمیان مزید گٹھ جوڑ بھی پا گیا ہوگا کہ مجھے کیسے گھیرا جائے، اور میرا نمبر بھی اسی نے ہی دیا ہوگا، یوں بھی میرے نمبر کا حصول میرے دُشمن کے لیے ناممکن کب رہا تھا؟

''اگر تم نے میرے ساتھ یہی بھونڈا مذاق کرنا ہے تو پھر تم سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، ہم اپنے ساتھی سندر داس کی رہائی کا دوسرا طریقہ بھی آزمانے کا آپشن رکھتے ہیں، مگر تمہارا باپ...'' اس خبیث نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو میں یہی سمجھا شاید وہ بددل ہوکے رابطہ منقطع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، میں فوراً مستفسر ہوا۔

''تم بلیو ٹلسی کے کرنل سی جی بھجوانی بات کررہے ہو؟''

''مجھے پوری اُمید تھی کہ تم پٹری پہ آجاؤ گے اور بغیر وقت ضائع کیے معاملے کی بات کرنے پر آمادہ ہوجاؤ گے۔'' وہ فوراً مکارانہ لہجے میں بولا، اس کا لہجہ فتح کا تاثر لیے ہوئے تھا۔ وہ کم بخت میری ازلی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مجھے واقعی اپنے اصل ٹریک پر لے آیا تھا۔

''اب تم وقت ضائع کررہے ہو۔ کیا تمہارے بارے میں میرا اندازہ درست نہیں؟''

''سو فیصد درست اندازہ لگایا ہے تم نے۔ مجھے کرنل سی جی بھجوانی کہتے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''اگر معاملے کی بات پر آتے ہیں تو ہم آپس میں کچھ لو اور کچھ دو کے تحت معاملہ داری طے کرسکتے ہیں۔''

''منظور ہے مجھے، آگے بولو۔'' میں نے فوراً کہا۔ یہ حقیقت جان لینے کے بعد کہ اس وقت بلیو ٹلسی کا کرنل سی جی بھجوانی مجھ سے مخاطب تھا، میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ مجھے جلد از جلد میرے باپ کے متعلق بتائے کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے؟

''دیکھو، مسٹر شہزاد! ہم جانتے ہیں کہ تمہارا پاکستان کے کسی قانونی یا خفیہ ادارے سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے، تم حادثاتی طور پر یا پھر اپنی کسی غرض اور مدد لینے کے لیے رضا کارانہ بھرتی کر لیے گئے ہو۔ پاکستانی خفیہ اداروں کا ہمیشہ سے یہی وتیرہ رہا ہے، وہ اپنے خفیہ مقاصد کی برآری کے لیے ایسے سویلین کو بھی نیڈی ایجنٹ بنا کر اپنے ساتھ شامل کرنے میں کوئی آر محسوس نہیں کرتے، جو ان کے لیے ڈیلی ویجز پر مخبری کر سکیں، انہیں صرف اپنے مفادات عزیز... ہوتے ہیں، جو پورے ہو جانے کے بعد اپنے ایسے ڈیلی ویجز مخبروں کو خاموشی اور رازداری کے ساتھ غائب کر ڈالتے ہیں۔ لہٰذا میرا تمہارے لیے سب سے پہلا مشورہ تو یہی ہے ہوگا کہ تم اگر یہی کام کسی دوسرے ملک کے لیے کرو تو تمہیں نہ صرف پورا تحفظ حاصل ہوگا بلکہ عیش و آرام اور دولت بھی ملے گی۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تم ایک معمولی کوارٹر میں رہتے ہو، ایک معمولی تنخواہ پر گزارا کرتے ہو۔ خیر! یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ اب بولو تو کام کی بات پر آجائیں؟'' اس نے آخر میں کہا۔

میں اس کی بکواس کو بہ ظاہر خاموشی سے سنتا رہا۔ را کا یہی طریقہ کار تھا، وہ اسی طرح برین واش کرتے تھے۔ ورنہ اس نے پاکستانی خفیہ اداروں کے متعلق جو بکواس کی تھی وہ صریحاً گمراہ کن اور غلط تھی۔ میں کوئی نیڈی ایجنٹ تھا، اور نہ ہی اپنی کسی ذاتی ضرورت کے تحت پاور میں ہیلپر یا والینٹرلی بھرتی ہوا تھا۔ بلکہ یہ ایک جذبہ تھا میرا اپنے وطن کی خدمت کا اور اس کی جڑوں کو کھوکھلی کرنے والے ملک دشمن عناصر کے خلاف کمر بستہ ہونے کا۔ جس کی مثال میرا باپ تھا۔ جس نے آج سے کئی برس پہلے دشمن ملک کے جاسوس کا اپنی جان پر کھیل کر تعاقب کیا اور اس کا منصوبہ خاک میں ملا دیا تھا۔ مگر خود گرفتار ہو کر ابھی تک وطن کے ایک گمنام سپاہی کی طرح دشمن ملک میں ایک قیدی کی صعوبتیں جھیل رہا تھا۔ اس نے صحیح معنوں میں اپنے وطن کے لیے قربانی دی تھی، خود کو ہی نہیں اپنے گھر بار کو بھی قربان کر ڈالا تھا، ان سے ایک طویل جدائی برداشت کی تھی، بلکہ ابھی تک کر رہا تھا۔ باقی رہی کرنل سی جی کی بکواس، اور مجھے برین واش کرنا، یہ تو ان کے چانکیہ پلان کا ایک حصہ ہی تھا۔ یہ ہمیشہ ضمیر فروشوں اور وطن فروشوں کو اپنے چانکیہ پلان کے تحت نشانہ بناتے تھے، میں نے بھی کسی جوش و جذبے کا مظاہرہ کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا کہ یہ میری ماسٹر ٹریننگ کا حصہ تھا کہ دشمن کو کیسے بلف کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ابھی مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ بلیو ٹلسی کے گھاگ چیف کرنل سی جی بھجوانی کو بے وقوف بنا سکتا ہوں۔ لہٰذا وہ مجھے اپنے جیسا سمجھ رہا تھا، میں نے بھی اس کی اسی ''سمجھ'' کو مزید پختہ کرنے کے لیے وہ کچھ کہنا مناسب سمجھا، جیسا کہ وہ میرے بارے میں اندازہ قائم کیے ہوئے تھا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ میرے بارے اس طرح کی تفصیل اسے وزیر جان سے ہی حاصل ہوئی ہوگی۔ لہٰذا میں نے اس کی بکواس سننے کے بعد دانستہ تھوڑی دیر کے لیے پُرسوچ خاموشی اختیار کی تھی، جیسے میں اس کے ٹرانس میں آرہا ہوں۔ تاہم پھر بولا۔

''یہ حقیقت ہے کہ میری یہاں کچھ لوگوں سے ذاتی نوعیت کی جنگ پہلے ہی سے جاری تھی، چوہدری ممتاز خان اور وزیر جان میرے دو ازلی دشمن تھے، مگر وہ مجھ سے اثر و رسوخ اور طاقت میں کہیں زیادہ تھے، میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، لیکن اسی جنگ کے دوران میں مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ وزیر جان کے پیچھے یہاں کے خفیہ ادارے بھی پڑے ہوئے تھے، بس اسی وجہ سے مجھے اپنی طاقت بڑھانے اور ان کی مدد حاصل کرنے کے لیے مجبوراً شامل ہونا پڑا۔ کیونکہ ابھی ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت حاصل کیے بنا یہ لوگ وزیر جان وغیرہ پر براہِ راست ہاتھ ڈالنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، اسی لیے میری پشت پناہی کرتے ہوئے، انہوں نے مجھے ہی آگے رکھا تھا۔''

وہ مجھے جیسا سمجھ رہا تھا، میں نے بھی اسے وہی بتا دیا اپنے بارے میں۔ اس پر اس نے میری توقع کے عین مطابق ایک فاتحانہ قہقہہ بلند کیا تھا۔ اور پھر اسی غرور تلے بولا۔ ''ہماری انفارمیشن کبھی غلط نہیں ہوتی ہیں۔''

میں نے دل ہی دل میں اس پر بے شمار لعنتیں رسید کیں پھر اصل بات کی طرف آتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''تم میرے باپ کے متعلق مجھے بتا رہے تھے۔''

''تمہارا باپ زندہ ہے، اور ہماری قید میں ہے۔ وہ بہت ضعیف ہو چکا ہے، اب تو وہ کسی کو شاید پہچاننے کے قابل بھی نہیں رہا اور نہ ہی اسے اپنا ماضی یاد ہے اچھی طرح، اس لیے وہ اب ویسے بھی ہمارے کام کا نہیں رہا۔''

اس انکشاف پر میرے پورے وجود میں کرب کی ایک لہر سی دوڑ گئی، اپنے باپ سے متعلق دُکھ بھری اطلاع نے مجھے رنجور سا کر دیا تھا۔ حلق میں رقت سی اُترنے لگی تھی، اس خبیث کرنل سی جی بھجوانی کے خلاف میرے دل و دماغ میں نفرت و غیظ کی ایک آگ سی سلگ اٹھی تھی، جی میں تو میرے آئی کہ اسی وقت اس کی بکواس اور اس لغو بیانی کا

جواب دے ڈالوں جو اس نے پاکستان کے خفیہ اداروں کے بارے میں کی تھی۔

''کہ اے خبیث انسان! تیری اس بکواس کا جواب میرا باپ ہے، جس نے اپنے وطن کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر ڈالا۔ اور تم اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے، وہ تو ایک گمنام سپاہی کی طرح اپنے وطن کی خدمت کرتا رہا، بغیر کسی صلے کے لالچ میں وہ دشمن ملک میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہا ہے اور سُرخرو ہے۔ اے ذلیل انسان! یہ صرف میرے ایک باپ کی مثال نہیں ہے۔ میرے وطن کا ہر خاص و عام پاکستانی جس کا دل وطن کے لیے دھڑکتا ہے، وہ بھی اپنے ملک کی خاطر اس سے بھی بڑی قربانی جھیلنے کے لیے خوشی خوشی اور ہر دم تیار رہتا ہے۔''

بہر طور میں اپنے سینے کے مچلتے طوفانوں کی اٹھل پر قابو پاتے ہوئے بہ ظاہر پُرسکون لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''اُسے تم نے کس جُرم کے تحت اتنے طویل عرصے سے اپنی قید میں رکھا ہوا ہے؟''

''بس! باقی باتیں تم خود اس سے پوچھ لینا۔'' اس نے مکاری سے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ اتنی آسانی سے اپنی زبان نہیں کھولے گا، اتنا بھی اُس خبیث نے میرے باپ کے بارے میں بتایا تھا تو اس میں بھی اس کی مجبوری ہو گی، پھر مجھے تسلی تھی کہ اس وقت معاہدے کی زیادہ ضرورت اسے محسوس ہو رہی تھی، اور اس کی اسی ''ضرورت'' کو ہوا دے کر ہی اس کے منہ سے مزید تھوڑا بہت اُگلوایا جا سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے بھی چالاکی سے کہا۔

''لیکن جب تک میری تسلی نہیں ہو گی تو یہ معاہدہ کیسے طے پا سکتا ہے؟ جبکہ میں اپنے باپ سے متعلق وزیر جان کی زبانی بہت کچھ جان اور سن چکا ہوں کہ وہ ابھی تک تم لوگوں کے لیے کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔''

''تم کیسی تسلی چاہتے ہو؟'' بالآخر اسے یہ کہنا ہی پڑا، جس کا میں متمنی تھا، لہٰذا اپنے لہجے میں بہ ظاہر بے اعتنائی سموتے ہوئے بولا۔

''تم نے ابھی مجھ سے کہا کہ میرا باپ اب تم لوگوں کے کام کا نہیں رہا اور تم مجھ سے ایک معاہدے کے تحت اُسے میرے حوالے کرنے پر رضامند بھی ہو، مگر میں سمجھتا ہوں کہ میرے باپ کو تم لوگ کبھی بھی نہیں چھوڑو گے۔ ایک طویل عرصے سے وہ تم لوگوں کی قید میں ہے، تو یقیناً تمہارے لیے اہم ہی ہو گا۔''

''وہ اب واقعی ہمارے لیے اہم نہیں رہا، میری بات کا وشواش کرو۔''

''جب تک مجھے اس کے جرم، جو تمہاری نظروں میں ہو سکتا ہے، کے متعلق آگاہی نہیں ہو گی میں کیسے یہ اندازہ لگا پاؤں گا کہ وہ تم لوگوں کے لیے اب بھی اہمیت رکھتا ہے یا نہیں؟''

''ٹھیک ہے، پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' بالآخر وہ شکست خوردہ سے لہجے میں بولا۔ میں نے پہلا سوال یہ کیا کہ ان کی نظر میں میرے باپ کا جرم کیا تھا تو وہ بولا۔

''جرم تو اس کا خیر معمولی نہیں تھا۔ اس نے ہمارے ایک نہایت اہم جاسوس کو عین اس وقت جان سے مار ڈالا تھا، جب وہ اپنا مشن کامیابی سے پورا کر کے اٹاری کے مقام پر پہنچا تھا۔ خیر! اب کیا فائدہ ان باتوں کا۔''

اس نے ایک بار پھر پہلوتہی کرنی چاہی مگر میرے اندر اس برسوں پرانے راز پر سے پوری طرح جان کاری حاصل کرنے کا ازلی تجسس کم نہ ہوا، میں جاننا چاہتا تھا کہ میرے باپ نے جو قربانی دی تھی، اس کا حاصل کیا ہوا تھا؟ کیونکہ رینجرز کے ہیڈ کوارٹر کے ریکارڈ روم میں مجھے میرے باپ تاج دین شاہ کی جو فائل ملی تھی، اس میں بھی کچھ معلومات ابہام کا شکار تھی کہ میرا باپ ایک دشمن ملک کے خطرناک جاسوس کے تعاقب میں گیا تھا جو ایک خطرناک ملکی راز اُڑا لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا، لیکن اس کے بعد اس راز سے متعلق آج تک ایسا کوئی نقصان وطنِ عزیز کو نہیں جھیلنا پڑا تھا، جس کا مطلب لامحالہ یہی لیا گیا تھا کہ فرنٹیئر واچ مین تاج دین شاہ نے اس دشمن جاسوس کا کامیاب تعاقب کر کے اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا، مگر خود بھی نہیں لوٹا تھا۔ لہٰذا میں نے اس سلسلے میں اس کا منہ کھولنے کے لیے کہا۔

''مجھے حیرت تو اس بات پر ہے کہ اگر تمہارا وہ جاسوس بہ قول تم لوگوں کے اپنے مشن میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن میرے باپ کے ہاتھوں قتل بھی ہو گیا تھا تو پھر تم نے ابھی تک میرے باپ کو زندہ کیوں رکھا ہوا تھا؟ اس پر قتل کا مقدمہ بنا کے...'' آگے مجھ سے نہ بولا گیا، دُکھ کا ایک غبار سا میرے سینے میں اُٹھنے لگا تھا، تب وہ خود ہی بول پڑا۔

''اگر تمہارا باپ ہمارے اس جاسوس کو ہلاک نہیں کرتا تو بہت پہلے جب تمہارا ملک ہماری سازشوں سے دولخت ہوا تھا، تو اس مشن کی کامیابی کے بعد اس کا لخت لخت ہو جانا بھی لازمی تھا۔ مگر افسوس تمہارے باپ نے نہ صرف ہمارے جاسوس کو ہلاک کر دیا بلکہ اس کے قبضے سے وہ راز بھی اُڑا کر زائل کر دیا تھا، جو ہمارے لیے اہم حیثیت رکھتا

تھا۔ بعد میں ہم نے ہر طرح سے کوشش کی لیکن تمہارے باپ نے کچھ بھی اُگل کے نہیں دیا۔''
اس کے لہجے میں شکست خوردگی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ ایسے میں اول خیر بھی آب دیدہ ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے خاموش انداز میں حوصلہ دینے کے لیے، دھیرے سے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے ہونٹ بھینچ کر اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ میری آواز مارے رقت کے لرزتی محسوس نہ ہو، اس سے کہا۔
''تو تم اس سے وہ راز اُگلوانے کے لیے اس پر اتنے عرصے تک تشدد کرتے رہے۔'' میرا غم ایکا ایکی آتش فشاں کا روپ دھارنے لگا تھا۔ جسے میں نے ہونٹ بھینچ کر جیسے بڑی مشکلوں سے قابو کیے رکھا تھا۔
''یہ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ مگر تمہارا باپ بھی سخت مٹی کا بنا ہوا تھا، کچھ بھی اُگل کر نہیں دیا۔ میں اُن دنوں انڈین بی ایس ایف میں تھا، پھر انڈین آرمی سے ریٹائر ہوا اور کافی عرصہ ''را'' میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز رہا، اس کے بعد اب تاحیات بلیو ٹلسی کا چیف بنا دیا گیا اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ وہ اب ہمارے کسی کام کا تو نہیں رہا البتہ تمہارے کام کا ضرور ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے اس خبیث نے ایک ہلکا سا استہزائیہ قہقہہ لگایا، میرے دل میں بڑی شدت سے یہ خواہش اُبھری تھی کہ کاش! یہ خبیث اس وقت میرے سامنے ہوتا تو میں اس کی گردن دبوچ لیتا، اور اس وقت تک نہیں چھوڑتا جب تک اس مردود کی آنکھیں اور زبان باہر کو نہیں آجاتیں۔ وہ بڑے آرام سے اپنی بربریت کی داستان سنا رہا تھا مجھے، بلکہ ایک بیٹے کو، جس کے باپ کا اس خبیث نے کیا حشر کیا تھا۔
''اگر تمہاری تسلی ہو گئی ہو تو اب معاہدے کی بات کر لی جائے؟'' دوسری جانب سے اس نے پوچھا، مجھے یہ تسلی ہو گئی تھی کہ میرے باپ نے وطن عزیز کے لیے جو قربانی دی تھی وہ ضائع نہیں گئی تھی۔ لہٰذا میں نے بھی اپنے دُکھ اور غضب ناک کیفیت پر قابو پاتے ہوئے اسے اثبات میں جواب دے ڈالا تو وہ بولا۔
''معاہدہ سیدھا سادہ سا ہے، ہم تمہارے باپ کو تمہارے حوالے کر دیتے ہیں اور تم ہمارا آدمی سندر داس ہمارے حوالے کر دو۔'' اس مکار بھارتی مہاویر چکر کی بات سن کر میں نے ایک بار پھر دانستہ چند ثانیوں کی خاموشی اختیار کرتے ہوئے یہی تاثر دینا چاہا کہ جیسے میں اس کی اس ''آفر'' پر ایک معمولی سی ردوقدح کے بعد غور کر سکتا ہوں، پھر اپنے لہجے کو گومگو سا بناتے ہوئے اس خبیث سے بولا۔
''سندر داس جن لوگوں کے حوالے کیا جا چکا ہے، وہاں سے اسے اگر میں نکال بھی لوں تو طرفین کی حوالگی کی ٹرم اینڈ کنڈیشن کیا ہوگی؟ علاوہ ازیں اس کا کیا ثبوت ہوگا کہ یہ معاہدہ طے پا جانے کے بعد تم یا تمہارا کوئی حواری مجھے پھنسانے کے لیے اس راز کو آشکارا نہیں کرے گا، کیونکہ اگر ایسا ہوا تو میرے لیے مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے، میرا کورٹ مارشل بھی ہو سکتا ہے۔''
میں نے آخر میں دانستہ ایسا کہا تھا، تاکہ اُس کی ''بدھی'' میں یہ بات اچھی طرح سما جائے کہ میں سنجیدگی سے اس کی باتوں میں آرہا تھا یا میں خود بھی ذاتی طور پر اس... معاہدے کی کامیاب تکمیل چاہتا تھا۔
''گڈ! یہ ہوئی ناں بات۔'' وہ یک دم خوش ہو کر بولا۔''اس کی تمہیں بالکل بھی چنتا نہیں کرنی چاہیے، ہمارا کام ہو جائے، یہی کافی ہوتا ہے ہمارے لیے، یہ ہمارے اُصولوں کے ہی خلاف ہے کہ ہم کام نکل جانے کے بعد مخالف پارٹی کے بارے میں ایسا کوئی فضول قدم بھی اُٹھائیں، کیونکہ اگر ہم ایسا کرنے لگ جائیں تو پھر کون ہماری باتوں کا آئندہ یقین کرے گا؟ ممکن ہے ہمیں پھر دوبارہ بھی تم سے کوئی کام پڑ سکتا ہے، اسی نوعیت کا۔''
''سمجھ گیا میں، اب اس کی ٹرم اینڈ کنڈیشن کی بات کرو۔'' میں نے لہجے میں جوش سا سموتے ہوئے کہا تو بولا۔
''سب سے پہلے تمہیں سندر داس کو نکالنا ہوگا، اور اُسے کسی محفوظ مقام پر لے کر پہنچو گے، پھر ہمارے فون کا انتظار کرو گے، اس نمبر پر تمہیں میں اب دوبارہ نہیں ملوں گا نہ ہی بات کروں گا۔ میرا ایک آدمی تم سے اب رابطے میں رہے گا، لیکن ضرورت پڑی تو میں بھی بات کر سکتا ہوں، اس کے بعد ہمارا ایک آدمی اپنی تسلی کرنے کے لیے تم سے ملے گا، اور وہی ہمیں ''آل اوکے'' کا سگنل دے گا جس کے بعد ہمارے حرکت میں آنے کی باری ہوگی یعنی تمہارے باپ تاج دین شاہ کو ہم ساتھ لے کر اٹاری کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچیں گے۔ اور وہیں تم یا تمہارا کوئی آدمی اس کی تصدیق کر کے تمہیں ''اوکے'' کا سگنل دے گا۔ اس طرح دوطرفہ تسلی ہو جانے کے بعد اٹاری ہی کے ایک سرحدی مقام پر دونوں آدمیوں کی ''میچوئل ری پلیسمنٹ'' عمل میں لائی جائے گی، ڈن؟''
اُس نے مختصر ترین الفاظ میں اس معاہدے کی عملی تصویر پیش کر دی۔ میں نے فوراً رضامندی کے بجائے یونہی چند متعلقہ سوالات کرنا ضروری سمجھا، اور معاہدے سے متعلق

کچھ روایتی قسم کے تحفظات کا اظہار کیا، جس کی تشفی ہوتے ہی میں نے بھی اس کے ساتھ یہ معاہدہ ڈن کر دیا۔ تاہم ایک اہم سوال جو واقعی میرے نزدیک اہم تھا، اس سے ضرور، رواروی کے انداز میں پوچھ لیا۔

"تمہارا وہ آدمی جو سندر داس کے سلسلے میں تشفی کرنے آئے گا، کیا وہ سرحد پار سے آئے گا یا ادھر ہی کہیں وہ رہتا ہے۔"

اس سوال کو پوچھنے کا مقصد میرا یہی تھا کہ میں جاننا چاہتا تھا کہ بلوتلسی کے اور کتنے خطرناک ایجنٹ یہاں پہلے سے گھسے بیٹھے تھے؟

"مسٹر شہزاد!" اس کی گمبھیر آواز اُبھری۔ "یہ ایک غیر متعلقہ سوال ہے اور ہمیں ان میں اپنا قیمتی وقت برباد نہیں کرنا چاہیے تو پھر میں معاہدے کو حتمی سمجھوں؟"

میں نے ایک گہری سانس خارج کر کے اثبات میں جواب دے دیا۔ دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

"اوخیر!" گفتگو اختتام پذیر ہوتے ہی میرے برابر میں اسٹیئرنگ سنبھالے بیٹھے اول خیر کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ سیل فون کے وائیڈ اسپیکر سسٹم سے وہ بھی میرے اور کرنل سی جی بھجوانی کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔ میں نے خاموشی سے اُسے کار آگے بڑھانے کا اشارہ کر دیا، اس نے ایک نظر میرے سوچ میں پڑے چہرے پر ڈالی اور کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اس موضوع پر پھر بات کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا، ابھی ہمیں عارفہ سے ملنا تھا، جس کی رہائش گاہ سے اب ہم زیادہ دور بھی نہیں تھے۔

وہاں پہنچے تو اُسے اپنا ہی منتظر پایا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ پنکی اور دانی اسکول سے آکر کھانا وغیرہ کھانے کے بعد اپنے کمروں میں سو رہے تھے یا پھر سُلا دیے گئے تھے۔ ایک دو نئے ملازم نظر آئے، پرانے ملازمین میں شریفاں اور اس کا شوہر دکھائی نہیں دیے تھے، جن کے بارے میں مجھے بہت پہلے اندازہ تھا کہ وہ سرمد بابا کے مرحوم ہونے کے بعد نہیں رہیں گے۔ تاہم دونوں بچوں سے انہیں بھی محبت تھی۔

معلوم ہوا، وہ چھوڑ کر جا چکے تھے۔ وہ نہ بھی جاتے تو عارفہ اپنے ناروا رویّے سے انہیں گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیتی اور مجھے یقین تھا کہ ہوا بھی یہی ہوگا۔ وہ اتنی ہی کینہ پرور اور کم ظرف عورت تھی۔ صرف اپنی عمل داری کی قائل تھی، مجھے یقین تھا کہ اس نے جمال انکل کو بھی اپنی کمپنی سے نکال باہر کیا ہوگا۔ وہ اپنے شوہر یا سسر کی کوئی بھی نشانی یا باقیات پالنے کی عادی نہیں تھی۔

یہ اس کے حد درجہ جلاپے اور حسد کی نشانی تھی۔ محسن کش تو اپنی جگہ تھی ہی، احساسِ کمتری اور احساسِ محرومی کی بھی ماری ہوئی لگتی تھی اور بلا کی خود غرض بھی۔ جابدہ کے ساتھ اس نے جو کیا تھا، یہ تعریفیں اس پر پوری اُترتی تھیں۔

ہم ایک کمرے میں بیٹھ گئے۔ شیئرز سے متعلق میری نرمی پر اس ناگن نے بھی فوراً اپنی کینچلی بدل ڈالی تھی ورنہ کہاں تو یہ میری صورت دیکھنے کی بھی روادار نہ تھی، وہ میرے ساتھ بہت دوستانہ رویے اور خوش دلی کا اظہار کر رہی تھی، لیکن میرے چہرے پہ ویسی ہی گمبھیرتا طاری رہی۔ اُس نے چائے وغیرہ بھی منگوانی چاہی تھی، لیکن میں نے منع کر دیا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ معاملات کی بات ہو جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

"میرے لیے وہ شیئرز کوئی حیثیت نہیں رکھتے، اور نہ ہی ان پر میں اپنا حق سمجھتا ہوں۔" اُسے اپنی جانب سنجیدگی سے متوجہ پا کر میں نے کہا۔ "لیکن بسا اوقات کنٹراڈکشن جیسی صورتِ حال میں جب بھی بات ایک ضد اختیار کر لیتی ہے تو بات اور ہو جاتی ہے۔ مختصراً یہ کہ میرا آپ سے بھی کوئی اور کسی قسم کا تعلق نہیں رہا ہے، جو بھی تھوڑا بہت تھا وہ سرمد بابا کے حوالے سے ہی تھا، اب وہ ہی نہیں رہے تو میرا خیال ہے ہمیں بھی کھلے دل و دماغ سے کام لیتے ہوئے ایک دوسرے پر عائد جو بھی واجبات بنتے ہیں، انہیں باہم رضامندی سے طے کر کے اپنے اپنے راستے پر ہو لیا جائے۔" میری بات پر اس مکار عورت کی آنکھوں میں خوش فہمی کی ایک چمک سی نمودار ہوئی تھی۔ فوراً چالاکی سے مسکرا کر بولی۔

"تم نے تو میرے دل کی بات کہہ ڈالی ہے شہزی! یقین کرو میں خود کو بے حد مطمئن محسوس کر رہی ہوں۔ لیکن تمہاری واجبات والی بات میری سمجھ میں نہ آسکی، اگر اس کی تھوڑی تشریح کر دیتے تو..."

"اچھی بات ہے۔" میں نے اس کی طرف پُرمتانت نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگرچہ سرمد بابا اپنی وصیت کے مطابق مجھے ایک بڑی ذمّے داری سونپ گئے ہیں جبکہ ایسے میں، خود میرے اپنے کاندھوں پہ ان گنت ذمّے داریوں کا بوجھ لدا ہوا ہے، اس بوجھ کو میں اضافی بوجھ ہی سمجھتا ہوں، آپ پنکی اور دانی کی ماں ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ ایک ماں سے بڑھ کر بھلا کون اپنے بچوں کا بھلا سوچے گی۔ لہٰذا اس کی تفصیل کی ضرورت اسی لیے مجھے پیش آئی تھی کہ آپ اچھی طرح میری بات سمجھ لیں، اور آپ کے دل میں

کسی قسم کا کوئی شبہ باقی نہ رہے۔''
''میں واقعی تمہاری باتوں کا مطلب سمجھ رہی ہوں شہزاد! لیکن یہ واجبات والی بات۔''
''میں اسی طرف آرہا ہوں۔'' میں نے ہولے سے کھنکھار کے کہا۔ ''واجبات والی بات سے میری مراد پیسوں وغیرہ کا لین دین نہیں ہے۔'' اتنا کہہ کر میں نے اس کے چہرے کے تاثرات بھانپنے کے لیے ایک پُرغور نظر ڈالی۔ حسب توقع وہاں مجھے اطمینان کے آثار کی جھلک محسوس ہوئی تھی۔

''واجبات سے میری مراد صرف وہ فرائض ہیں جو ہمیں نیک نیتی سے پورے کرنا ہوں گے۔''
''کیسے فرائض؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔
''سب سے پہلی بات تو یہ کہ عابدہ آپ کی محسن تھی، اور ہے۔ لیکن آپ نے اپنی گردن بچانے کے لیے اُس بے چاری کو پھنسوا دیا اور سرمد بابا نے بھی اس سلسلے میں جانبداری برتتے ہوئے عابدہ کے بجائے اپنے بیٹے کی بیوہ یعنی آپ کو ہی ترجیح دی، اس سلسلے میں میری ان سے بھی تلخ کلامی ہوئی تھی، لیکن میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اب آپ پر اخلاقی ہی نہیں بلکہ قانونی طور پر بھی یہی فرض عائد ہوتا ہے کہ عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں آپ میری مدد کریں۔'' میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

میں نے دانستہ سرمد بابا کا اس انداز میں ذکر کرنا ضروری سمجھا تھا، تاکہ وہ یہی سمجھے کہ میرا سرمد بابا سے دل خراب ہو چکا ہے اور اسی لیے میں ان کی سونپی ہوئی ذمے داری سے عہدہ برآ ہونا چاہتا ہوں، اگرچہ اس ذمے داری میں مجھے بھی مالی منفعت حاصل تھی۔ لیکن حقیقت یہی تھی سرمد بابا نے درمیانی راہ اختیار کی تھی، اور عابدہ کے لیے اُنہوں نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا، مگر افسوس کہ زندگی نے اُنہیں موقع ہی نہ دیا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ عابدہ نے میرے لیے قربانی دی ہے، یہ اس کا احسان ہے مجھ پر، مگر تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ سرمد بابا نے بھی تم دونوں پر بہت سے احسانات کیے تھے۔ اور یہ بھی مت بھولو کہ میرے لیے تم نے جو کچھ کیا وہ سرمد بابا کی خاطر ہی کیا تھا۔'' اس نے بڑی مکاری سے جتایا تو میں نے بھی کہہ ڈالا۔

''میری اور عابدہ کی قربانیاں سرمد بابا کے احسانات کے سامنے ہیچ ہیں، مگر عابدہ کی اب جان پر بن آئی ہے۔ لیکن ہم اگر اس طرح کی بحث میں اُلجھ گئے تو آپس میں ہماری معاملے داری رہ جائے گی۔''
''آف کورس! میں بھی یہی چاہ رہی ہوں کہ معاملے کی بات شروع کی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔''
''سرمد بابا کی اچانک رحلت کے بعد امریکا کی عدالت میں عابدہ کا کیس کھٹائی میں پڑنے لگا ہے، میں نے اس کے لائر سے فون پر بات کی تھی، اس پر اس نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب ایک ہی صورت ہے کہ اس مقدمے کے دوسرے فریق، یعنی آپ کو عدالت میں پیش ہو کر عابدہ کے حق میں یہ گواہی دینا ہوگی جو ظاہر بھی ہے کہ وہ آپ کے ساتھ لک آفٹر کے لیے امریکا گئی تھی اور وہاں ایک سازش کے تحت اُسے پھنسوا دیا گیا، لہٰذا اصل معاملے کی چھان بین یا غیر جانبدارانہ تحقیق کے بجائے عابدہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ جو صریحاً ناانصافی ہے، باقی آپ کو لائر سمجھا دے گا۔''
''او آئی سی تو یہ بات ہے، تبھی میں کہوں کہ یہ اونٹ پہاڑ تلے کیسے آیا ہے۔''
ساری بات سمجھنے کے بعد وہ بڑی مکاری سے بولی۔ اس کے لہجے میں ایکا ایکی جیسے سنکھیا گھل گیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ''اُونٹ'' کسے کہہ رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے جو اس کے چہرے سے مکارانہ فروتنی مترشح تھی وہ اب ہوا ہو کے ایکا ایکی ''آکڑ'' میں بدل گئی تھی۔ گویا وہ سمجھ رہی تھی کہ میری دُکھتی رگ اس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے بھی بڑے مستحکم اور بہ ظاہر پُرسکون لہجے میں کہا۔
''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے سامنے اس وقت ہاتھ جوڑے بیٹھا ہوں؟ اور تم سے عابدہ کی مدد کے سلسلے میں بھیک مانگ رہا ہوں؟ ہرگز نہیں، اس خوش فہمی کو تم اپنے دل سے ہی نکال دو۔ کیونکہ میرے پاس اس سے بہتر آپشن موجود ہے، جو نسبتاً آسان بھی ہے۔''
''اچھا!'' وہ طنزیہ کاٹ سے بولی۔ ''تو پھر حیرت ہے مجھے کہ تم اتنے آسان آپشن کو رد کر کے پھر میرے پاس کیا لینے آئے ہو۔'' اس کی گفتگو لحہ بہ لحہ زہریلی ہوتی جارہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا۔
''محترمہ عارفہ بیگم! میں اس لیے یہاں آیا ہوں تاکہ تم عابدہ کے سلسلے میں اپنا اُصولی کردار ادا کر کے میرے دُشمنوں کی ہٹ لسٹ سے خارج ہو جاؤ، کیونکہ یہ امر ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ عابدہ تمہارے غلط بیان دینے کی وجہ

سے پھنسی ہے۔ اور اگر اُسے خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو سب سے پہلے تمہیں اس کا حساب چکانا ہوگا اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اپنے دُشمنوں کو بالکل معاف نہیں کیا کرتا اور عابدہ کے دُشمن کو تو بالکل بھی نہیں۔''

میری بات پر عارفہ کے چہرے پہ ایک پھیکا سا رنگ آ کے گزر گیا، یقینی طور پر یہ اس کے اندر کا دبا دبا خوف تھا جو شاید اس حوالے سے پہلے ہی اس کے اندر کی بے چینی بنا ہوا تھا۔

''دھمکی دے رہے ہو مجھے؟'' اس نے میری طرف شاکی نگاہوں سے دیکھا۔

''دھمکی وہ لوگ دیتے ہیں جو کچھ کرنے کی سکت نہ رکھتے ہوں۔ میری اب تک کی زندگی تمہارے سامنے ہے، میں نے جو کہا وہ کر دکھایا۔''

''تمہارے پاس دوسرا آپشن کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''لولوش۔''

''لولوش؟'' اسے ایک جھٹکا لگا۔ میرا خیال تھا کہ اب میں نے شاید اس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''تت... تم اسے کیسے جانتے ہو؟''

''بچکانا سوال ہے۔'' میں نے بے پروا انداز میں کہا۔ ''اب معاملے کی بات کریں تو بہتر ہوگا۔'' اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بولی۔

''تم یہ چاہتے ہو کہ میں عابدہ کے حق میں گواہی دینے امریکا جاؤں اور پھر تم وہ سارے شیئرز میرے حوالے کر دو گے؟''

''ہاں!'' میں نے مختصراً کہا تو وہ ایک استہزائیہ مسکراہٹ سے بولی۔

''اور تمہارا خیال ہے کہ میں تمہارے اس جھانسے میں آجاؤں گی۔''

اس کی بات پر میرا طیش آسمان کو چھونے لگا، یہ عورت نہ ہوتی تو میں اسی وقت اس کی گردن دبوچ کر اسے کہتا ''اے خبیث انسان! تم نے جو عابدہ کے ساتھ کیا ہے، اس سلسلے میں مجھے تم سے کسی ڈیلنگ یا معاہدے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ تم پر واجب ہے کہ تم اپنی محسنہ کے لیے یہ سب کرو۔ ورنہ میں تمہاری زندگی کو جہنم بنا دوں گا۔''

لیکن میں عارفہ سے اس طرح نہیں کہہ سکتا تھا۔ پتا نہیں کیوں جب بھی میرے دل و دماغ میں عارفہ کے لیے ایسا کوئی جارحانہ خیال آتا تھا تو میری نظروں کے سامنے سرمد بابا کا چہرہ گھوم جاتا تھا۔ تاہم میں نے اپنے اندر کے اُبال پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''جھانسا نہیں دے رہا ہوں، حقیقت بیان کر رہا ہوں، اور ویسے بھی کیا تم پر یہ واجب نہیں ہوتا کہ تم بغیر کسی معاہدے یا معاملے کے اپنی محسنہ عابدہ کی مدد کرو، جو تم پر اُصولی طور پر واجب بھی ہے؟'' میری اس بات نے اُسے سٹپٹا دیا، مگر ڈھٹائی سے بولی۔

''میں بھلا کیا کر سکتی ہوں؟''

''ٹھیک ہے پھر میں دوسرے آپشن پر غور کر لیتا ہوں۔'' کہتے ہوئے میں صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا تو اس نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور میرے مقابل کھڑے ہو کر بولی۔

''ٹھہرو! اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تم ان شیئرز کے حقدار ہو تو یہ تمہاری خوش فہمی ہے، میں نے سرمد بابا کی وصیت کو کورٹ میں چیلنج کر دیا ہے، بہت جلد فیصلہ میرے حق میں ہونے والا ہے۔''

''خوش فہمی تمہیں ہے، مجھے نہیں۔'' میں نے کہا، پھر ایک سناٹے دار مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے چند پل کے توقف سے بولا۔ ''بائی دی وے، جسے تم نے اپنے مستقبل کا جیون ساتھی بنا رکھا ہے، یعنی سیٹھ نوید سانچے والا۔ وہ بہت جلد پولیس کے سامنے یہ سچ اُگلنے والا ہے کہ سرمد بابا کے اغوا اور قتل میں تم بھی اس کے ساتھ شامل تھیں۔ کسی وقت بھی پولیس تمہاری گرفتاری کے لیے یہاں چھاپا مارنے والی ہے۔''

''کون سیٹھ نوید سانچے والا؟ میں اسے جانتی بھی نہیں۔'' وہ مکاری سے مسکرا کر بولی۔

''اچھی ٹرک ہے، شاید چل بھی جائے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں دوسرے آپشن پر عمل پیرا ہو جاؤں گا۔ کیونکہ میں ہی نہیں تم بھی جانتی ہو اچھی طرح کہ لولوش کی ان شیئرز میں جان اٹکی ہوئی ہے اور شاید تمہارے علم میں نہیں ہے کہ جس سی آئی اے افسر باسکل ہولارڈ نے عابدہ کو حراست میں لیا ہوا ہے لولوش اس کا چہیتا داماد ہے، وہ بڑے آرام سے اور بغیر کسی لمبے چوڑے چکروں میں پڑے، عابدہ کو امریکا سے یہاں پاکستان پہنچا دے گا۔''

''اس کے لیے ایک طویل پروسس کی ضرورت پڑے گی تمہیں اور اس کی کیا ضمانت ہوگی کہ لولوش جیسا عالمی گینگسٹر تمہیں دھوکا نہیں دے گا؟'' اس نے کہا۔

وہ بلا کی عیار اور شاطر تھی۔ میری ہر بات کو ایک

مضبوط دلیل سے باطل قرار دیے جا رہی تھی، اور میں شاید اس خوش فہمی میں تھا کہ میں اسے مختلف چکروں میں ڈال کر خوف زدہ کر کے اپنا کام نکلوالوں گا۔ حقیقت یہی تھی کہ میں خود بھی عارفہ کے خلاف ایسا کوئی قدم نہیں اُٹھانا چاہتا تھا جس سے پنکی اور دانی دنیا میں اکیلے رہ جاتے، کیونکہ سرمد بابا کے بعد اب بھلا ان دونوں معصوم بچوں کا دنیا میں اپنی ماں (عارفہ) کے سوا اور کون تھا؟ میں نے اپنی اسی جذباتی کمزوری کو عارفہ سے چھپانے کے لیے شروع میں ہی یہ ظاہر کر دیا تھا کہ میرا سرمد بابا سے دل خراب ہو چکا ہے۔ رہی بات سیٹھ نوید سانچے والا پر سرمد بابا کو اغوا اور بعد ان کے حادثاتی قتل والے کیس کی تو یہ کام پبلک پراسیکیوٹر کے سپرد تھا۔

''یہ میرا دردِ سر ہے کہ میں اس سے کیسے اپنی بات منواتا ہوں۔ تم میرے ساتھ معاملے کی بات کرو۔ ہاں یا نہیں؟ میرا بہت وقت ضائع ہو گیا۔ سب سے پہلے مجھے سرمد بابا کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہے۔ وہ میں لائر کو امریکا فوراً ارسال کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد لائر پیشی کی تاریخ لے گا اور تم امریکا روانگی کا پروگرام بناؤ گی۔ ممکن ہے اس میں تھوڑی بہت تبدیلی بھی کرنا پڑے۔''

''اور شیئرز میرے حوالے کب کرو گے؟'' اس نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف تکتے ہوئے پوچھا۔

''عابدہ کی رہائی اور اس کی یہاں بہ خیریت واپسی کے بعد۔''

''اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم بعد میں اس معاہدے سے ہی مکر جاؤ۔''

''اتنا تم بھی مجھے جانتی ہو کہ میں کیسا آدمی ہوں۔ عابدہ مجھے مل جائے، میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں ہوگی۔''

''مگر میں اس سلسلے میں تحفظات اور ابہام کا شکار رہوں گی۔ بہرحال میں کسی سے مشورہ کر کے تمہیں کوئی حتمی جواب دوں گی۔'' وہ کچھ نیم رضامندی سے بولی۔

''سیٹھ نوید سانچے والا سے مشورہ کرو گی؟''

''ہاں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا، سمجھتی تھی کہ مجھ سے اس کا کیا پوشیدہ تھا بھلا۔

''کیا اس نے اپنی ضمانت کروالی ہے یا پھر جیل میں اس سے ملو گی؟''

''اس کی ضمانت جلد ہونے والی ہے، ویسے میں اس سے ملتی رہتی ہوں۔ کل ہی اس سے مل کر میں تمہیں آگاہ کر دوں گی۔'' میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ وہ سیٹھ نوید سے ملتی رہتی تھی۔ اور کوئی بعید نہیں کہ اس نے اس کی ضمانت کے ساتھ ساتھ اپنے لیے بھی ایک وکیل ہائر کر لیا ہو۔ میں نے طنزیہ کہا۔

''ابھی تو کہہ رہی تھیں کہ تم سیٹھ نوید کو جانتی بھی نہیں۔''

''اب چھوڑو ان باتوں کو۔'' اس نے گفتگو ختم کرنے کے ارادے سے کہا۔

''اچھی بات ہے۔ اب آپ ڈیتھ سرٹیفکیٹ میرے حوالے کر دیں تو میں وہ امریکا لائر کو بائی پوسٹ کر دوں۔'' میں نے کہا۔

''وہ ابھی میں تمہیں نہیں دے سکتی۔ پہلے نوید سے بات کروں گی۔ اس کے بعد۔'' وہ بولی۔ ''ویسے تم یہ متعلقہ اسپتال سے بھی نکلوا سکتے ہو۔ اس میں بھلا کیا پریشانی ہے؟''

''وہ ڈپلی کیٹ کہلائے گا۔'' میں نے کہا۔

''تو کیا ہوا پھر؟ تم اسے کسی کلاس ون آفیسر سے اٹیسٹ کروالو۔ وہ سرٹیفکیٹ خود میرے لیے بھی ضروری ہو گا، وہ تو میں تمہیں کسی صورت میں بھی نہیں دے سکتی۔''

''میں عابدہ کے کیس کے سلسلے میں تھوڑا سا بھی ابہام چھوڑنا نہیں چاہتا۔ ویسے میں اس سلسلے میں لائر سے مشورہ لے لوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''ڈپلی کیٹ سرٹیفکیٹ تو تم بھی نکلوا سکتی ہو، اس میں کیا قباحت ہے؟''

''تم پہلے اپنے لائر سے بات کر لو، میں تب تک نوید سے بات کر لیتی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ خاموشی سے اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔ میں اور اول خیر واپس لوٹ آئے۔

میری اور عارفہ کی اس ملاقات سے اول خیر اور شکیلہ زیادہ پُرامید نہ تھے کہ وہ اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد کرنے پر رضامند ہوگی، اور اس کی باتوں سے مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہونے لگا تھا۔

بہرحال میں نے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کے سلسلے میں آنسہ خالدہ سے مشورہ لینے کا ارادہ کیا، لیکن امریکا کے وقت کے حساب سے وہاں آدھی رات تھی، اسی لیے میں نے اُسے میسج کر دیا۔ اور تب تک میں نے متعلقہ اسپتال سے ایک اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھی نکلوالیا، تاکہ آنسہ خالدہ کا جواب اثبات میں آئے تو میں فوراً اُسے ارسال کر دوں۔

اپنے کوارٹر پہنچے تو شکیلہ نے مجھے بتایا کہ میجر ریاض باجوہ کا فون آیا تھا۔ میں چونکا۔

''کیا کہہ رہے تھے وہ؟'' میں نے شکیلہ کی طرف

سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''اور تو کوئی خاص بات نہیں کی، بس تمہارا ہی پوچھ رہے تھے کہ آجائے تو میرے پاس بھیج دینا۔''
شکیلہ کی بات سن کر میں اکیلا ہی میجر صاحب سے ملنے ان کے آفس روم کی طرف چلا گیا۔
☆☆☆
ایک بند کمرے میں، میری ون ٹو ون ملاقات میجر ریاض باجوہ سے ہوئی۔
رسمی کلمات کے بعد میں نے ان کے چہرے سے ایک تفکر سا جھلکتا محسوس کیا۔ تاہم میں نے اصل بات کی طرف آنے سے پہلے پوچھا۔
''سر! وزیر جان کا کچھ پتا چلا؟''
''ابھی تک تو نہیں، لیکن اس کی تلاش جاری ہے۔'' اُنہوں نے مختصراً جواب دیا۔
''اور سندر داس یا چوہدری ممتاز خان نے کچھ اُگل کے دیا؟''
''اصل مسئلہ ان کے منہ سے کچھ اُگلوانا نہیں بلکہ تسلیم کروانا ہے، کیونکہ وہ کون ہیں، کیا ہیں یہ سب ہمیں معلوم ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگئے۔ ان کے عجیب سے لہجے نے مجھے چونکا سا دیا۔ پتا نہیں کیوں وہ آج مجھے کچھ بدلے بدلے سے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک بددلی کی سی کیفیات ان کے سنجیدہ چہرے سے مترشح ہوتی نظر آرہی تھی۔ خاموشی کا یہ وقفہ طول پکڑنے لگا تو میں نے پوچھ لیا۔
''کیا بات ہے سر! آپ آج کچھ اُلجھی اُلجھی سی باتیں کررہے ہیں؟''
اُنہوں نے ایک گہری ہنکاری خارج کی اور اپنی کرسی سے اُٹھ کر اپنے سیدھے ہاتھ والی اس دیوار کی طرف جا کھڑے ہوئے جہاں ایک کھڑکی باہر ہیڈ کوارٹر کے اس میدان میں کھلتی تھی، جدھر ڈرل وغیرہ ہوتی تھی۔ میری نظریں ہنوز ان کے تعاقب میں تھیں۔ وہ چند ثانیے کھڑے باہر میدان کی طرف تکتے رہے، پھر میز کی طرف آئے اور جھک کر اس کی دراز کھولی اور اس کے اندر سے ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویر نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔
''اسے پہچانتے ہو؟''
میں نے حیران حیران سی نظروں سے تصویر پر ایک نظر ڈالی، صورت دیکھی بھالی تھی اور ذرا سا ذہن کھنگالنے پر میں اسے پہچان بھی گیا اور مجھے حیرت بھی ہوئی کہ یہ تصویر بھلا یہاں کیسے آگئی اور کیوں؟''
''جی سر! میں اس تصویر کو پہچان گیا ہوں، مگر یہ آپ کے پاس؟''
''کیا واقعی تم اس تصویر والی کو پہچان گئے ہو یا پھر...''
''میں پہچان گیا ہوں سر! یہ چوہدری ممتاز خان کی جواں سال بیٹی نوشابہ ہے۔'' میں نے فوراً بتایا۔
''ہاں! اس کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا۔ فرخ نام تھا اس کا۔'' وہ بولے۔ ''جس کے قتل کا الزام تم پر اور تمہارے ساتھی اول خیر پر لگا تھا۔''
''ج... جی ہاں سر!'' میری آواز جانے کیوں حلق میں اٹکنے لگی تھی۔ میجر صاحب کا بدلا بدلا لہجہ، ممتاز خان کی بیٹی نوشابہ کی تصویر، اور اب میجر صاحب کے منہ سے نوشابہ کے چھوٹے مقتول بھائی فرخ کا ذکر۔ یہ سب کیا تھا؟ کون سا نیا محاذ اب کھلنے والا تھا؟ اس نازک وقت کی بساط پر دشمن پھر کون سی نئی چال چلنے والے تھے میرے ساتھ؟ میرے اندر کوئی جیسے حلق پھاڑ کر چلّایا۔
''شہزاد احمد خان! تمہارے دُشمنوں کے ترکش میں ابھی بہت تیر باقی ہیں، تم کب تک اور ان کے کون کون سے تیروتفنگ کا مقابلہ کرو گے۔''
میرے اندر ایک زبردست سی ہلچل مچ گئی تھی۔ میں بے چین تھا یہ جاننے کے لیے کہ آخر یہ کون سا نیا گورکھ دھندا شروع ہونے والا تھا؟
میجر ریاض باجوہ تھکے تھکے سے انداز سے میرے سامنے اپنی چیئر پر دوبارہ براجمان ہوگئے۔ پھر بولے۔
''شہزاد! نوشابہ نے اپنے بھائی فرخ کا مرڈر کیس ری اوپن کرا دیا ہے۔ تمہارے اور اول خیر کے خلاف ایف آئی آر کٹوا دی ہے۔ پولیس تمہیں کسی بھی وقت گرفتار کرنے والی ہے۔'' میجر ریاض باجوہ نے جیسے میری سماعتوں میں دھماکا کیا۔ میں اس وقت جن نازک اور حساس ترین حالات سے گزر رہا تھا، اس میں ایسے کسی نئے محاذ کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ قطعاً نہیں۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں کنپٹیوں پہ سنائی دیتی محسوس ہونے لگی تھیں، میں غیر یقینی نظروں سے میجر باجوہ صاحب کا چہرہ تکے جارہا تھا اور جب بولا تو مجھے اپنی آواز حلق سے بہ مشکل نکلتی محسوس ہوئی۔
''یہ... یہ کیسے ہوسکتا ہے سر؟ وہ کیس داخل ہی نہیں ہوا تھا کبھی میرے خلاف، ری اوپن کیسے ہوگیا؟ حتیٰ کہ میرے اور اول خیر کے خلاف ایف آئی آر بھی کٹ گئی؟ پہلے کیا نوشابہ سوئی ہوئی تھی؟''

''لگتا ہے اس کی پشت پر کسی کا ہاتھ ہے۔ ایک ہی آدمی ہوسکتا ہے، جس نے اُسے سارے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے، اُسے اُکسایا ہے۔ اور وہ وزیر جان ہی ہوسکتا ہے۔''

''وزیر جان؟ مگر وہ تو روپوش ہے؟''

''یہی تو مسئلہ ہے کہ وہ روپوش ہے اور اپنی کسی خفیہ کمین گاہ میں بیٹھا یہ سب کررہا ہے، ہاتھ آجاتا ہمارے تو اور حالات ہوتے شاید۔''

''آپ کا خیال ہے کہ اُسی نے نوشابہ کو...''

''ہاں! میں اپنے طور پر کنفرم کروا چکا ہوں۔ نوشابہ اپنے باپ چوہدری ممتاز کی رہائی کے سلسلے میں بھی سرگرم ہو گئی ہے اور اپنے باپ کی سیاسی پارٹی سے وابستگی کو ظاہر کرتے ہوئے خود بھی شامل ہوگئی ہے۔ بعض ابن الوقت قسم کے سیاست دان جنھیں سیاہ ست دان کہنا زیادہ بہتر ہوگا، وہ بھی اس کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف بیان بازی کرنے لگے ہیں اور بالخصوص تمہارے ایشو کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرکے ہمارے حوالے سے اُچھالا جارہا ہے۔ یہ سب کچھ ہماری توقع کے خلاف اور قبل از وقت ہوگیا ہے۔ وزیر جان بہت ہی شاطر دماغ کا آدمی نکلا۔ جانتا ہے اچھی طرح کہ کب اور کس وقت کون سے مہرے کو سرکانا ہے۔''

''حیرت ہے سر! وزیر جان نے اتنی جلدی کس طرح نوشابہ کا مائنڈ سیٹ اَپ بدل کر رکھ دیا۔'' میں گومگو سے انداز میں بولا۔

''ایسی بات نہیں ہے، نوشابہ کا تیر اس نے بہت پہلے ہی سے تیار کررکھا ہوگا۔ نوشابہ کا اب اپنے باپ ممتاز خان کے علاوہ رہ بھی کون گیا ہے؟ وہ باپ کے بغیر خود کو تنہا تصور کرنے لگی ہوگی اور اسی ایشو کو وزیر جان نے استعمال کرتے ہوئے اس کا مائنڈ سیٹ اَپ چینج کرنے کی کوشش کی ہوگی، بہر حال وہ ایک عورت ہے، تنہائی اُسے عدم تحفظ کا احساس دلاتی ہوگی۔''

''تو پھر اب ایسی صورتِ حال میں کیا کرنا ہوگا ہمیں؟'' میں نے دھڑکتے دل سے میجر صاحب کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ابھی تو مجھے ان سے کرنل سی جی بھوانی کے سلسلے میں بھی بات کرنا تھی۔

''اس سلسلے میں آج رات ڈی آئی جی جنرل رینجرز سے ہماری خصوصی میٹنگ ہے۔ ہوسکتا ہے ہمیں ''پاور'' کو ہنگامی... بنیادوں پر ڈراپ کرنا پڑے۔'' وہ بولے، اور مجھے ایک اور جھٹکا لگا۔

پاور کے خاتمے کا مطلب تھا، میں، شکیلہ اور اول خیر بے سروساماں ہوجاتے۔ جبکہ پولیس بھی ہمارے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ پریشانیوں اور تفکرات کی یلغار سے میرا حلق سوکھنے لگا تھا۔ ہماری حیثیت ہی کیا تھی؟ ایک رضا کار، اور ڈیلی ویجز کی۔

''تم فکر نہ کرو شہزادو! اگر ایسا کوئی فیصلہ ہوا بھی تو میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔'' اُنھوں نے شاید میرے چہرے سے پریشانی کے آثار بھانپتے ہوئے کہا۔

''سر! میری پریشانی اپنی جگہ لیکن آپ سے ایک اور اہم معاملے پر بھی ڈسکشن کرنا تھی، سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کروں؟''

''ہاں، تم بولو، میں سن رہا ہوں، تم کون سے معاملے کی بات کرنا چاہتے ہو؟'' وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے، تو میں نے اُنھیں بلیوتکسی کے سی جی بھوانی سے فونک گفتگو کے بارے میں پوری صراحت سے آگاہ کردیا اور اس سلسلے میں مجھے کون سا قدم اُٹھانا چاہیے تھا، اس کے بارے میں بھی بتادیا۔ یہ سب باتیں سننے کے بعد ان کے چہرے کی سنجیدگی بڑھ گئی، شکنوں کا ایک جال سا اُن کے ماتھے پر پھیل گیا۔

کچھ ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد بولے۔ ''یہ معاملہ بھی بہت حساس نوعیت کا ہے، ایسے میں جبکہ ہمارے خصوصی ونگ پاور کے سلسلے میں آخری فیصلہ کیا جانے والا ہے، ہم ایسی مہم جوئی کا رسک نہیں لے سکتے۔ یہ بہت رسکی مشن ہوگا، اگر سندرداس فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تو بہت مشکل کھڑی ہوجائے گی، جبکہ ایسے میں ہم پہلے ہی گمبھیر حالات سے دوچار ہوچکے ہیں، اور بلیوتکسی کے کھاگ ایجنٹ اتنے سہل نہیں ہیں کہ ہم اُنھیں اس طرح آسانی سے ٹھل دے سکیں۔'' مجھے میجر باجوہ صاحب کی بات پر حیرانی سی ہوئی۔

''لیکن سر! میرا منصوبہ بے داغ ہے۔ اس کے لیے پاور کے چار ایجنٹ کافی ہوں گے میرے ساتھ۔''

میری بات پر وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔ ''جنٹلمین! تمھیں اپنا یہ رسکی منصوبہ اسی لیے بے سقم لگ رہا ہے کہ تم اپنے باپ کو بھارتی خفیہ ایجنسی کی قید سے چھڑوانا چاہتے ہو۔''

میجر ریاض باجوہ کی اس بات سے مجھے ایک تکلیف دہ حیرت ہوئی تھی، آج پہلی بار میں نے ان کی بات سے شدید اختلاف کیا تھا۔

''تو کیا سر! میرے باپ کی رہائی کی ذمے داری آپ لوگوں پر عائد نہیں ہوتی؟ کیا وہ اپنے کسی ذاتی کام سے سرحد پار گیا تھا؟ اس نے اپنا گھر بار وطن کی خاطر قربان کر ڈالا، اور اپنی جان کی بازی لگا کر دشمن ملک کے ایسے خطرناک جاسوس کو اسی کے ملک میں جہنم واصل بھی کیا، جو ایک خطرناک ملکی راز چرا لے جانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ کیا اس کا یہ حق نہیں بنتا کہ اس کی رہائی اور وطن واپسی کے لیے ہم کچھ کریں۔ اور پھر آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ یہ میرا محض ایک ذاتی مسئلہ ہے؟ بہت افسوس ہوا سر مجھے آپ کی بات پر۔''

''تم خوامخواہ جذباتی ہو رہے ہو جنٹلمین!'' میجر ریاض باجوہ نے میرے چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''اس کا کیا ثبوت ہے کہ کرنل سی جی بھجوانی تمہاری ایک جذباتی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر تمہیں بلف نہیں کر رہا؟ کیا ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ جس تاج دین شاہ کی بات کر رہا ہے، وہ زندہ بھی ہے۔'' مجھے میجر باجوہ کا لہجہ بے رحمی کا عکاس محسوس ہوا۔ میں ان کا احترام کرتا تھا اس لیے کوئی سخت جواب دینے سے گریزاں ہی رہا، لیکن وہ فوراً نرمی سے بولے۔

''دیکھو! جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ بلیو ٹکسی والے تم سے گیم کھیل رہے ہیں۔''

''اگر یہ کنفرم ہو جائے کہ میرا باپ زندہ ہے تب آپ کا کیا ردِعمل ہوگا؟'' میں نے اپنے تئیں باجوہ صاحب سے رائے چاہی تو وہ بولے۔

''باوجود اس کے سندر داس جیسے اہم اور خطرناک مہرے کو ہم اپنے قبضہ گرفت سے نہیں نکال سکتے۔''

''سر! میری آپ سے ریکویسٹ ہے، اس موقع سے ہمیں فائدہ اُٹھانا چاہیے، اس طرح نہ صرف ہم یہاں گھسے بیٹھے ''را'' سمیت بلیو ٹکسی کے ایجنٹوں کا سراغ لگا لیں گے بلکہ اس طرح میرے باپ کو بھی رہائی مل جائے گی۔ میرا باپ ایک غازی ہے سر، وطن کا غازی۔ کرنل سی جی بھجوانی کی باتوں سے میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی کہ میرا باپ اب واقعی ان کے لیے.... کارآمد نہیں رہا ہے، اور اسی لیے اُنہوں نے اس آپشن کو استعمال کرنے کا سوچا ہوگا کہ میری اس جذباتی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر وہ اپنے اہم آدمی کو حاصل کر لیں۔ ان کی اس اُمید اور ڈیل کی وجہ بڑی ٹھوس اور سمجھ میں آنے والی ہے! پلیز سر! مجھ پر بھروسا کریں۔'' کہتے ہوئے میں نے ملتجی نظروں سے ان کی طرف دیکھا، مجھے ان کا چہرہ کسی گہری سوچ میں مستغرق محسوس ہوا تو مجھے اُمید سی ہوئی اور میں پہلے سے بھی زیادہ مستحکم لہجے میں بولا۔

''سر! پاور رہتی ہے یا نہیں، بھلا اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ وطنِ عزیز کا ہر محبِ وطن ایک ''پاور'' ہے۔ اور یہ پاور درحقیقت اللہ کی پاور ہے۔ میں اور میرے دونوں ساتھی (شکیلہ اور اول خیر) بے شک یہاں سے بے دخل بھی کر دیے جائیں تو کوئی پروا نہیں، میرا آپ سے وعدہ ہے سر! ہم آپ سے ملاقات سے پہلے بھی پاور تھے اور اب بھی ہیں اور ان شاء اللہ رہیں گے، بھلا آپ کو ہم سے آج تک بھی کوئی شکایت ہوئی ہے؟ ہم نے آپ سے ٹریننگ لی ہے سر! میرے دونوں ساتھیوں کو بھی کیپٹن افتخار جنجوعہ صاحب نے کافی حد تک ٹرینڈ کیا ہے، لیکن ہمارا اصل ہتھیار ہمارا نیک جذبہ ہے۔ ہم تو فتح کے قریب ہیں، لیکن محض اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ ختم کرنا بڑی بات نہیں، یہ ایک ایسے آکٹوپس کی طرح پھیلی ہوئی ہے جس کا اگر ایک ٹینٹیکل (Tentacle) کاٹ دو تو چند دنوں بعد دوسرا نکل آتا ہے، جبکہ ہمیں اس کا سر کچلنا چاہیے، آپ کے بھی علم میں یہ ہوگا کہ ہمارے بیرونی دشمنوں نے اسے ہمارے خلاف استعمال کرنے کے لیے ہائر کر لیا ہے، لہٰذا اس حقیقت سے آپ کو بھی انکار نہیں ہوگا سر! کہ ملک اس وقت بہت نازک دور سے گزر رہا ہے۔ اس طرح کی سازشیں ماضی میں بھی ہوتی رہی ہیں، وطنِ عزیز اس وقت بیرونی سازشوں کے نرغے میں بھی ہے، ہمارے دشمن آپس میں گٹھ جوڑ کر چکے ہیں، ٹھیک ہے ملک کے بعض وسیع تر.... مفادات کو مدِ نگاہ رکھتے ہوئے، کچھ سخت فیصلے بھی ہمیں جھیلنے پڑتے ہیں، اور بعض ملک دشمن عناصر سیاست کی آڑ میں بھی اپنے ذاتی مفادات کے حصول سے نہیں چوکتے، اور جہاں ان کی گردن پھنستی ہے وہ بلبلا کر ''عوامی کارڈ'' کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں، اور کیا آپ بھول گئے سر؟ پاور سیکریٹ سروس بھی تو اسی کا توڑ کرنے کے لیے وجود میں لائی گئی تھی تاکہ زہر کو زہر سے اور لوہے کو لوہے سے کاٹا جائے، ناک کو ہاتھ گھما کر پکڑیں یا سامنے سے، بات تو ایک ہی ہے سر، یہ ٹھیک ہے کہ پاور طشت ازبام ہو گئی، اور اب اسے ختم کیا جا رہا ہے، لیکن کیا اس سے پاور کا مقصد ختم ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں سر! اس سے کیا فرق پڑے گا؟ رہی بات میری اور میرے ساتھیوں کی متوقع گرفتاری کی، تو آپ بے فکر رہیں، مجھے ایسے دشمنوں سے مقابلہ کرنے کا تجربہ ہے، وہ میں دیکھ لوں گا، مگر اس وقت جو کام ضروری ہے وہ نمٹانا ہوگا۔ پلیز سر آئی ہمبلی ریکویسٹڈ یو، آخر میں یہی کہوں گا کہ وطن کے جس جاں

نثار سپاہی کی آزادی کے لیے جو شخص کوشاں ہے، وہ بھی۔ اسی بہادر اور محبِ وطن سپاہی کا بیٹا ہے۔ میرا وعدہ ہے سر، میں سندر داس کو ہاتھ سے نہیں نکلنے دوں گا۔''

میجر ریاض باجوہ سے یہ سب کہتے ہوئے میری آنکھیں نمناک ہو گئی تھیں۔ ایک عجیب سے جوش تلے میرے وجود کا رُواں رُواں مرتعش سا ہو رہا تھا۔ میری لرزتی نظروں کے سامنے میجر باجوہ کا چہرہ ان کے اندرونی جذبات کا عکاس نظر آنے لگا۔ میری پُرجوش باتوں کی اثر پذیری ان کے بُشرے سے عیاں تھی۔

پھر وہ اپنی چیئر سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور ''ویل ڈن جنٹلمین!'' کہتے ہوئے اپنے دونوں بازو پھیلا کر میری طرف بڑھے، میں نے بھی اپنی کرسی چھوڑ دی اور فرطِ جوش سے ان کے ساتھ بغل گیر ہو گیا۔ وہ میرا کاندھا تھپتھپا کر بولے۔

''شہزاد احمد خان! مجھے تم پر اور تمہاری صلاحیتوں پر پورا بھروسا ہے۔'' یہ کہہ کر اُنہوں نے دوبارہ اپنی چیئر سنبھال لی، اور ساتھ ہی مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر میرے چہرے پہ اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے بولے۔

''شہزاد! ہم کسی بھی صورت میں اپنے مشن کو اُدھورا نہیں چھوڑتے، ہاں، مصلحتاً یا موقع محل کے تحت اس میں تعطل آسکتا ہے یا کچھ تبدیلیاں لانی پڑتی ہیں، تم نے پاور سے متعلق اور مابعد جو باتیں کی ہیں، ان کی مماثلت کی وجہ سے ہی میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں یہ چانس دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

''تھینک یو سوچ سر!'' خوشی کے باعث یہ اظہار مسرت میرے لبوں پہ آ گیا۔ ''سر! میں انشاء اللہ ہمیشہ کی طرح آپ کی اُمیدوں پہ پورا اُترنے کی کوشش کروں گا۔''

''میری بھی تم سے ہمیشہ یہی توقعات رہی ہیں۔'' وہ مسکرا کر بولے۔ ''لیکن ایک بات یاد رکھنا شہزاد کہ یہ سب کچھ میں خالصتاً اپنی صوابدید پر کروں گا۔ اگر خدانخواستہ تمہارا یہ مشن ناکامی سے دوچار ہوا یا سندر داس نکل بھاگا تو میں محکمہ جاتی کارروائی کے زیرِ عتاب آجاؤں گا، میرا کورٹ مارشل بھی ہو سکتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ان کے بُشرے پہ یکا یک ایک گمبھیر سنجیدگی عود کر آئی تھی۔ میں نے فوراً کہا۔

''آئی نو سر! مجھے بھی اس خدشے کا احساس ہے، لیکن میں جان لڑا دوں گا اس اہم مشن کی تکمیل کے لیے لیکن سندر داس کو نکلنے نہیں دوں گا۔ اور مجھے اُمید ہے انشاء اللہ میں کامیاب رہوں گا، کیونکہ میرا دل کہتا ہے جس غفور و رحیم نے مجھے میری ماں سے ملوایا ہے، یہ ذریعہ بھی اُسی کا ہی عطا کردہ ہے، ہمت مرداں مدد خدا۔ یہ اُس رب کریم کا وعدہ ہے سر!''

میری بات پر ریاض باجوہ نے ایک بار پھر بڑی گرمجوشی سے مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور... میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں جنٹلمین!'' پھر ذرا توقف سے بولے۔ ''یہ تو شکر ہے کہ سندر داس ابھی تک میری ہی کسٹڈی میں ہے۔ لیکن میں زیادہ دیر اُسے اپنی کسٹڈی میں نہیں رکھ سکتا۔ جی ایچ کیو کے احکامات کے مطابق مجھے جلد ہی اُسے ان کے سپرد کرنا ہے۔''

''میں سمجھ گیا سر! میں انشاء اللہ بہت جلد یہ مشن نمٹانے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا چوہدری ممتاز خان کو جی ایچ کیو کے حوالے کر دیا گیا ہے؟''

''ہاں!'' اُنہوں نے مختصر جواب دیا۔

''ہمارے لیے کیا حکم ہے سر! آئی مین، کیا ہم یہاں سے کہیں اور شفٹ ہونے کی تیاری کریں؟''

''ابھی نہیں، پہلے اپنا یہ مشن نمٹاؤ، دیکھتے ہیں پھر، ابھی میٹنگ کے بعد ہی یہ فیصلہ ہو گا، تاہم تم تینوں خود کو ذہنی طور پر اس کے لیے تیار رکھو۔'' میں نے ان کی بات پر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور رخصت ہوتے وقت میجر صاحب نے میری اس جانب بھی توجہ دلوا دی تھی کہ نوشابہ والے کیس کے سلسلے میں کوئی اچھا سا وکیل بھی ہائر کرلوں، وغیرہ۔

☆☆☆

میں اپنے کوارٹر پہنچا تو شکیلہ اور راول خیر کو اپنا منتظر پایا، مگر میں ان کے چہرے دیکھ کر چونک پڑا۔ وہ دونوں ہی مجھے خاصے متفکر اور تشویش زدہ نظر آ رہے تھے۔

''تم دونوں کو کیا ہوا؟ تم دونوں خاصے پریشان دکھائی دے رہے ہو؟''

''شہزی! کیا میجر صاحب سے تمہیں کچھ پتا نہیں چلا؟'' شکیلہ نے مجھ سے مخاطب ہونے میں پہل کی تو مجھے ان کے چہروں سے ٹپکتی پریشانی اور تشویش کا کچھ اندازہ ہوا۔

''ہاں! نوشابہ کی بات تو نہیں کر رہے ہو تم؟''

''ہاں کاکے! ابھی ابھی ایک نجی ٹی وی چینل میں ہم نے اُسے ایک پریس کانفرنس کرتے ہوئے دیکھا اور سنا تھا۔ میرا دل ایسا بے چین ہوا کہ جی چاہا اسی وقت تمہارے پیچھے جاؤں اور تمہیں مطلع کردوں۔''

''چل رہی ہے پریس کانفرنس یا ختم ہو گئی۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے پوچھا تو اس بار شکیلہ نے جواب دیا۔

"ختم ہوگئی ہے، مگر شہزی! اس لڑکی نے تمہارے خلاف بڑی بکواس کی ہے اور... اس نے تو تمہیں اشاروں کنایوں میں اسٹیبلشمنٹ کا اور نجانے کن کن لوگوں کا ٹاؤٹ بھی قرار دے ڈالا ہے۔ بہت زہر اُگل رہی تھی وہ تمہارے خلاف۔"

"تم بتاؤ شہزی! میجر صاحب نے تم سے کیا کہا۔" اول خیر نے پُرفکر نظروں سے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ہم تینوں تب تک نشست گاہ میں آبیٹھے تھے، جہاں ٹی وی آن تھا۔

میں نے انہیں اپنے اور میجر صاحب کے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کردیا۔ اور یہ بھی بتایا کہ میں اپنے نئے مشن کے سلسلے میں اُن کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ ساتھ ہی ان دونوں کو بھی تسلی دی کہ انہیں اس نئی صورتِ حال سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن شکیلہ کے مقابلے میں اول خیر کے چہرے پر عدم طمانیت کے آثار جوں کے توں موجود رہے اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا، پھر میں نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

"کیا بات ہے اول خیر! تم کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آرہے ہو؟"

"پریشانی کی بات تو ہے کاکے!" وہ پُرتفکیر آواز میں بولا۔ "میرا خیال تھا پہلے نوشابہ والے معاملے سے نمٹ لیتے، اس کے بعد اس مشن میں ہاتھ ڈالتے، پھر عارفہ سے بھی ہم نے عابدہ کے سلسلے میں معاملہ داری کی بات شروع کر رکھی ہے۔ یار کاکے! تُو کیا شے ہے؟ تُو نے بیک وقت اتنے سارے معاملات میں ٹانگ پھنسا دی ہے۔ کس معاملے کو پہلے دیکھنا ہے اس کا کچھ پتا ہی نہیں چل رہا۔" وہ بے چارہ آخر میں اُلجھ سا گیا تھا۔

"شہزی جو کر رہا ہے وہ ٹھیک ہی کر رہا ہے۔" شکیلہ نے کہا۔ "حالات کی یلغار ہی ایسی ہے، ہم پر کہ یہ سارے معاملات جو تمہاری ناقص عقل میں اُلجھن کا باعث بن رہے ہیں، درحقیقت ان سب کے تانے بانے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، ایک چین ہے جسے کڑی در کڑی سلجھانا ہے۔"

شکیلہ نے اپنی فہم و فراست کے مطابق "حالات و دوراں" کا بالکل صحیح تجزیہ کیا تھا، ان سارے مذکورہ معاملات کا "لنک" کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی حوالے سے آپس میں ملتا ضرور تھا، اور حالات کا دھارا بھی ایک ہی تھا کہ اس پر اسی طرح بہا جائے۔

اگرچہ مجھے شکیلہ کی اس بات میں وزن محسوس ہوا تھا لیکن میں نے دانستہ اس کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اپنے چہرے پہ پُرسوچ خاموشی طاری رکھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اول خیر اس کے جواب میں کیا کہتا ہے؟ لہٰذا وہ مجھے خاموش پا کر اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔

"میں تم سے زیادہ شہزی کے قریب رہا ہوں، اور شروع سے لے کر اب تک کے سارے حالات کا بھی گہرا مُشاہدہ رکھتا ہوں بلکہ ان کا مجھے تجربہ بھی رہا ہے۔ شطرنج کی اس چار دانگ پھیلی بازی میں کب اور کہاں مہرہ کھسکانا چاہیے، اس کا بھی مجھے بہ خوبی ادراک ہے۔ میرے کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ بیک وقت اتنے سارے معاملات کو ہاتھ میں لینے کی وجہ سے کسی ایک معاملے پر گرفت کمزور ہونے لگتی ہے، اور انسان صحیح طور پر انصاف نہیں کر پاتا، جبکہ یہاں ہر معاملہ اپنی جگہ نازک اور حساس نوعیت کا ہے، کوئی ایک معاملہ بگڑا تو سب درہم برہم بھی ہوسکتا ہے۔"

"لو! تم نے تو خود ہی میری بات کی تصدیق کر ڈالی۔" شکیلہ نے پورے اعتماد سے مسکرا کر کہا۔ اور اول خیر بھونچکی سی صورت بنا کر اس کا چہرہ تکنے لگا، ان نازک گھڑیوں میں بھی میرے اندر ہنسی کا شگوفہ پھوٹا تھا، مگر بڑی مشکل سے میں نے اسے اپنے ہونٹوں پر "پھٹنے" سے روک کے رکھا۔ وہ اسی اعتماد سے آگے بولی۔

"تمہاری آخری بات سے یہ وضاحت ہوگئی کہ یہ سارے معاملات ایک دوسرے سے نتھی ہیں اور ایک کو چھوڑیں تو دوسرا سر اُٹھا کر آڑے آجائے گا۔ اور بدقسمتی سے یہ سب ایک ساتھ ہی سر پہ آن پڑے ہیں۔ کسے حل کیا جائے اور کسے چھوڑا جائے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ یہ سب معاملات ساتھ ساتھ ہی فیس کرنے کے متقاضی ہیں۔"

میں اب منتظر تھا کہ اول خیر کیا جواب دیتا ہے؟ لیکن میرا مقصد یہ دیکھنا نہیں تھا کہ دونوں میں سے کون زیادہ ذہین تھا اور کون کم۔ بلکہ میرے دل میں ان دونوں کے متعلق ایسی کوئی سوچ تھی ہی نہیں۔ شکیلہ کی عقل و فراست کی کسوٹی کچھ اور تھی، جبکہ اول خیر کی فہم و فطانت اور تھی۔ اور دونوں ہی فی زمانہ ضروری بھی تھیں۔ شکیلہ کی سوچ کا تھوڑا "ٹچ" مجھ سے میل کھاتا تھا، جبکہ اول خیر اس کے اُلٹ تھا۔ شکیلہ کی سوچ "ابھی" سے متعلق تھی تو اول خیر کی "کبھی" سے وابستہ۔ وہ دور اندیشی کو ملحوظ رکھنے کا عادی تھا اور شکیلہ کو کل پر بھروسا نہیں تھا۔ اُسے کل پر تشویش ہوتی تھی، نجانے کیا ہو؟ اور جو ہو وہ ابھی نمٹا دیا جائے، اول خیر دوربین تھا تو شکیلہ خوردبین۔ اور

میں ان دونوں کی باتوں کی روشنی میں اپنی عقل کی مشترکہ کسوٹی پر کوئی ایک فیصلہ صادر کر ڈالتا تھا۔ میں اسی کا منتظر تھا، جب اول خیر نے جواب میں کہا۔

''باوجود اس کے ہمیں دیکھنا یہ ہوگا کہ کون سا معاملہ اپنی ترتیب اور اہمیت کے لحاظ سے پہلے آتا ہے۔''

''ایگزیکٹلی! میں بھی تو یہی کہنا چاہ رہی تھی۔'' وہ بولی۔ تب میں نے بھی گفتگو کو حتمی شکل دیتے ہوئے درمیان میں کہا۔ ''عارفہ کے جواب کا ہمیں انتظار ہے، یہاں ہیڈ کوارٹر میں اب ہمارا کیا مستقبل ہوگا، یہ میجر باجوہ صاحب ہمیں کل صبح تک بتا دیں گے، کرنل سی جی کے ساتھی نے ہم سے خود رابطہ کرنا تھا، کب؟ یہ بھی اندھیرے میں ہے۔''

وزیر جان کا کھوج اور نوشابہ والا معاملہ ایسا ہے جس کے لیے ہمیں پہلے سوچنا ہوگا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ ضروری نوشابہ کے معاملے کو دیکھنا ہے، جس نے میرے اور اول خیر کے خلاف باقاعدہ ایف آئی آر بھی کٹوا دی ہے۔''

شکیلہ نے میری بات پر اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی تھی۔ میں نے دُزدیدہ نظروں سے اول خیر کی طرف دیکھا، وہ ہنوز کسی نامعلوم سی اُلجھن کا شکار دکھائی دے رہا تھا، اس کے چہرے کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا جیسے وہ کوئی بات کہنا چاہتا ہو، مگر کہنے کی شاید ہمت نہیں پا رہا تھا۔

اسی وقت میرے سیل کی بیل گنگنائی، ایسے میں سیل کی بیل بھی اچانک دل دھڑکا دیتی تھی۔ میں نے سیل پر نمبر دیکھا تو ایک نئی سوچ نے میرے اعصاب پر یلغار کر دی۔ کال زہرہ بانو کی تھی، میری جب سے ان کے ساتھ تلخ کلامی ہوئی تھی تب سے مجھے کم ہی اُمید تھی کہ وہ مجھ سے دوبارہ رابطہ کریں گی۔ ماں جی وہیں تھیں، ممکن ہے ان سے متعلق انہوں نے مجھ سے کوئی بات کہنا ہو، میں نے سیل کان سے لگا کر ہیلو کہا۔

میرے اور زہرہ بانو کے درمیان چونکہ کچھ ذاتی معاملات بھی تھے، اسی لیے میں نے اس کا اسپیکر وائیڈ نہیں کیا تھا اور دوسرے کمرے میں آ گیا تھا۔

''شہزی! کیسے ہو؟'' دوسری طرف سے اُن کی وہی لچکدار، اپنائیت اور ملامت آمیزی میں ڈوبی ہوئی آواز اُبھری۔ جس کی تہ میں مجھے ہمیشہ ایک حسرت کا دردناک لوچ سا بھی محسوس ہوا کرتا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں زہرہ! تم کیسی ہو؟''

''بہرحال تمہارے لہجے کا یہ بے تکلفانہ پن اور تمہارا مجھے زہرہ کہنا اچھا لگا، ورنہ تو تم بھابی کہتے تھے مجھے۔'' ان کے لہجے کی معنی خیزی نے مجھے ذرا گڑبڑا سا دیا، ایسا واقعی میرے ہونٹوں سے روا روی اور بے اختیاری میں نکل گیا تھا۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ بول پڑیں۔

''تم نے جانے کے بعد مجھ سے پھر کوئی رابطہ ہی نہیں کیا، مگر مجھے تمہاری ہر وقت فکر رہتی ہے۔ سوچا تھا کہ اس روز کی الزام تراشی کے بعد تم سے کوئی بات نہ کروں گی لیکن یہ بھلا میرے لیے کب اور کہاں ممکن ہو سکتا ہے؟ مگر تم تو رہے ہمیشہ کے بے مروت، ماں جی کے بہانے ہی فون کر لیتے کہ ہمارے بجھے ہوئے دل کو ایک خوش فہمی کا سہارا ہی ہو جاتا۔ ہمیں دیکھو بچوں کی طرح تمہارے ساتھ لڑتے ہیں اور دل میں کوئی بُغض رکھے بغیر بچوں ہی کی طرح سب کچھ بھول بھال کر خود ہی من بھی جاتے ہیں۔ کیا تم اس روز کی ناراضی ابھی تک اپنے دل میں رکھے ہوئے ہو شہزی؟'' اُنہوں نے آخر میں پوچھا۔

ان کے گداز لب و لہجے میں بہت درد تھا، بہت سوز تھا، ان کی آواز اور ان کے لہجے میں دور کہیں کسی حسرت زدہ و نارسا تمنا کی کسک بھی تھی، جس کا اظہار بھی شاید ان کے لیے عذاب ناک تھا۔ یہی وہ سب کچھ آشکارا کرتا تھا کہ وہ شکست خوردگی کا کتنا بڑا گھاؤ کھائے ہوئے تھیں۔ لیکن مجھے آج یہ سب کیوں محسوس ہوا تھا؟ خود سے سوال کیا تو میرے اندر سے بھی ایک آہ سی نکل گئی۔ میری آنکھیں بھی تو کسی کی منتظر تھیں؟ میں بھی تو عابدہ سے جدائی کا زخم کھائے ہوئے تھا۔ موسم ہجراں کے اس بے برگ و بار چمن کی زمین پر گرے ہوئے خزاں رسیدہ پتوں میں خود میں بھی تو شامل تھا جو حسرت بھری نظروں سے اس درخت کو تکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں جن پر کبھی وہ جھول کر موسمِ بہار کے گیت گایا کرتے تھے، مگر وہ اب نوحہ کناں تھے۔ تو کیا... میرا اور زہرہ بانو کا دُکھ سانجھا ہو گیا تھا؟ تو کیا... اَب میں اور زہرہ بانو رہِ اُلفت کے دو ایسے ہم رکاب بن چکے تھے، جن کی بے نشاں منزلیں بغیر کسی سنگِ میل کے طے ہو رہی تھیں، آہ... شاید آج مجھے صحیح معنوں میں زہرہ بانو کے دُکھ کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ ہاں آج... میرا دل بے اختیار ان کی طرف کھنچنے لگا تھا۔ آج مجھے اول خیر کی وہ بات یاد آ رہی تھی جو اس نے زہرہ بانو کے ساتھ ہونے والی میری تلخی کے نتیجے میں ان کی حمایت میں مجھ سے کہی تھی۔

''انسان اپنی پہلی محبت کو کبھی فراموش نہیں کرتا، اور وہ بھی ایسی محبت جو دائمی جدائی کا جاں گسل احساس بھی رکھتی ہو۔ یہی شے انسان کو ہمیشہ ایک ایسی احساسِ محرومی سے

دو چار رکھتی ہے کہ لاشعوری طور پر اپنے محبوب جیسی جھلک یا مستعار لی گئی اس سے متعلق کوئی نشانی کے لیے اس کا دل تڑپتا رہتا ہے۔ اور پھر کا کے! تُو تو پورا ہی لئیق شاہ ہے۔ اس لیے تھوڑا یہ بات سمجھنے کی کوشش کیا کر اور اتنی وسعت اپنے دل میں رکھا کر کہ کچھ حقیقتوں کے آگے ایک کمزور انسان بے بس ہوتا ہی ہے۔ یہی حال اس بے چاری بیگم صاحبہ کا بھی ہے۔''

اول خیر کے یہ الفاظ یاد کر کے آج مجھے لگا جیسے میرا بھی زہرہ بانو جیسا حال ہونے لگا ہے۔ عابدہ کی جدائی نے مجھے بھی تو ایک ایسی ہی احساسِ محرومی سے دو چار کر دیا تھا، جس میں لاشعوری طور پر وہ کسی ایسے انسان میں اپنے بچھڑے محبوب کی جھلک دیکھتا ہے، جو اس کے قریب رہتا ہو۔ جس سے ایک عرصے سے تعلق داری رہی ہو۔ اگر زہرہ بانو مجھ میں لئیق شاہ کی مماثلت کے حوالے سے اپنی کسی لاشعوری اپنائیت میں مبتلا تھی، تو کیا میں بھی ان کی نرمی، ملائمت آمیزی اور ان کے لہجے سے مترشح وارفتانہ انداز کا پیاسا ہو رہا تھا، کیا میں بھی لاشعوری طور پر اپنی کسی احساسِ محرومی کو دور کرنے کے لیے کسی مستعار گھڑیوں کا متلاشی تھا؟ یا پھر یہ آج زہرہ بانو کے لب و لہجے اور اندازِ تخاطب کا شاخسانہ تھا؟

''کیا سوچنے لگے شہزی!'' دوسری جانب سے دوبارہ ان کی لوچ دار آواز اُبھری، جس نے مجھے خیالات کے بھنور سے اُبھارا۔ نجانے کیوں ان کی آواز آج میرے دل کی تڑپ بڑھا رہی تھی۔ پریشانیوں کی یلغار میں کسی کا میٹھا اور اپنائیت بھرے لہجے کا اپنا ایک اثر ہوتا ہے۔ اور یہی اثر پذیری مجھ پر حاوی ہونے لگی تھی۔ اس قدر کے بے اختیار میرے منہ سے برآمد ہو گیا۔

''زہرہ! امم... میں بہت پریشان ہوں... آج ایسا لگتا ہے جیسے مسائل کا پورا ملبا میرے سر پہ آن گرا ہے۔''

''چلے آؤ پھر میرے پاس۔'' وہ بے اختیار جیسے وارفتانہ انداز میں بولیں۔ ''ایسے وقتوں میں انسان کسی اپنے کا ہی سہارا ڈھونڈتا ہے۔ آجاؤ' میں تمہاری منتظر ہوں۔''

انہیں شاید تازہ حالات کا علم نہ تھا اور ایسے میں مجھے انہی کے سہارے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

''گاڑی بھجوا دوں میں؟ کمیل دادا اور میرے آدمی تمہیں لینے آجائیں گے۔''

''نہیں، میں خود ہی آجاتا ہوں۔ آپ سے اور بھی... موضوعات پر گفتگو کرنی ہے مجھے۔''

''میں منتظر ہوں۔ بلا تاخیر چلے آؤ شہزی!''

''آپ ناراض تو نہیں ہیں مجھ سے۔ اس روز کی تلخ کلامی پر میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ شاید میں واقعی آپ کی طرف سے کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔''

''او... کم آن شہزی! لیواِٹ پلیز! آرہے ہو ناں پھر؟''

''میں آرہا ہوں۔''

رابطہ منقطع ہوتے ہی میں نے دوبارہ نشست گاہ کا رخ کیا تھا۔ شکیلہ اور اول خیر قدرے چونک کر میری طرف تکنے لگے۔ اول خیر کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی جیسے اُسے اندازہ ہو چکا تھا کہ فون کس کا تھا۔

''بیگم صاحبہ کا فون تھا۔'' میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ شکیلہ نے تو نہیں، البتہ اول خیر ضرور مجھے بھانپتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''او خیر... کیا کہہ رہی تھیں؟ خیریت سے تو ہیں؟ اور ماں جی؟''

''سب خیریت تھی، یوں ہی انہوں نے میری خیریت کے لیے فون کیا تھا۔'' میں نے کہا اور خاموش سا کھڑا رہا۔ میری نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔ مجھے پتا بھی نہ چلا کہ اول خیر نے شکیلہ کو کمرے سے جانے کا مخصوص اشارہ کر دیا اور میرے بالکل قریب آکر میرے کاندھے پر ہولے سے اپنا ایک ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''او خیر... کا کے! تُو نے بیگم صاحبہ سے دوبارہ تو اپنی کسی ناراضی کا اظہار نہیں کیا؟''

''نہیں یار! بلکہ میں نے تو اُن سے اپنے اُس دن والے رویّے پر معذرت بھی کر لی تھی۔''

''تو پھر کیا کہا انہوں نے؟''

''انہوں نے میری معذرت والی بات تو جیسے سرے سے سُنی ہی نہیں، بس اتنا کہا۔ ''آجاؤ میرے پاس۔'' میں جیسے عمل تنویم کے زیرِ اثر بولا۔

''وہ ایسی ہی مہربان خاتون ہیں۔ بہت محبت کرنے والی، صاف اور سچے دل کی مالک۔'' اول خیر نے بھی ایک گہری سانس بھر کے کہا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔

''شہزی! برا مت منانا میرے یار! سچی کہوں گا تجھ سے، اس وقت تجھے بیگم صاحبہ جیسی مہربان خاتون کے سہارے کی ضرورت ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جس وقت تُو بہت پریشان نظر آرہا تھا ناں، اور کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا تو پتا ہے میرے دل میں سب سے پہلے بیگم صاحبہ کا ہی خیال آرہا تھا، لیکن میں تجھ سے ان کا ذکر کرنے سے گھبرا رہا تھا۔ دیکھ لے کا کے! تُو نے ان پر ایک بڑا الزام لگایا تھا، لیکن

انہوں نے وہ سب بھلا دیا اور تجھ سے بات کیے بنا نہ رہ سکیں وہ۔ یہ تو نے اور بھی اچھا کیا کہ ان سے اپنے اس دن والے رویے پر دلی معذرت بھی کر لی۔ چل کا کے! جا۔ اب بغیر کسی غلط فہمی کے پہنچ جا ان کے پاس۔ اور اپنی ساری پریشانی بتا دے اُنہیں۔ اب تو ہمارا یہاں سے بھی بوریا بستر گول ہونے والا ہے۔ کوئی پروا نہیں اللہ مالک ہے، اور مجھے یقین ہے کہ میجر صاحب ہمیں اس طرح تنہا تو نہیں چھوڑیں گے، جیسا کہ اُنہوں نے تجھ سے وعدہ کیا ہے۔ لیکن پتا نہیں بعد کے حالات کیا ہوں۔ بیگم صاحبہ کی اور بات ہے، وہ ایک دردمند دل رکھنے والی خاتون ہیں۔ ادارہ چلانے والے یا ملکی معاملات چلانے والے لوگوں کے ہاتھ کہیں نہ کہیں بندھے ہوئے ہوتے ہیں، لیکن بیگم صاحبہ اور ان کا گروہ ہی ایک ایسا ادارہ سمجھو جو صحیح معنوں میں لوہے کو لوہے سا کاٹتا ہے۔ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہوتے۔ چل کا کے! بیگم ولا۔ آج بیگم صاحبہ کو اپنی ساری پریشانی بتا دے، کچھ مت چھپانا اُن سے۔"

"تو بھی میرے ساتھ چلے گا۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"میں تیار ہوں۔" اس نے کچھ سوچ کر اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہم بیگم ولا کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہمیں پولیس کا بھی ڈر تھا۔ مگر میجر باجوہ صاحب نے اس سلسلے میں مجھے اتنی تسلی تو دے رکھی تھی کہ جب تک میں یہاں ہوں، وہ مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکے گی۔

تھوڑی دیر بعد ہم بیگم ولا پہنچ چکے تھے تو شام جھکنے لگی تھی۔ میں بے دھڑک اول خیر کو لے کر اندر داخل ہوا۔ شاید میرے آنے کی اطلاع گیٹ پر موجود مسلح محافظوں کو کر دی گئی تھی۔ میں جہاں سے گزرتا، میرے لیے دروازے وا ہوتے چلے جاتے۔ اول خیر البتہ مصلحتاً اپنے یاروں دوستوں کے ساتھ مصروف گفتگو ہو گیا تھا۔ مجھے کچھ تبدیلی کا احساس ہوا۔ وہ یہ کہ گبیل دادا مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ پھر کسی سے پوچھنے پر پتا چلا کہ بیگم صاحبہ نے ہی اُسے باہر کہیں کسی کام سے بھیجا تھا۔

خوب صورت مرکزی محرابی دروازے کی چوکھٹ پار کر کے جیسے ہی میں نے اندر قدم رکھا تو چونک پڑا۔ سامنے زہرہ بانو کھڑی دکھائی دیں۔ اگرچہ اس میں کوئی چونکنے والی بات نہیں تھی وہ ہمیشہ میرا یہاں آنے پر عموماً اسی طرح ہی خود آ کر استقبال کرتی تھیں، لیکن آج کی بات اور تھی، آج کی ملاقات اور تھی، آج لگتا تھا جیسے کچھ خاص ہو۔ اور وہ اسی "خاصیت" سے ہی تیار ہو کر میرے سامنے کھڑی تھیں۔ پوری تیاری کے ساتھ، تیاری بھی کیسی۔ جیسے آج ان کی شادی کا دن ہو۔ ان کے عنابی ہونٹوں کی سرخی اور اس پر کھلتی دل آویز مسکراہٹ۔ ایسا کیوں تھا؟ میں یہی سمجھا تھا کہ ناراضی ڈھلنے کی خوشی میں ایسی دلہنوں جیسی سج دھج اس کا التزام قرار پایا ہو؟ ہلکا آسمانی مہین لباس، جو دیکھنے میں بالکل سادہ مگر پُرکار تھا، ایسا کہ ان کے بھرے بھرے جسم پر بالکل فٹ تھا۔ میں ایک ٹک پہلے تو انہیں دیکھتا ہی رہ گیا، وہ اپنے دلنشیں ہونٹوں پہ مسکراہٹ لیے میری طرف سج سج قدم اُٹھاتی ہوئی بڑھیں اور میں جیسے ان کے ٹرانس میں ان کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچنے پر انہوں نے اپنا نازک اندام سا ہاتھ میری جانب بڑھا دیا اور میں نے بھی بے اختیار ان کا مرمریں ہاتھ تھام لیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے یہاں آ کر ایک سُکھ ایک سکون کا احساس ہونے لگا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لیے کسی اندرونی گوشے کی طرف بڑھنے لگیں۔ ان کے بدن کی عطر بیز نکہت میرے حواسوں پہ چھا رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے دل و دماغ کا سارا بوجھ کہیں باہر چھوڑ آیا ہوں۔ اسی وقت مجھے ماں جی کا خیال آ گیا۔ میں نے ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھ لیا۔

"وہ بالکل ٹھیک ہیں اور آرام کر رہی ہیں۔ آؤ ہم کچھ دیر تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ اپنے اپنے اندر کا بوجھ اُتارتے ہیں۔"

وہ مجھے... ولا کے کسی گوشۂ تنہائی میں بنے کمرے میں لے آئی۔ کمرے کی فضا بھی معطر تھی، روم فریشنر میں گلاب کی خوشبو مہک رہی تھی، کمرے کی روشنی فقط اتنی ہی تھی کہ کچھ قریب سے سجھائی دے سکے، سامنے مسہری تھی، سرخ گاؤ تکیے فینسی اسٹائل کے سرہانے کے پاس دھرے، جیسے مکین کے ہنڈولوں کے منتظر تھے۔

"بیٹھ جاؤ یہاں۔" اس نے مجھے مسہری پر بیٹھا دیا اور خود چلتی ہوئی، ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے ہوئے موتیے کے گجرے اُٹھا لائی اور بالکل میرے پاس میرے قریب بیٹھ گئی۔ گجروں کی دل آویز خوشبو زہرہ بانو کے بدن کی مہک میں رل مل کر حواسوں پر ایک عجیب سا نشہ طاری کر رہی تھی۔ کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا، مگر جتنا مختصر تھا اتنا ہی قربت کا احساس جگا رہا تھا، بڑھا رہا تھا۔ ایسے میں زہرہ بانو نے موتیے کا وہ گجرا میری طرف بڑھا دیا اور بہت دھیرے سے بولی۔

"یہ میرے یہاں سجا دو۔" اس نے اشارے سے

بتایا۔ میں نے گجرا اس کے ہاتھ سے لیا اور تھوڑا آگے جھک کر اس کے ایک کان کے پاس اٹکا دیا، میرے ہاتھ کھینچنے سے قبل ہی اس نے میرا ہاتھ وہیں تھام کر روک دیا اور اپنا مرمریں نازک مگر جلتا تپتا گال میرے کھردرے بالوں بھرے ہاتھ سے لگا دیا۔ ایک تپش، ایک تڑپ سی میرے اندر اُٹھی تھی۔ ایسے میں میرا اور اس کا چہرہ قریب، قریب تر ہوگیا۔ اس قدر کہ سانسوں کی بازگشت بھی ایک دوسرے کو صاف سنائی دینے لگی تھی۔

''شہزی! لگتا ہے آج تم زندگی کی ایک طویل سڑک پر دوڑتے دوڑتے تھک گئے ہو۔ اور... اور آج میرے کاندھے پر اپنا سر رکھنے چلے آئے ہو۔ ہے ناں؟''

''ہاں زہرہ، میں واقعی بہت تھک سا گیا ہوں اور شاید ٹوٹ بھی رہا ہوں۔ شاید مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں میں کچھ وقت آرام اور سکون سے سو کے گزار دوں۔''

''شہزی! میرا بھی یہی حال ہے، میں بھی شاید آج ٹوٹ رہی ہوں، بکھر رہی ہوں، آؤ کہ ہم ایک دوسرے کو بچا لیں، نہ میں تمہیں ٹوٹنے دوں نہ تم مجھے بکھرنے دو۔'' کہتے ہوئے وہ میرے قریب آگئی، بہت قریب۔ اس کی آواز میں جادو تھا ایک رمز تھا، جو مجھے ٹرانس میں لے رہا تھا۔ وہ سرگوشی میں بولی ''لئیق!''

''عابدہ۔''

ایک فسوں کی وادی تھی جہاں وہ میرا ہاتھ پکڑے مجھے وہاں اُتار رہی تھی اور میں بھی اُترے جا رہا تھا۔

پتا نہیں کب اور کس وقت میری آنکھ کھلی تھی اور میں جیسے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا تھا۔ ہوش و خرد کا یارا ہوا تو سب یاد آنے لگا۔ وہ سب کچھ میرے لیے قطعاً ناقابلِ عمل ہی نہیں بلکہ ناقابلِ تصور بھی تھا۔ میں نے شکر کیا کہ یہ سب ایک خواب کے سوا کچھ نہیں تھا۔ نہ میں لئیق شاہ کی جگہ لے سکتا تھا، نہ زہرہ بانو، عابدہ کی۔ تو پھر یہ کیا تھا اور کیسا خواب تھا؟

میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے گرد و پیش میں دیکھا اور ہل کر رہ گیا۔ وہی ماحول تھا، وہی کمرا تھا اور وہی مسہری تھی جہاں میں عابدہ سے بے وفائی کا مرتکب ہوا تھا۔ مگر وہ کہاں تھی؟ زہرہ بانو۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے چکر سا آگیا۔ دماغ گھومنے لگا۔ خود کو یقین دلانے لگا۔ شہزاد احمد خان اتنا کمزور کب سے ہوگیا۔ وہ اگر ہر میدان کا شہ سوار تھا اور اب تک بہادری سے اپنے حالات اور دشمنوں سے نمٹتا چلا آرہا تھا تو پھر یہاں کیوں بزدلی پر آمادہ ہوگیا؟ کیسے؟ کیوں؟ کیا میرے ساتھ اس بار اس نے سازش کھیلی تھی، جسے اپنا سمجھتا آیا تھا؟

اسی وقت کمرے میں دم بہ خود فضا میں تالی بجنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے سر اُٹھا کے دیکھا اور میری آنکھیں یہ غیر یقینی منظر دیکھنے کے لیے پھیل سی گئیں۔

وہ عابدہ تھی۔ ستا ہوا مرجھایا ہوا چہرہ لیے، آنکھوں میں شکوہ و شکایت کے دیپ جلائے، ہونٹوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ سجائے کھڑی تھی۔

''واہ شہزی! میں تو تمہیں مردِ آہن سمجھتی تھی۔ مگر تم نے تو اپنی مردانگی یہاں پر ایک غیر عورت کے ساتھ خوب دکھا دی۔ کیا تم اسے مردانگی کہو گے، ہاں؟ نہیں شہزی۔ کم از کم ایسی مردانگی تو تمہیں بالکل شیوا نہیں دیتی تھی' تم نے بس میرا فقط یہی انتظار کیا؟ میری محبت کا یہی پاس تھا تمہاری نگاہوں میں، جسے تم نے آج ہوس کی سولی پر چڑھا دیا۔ یہ کیسا تمہارا جذبہ محبت تھا شہزی! جس نے تمہیں اس قدر کمزور بنا دیا کہ تم نے پناہ کے لیے میری بانہوں کے بجائے کسی اور کی زُلفوں کو سہارا بنا لیا۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی شہزی، کبھی بھی نہیں اور شاید تم بھی خود کو کبھی معاف نہیں کر پاؤ گے۔ تم نے آج میرا مان توڑا ہے۔ میرا دل، میرا اندر توڑ دیا ہے۔ تو کیا میں بھی خود کو بکھرنے سے بچانے کے لیے کسی غیر مرد...''

''عابدہ...!'' میں چلّا اٹھا اور مسہری سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت کمرے میں روشنی ہوگئی۔ سامنے زہرہ بانو کھڑی تھی جو اس وقت مجھے ایک زہریلی ناگن کی صورت نظر آرہی تھی۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹ میں مجھے ایک فاتحانہ سی چمک محسوس ہوئی تھی جو میری اس خوش فہمی کو پل کے پل ہوا کیے دے رہی تھی۔ جو میرے اندر ایک موہوم سی اُمید جگائے ہوئے تھی کہ ایسا کچھ نہیں ہوا ہوگا۔ مگر زہرہ بانو کی مسکراہٹ نے مجھے دہلا کر رکھ دیا تھا اندر سے۔

ایک سوالیہ نشان آنکڑے کی طرح جیسے میرے حلق میں آن اٹکا تھا کہ کیا واقعی یہ ''سب کچھ'' ہو چکا تھا؟

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرانے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

ایک آفس میں ہونے والی پراسرار اموات ۔ عملہ و آفیسر سب اس سے پریشان تھے

جنونی کیفیات کسی نہ کسی واقعے کا پیش خیمہ ہوتی ہیں . . . ماضی نے اسے ایسے جنون میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ شریفانہ اطوار چھوڑ کر جرم کی راہ پر ہو لیا . . . ہولناک اور جنون پسندی کی یہ عادت اسے مسلسل اپنے مقصد میں کامیابی سے ہم کنار کر رہی تھی . . .

جنونی

مریم کے خان

معین الدین نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کرسی کو گھما کر دفتر کا معائنہ کیا۔ اس کے سامنے گلاس ٹاپ میز تھی۔ جدید ترین مصنوعی لکڑی کی بنی یہ میز شاید حال ہی میں یہاں لگی تھی کیونکہ اس سے ابھی تک خوشبو آ رہی تھی۔ فرش پر گہرے ہرے رنگ کا قالین تھا۔ اگرچہ یہ پرانا تھا مگر صاف ستھرا قالین تھا۔ ایک طرف پوری دیوار کے ساتھ کتابوں اور چیزوں کے لیے ریک تھا۔ ریک کا نچلا حصہ فائلیں رکھنے کے لیے تھا اور اس پر بڑے اہتمام سے مضبوط

لاک لگا ہوا تھا۔ میز کے دوسری طرف دو عدد اسی ڈیزائن کی لیکن کسی قدر ہلکے معیار کی کرسیاں تھیں اور ایک طرف دیوار کے ساتھ ایک ٹو سیٹر صوفہ سیٹ مع چھوٹی سی ٹیبل کے تھا۔ کمرا ویسا ہی تھا جیسا کہ ایک سترہ گریڈ کے افسر کا ہونا چاہیے تھا۔
معین نے فیڈرل سول سروس کا امتحان کامیابی سے بلکہ امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔ ٹیسٹ وانٹرویو کے بعد وہ اپنی جاب پر آیا تھا۔
آج اس کا دفتر میں پہلا دن تھا۔ وہ بہ طور سیکشن آفیسر پوسٹ ہوا تھا۔ کمرے کے عقب میں دیوار پر کھڑکی کے ساتھ لگا ہوا ونڈو اے سی فی الحال بند تھا کیونکہ سرما کا آغاز تھا اور موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ اے سی کے بجائے اس نے کھڑکی کھول لی تھی جس سے عمارت کے عقب میں واقع جنگل سے خوشبو آمیز سرسراتی ہوئی ہوا آرہی تھی۔ دو دن پہلے وہ اپنے شہر سے یہاں وارد ہوا تو کسی جدوجہد اور کوشش کے بغیر اسے آفیسرز ہاسٹل میں کمرا مل گیا۔ کیونکہ انہوں نے اس کی آمد سے پہلے اس کے لیے کمرے کا بندوبست کر لیا تھا۔ فی الحال اس کے پاس گاڑی نہیں تھی مگر خالو نے اپنی ایک چھوٹی کار اسے استعمال کے لیے دے دی تھی۔ کیونکہ خالہ اس سے بہت پیار کرتی تھیں اس لیے خالو مہربان تھے۔
آج پہلا دن تھا اور کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہوا تھا۔ کونے میں دیوار کے اوپر لگا ہوا ایل ای ڈی ٹی وی خراب تھا یا شاید کسی افسر نے اسے اپنے گھر کے خراب ایل ای ڈی سے بدل دیا تھا۔ بہرحال یہ کام نہیں کر رہا تھا۔ سامنے چند فائلیں ایک پلاسٹک ٹرے میں رکھی تھیں۔ ہولڈر میں پین اور دوسرے لوازمات تھے۔ میز پر کمپیوٹر کی کمی تھی۔ اس نے چارج لیتے ہی متعلقہ افسر منیر رحمان سے کمپیوٹر کا مطالبہ کیا تھا اور اس نے یقین دلایا تھا کہ دو دن کے اندر اس کی میز پر نیا کمپیوٹر موجود ہو گا۔ یہاں وائی فائی نہیں تھا ورنہ وہ اپنے موبائل پر کچھ وقت گزاری کر لیتا۔ اسے سیما کا خیال آرہا تھا جو اس کی منگیتر تھی اور ان دنوں تعلیم حاصل کرنے کے لیے یو کے میں تھی۔ وہ اسکائپ اور واٹس ایپ پر ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے تھے۔
دہشت گردی کے واقعات کے بعد دارالحکومت کے اہم سرکاری اداروں میں جیمر نصب کر دیے گئے تھے اور یہاں موبائل فون سروس کام نہیں کرتی تھی۔ پہلے وائی فائی تھا مگر وہ بھی اسی خدشے کی وجہ سے بند کر دیا، اب صرف وائر کی مدد سے انٹرنیٹ استعمال کیا جا سکتا تھا اور اس کے لیے کمپیوٹر لازمی تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ دروازہ کھلا اور اس کا پیون سراج بابا اندر آیا۔ اس کا نام سراج الدین تھا مگر دفتر میں سب ہی اسے سراج بابا کہتے تھے۔ وہ تقریباً پچپن چھپن برس کا دبلا پتلا لیکن مستعد آدمی تھا۔ وہ گزشتہ پینتیس برس سے یہاں کام کر رہا تھا۔ جس وقت وہ بھرتی ہوا تو چپراسی کے لیے تعلیم کی شرط نہیں تھی اسی وجہ سے وہ بھرتی ہو گیا ورنہ وہ صرف تین جماعت پڑھا ہوا تھا۔ اب چپراسی کے لیے بھی میٹرک کی تعلیم لازمی تھی۔ معمولی تعلیم کے باوجود طویل ملازمت نے اسے ادب و آداب سکھا دیے تھے۔ وہ بہت نستعلیق لہجے میں بات کرتا تھا اور ہر جملے میں سر ضرور استعمال کرتا تھا۔ اپنے افسر کا اشارۂ ابرو سمجھتا تھا اور اسی وجہ سے اتنے عرصے سے اسی جگہ کام کر رہا تھا۔
''سر، کسی چیز کی ضرورت ہے؟''
''چائے لے آؤ۔'' معین نے کہا۔ ''آج کوئی کام نہیں ہے اس لیے بوریت ہے۔''
''سر، کام بہت ہے۔'' سراج بابا نے کہا۔ ''مگر گزشتہ ایک سال سے یہاں جو ہو رہا ہے اس وجہ سے اس دفتر کے لیے کام کم رہ گیا ہے۔''
معین نے بھی اس بارے میں سنا تھا مگر سرسری سا اور وہ ایسی باتوں کو اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اس پوسٹ پر آنے والے تین افسران گزشتہ ایک سال میں غیر طبعی موت کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ معین نے سراج بابا سے کہا۔ ''ہاں میں نے سنا تھا۔ تم چائے لے آؤ اس کے بعد مجھے اس بارے میں بتانا، کچھ وقت ہی کٹ جائے گا۔''
سراج بابا چلا گیا۔ معین نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اس کا دفتر چوتھی منزل پر تھا۔ یہاں سے جنگل اور اس کے عقب میں دور پہاڑوں کا منظر واضح دکھائی دے رہا تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور اس میں سارا منظر بہت واضح تھا۔ سراج بابا چائے کی ٹرالی سجا کر لایا اور صوفے پر بیٹھ کر چائے بنانے لگا۔ اس کی حرکات نپی تلی اور موزوں تھیں۔ صاف پتلون قمیص اور سلیقے سے بنے بالوں اور داڑھی کے ساتھ وہ اچھا لگ رہا تھا۔ البتہ سر اور داڑھی کے بیشتر بال سفید ہو گئے تھے۔ معین نے چائے

لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے سرسری سا سنا ہے، یہاں کیا ہوا تھا؟''

سراج بابا کے چہرے پر دکھ چھا گیا۔ اس نے گہری سانس لی۔ ''پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی اس دفتر کو سر۔ جب میں نوکر ہو کر آیا تو یہاں ضمیر شاہ صاحب تھے۔ ان کے ساتھ میں چار برس رہا۔ بہت اچھے آدمی تھے اور بہت خیال کرتے تھے۔ پھر وہ چلے گئے اور دوسرے افسران آتے رہے۔ ایک سال پہلے صغیر صاحب آئے۔'' یہ کہتے ہوئے سراج بابا کے چہرے پر دکھ کا تاثر گہرا ہو گیا۔ ''بہت خوب صورت اور اچھے نوجوان تھے۔ وہ براہِ راست پوسٹ پر آئے تھے۔ مگر مشکل سے ایک مہینا نہیں گزرا تھا کہ لفٹ میں گر گئے۔''

معین نے پوچھا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ لفٹ گر گئی؟''

''نہیں جی، وہ پریشان تھے۔ اصل میں ان سے ایک اہم فائل مس ہو گئی تھی۔ اوپر سے دباؤ تھا اور نئی نئی جاب تھی۔ پریشانی میں آدمی کا دماغ کہاں کام کرتا ہے۔ شام کو جاتے ہوئے انہوں نے لفٹ کا بٹن دبایا اور دروازہ کھلا تو وہ سمجھے کہ لفٹ آ گئی ہے۔ انہوں نے بے دھیانی میں اندر قدم رکھ دیا مگر لفٹ اوپر تھی۔ وہ نیچے گر گئے......'' سراج بابا چپ ہو گیا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''شام چھ بجے کے بعد ایک لفٹ آن ہوتی ہے دو بند کر دی جاتی ہیں۔ کوئی ساتھ بھی نہیں تھا اس وقت تک ساری بلڈنگ خالی ہو گئی تھی۔ صفائی کرنے والے نے لفٹ کا دروازہ کھلا دیکھ کر جھانکا تو......''

''ان کے گھر والوں پر تو قیامت گزر گئی ہو گی۔''

''غریب گھرے تھے۔ ادھر کسی سے دوستی اور جان پہچان نہیں تھی۔ ان کی میت بھی میں ان کے گاؤں لے گیا تھا۔''

''افسوس ہوا۔'' معین نے چائے کی چسکی لے کر کہا۔ ''تم چائے اچھی بناتے ہو۔''

سراج بابا خوش ہو گیا۔ ''برسوں سے یہاں ہوں صرف ایک بار پسند ناپسند کا بتانا پڑتا ہے سر۔ اللہ کی مرضی ہو تو اور بات ہے ورنہ کبھی کسی کو شکایت نہیں ہوئی۔''

''اچھا اس کے بعد کیا ہوا؟''

''ادھر چار مہینے دفتر خالی پڑا رہا۔ میں صبح آتا اور صفائی کر کے بیٹھ جاتا اور شام کو گھر چلا جاتا۔ کام کا عادی ہوں اس لیے فارغ بیٹھنا پڑا تو بہت مشکل ہوئی۔ پھر کامران صاحب آ گئے۔ ان کے والد بھی بیوروکریٹ رہے ہیں۔ اچھی فیملی سے تعلق تھا۔ تھوڑے شوقین مزاج تھے مگر دل کے بہت اچھے تھے۔ مجھ سے عزت سے پیش آتے تھے۔ بلکہ وہ کیا میں نے آج تک جتنے بھی افسروں کے ساتھ کام کیا کبھی کسی نے بے عزت نہیں کیا۔ غلطی بھی ہوئی تو اکیلے میں بلا کر ڈانٹا۔ سب کے سامنے کسی نے بے عزت نہیں کیا۔''

کوئی اور موقع ہوتا تو معین شاید اتنی لمبی بات نہ سنتا مگر اس وقت وہ سننے کے موڈ میں تھا۔ اسی لمحے سراج بابا کو بھی احساس ہوا کہ وہ زیادہ بول رہا ہے۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''سر، اگر آپ کہیں تو میں مختصر الفاظ میں سناؤں، بوڑھا آدمی ہوں اور آدمی بوڑھا ہو کر زیادہ بولنے لگتا ہے۔''

''نہیں بابا تم تفصیل سے سناؤ۔ آج کام نہیں ہے وقت اسی طرح کٹے۔''

سراج بابا نے مطمئن ہو کر بات جاری رکھی۔ ''کامران صاحب بھی اچھے خوبرو جوان آدمی تھے۔ ان کی دوسری پوسٹنگ تھی۔ ایک سال وہ دوسرے سیکشن میں رہے تھے۔ پھر یہاں تبادلہ کرا لیا۔ آرام سے دفتر آتے تھے اور جلدی چلے جاتے تھے مگر اپنا کام پورا کرتے تھے۔ اگر کسی دن کام زیادہ ہوتا تو وہ دیر تک بھی رکتے تھے مگر روز کا کام روز کرتے تھے۔ جب جلدی جاتے تو مجھے بھی چھٹی کرنے کو کہہ دیتے تھے مگر جب دیر تک رکتے تو مجھے کہتے کہ میں وقت پر چلا جاؤں۔ مگر مجھے اچھا نہیں لگتا کہ افسر کام کر رہا ہو اور میں چھٹی کر کے چلا جاؤں۔ انہیں چائے پانی یا کسی چیز کی ضرورت پڑتی تو خود اٹھنا پڑتا۔ انہیں بھی بس دو مہینے گزارنا نصیب ہوئے۔

''ایک دن چھٹی کے وقت وہ سیڑھیوں سے اتر رہے تھے کہ ان کا پاؤں سلپ ہوا یا نہ جانے کیا ہوا۔ وہ نیچے گرے اور ان کے سر پر شدید چوٹ آئی۔ اتفاق سے اس دن وہ دیر تک رکے تھے اور میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے میں ذرا جلدی چلا گیا۔ نہ جانے کتنی دیر پڑے رہے۔ پھر رات کے چوکیدار نے انہیں دیکھا تو ایمبولینس بلوائی اور انہیں اسپتال لے جایا گیا مگر ڈاکٹروں نے بتایا کہ ان کا بہت دیر پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اگلے دن میں دفتر آیا تو یہاں سوگ کا سماں تھا۔ کامران صاحب کے والد بیرونِ ملک تھے ان کے انتقال کا سن کر آئے تھے۔ پورا دفتر ان سے تعزیت کرنے گیا تھا۔ میں بھی گیا تھا مگر وہاں بڑے

بڑے لوگ تھے۔ ہم جیسے چھوٹے ملازمین کو موقع ہی نہیں ملا۔ بس باہر سے دعا کر کے واپس آگئے۔''

''پولیس نے تفتیش کی تھی؟''

''ہاں جی پولیس آئی تھی اور اس نے پوری تفتیش کی اور پھر اسے حادثہ قرار دیا۔ جیسے صغیر صاحب کا واقعہ حادثہ قرار دے دیا گیا تھا۔''

معین نے دلچسپی لی۔ ''وہ بھی حادثہ ہی تھا۔''

''دیکھا جائے تو حادثہ ہی تھا لیکن اصل قصور تو لفٹ کی خرابی کا تھا اور ان لوگوں کا تھا جو اس کی مرمت کے ذمے دار تھے لیکن کسی کو کچھ نہیں کہا۔ ایک بندہ اپنی جان سے گیا اور محکمے نے کوئی ایکشن ہی نہیں لیا۔''

معین نے نرمی سے کہا۔ ''ایسا نہیں ہے، ایکشن اس وقت لیا جاتا ہے جب کوئی قصوروار ہو۔ کیا لفٹ میں پہلے سے خرابی تھی؟''

''پتا نہیں سر لیکن اس وقت تو لفٹ خراب ہی تھی۔''

''تب ہو سکتا ہے کہ لفٹ خراب ہی اس وقت ہوئی ہو اور صغیر کا وقت آ گیا ہو بھی وہ اس کا شکار ہوا۔''

سراج بابا کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ اس سے متفق نہیں تھا۔ پھر اس نے بات آگے بڑھائی۔ ''سب سے برا عظمت صاحب کے ساتھ ہوا۔ دیکھا جائے تو انہوں نے خود اپنے ساتھ برا کیا۔ وہ پینے کے عادی تھے۔ دفتر میں بھی پیتے تھے۔ کام کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ان کا تعلق ایک بڑے جاگیردار گھرانے سے تھا۔ خاندان کے کئی بندے وزیر مشیر لگے ہوئے تھے۔ انہیں ملازمت کی پروا کہاں ہوتی۔ چائے پانی کا شوق نہیں تھا، کام کی پروا نہیں کرتے تھے اس لیے میری ضرورت بھی کم پڑتی تھی۔ بہت ہوا تو شراب کے گلاس دھلوا لیتے تھے۔ آتے ہوئے بوتل ساتھ لاتے اور پینا شروع کر دیتے تھے۔ اکثر اتنی پی جاتے کہ مدہوش ہو جاتے اور چھٹی کے بعد بھی یہیں پڑے رہتے تھے۔ سارا دفتر چھٹی کر کے چلا جاتا پر وہ ہوتے تھے۔

وہ یہ جاتی سردیوں کے دن تھے۔ اس روز بارش ہوئی تھی اور ٹھنڈا چانک ہی بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے مجھ سے ہیٹر آن کرنے کو کہا۔ وہ بہت نشے میں تھے۔ میں نے ہیٹر آن کر دیا۔ چھٹی کا وقت آیا تو وہ سو رہے تھے۔ میں ان سے اجازت لے کر جاتا تھا ورنہ وہ ڈانٹتے تھے۔ مگر جب ایک گھنٹا اوپر ہو گیا اور رات ہو گئی تو مجبوراً میں چھٹی کر کے گھر چلا گیا۔ پتا نہیں کیا ہوا، گیس پریشر میں مسئلہ ہوا تھا یا ہیٹر میں۔ ہیٹر بند ہو گیا مگر گیس خارج ہوتی رہی۔ کمرا بند تھا۔ اس لیے گیس باہر نہیں نکلی اور عظمت صاحب کا دم گھٹ گیا۔ جب انہوں نے اپنی بیوی کا فون ریسیو نہیں کیا تو انہوں نے ملازم کو بھیجا۔ ان کی گاڑی یہاں پارکنگ میں موجود تھی۔ اوپر آ کر ان کا کمرا کھولا تو وہ دم گھٹنے سے مر چکے تھے۔ کیونکہ ان کا تعلق ایک بڑے گھرانے سے تھا اس لیے ہاہاکار مچ گئی۔ پولیس تفتیش کرنے آگئی اور مجھے بھی پکڑ لیا۔ مگر میرا کیا قصور تھا، دو دن تھانے میں بند رکھ کر چھوڑ دیا۔''

''ہاں اس میں تمہارا کیا قصور۔'' معین نے تائید کی۔

''اس کے بعد چھ مہینے تک دفتر بند پڑا رہا، میرا مطلب ہے کہ خالی رہا۔ اب آپ آئے ہیں۔''

معین مسکرایا۔ ''دیکھو مجھے کتنے عرصے یہاں کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔''

''اللہ نے چاہا تو آپ اس دفتر سے ترقی پا کر جائیں گے سر۔'' سراج بابا نے دعائیہ انداز میں کہا۔

''موت و زندگی اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔'' معین نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ دعا کرو کہ اللہ دونوں جہانوں میں اچھا کرے۔''

''جی، سر ایسا ہی ہوگا۔'' سراج بابا نے کہا پھر چائے کا پوچھا اور اس کے مزید چائے کا منع کرنے پر ٹرالی واپس لے گیا۔ کچھ دیر بعد سیما کی کال آگئی۔

''مبارک ہو آج جوائننگ ہے۔''

''ہو بھی گئی۔'' معین نے جواب دیا۔ ''مگر صبح سے بیٹھا مکھیاں مار رہا ہوں۔ وہ بھی محاورتاً ورنہ یہاں مارنے کے لیے مکھیاں بھی نہیں ہیں۔''

''اوہ سوری! اصل میں، میں ابھی اٹھی ہوں اور یہاں صبح ہوئی ہے بلکہ نام نہاد ہی صبح ہے۔ آسمان پر گہرے بادل ہیں اور نہایت تیز اور ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ بستر سے نکلنے کو دل نہیں چاہ رہا مگر آدھے گھنٹے بعد کلاس ہے۔''

''کس جنجال میں خود کو پھنسا لیا ہے۔ اس سے اچھا تھا کہ یہاں ہوتیں اور میں تمہیں اپنے ساتھ لے آتا۔ سچ بہت بور ہو رہا ہوں۔''

''بس پاپا کی ضد کہ یوکے سے ڈگری لینی ہے۔'' سیما نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ورنہ میرا کون سا ارادہ تھا اور سناؤ وہاں کا حال احوال؟''

جواب میں معین نے اسے اپنے پیش روؤں کا احوال سنایا جو جوائننگ کے بعد زیادہ عرصے زندہ نہیں رہے تھے۔ آخر میں اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ''دیکھو میری باری

کب تک آتی ہے۔''

''اللہ نہ کرے۔'' سیمانے دہل کر کہا۔''کیسی باتیں کررہے ہو۔مگر یہ سب کیا ہے؟''

''اسے اتفاق کہا جاسکتا ہے۔''

''کہیں ان اموات میں کسی شخص کا ہاتھ نہ ہو۔''

''کس کا ہاتھ ہوسکتا ہے، وہ تینوں بالکل الگ اور الگ پس منظر کے لوگ تھے۔کوئی انہیں کیوں مارنے لگا۔''

''ممکن ہے اس سیٹ پر کسی کی نظر ہو۔''

''سیما جان تم بائیولوجی میں ماسٹر کررہی ہو۔ کرمنالوجی میں نہیں۔ بھلا ایک سیٹ کی خاطر کون تین بندے مار سکتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ بہ ظاہر حادثہ لگے اور اس سیٹ پر تو میں آیا ہوں، اگر مارنے والا اتنا ہی چالاک تھا تو اسے اس سیٹ پر آنا چاہیے تھا۔''

''ہوسکتا ہے کہ کوئی چکر ہو۔ اصل میں لگا تار تین اموات اتفاق یا حادثہ نہیں ہوسکتیں۔''

''یہ دنیا اتفاقات کا گھر ہے، یہاں ہونے کو کیا نہیں ہوسکتا۔''

''پلیز تم محتاط رہنا۔'' سیمانے التجا کی۔''سیٹ والی بات میں نے ایسے ہی کی تھی۔مگر سوچو کہ اس دفتر سے تعلق رکھنے والے تین افراد غیر فطری موت کا شکار ہوچکے ہیں۔ کوئی اور بات بھی ہوسکتی ہے۔''

سیما کی اس بات نے معین کو بھی سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔اس نے وعدہ کیا۔''اوکے میں سوچوں گا۔''

سراج بابا نے اسے خاصی حد تک معلومات دی تھیں لیکن واقعات کے اصل حقائق سے وہی لوگ واقف ہوسکتے تھے جنہوں نے ان کیسوں کی تفتیش کی ہوگی۔

پھر معین نے دفتر کے بجائے کلب میں اس موضوع پر بات کرنا مناسب سمجھا۔ ہاسٹل کے بعد اس نے جو دوسری جگہ دیکھی تھی وہ آفیسر کلب تھا۔کلب کیا ایک الگ دنیا تھی جسے بیوروکریٹس نے اپنی مرضی سے بنایا ہوا تھا اور وہاں ہر سہولت اور تفریح تھی۔معین کی خالو سے ملاقات یہیں ہوئی تھی اور انہوں نے اس کا تعارف اپنے سرکل میں کرایا تھا جس میں معین بھی آنے والے وقتوں میں شامل ہوتا۔ فی الحال تو یہ طاقتور بیوروکریٹس کا ایک گروپ تھا جس میں نیا فرد اسی وقت شامل ہوتا تھا جب ایک فرد ریٹائر ہوکر یہاں سے نکل جاتا تھا۔معین کی باری بہت دور تھی۔خالو نے اسے نصیحت کی تھی کہ وہ ہفتے میں ایک دو دن کلب کا چکر لگاتا رہے۔ کیونکہ جو مسائل یہاں آسانی سے حل ہوجاتے تھے وہ دفتر میں بہت مشکل سے بھی حل نہیں ہوتے تھے۔

☆☆☆

ایک مہینے بعد جاکر معین کا حلقہ سیٹ ہوا تھا۔کلب میں ابتدائی دن بہت بور گزرے تھے۔ نئے افسران ابھی تک اکیڈمی کی تربیت سے نہیں نکلے تھے اور وہ بات بھی ناپ تول کر کرتے تھے۔درمیانے درجے کے افسران نیچے والوں کو منہ نہیں لگاتے تھے جیسے اوپر والے نیچے والوں کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ معین کو ذرا مشکل پیش آئی مگر وہ زبان کا تیز اور ہنسنے ہنسانے والا آدمی تھا اس لیے اسے زیادہ دیر بھی نہیں لگی۔ اس نے نیشنل آرٹ کالج سے گریجویشن کیا تھا اور اس کا اس کی شخصیت پر گہرا اثر آیا تھا۔ جنید اور صدیق اس کے اچھے دوست بن گئے تھے۔ اتفاق سے وہ بھی دوسرے شہروں سے آئے تھے اور ہاسٹل میں مقیم تھے۔ جنید آئی بی میں تھا جبکہ صدیق پولیس کے امور کی دیکھ بھال کرنے والے سیکشن سے تعلق رکھتا تھا۔ اس دوران میں اپنے پیش روؤں کی غیر فطری موت اس کے ذہن سے محو ہوگئی تھی۔ حالانکہ اس نے سوچا تھا کہ اس بارے میں پولیس رپورٹس تو دیکھے گا۔

سراج بابا کی بات درست ثابت ہوئی تھی۔ کام آیا تو اتنا آیا کہ اسے سر کھجانے کی فرصت بھی مشکل سے ملتی تھی۔ اس نے صرف سیما سے رابطے میں رہنے کے لیے تھری جی انٹرنیٹ وائی فائی ڈیوائس لے لی تھی جسے وہ ساتھ لاتا اور دفتر میں کمپیوٹر کی یو ایس بی میں لگا دیتا تھا۔ مگر کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ مشکل سے چند ایک میسج سیما کو کرپاتا تھا اور اس کے آئے میسج شام کو یا رات کو ہاسٹل میں جاکر سنتا اور جواب دیتا تھا۔ ہفتے میں تین دن اس نے کلب کے لیے مخصوص کررکھے تھے۔ جنید اور صدیق تقریباً سارے ہفتے آتے تھے۔ اس لیے معین کی ان سے ملاقات لازمی ہوتی تھی۔ معین دفتر سے سیدھا یہیں آتا اور چند گھنٹے وہاں گزار کر اور ڈنر کے بعد واپس جاتا تھا۔ وقت گزاری کے لیے وہ گپ شپ کرتے تھے یا پھر اسنوکر کھیلتے تھے۔ ایک شام اسنوکر میں صدیق نے شاٹ مارتے ہوئے اس سے کہا۔

''ہوشیار رہنا.... تمہارا دوسرا مہینا شروع ہوگیا ہے۔''

''ہوشیار! کس سے؟'' معین نے ٹیبل کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں اپنے تین پریویس کا انجام یاد نہیں ہے؟''

معین نے شاٹ مارا۔''بالکل یاد ہے بلکہ میرے

نے مکمل رپورٹ بھی دی تھی جو یقیناً پولیس رپورٹ سے خاصی بہتر ہوگی۔''
''شاید۔'' صدیق نے سر ہلایا۔ ''ویسے میں نے کل فائل دیکھی ہے۔''
معین نے پہلی بار دلچسپی لی۔ ''کیا میں دیکھ سکتا ہوں؟''
''کیوں نہیں لیکن میرے دفتر آنا ہوگا۔''
''میں اپنا دفتر چھوڑ کر تمہارے دفتر آؤں۔'' معین ہنسا۔ ''نہیں، تم کل فائل یہاں لے آنا کسی سادہ کور میں۔''
''تاکہ سارا محکمہ جان جائے کہ ہم یہاں دفتر کی فائلیں لاتے ہیں اور افسران کو رگڑنے کا موقع مل جائے۔''
''اوکے تم مجھے اس کی کاپی لا دینا۔'' معین نے متبادل پیش کیا اور اس بار صدیق مان گیا۔ اس نے اگلے دن معین کو فائل کی کاپی لا دی۔ اس میں پولیس کی رپورٹس تھیں اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹیں بھی۔ معین نے فائل اپنے بریف کیس میں رکھ لی۔ اس رات وہ دیر سے ہاسٹل پہنچا تھا۔ اس لیے فائل نہیں دیکھ سکا۔ اگلے دن دفتر میں سراج بابا نے چائے اور لوازمات سرو کرنے کے دوران اپنے تین سابق افسروں کا ذکر کیا تو معین نے اسے بتایا۔ ''میں نے ان کیسز کی فائل منگوائی ہے لیکن ابھی دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہے۔''
''کیا اس میں الگ سے کوئی بات ہوگی سر؟''
''ہاں پولیس اور ڈاکٹر کی رپورٹس بہرحال ہماری معلومات سے زیادہ ہوتی ہیں۔''
''اس سے کیا ہوگا۔ جانے والے تو جا چکے ہیں سر۔'' سراج بابا نے افسردگی سے کہا۔
معین نے ابھی تک نہیں سوچا تھا کہ وہ رپورٹ دیکھ کر کیا کرے گا۔ سراج بابا کی بات سے اسے خیال آیا اور اسے لگا کہ سیما کی بات اس کے ذہن سے نکلی نہیں تھی۔ شاید تبھی اس نے رپورٹ منگوائی تھی۔ اس نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ ان حادثات کے پیچھے کوئی اور کہانی ہو۔''
سراج بابا چونکا۔ ''سر، آپ کا مطلب ہے کوئی بندہ اس میں ملوث ہوسکتا ہے؟''
''اس دنیا میں ہونے کو کیا نہیں ہوسکتا۔''
''اگر ایسا ہے تو اسے پکڑا جانا چاہیے۔ مگر پولیس نے تو کسی کو بھی نہیں پکڑا۔''
''تم جانتے ہو ہماری پولیس کی کارکردگی جب تک اوپر سے دباؤ نہ پڑے یہ حرکت بھی نہیں کرتے۔''
''صغیر صاحب عام سے گھرانے سے تھے سر لیکن کامران اور عظمت صاحب تو بڑے گھرانوں سے تھے۔ پولیس نے ان کے لیے بھی کچھ نہیں کیا۔''
اگر انہیں شک ہوتا کہ موت کی وجہ حادثہ نہیں ہے اور اس میں کوئی فرد ملوث ہے تو وہ پولیس پر دباؤ ڈالتے اور پھر پولیس دوسرے انداز میں تفتیش کرتی مگر انہیں شک ہی نہیں ہوا۔''
سراج بابا نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''شک تو یہاں بھی کسی کو نہیں ہے۔ پر لوگ تعجب کرتے ہیں کہ ایک ہی دفتر میں آنے والے تین نئے افسران کی اموات ہوئی ہیں۔''
''کسی پر شک بھی کیا جاتا ہے؟''
''بعض لوگ منیر صاحب پر شک کرتے ہیں مگر وہ ایسے آدمی نہیں ہیں۔''
معین، منیر رحمان کو جانتا تھا۔ وہ ایڈمن آفیسر تھا اور نیچے سے ترقی کر کے اوپر آیا تھا۔ وہ اپنے رینک میں سب سے سینئر آدمی تھا اور اگر اسے سترہ گریڈ مل جاتا تو اس پوسٹ کا وہی حقدار بنتا تھا مگر فی الحال وہ سولہ گریڈ کا افسر تھا۔ یہاں کی انوینٹری اور عمارت کی مینٹی ننس اسی کے پاس تھی۔ وہ ذرا اکھڑ اور غصہ ور قسم کا آدمی تھا۔ بعض اوقات افسرانِ بالا سے بھی تکرار کر بیٹھتا تھا شاید اسی وجہ سے وہ پچیس برس میں سولہ گریڈ تک پہنچا تھا۔ لیکن اس میں شبہ نہیں تھا کہ اپنے کام میں ماہر تھا۔ اس لحاظ سے اس کی فائل مکمل تھی۔ اس کے پاس ماسٹر کی ڈگری بھی تھی۔ منیر کی عمر پینتالیس سال تھی مگر اپنی مضبوط جسامت اور بے داغ چہرے کی وجہ سے وہ پینتیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا اور پینتیس کا بھی اس وجہ سے کہ اس کے بال کنپٹی سے سفید ہوگئے تھے۔ اگر وہ انہیں رنگ لیتا تو اور بھی کم عمر لگتا۔ وقت کا حد سے زیادہ پابند تھا۔ شدید قسم کا طوفانی موسم بھی اسے وقت پر دفتر آنے سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ چند مہینے پہلے بدترین قسم کی خراب سیاسی صورتِ حال میں بھی وہ دفتر آنے والے چند ملازمین میں شامل تھا۔ معین سے اس کا دو تین بار ہی واسطہ پڑا تھا اور اس نے منیر کو سرد مزاج شخص پایا تھا۔
سراج بابا نے اگرچہ اسے اچھا انسان قرار دیا تھا مگر معین سوچنے پر مجبور ہوگیا۔ دیکھا جائے تو منیر شک کا حق دار بنتا تھا۔ پچیس سال کی طویل ملازمت کرنے کے بعد بھی وہ جس سیٹ پر صرف اس لیے نہیں آسکا تھا کہ سترہ گریڈ کا نہیں تھا۔ اس پر مقابلے کا امتحان دینے والے براہِ راست آرہے تھے۔ یہ بات اسے طیش دلانے کے لیے کافی تھی۔
معین نے سراج بابا سے پوچھا۔ ''اس عمارت کی مینٹی ننس

کی ذمّے داری منیر رحمان کے پاس ہے؟''

''جی، منیر صاحب کے پاس ہے۔'' سراج بابا نے کہا۔ ''مگر یہ اضافی ذمّے داری ہے جو ان پر ہے۔ وہ اصل میں انوینٹری کے انچارج ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے لفٹ کی مرمت اور دیکھ بھال ان ہی کے ذمّے آتی ہے؟''

''جی، ان کے ذمّے آتی ہے لیکن وہ ایسے آدمی نہیں ہیں جو اپنی ذمّے داری پوری نہ کریں۔ جیسے ہی ان کے پاس کوئی درخواست یا شکایت آتی ہے وہ اس پر فوری ایکشن لیتے ہیں۔''

یہ تو معین نے بھی دیکھا تھا کہ عام سرکاری دفاتر کے مقابلے میں یہاں مرمت کا کوئی بھی مسئلہ فوری حل کیا جاتا تھا۔ نہ تو بلب خراب ہوتے تھے اور نہ ہی نل ٹپکتے تھے۔ اس کے کمرے میں نئے ماڈل کا کمپیوٹر دو دن بعد ہی لگ گیا تھا۔ عمارت کی صفائی ستھرائی مکمل رہتی تھی اور کہیں ایک دھبا یا کاغذ کا ٹکڑا پڑا نظر نہیں آتا تھا۔ ظاہر ہے یہ سب منیر کی مستعدی اور انتظام کاری کا نتیجہ تھا۔ وہ دفتر میں اپنے ساتھ کے ملازمین سے بھی زیادہ بے تکلف نہیں تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا اور شام چھ بجے اپنی سیٹ سے اٹھ جاتا تھا۔ اسے شاذ ہی شام چھ بجے کے بعد یا گپ شپ کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ آج کام زیادہ نہیں تھا۔ معین ساڑھے پانچ بجے دفتر سے اٹھ گیا۔

اس کا کلب جانے کا موڈ نہیں تھا اس لیے وہ ہاسٹل چلا گیا۔ فریش ہو کر اس نے میس کا رخ کیا۔ ڈنر کے بعد وہ پھر کمرے میں آیا۔ اس نے اپنے لیے چائے منگوائی اور فائل نکال لی۔ چائے آئی تو وہ فائل دیکھنے لگا۔ پولیس رپورٹ خاص نہیں تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ پولیس نے پہلے سے ذہن بنا کر تفتیش کی تھی اور واقعات کو حادثہ قرار دے کر جان چھڑائی تھی۔ جن لوگوں سے بیانات لیے تھے وہ بھی اس فائل میں شامل تھے۔ البتہ پوسٹ مارٹم رپورٹس قابلِ توجہ تھیں۔ پہلے افسر صغیر کی موت گردن ٹوٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ گردن نیچے گرتے ہوئے ایک راڈ سے ٹکرانے سے ٹوٹی تھی۔ اس کے علاوہ اسے تین فریکچرز بھی ہوئے تھے لیکن یہ زخم جان لیوا نہیں تھے۔ کامران کی موت دماغ پر آنے والی شدید ضرب سے آئی تھی۔ ضرب گدی سے اوپر لگی تھی۔

رپورٹ کے مطابق کامران ایک فلور کی سیڑھیوں سے نیچے گرا تھا۔ سیڑھی کوئی بیس فٹ لمبی تھی۔ بلڈنگ میں فلور کی اونچائی بارہ فٹ تھی۔ معین نے عمارت کی سیڑھیاں دیکھی ہوئی تھیں۔ یہ آسان اور آرام دہ سیڑھیاں تھیں۔ قدمچے نو انچ چوڑے اور چھ انچ اونچے تھے۔ دونوں طرف ریلنگ لگی تھی۔ کنارے ماربل کے اور گولائی لیے ہوئے تھے۔ رپورٹ کے مطابق کامران کے سر کی چوٹ کسی دو انچ موٹی چیز سے ٹکرانے کا نتیجہ تھی۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ اس نے دماغ کا یہ حصہ تباہ کر دیا تھا اور موت فوری واقع ہوئی تھی۔ سر کی ضرب کے علاوہ باقی جسم پر معمولی سی چوٹیں آئی تھیں اور کوئی فریکچر نہیں ہوا تھا۔ باقی چوٹیں اتنی معمولی تھیں کہ سر پر ضرب نہ لگی ہوتی تو کامران شاید کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو جاتا اور ڈاکٹر کو دکھانے کی زحمت بھی نہ کرتا۔

سب سے سادہ پوسٹ مارٹم رپورٹ عظمت کی تھی۔ اس نے بہت زیادہ پی تھی اور نشے کو بڑھانے کے لیے اس نے نشہ آور گولیوں کا استعمال بھی کیا تھا جیسا کہ بہت زیادہ عادی شرابی کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک پیگ میں دو پیگ کا نشہ کر لیتے ہیں۔ مدہوشی کی حالت میں وہ کمرے میں گیس بھر جانے سے دم گھٹنے سے ہلاک ہوا۔ نشے کی زیادتی کی وجہ سے وہ اس قابل نہیں رہا کہ اپنی جان بچانے کے لیے کچھ کر سکے۔ اس کے جسم پر کوئی نشان نہیں تھا۔ کیونکہ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے موت سے ہمکنار ہوا تھا اور غالباً اسے موت کی آمد کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔ فائل میں گواہوں کے بیانات دیکھنے کے بعد معین نے فائل ایک طرف رکھ دی اور سوچنے لگا۔ جہاں تک صغیر کی موت کا تعلق ہے، وہ یقیناً حادثہ تھا ورنہ لفٹ کے یہ مسئلہ پیدا کرنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

البتہ اسے کامران اور عظمت کی اموات کھٹک رہی تھیں۔ آخر سیڑھی پر کس چیز نے اس کے سر کے پچھلے حصے پر اتنی شدید ضرب لگائی کہ دماغ براہِ راست متاثر ہوا اور موت فوری واقع ہوئی تھی۔ عظمت کی پولیس رپورٹ میں نشہ آور دوا کی گولیوں کی برآمدگی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس نے کال کر کے صدیق سے تصدیق کر لی تھی کہ پولیس کو عظمت کے پاس سے نشہ آور گولیاں نہیں ملی تھیں۔ اگلے دن اس نے دفتر آتے ہوئے اس جگہ کا معائنہ کیا جہاں کامران گرا تھا۔ یہاں اوپر سے لے کر نیچے تک کہیں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جو کامران کے سر پر لگتی تو اتنی شدید چوٹ آتی۔ شام کو اس نے کلب میں صدیق سے اپنے شبہات کا اظہار کیا۔ اس نے کہا۔

''سوال یہ ہے کہ اگر یہ کام منیر رحمان نے کیا ہے تب

بھی اس کے خلاف کیا ثبوت ہے۔ وہ ایک سرکاری افسر ہے، اسے صرف شبے کی بنیاد پر گرفتار نہیں کیا جا سکتا جب تک کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہو۔''

''ایک تو ہمارے ہاں پولیس کو فوراً گرفتاری کی پڑ جاتی ہے۔'' معین نے کہا۔ ''بھائی ساری دنیا میں پولیس پہلے ثبوت اور گواہیاں تلاش کرتی ہے اور جب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ بندہ اب بچ کر نہیں جا سکے گا تو پھر گرفتار کرتی ہے۔ تم ثبوت تلاش کرواؤ۔''

صدیق ہنسا۔ ''بھائی وہ دنیا کی پولیس ہے۔ ان کی تربیت دوسری ہوتی ہے، ہماری پولیس کی تربیت تم جانتے ہو۔''

''اس کے باوجود وہ واردات سے دو گھنٹے پہلے باخبر ہو جاتی ہے کہ واردات ہونے والی ہے۔'' جنید نے لطیفہ بیان کیا۔

''یار میں سنجیدہ ہوں کیونکہ سیما اس معاملے میں سنجیدہ ہے۔'' معین نے کہا۔ ''تین افراد کا مارا جانا اتفاق نہیں ہو سکتا ہے۔''

صدیق سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے میں پولیس حکام سے بات کرتا ہوں۔ مگر بات آف دی ریکارڈ ہوگی کیونکہ میں اس قسم کی کسی درخواست کا مجاز نہیں ہوں۔ ایک ڈی آئی جی سے رشتے داری ہے اس سے بات کرتا ہوں۔''

جنید بھی سنجیدہ ہو گیا تھا، اس نے معین کو مشورہ دیا۔ ''تم محتاط رہو، اگر تمہارے خیال میں ان واقعات کے پیچھے کوئی فرد ہے تو تمہیں محتاط رہنا چاہیے۔''

معین کو اب تک یہ خیال نہیں آیا تھا۔ واقعی اسے محتاط رہنا چاہیے۔ تین میں سے دو حادثے بلندی سے گرنے سے ہوئے تھے جبکہ ایک گیس سے دم گھٹنے کا کیس تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب گیس ہیٹر دفتر میں استعمال نہیں کرے گا۔ اس کی جگہ اے سی استعمال کرے گا۔ یہ پرانے طرز کا اے سی تھا جو گرمائش بھی دیتا تھا۔ اسی طرح وہ لفٹ اور سیڑھیوں کے پاس محتاط رہے گا۔ صغیر کو پیش آنے والے حادثے کے بعد عمارت کی تمام ہی لفٹس بدل کر ان کی جگہ جدید ترین لفٹس لگائی گئی تھیں جن کے دروازے اسی صورت میں کھلتے تھے جب لفٹ دروازے کے سامنے آ چکی ہو۔ اگلے دن وہ کلب پہنچا تو وہاں ایک نئی صورتِ حال تھی۔ جنید نے اسے مبارک باد دی۔ ''منیر بھی سترہ گریڈ کے لیے پروموٹ ہو رہا ہے۔ کچھ دن بعد وہ اس کلب میں نظر آئے گا اور شاید تمہاری سیٹ پر بھی۔''

معین نے اسے گھورا۔ ''تمہارا مطلب ہے؟''

''میرا کوئی مطلب نہیں ہے کیونکہ میرے نزدیک یہ احمقانہ بات ہے۔'' جنید نے کہا۔ ''صدیق کے پاس بھی کچھ ہے بتانے کے لیے۔''

صدیق بولا۔ ''میری بات ہوئی ہے اور کیس اسپیشل برانچ کو بھیجا جا رہا ہے۔ میں نے تمہارے پوائنٹس آگے کر دیے ہیں اور اب ان پر تفتیش ہوگی۔''

''اسپیشل برانچ والے کب تک حرکت میں آئیں گے؟'' معین نے پوچھا۔ ''یقیناً اس کے لیے انہیں میری وفات کا انتظار نہیں ہوگا۔''

''یار، سرکاری مشینری کو استعمال کرنا آسان نہیں ہے۔''

اس رات سیما سے بات ہوئی تو اس نے پھر تشویش کا اظہار کیا اور اس سے کہا کہ وہ محتاط رہے۔ سیما نے کہا۔ ''میں نے اس پر غور کیا ہے۔ تینوں افراد دفتر کی عمارت میں حادثے کا شکار ہوئے یعنی خطرہ یہیں ہے۔''

''یہاں صرف ایک آدمی ہے جس کا نام لیا جا سکتا ہے۔'' معین نے اسے منیر کے بارے میں بتایا۔ ''مگر پولیس نے سرے سے قتل کا سوچا ہی نہیں اس لیے کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔''

''اگر قاتل یہی شخص ہے اور تینوں افراد کو اسی نے قتل کیا ہے تو یہ بہت چالاک ہے۔ معین تمہیں بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔''

چند دن بعد محکمے کے انڈر سیکریٹری نے میٹنگ بلائی تھی۔ مقصد کارکردگی میں اضافہ اور اخراجات میں کمی تھی۔ حکومت کی طرف سے ایک سرکلر تمام سرکاری محکموں کو بھیج دیا گیا تھا کہ اخراجات میں دس فیصد تک کمی لائیں۔ منیر اس میٹنگ میں موجود تھا۔ اس نے مخصوص بے باک انداز میں انڈر سیکریٹری سے کہا۔ ''سر، اخراجات میں کمی ہو جائے گی مگر اس سے کارکردگی لازمی متاثر ہوگی۔''

''وہ کیوں؟'' انڈر سیکریٹری نے بدمزگی سے کہا۔ کیونکہ سب ہاں میں ہاں ملا رہے تھے یا خاموش تھے، یہ پہلی معترض آواز تھی۔

''کیونکہ کٹوتی یا تو عام ملازمین کے لیے مخصوص مراعات سے ہوگی یا پھر بلڈنگ مینٹی نینس سے۔ دونوں صورتوں میں کارکردگی متاثر ہوگی۔''

''فضول اخراجات سے گریز بھی کیا جا سکتا ہے۔'' ایک چمچے افسر نے منیر سے کہا۔

''جو ایسے نہیں ہوتے ہیں وہ میری طرح دھکے کھاتے ہیں۔'' منیر کہتے ہوئے اپنے آفس کی طرف مڑ گیا۔ معین کو اس کا انداز اچھا نہیں لگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سول سروس والوں کے لیے اس کے اندر تلخی بھری ہوئی تھی اور وجہ صاف ظاہر تھی کہ وہ اب تک اوپر نہیں آسکا اور اس کا ذمے دار وہ سول سروس سے آنے والوں کو سمجھتا تھا۔ معین سوچ میں پڑ گیا کہ کیا وہ اس کا بدلہ یوں لے رہا تھا۔ وہ ذہین اور سازشوں سے شناسا تھا۔ معین مختصر عرصے میں جان گیا تھا کہ جتنی سازشیں یہاں سرکاری محکموں میں ہوتی ہیں اتنی دنیا میں اور کہیں نہیں ہوتیں۔ کامران اور عظمت کی موت کا آسانی سے بندوبست کیا جا سکتا تھا۔ صغیر کی موت اگرچہ ایک پیچیدہ حادثے میں ہوئی تھی لیکن دیکھا جائے تو یہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ رات جب اس نے سیما سے بات کی تو اس نے معین کی سوچ کی تائید کی۔

''یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ صغیر کو لفٹ کا دروازہ کھول کر نیچے پھینکا جا سکتا تھا۔''

معین کو تجربہ تھا کہ پرانی طرز کی لفٹوں کے دروازے جبکہ لفٹ فلور پر نہ ہو ذرا سا زور لگانے سے کھل جاتے ہیں۔ جدید لفٹوں میں ایسے لاک ہوتے ہیں جو اس وقت تک دروازہ نہیں کھلنے دیتے جب تک لفٹ فلور پر نہ آجائے۔ اگر ایمرجنسی میں کھولنا ہو تو اس کے لیے مخصوص چابی ہوتی ہے جسے بٹنوں کے پینل کے ساتھ بنے مخصوص خانے میں ڈالنے سے لفٹ کا دروازہ کھولا جا سکتا تھا مگر یہ چابی صرف مخصوص لوگوں کے پاس ہو سکتی ہے۔ معین نے پوچھا۔ ''اس نے صغیر کو اندر کیسے پھینکا ہوگا؟''

''دھوکے سے یا بے بس کر کے۔'' سیما نے جواب دیا۔ کیونکہ اس وقت عمارت میں کوئی اور نہیں تھا اس لیے کسی نے نہیں دیکھا۔''

''وہ انٹرنس لابی کے کیمروں سے کیسے بچا ہوگا؟'' معین نے پوچھا۔

''یہ بھی کوئی مشکل کام نہیں ہے، وہ ایڈمن میں ہے اور اس کے پاس ایمرجنسی ڈور کی چابی لازمی ہوگی۔''

''یو آر جینیئس۔'' معین نے کہا۔ ''لیکن اگر وہ نہیں گیا ہوگا تو کیمرے کی ریکارڈنگ سے اس کا پتا بھی چل سکتا ہے۔''

''میرا خیال ہے وہ اپنے وقت پر گیا ہوگا اور دوبارہ ایمرجنسی ڈور سے اندر آیا ہوگا۔ اگر یہ باہر سے نہیں کھلتا ہے تو اس نے اسے پہلے ہی ان لاک کر دیا ہوگا۔ اندر آکر وہ

''سر! میرے پاس سیٹی نینس کی ذمے داری اضافی ہے۔'' منیر نے کہا۔ ''میں سو فیصد کام کا قائل ہوں، آدھا ادھورا کام مجھ سے نہیں ہوگا کیونکہ اس سے میری ساکھ پر حرف آئے گا۔ اگر ایسا ہوا تو میں یہ ذمے داری چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔''

انڈر سیکریٹری نے کڑے تیوروں سے منیر کی طرف دیکھا۔ ''آپ کے پاس اخراجات میں کمی کی کوئی تجویز ہے۔''

''بالکل ہے سر۔ بلڈنگ کو سینٹرلی اے سی کرنے کا منصوبہ زیر التوا ہے، گرمی آنے سے پہلے اسے مکمل کیا جائے تو بجلی کے بل میں نصف کمی ہوگی۔ اسی طرح سرما میں گیس کا بل کم ہوگا۔ باغ کی تزئین و آرائش کے لیے جن غیر ملکی پودوں اور درختوں کا پلان ہے اس کی جگہ مقامی پودے لگائیں جائیں تو اخراجات میں خاصی کمی آئے گی۔''

منیر کی ان تجاویز پر افسران کا منہ بن گیا تھا۔ خاص طور سے ان افسران کا جو ان منصوبوں سے براہِ راست فائدہ اٹھا رہے تھے۔ معین کی توقع کے عین مطابق منیر کی تجاویز پر سرے سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس نے بھی اصرار نہیں کیا۔ باقی میٹنگ میں وہ سپاٹ چہرہ لیے بیٹھا رہا۔ میٹنگ کے بعد جب وہ باہر نکل رہے تھے تو معین نے کسی کو کہتے سنا۔ ''اس کی کسی نے نہیں سنی اور نہ اس کے اوپر آنے کا چانس ہے۔''

''ہاں جب تک دو تین افسر اور نہیں مارے جاتے۔'' کوئی دوسرا ہنسا۔ معین نے مڑ کر دیکھا مگر بھیڑ میں اسے بولنے والے نظر نہیں آئے تھے۔ بہرحال ان کی بات اور اشارے واضح تھے۔ گویا یہ بات محکمے کے لوگوں کے ذہن میں تھی۔ منیر رحمان کا رویہ ایسا تھا کہ ترقی کے خانے میں اس کے لیے اچھے ریمارکس مشکل سے ہی کسی افسر کے قلم سے نکل سکتے تھے۔ وہ اسی طرح اوپر آسکتا تھا جب مطلوبہ اہلیت کا آدمی سیٹ کے لیے دستیاب نہ ہو۔ وہ دفتر کی طرف جا رہا تو اتفاق سے منیر اس کے ساتھ ہی چل رہا تھا۔ معین نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ نے اچھی تجاویز پیش کیں۔''

''اور آپ نے اس پر ردِعمل بھی دیکھ لیا۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''اوپر سے آنے والوں کا رویہ یہی ہوتا ہے۔''

منیر کا اشارہ سول سروس کی طرف تھا۔ معین نے آہستہ سے کہا۔ ''ویسے آپ بھی اب سترہ گریڈ میں آچکے ہیں اور سب ایک سے نہیں ہوتے ہیں۔''

چھپ گیا ہوگا جب تک سب نہ چلے جائیں۔ صغیر کے بارے میں اسے معلوم ہوگا کہ وہ دیر تک رکے گا۔ اس نے اپنا کام کیا اور ایمرجنسی ڈور سے ہی واپس چلا گیا۔''

معین، سیما کی ذہانت کا معترف ہوگیا تھا اور اس نے اگلے دن کلب میں فخر کے ساتھ اس کا خیال پیش کیا۔ مگر صدیق اور جنید دونوں ہی متاثر نہیں ہوئے تھے۔ جنید نے کہا۔ ''خیال آرائی کرنا آسان ہے لیکن اسے ثابت کرنا ہرگز آسان نہیں ہے۔''

''جبکہ ہونے والی بھابی نے اسے ویسے ہی چالاک ثابت کردیا ہے کہ اس نے کوئی نشان نہیں چھوڑا۔''

معین کا موڈ خراب ہوگیا۔ ''تم لوگ کیا چاہتے ہو کہ اصل تفتیش کا آغاز میرے مرڈر سے کیا جائے۔''

''دیکھو دوست ہم قضا و قدر کے قائل ہیں۔ اگر تمہاری موت اسی طرح لکھی ہے تو تم اور ہم سمیت کوئی اسے ٹال نہیں سکتا۔'' صدیق نے کہا۔ ''باقی رہی تفتیش تو میں کہہ چکا ہوں کہ اسپیشل برانچ کے پاس کیس جائے گا۔''

''یعنی عراق سے تریاق آئے گا۔'' معین نے گہری سانس لی۔ ''تب تک یہ غریب بچ پائے گا یا نہیں۔''

اگلے دن وہ ذرا دیر سے دفتر پہنچا۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ وہ انٹرنس لابی کی طرف جارہا تھا کہ اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا اور وہ بروقت رکا تھا کیونکہ اس کے رکتے ہی اوپر سے ایک گملا آکر عین اس کے قدموں میں گرا تھا۔ اگر وہ روانی سے چل رہا ہوتا تو گملا اس کے سر پر گرتا۔ نیچے گر کر گملا جس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوا تھا اس سے ظاہر تھا کہ وہ کتنی رفتار سے آرہا تھا۔ معین نے بے ساختہ اوپر دیکھا تو اسے براؤن رنگ کی جھلک دکھائی دی۔ یہ جھلک اسے اوپر دیوار کے ساتھ رکھے گملوں میں خالی گملے والی جگہ دکھائی دی تھی۔ جس گملے کی جگہ خالی تھی، وہ اس کے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔ معین تیزی سے بھاگا اور اسے یہ خیال بھی نہیں رہا کہ لابی میں موجود لوگ اسے یوں آتے دیکھ کر کیا سوچیں گے۔ وہ لفٹ اور سیڑھیوں والے حصے تک آیا۔ اس کی نظر تین نمبر کی لفٹ پر مرکوز تھی۔ وہ اوپر سے آرہی تھی اور چوتھے فلور پر رکی تھی۔ اس نے بٹن دبایا تو وہ نیچے آنے لگی، جب وہ کھلی تو خالی تھی یعنی اس میں کوئی نہیں تھا۔ وہ چوتھے فلور پر پہنچا اور اس نے سامنے صفائی کرتے سوئپر سے پوچھا۔

''ابھی لفٹ سے کون آیا تھا؟''

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ''کوئی آیا تھا صاحب اور اس طرف گیا تھا۔'' اس نے منیر کے دفتر کی طرف اشارہ کیا۔ ''پر میں دیکھ نہیں سکا صاحب، اس وقت میں صفائی کرتا آگے جارہا تھا۔''

معین تیز قدموں سے منیر کے دفتر تک پہنچا۔ اس ہال نما کمرے کو پارٹیشن کیا گیا تھا اور آخری حصے میں منیر کا دفتر تھا۔ وہ اس وقت اپنے گیس ہیٹر کے ساتھ کچھ کررہا تھا۔ معین ٹھٹکا کیونکہ اس نے براؤن رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ جب وہ ہاتھ جھاڑتا کھڑا ہوا تو اسے دیکھ کر چونکا۔ ''معین صاحب آپ....''

''کوئی مسئلہ ہے ہیٹر میں؟''

''ہاں اس کو آٹومیٹک آف کرنے والی وائر ڈھیلی ہو گئی تھی، اسے ٹائٹ کررہا تھا۔''

''یہ وائر اگر ڈھیلی رہ جائے تو ہیٹر آف ہونے کے بعد بھی گیس خارج ہوتی رہے گی۔''

''آف کورس، بہت سے لوگ اس چیز کا خیال نہیں رکھتے ہیں۔''

''اور حادثے کا شکار ہوجاتے ہیں۔'' معین نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''اوپر یقیناً خاصی سردی ہوگی۔ مگر آپ کا کوٹ خاصا گرم ہے۔''

''اوپر....؟'' منیر نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہاں ابھی آپ چھت سے آرہے ہیں۔''

''میں آدھے گھنٹے پہلے دفتر آیا تھا اور تب سے ہیٹر کے ساتھ لگا ہوا ہوں۔ پہلے میں نے مکینک بلانے کا سوچا مگر بجٹ کٹ پلان یاد آگیا۔'' کہتے ہوئے اس کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ ''میں نے سوچا کہ خود ٹھیک کرلوں۔ اوپر تو میں دو دن پہلے گیا تھا۔''

''آپ کو یقین ہے کہ آپ اوپر نہیں گئے۔''

اس بار منیر نے اسے غور سے دیکھا۔ ''آپ کو یقین دلانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''کچھ نہیں۔'' معین نے کہا اور مڑ گیا۔ اسے یقین تھا کہ گملا اسی نے پھینکا تھا اور اب معصوم بن رہا تھا۔ وہ دروازے کے پاس رکا اور بولا۔ ''اگر میں پارکنگ میں ایک قدم اور بڑھا لیتا تو شاید کل آپ میری سیٹ کا چارج لے رہے ہوتے۔''

منیر نے پوچھنا چاہا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے مگر وہ وہاں سے نکل آیا۔ اس نے عمارت کے سیکیورٹی چیف کو اس واقعے کی اطلاع دی مگر اس کا ذکر کرنے سے گریز کیا کہ اسے منیر

پر شبہ ہے۔ البتہ یہ بتا دیا تھا کہ جب اس نے اوپر دیکھا تو اسے براؤن رنگ کے لباس کی جھلک نظر آئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ سیکیورٹی چیف اس کے ساتھ جائے وقوع پر کھڑا تھا۔ اس نے اوپر دیکھا۔ ''گملا اسی جگہ سے گرا ہے۔''

''وہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے۔'' معین نے سرد لہجے میں کہا۔ ''سوال یہ ہے کہ یہ گرا کیسے؟''

''یہ دیکھنا پڑے گا جناب کیونکہ ہوا نہیں چل رہی ہے اور اتنا وزنی گملا خود سے نہیں گر سکتا۔''

دوپہر تک یہ خبر ساری عمارت میں پھیل چکی تھی۔ اس کے ساتھ کے لوگ اس سے پوچھنے آرہے تھے اور وہ انہیں بتا بتا کر تنگ آگیا تھا۔ شام تک یہ اطلاع منیر تک بھی پہنچ گئی کیونکہ اس کی کال آئی تھی۔ ''معین صاحب، آپ صبح سیدھے میرے دفتر آئے تھے اور مجھ سے اوپر سے آنے کے بارے میں پوچھا تھا۔''

''ہاں۔''

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے کوئی غلط کام کیا ہے۔''

''تب ایسا کون کر سکتا ہے؟''

''میں نہیں جانتا سر۔'' منیر نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ''مجھے ابھی دفتر میں ہونے والی سرگوشیوں کا پتا چلا ہے۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے، نہ آج اور نہ آج سے پہلے۔''

معین کو اب طیش آرہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''یہ سب آپ پولیس کو بتایئے گا۔''

مگر کچھ دیر بعد انڈر سیکریٹری نے آکر معاملات سنبھال لیے تھے۔ اس نے سب کو زبان بندی کا حکم دیا اور منیر کو معین کے ساتھ بلا کر بات کی۔ معین نے الزام لگایا کہ اس کے تین پیش رووں کی موت میں منیر کا ہاتھ تھا اور آج اسے قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اگر گملا اس کے سر پر گرتا تو وہ مردہ خانے میں لیٹا ہوتا۔ منیر نے ان الزامات کی تردید کی۔ ان دونوں کی بات سننے کے بعد انڈر سیکریٹری نے کہا کہ اس معاملے کو فی الحال پولیس کے سپرد نہیں کیا جارہا ہے لیکن محکمہ اپنے طور پر تحقیق کرے گا۔ اس نے ان دونوں کو اس معاملے میں خاموش رہنے کا حکم دیا۔ اگلے روز معین دفتر پہنچا تو اسے پتا چلا کہ منیر گرفتار ہوگیا ہے اور اسے پولیس کی تحویل میں دے دیا گیا ہے۔ فی الحال وہ میٹنگ روم میں پولیس والوں کی تفتیش کا سامنا کررہا تھا۔ وہاں انڈر سیکریٹری بھی موجود تھا۔

گرفتاری کی وجہ اس کے دفتر کی کیبنٹ سے ایک چھوٹا بیس بال کا بلا ملا تھا جس پر خشک خون اور بالوں کے آثار تھے۔ اسی طرح اس کی کیبنٹ سے ہیٹر کے وہ تار ملے تھے جو گرم ہونے پر مڑ جاتے ہیں اور سرد ہونے پر سیدھے ہوکر ہیٹر کو گیس کی فراہمی روک دیتے ہیں۔ منیر نے بلے کو اپنا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہیٹر کے تاروں کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ اس کا ہیٹر اکثر مسئلہ کرتا ہے تو وہ کچھ اضافی تار لے آیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر ہیٹر کی فوری مرمت کر سکے۔ بلا ٹھوس لکڑی کا تھا اور ابھی اس پر لگے خون اور بالوں کا تجزیہ کرانا تھا۔ اگر یہ خون اور بال کامران کے بلڈ گروپ اور بالوں کے اسٹرکچر سے میچ کر جاتے تو منیر اس کے قتل کے الزام میں پکڑا جاتا۔ فی الحال پولیس نے اسے شبہے کی بنیاد پر گرفتار کیا تھا۔ معین خوش تھا۔ وہ اپنے دفتر میں آیا اور اس نے سراج بابا کو بتایا تو اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

''سر، پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ منیر صاحب چھوٹ جائیں گے۔''

''تم اب بھی اسے بے گناہ سمجھ رہے ہو؟''

''نہیں سر، یہ قانونی معاملات ہیں میرے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے ان پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں مجھے حیرت ہوگی اگر وہ قاتل نکلے تو۔ پھر سر بڑے لوگوں کو سزا کہاں ہوتی ہے۔ اب تو وہ بھی سترہ گریڈ کے افسر ہوگئے ہیں۔''

''وہ قاتل ہے۔ اسی نے ان تینوں کو قتل کیا ہے۔ کامران اور عظمت کے قتل میں استعمال ہونے والی چیزیں اس کے پاس سے نکلی ہیں اور جب وہ پولیس کی مار کھائے گا تو صغیر کے قتل کا اعتراف بھی کرے گا۔''

''نہیں سر، وہ اس قتل کا اعتراف نہیں کرے گا۔'' سراج بابا نے کہا اور بات بدل دی۔ ''آپ کے لیے چائے لاؤں سر۔''

معین نے اس کی بات پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ ''ہاں اس وقت میں ضرورت بھی محسوس کررہا ہوں۔''

چائے نوشی کے دوران معین حالات پر غور کرتا رہا۔ اسے حیرت تھی کہ منیر جیسے ہوشیار اور چالاک آدمی نے اپنے خلاف ثبوت دفتر کی الماری میں رکھے تھے۔ آخر اسے کیا سوجھی تھی۔ ورنہ ایک چھوٹے بلے اور چند تاروں کو ٹھکانے لگانا کون سا مسئلہ تھا۔ اسی وجہ سے وہ پکڑا گیا تھا۔ گزشتہ روز گرنے والے گملے کے ٹکڑے بھی پولیس کے حوالے کردیے گئے تھے کہ ممکن ہے ان پر منیر کے فنگر پرنٹس ہوں۔ جب منیر کو لے جایا جارہا تھا تو وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ اس نے کچھ نہیں

کیا ہے کسی نے اس کے خلاف سازش کی ہے، اسے پھنسایا ہے اور ... ہی اصل قاتل ہے۔ نہ جانے کیوں معین کو اس پر ترس بھی آیا تھا مگر یہ لمحاتی بات تھی۔ اب اس کا خیال تھا کہ منیر جیسے لوگوں کی جگہ پھانسی گھاٹ ورنہ جیل کی کوٹھری تو ہونی ہی چاہیے۔ وہ اتنا پُرجوش ہو رہا تھا کہ اس نے اسی وقت سیما کو کال کر کے منیر کی گرفتاری کا بتا دیا۔ وہ بھی خوش ہوگئی۔ زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ معین کو اب خطرہ نہیں رہا تھا۔

''وہ جائے بھاڑ میں، مجھے تو تمہاری فکر ہو رہی تھی کہ تمہیں خطرہ ہوگا۔''

اگلے دن پتا چلا کہ منیر ضمانت پر رہا ہو گیا ہے۔ عدالت نے بلے پر لگے خون اور بالوں کے تجزیے سے پہلے اس کا ریمانڈ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ رپورٹ آنے میں چند دن لگتے۔ معین کسی قدر مایوس ہوا تھا مگر پھر اسے اپنی ہی بات یاد آئی کہ گرفتاری اہم نہیں ہے سزا دلوانے والے ثبوت اور گواہیاں اہم ہیں۔ اگر اس کے خلاف ثبوت مل گئے تو وہ دوبارہ گرفتار ہو سکتا تھا۔ منیر ضمانت پر رہا ہو گیا تھا مگر وہ ملازمت سے معطل تھا۔ جب تک اس کے کیس کا فیصلہ نہیں ہو جاتا اسے دفتر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ معین اس لیے زیادہ فکرمند نہیں تھا کہ منیر کا داخلہ دفتر میں بند تھا اور وہ مشکوک تھا اس لیے کوئی غلط حرکت کرنے سے گریز کرتا۔

اس دن موسم بہت زیادہ سرد تھا۔ صبح سے وقفے وقفے سے بارش جاری تھی۔ دفتر میں پارکنگ سے نکل کر انٹرنس لابی تک آتے آتے اس کا برا حال ہو گیا تھا حالانکہ اس نے اوورکوٹ بھی پہنا ہوا تھا۔ موسم کی وجہ سے اسٹاف کے خاصے لوگ نہیں آئے تھے اور جو آئے تھے وہ بھی جلدی چھٹی کر کے بھاگنے کی فکر میں تھے۔ دو بجے کے بعد لوگ جانا شروع ہوئے اور چار بجے تک عمارت تقریباً خالی ہو گئی تھی۔ معین کام کر رہا تھا۔ اس نے سراج بابا سے کئی بار کہا کہ وہ بھی چلے جائیں۔ اس کے پاس کچھ فائلیں آئی تھیں اور وہ انہیں چیک کر کے ہی جانا چاہتا تھا مگر سراج بابا نے جانے سے انکار کر دیا۔ ''سر، میں آپ کے ساتھ ہی نکلوں گا، مجھے بس اسٹاپ تک چھوڑ دیجیے گا۔''

پانچ بجے سراج بابا کہیں گیا اور دس منٹ بعد آیا تو عجلت میں تھا۔ اس نے معین سے کہا۔ ''سر، میرے ساتھ چلیں، منیر صاحب کے دفتر میں کچھ گڑبڑ ہے۔''

معین اٹھتے ہوئے بولا۔ ''کیسی گڑبڑ؟''

''آئیں سر، میں دکھاتا ہوں۔'' سراج بابا نے تیز قدموں سے آگے جاتے ہوئے کہا۔ معین نے راستے میں کئی بار پوچھا مگر اس نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ ... یہ لوگ آفس ہال میں داخل ہوئے اور منیر کے کیبن کی طرف بڑھے۔ سراج بابا نے دروازے پر رک کر آگے اشارہ کیا۔ میز کے پیچھے سے دو ٹانگیں جھانک رہی تھیں۔ معین بے ساختہ آگے آیا اور جھک کر دیکھا اور اچھل پڑا، یہ منیر تھا جو بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے مڑ کر کچھ کہنا چاہا تھا کہ کوئی چیز اس کے سر سے ٹکرائی اور وہ چکرا کر گر پڑا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ اس کے ہاتھ پیروں سے جیسے جان نکل گئی، اس نے دھندلائی آنکھوں سے دیکھا۔ ضرب ایک پیپر ویٹ سے لگائی گئی تھی اور پیپر ویٹ سراج بابا کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے تاثرات بالکل بدلے ہوئے تھے۔ اس نے جھک کر معین کو دیکھا اور بولا۔ ''سر، آپ ابھی ہوش میں ہیں۔''

''سراج .... تم .... یہ سب تم .... ؟'' معین نے ٹوٹے الفاظ میں کہا۔

''ہاں یہ سب میں نے کیا ہے اور اس شخص کی وجہ سے کیا ہے۔'' اس نے منیر کی طرف دیکھا۔ ''اس ذلیل آدمی کی وجہ سے صغیر کو حادثہ پیش آیا۔ وہ نیا نیا آیا تھا اور اس سے ایک اہم فائل مس ہوگئی۔ اس شیطان صفت آدمی نے اس چھوٹی سی بات کو بہت بڑا مسئلہ بنا دیا اور صغیر کو انکوائری کی دھمکیاں دینے لگا۔''

''صغیر کو .... اس نے مارا؟''

''نہیں، وہ حادثے کا ہی شکار ہوا تھا مگر اس کی وجہ یہی شخص تھا۔ اس نے اسے اتنی ٹینشن دی کہ وہ بے خیالی میں لفٹ کے خلا میں گر گیا۔''

معین کا سر اب بھی چکرا رہا تھا اور ہاتھ پیروں میں جان نہیں تھی مگر اس کی زبان کسی قدر قابو میں آرہی تھی۔

''کامران اور عظمت؟''

''انہیں میں نے مارا کیونکہ وہ صغیر کی سیٹ پر آئے تھے۔ مجھے گوارا نہیں ہے کہ اس سیٹ پر کوئی اور آئے۔ پھر اسے بھی پھنسانا تھا۔'' سراج بابا نے منیر کی طرف اشارہ کیا۔ معین کو اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ کمزور اور معمولی سا سراج بابا جس کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ دوسرے اسے اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اس سے سوائے خدمت کے اور کسی کام کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ اپنے منہ سے کہہ رہا تھا کہ اس نے دو نوجوان افسروں کو قتل کیا تھا۔ رفتہ رفتہ معین کو یقین آنے لگا کیونکہ اس نے اسے بھی نہایت آسانی سے قابو کر لیا تھا۔ اس نے منیر کی طرف دیکھا، اس کا سینہ

حرکت کر رہا تھا یعنی وہ زندہ تھا۔ سراج بابا نے اسے بھی سر پر ضرب لگا کر بے ہوش کیا تھا۔ خون اس کے سر سے بہہ کر اس کے چہرے پر آ رہا تھا۔

''منیر یہاں کیسے آیا؟''

''میں نے کال کر کے بلایا ہے۔'' سراج بابا نے اطمینان سے کہا۔ ''آفس کے نمبر سے کال کی اور آپ کی آواز میں کی۔''

''میری آواز میں؟''

''جی سر، آپ کی آواز کی نقل اتارنا آسان ہے سارا دن سنتا رہتا ہوں۔'' اس نے بالکل معین جیسی آواز میں کہا۔ ''یہ دھوکا کھا گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ دفتر میں آ کر آپ سے ملے کیونکہ آپ کے پاس کچھ ایسے ثبوت ہیں جو اس کی بے گناہی ثابت کرتے ہیں۔ یہ سن کر یہ دوڑا آیا اور میں نے اسے آرام سے قابو کر لیا۔''

سراج بابا یوں سکون سے کہہ رہا تھا جیسے اسے کوئی عجلت یا خوف نہیں رہا تھا۔ یوں لگ رہا جیسے حالات مکمل طور پر اس کے قابو میں ہوں۔ یہ اس لحاظ سے درست تھا کہ عمارت خالی ہو چکی تھی۔ سردیوں میں صفائی کرنے والا عملہ بھی جلدی چھٹی کر جاتا تھا۔ اس لیے اب یہاں کسی کے آنے کا امکان نہیں تھا۔ اس کے باوجود معین اسے باتوں میں نہ لگاتا تو وہ اپنا منصوبہ بتانے کے بجائے اسے قتل کر چکا ہوتا۔ معین بہتر محسوس کر رہا تھا مگر وہ خود کو کمزور ہی ظاہر کرتا رہا۔ وہ سانس کھینچ کھینچ کر لے رہا تھا اور ٹوٹے پھوٹے انداز میں بات کر رہا تھا۔ ''تم ہم..... دونوں کو..... مار دو گے؟''

''صرف آپ کو سر۔'' سراج بابا نے بدستور مؤدب لہجے میں بات کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ زندہ رہے گا اور پھانسی چڑھے گا تب میرے دل کی آگ ٹھنڈی ہوگی۔''

''تم اس سے..... کس بات کا..... بدلہ لے..... رہے ہو؟''

سراج بابا نے منیر کی طرف دیکھا۔ ''کیونکہ یہ میرے بیٹے کا قاتل ہے۔ صغیر میرا ایک ہی بیٹا تھا۔ میں نے اسے پڑھایا لکھایا۔ جب اس نے سول سروس کا امتحان دیا تو میں اس سے لاتعلق ہو گیا کہ کبھی میری نوکری اس کے لیے طعنہ نہ بنے۔ اتفاق سے اس کی پوسٹنگ یہاں ہوئی جہاں میں چپراسی ہوں۔ میں اپنے بیٹے کا چپراسی بنا رہا۔ صرف اس کی خاطر۔''

معین کو ایک بار پھر جھٹکا لگا۔ صغیر، سراج بابا کا بیٹا تھا۔ یہ ایک اور ناقابلِ یقین بات تھی۔ ''ہمارا کیا..... قصور ہے؟''

''مجھے گوارا نہیں کہ میرے بیٹے کی سیٹ پر کوئی آئے۔'' سراج بابا نے کہا تو اس کے تاثرات جنونی ہو گئے تھے۔ ''جو بھی آیا میں اسے قتل کر دوں گا۔''

''تم کب تک..... ایسا کرو گے؟''

''میں ہمیشہ ایسا نہیں کر سکوں گا۔'' اس نے اعتراف کیا۔ ''مگر جب تک یہاں ہوں اور آزاد ہوں ایسا کرتا رہوں گا۔ ابھی آپ کو اس پیپر ویٹ سے قتل کر دوں گا۔'' اس نے ہاتھ میں دبا ہوا پیپر ویٹ دکھایا۔ پھر منیر کی میز پر رکھے پیپر ویٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس پر منیر کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔ اس پر خون لگا دوں گا تو ایسا لگے گا جیسے منیر نے اسی سے آپ کو قتل کیا ہے اور خود بھی مقابلے میں زخمی ہوا۔ پولیس آ کر اسے لے جائے گی۔ کوئی اس کی بات نہیں سنے گا کیونکہ سارے ثبوت اس کے خلاف ہوں گے اور اسے پھانسی سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔''

''تم نے دو..... بے گناہ قتل کر دیے۔'' معین نے کہا۔

''آج اس میں ایک اور کا اضافہ ہو جائے گا۔'' سراج بابا آگے آیا۔ اس نے پیپر ویٹ والا ہاتھ بلند کیا کہ معین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی حالت خاصی حد تک بہتر ہو گئی تھی۔ معین نے اسے پیچھے دھکا دیا۔ سراج بابا ذرا دور جا گرا پھر دوبارہ جنونی انداز میں اٹھا۔ معین بھی اٹھ گیا تھا۔ اس نے سراج بابا پر نظر رکھتے ہوئے میز پر ہاتھ مارا تو ایک چیز اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ جیسے ہی وہ آگے آیا اور اس پر وار کرنے کی کوشش کی معین نے پیپر نائف اس کے پیٹ میں اتار دی۔

☆☆☆

اسپتال میں معین سر کی مرہم پٹی سے فارغ ہوا تو ایک پولیس انسپکٹر اس سے بیان لینے کے لیے موجود تھا۔ منیر بھی اسپتال میں تھا، اسے ہوش نہیں آیا تھا مگر اس کی حالت بہتر تھی۔ سراج بابا کاری زخم کے باوجود بچ گیا تھا اور اس کی حالت بھی بہتر تھی۔ پولیس نے اس سے ابتدائی بیان لے لیا تھا، اس نے اعتراف کیا کہ سب اسی نے کیا ہے۔ کامران اور عظمت کا قتل، اس کے بعد منیر کے خلاف سازش اور معین کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ معین بیان دے کر ٹیکسی میں ہاسٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا سر دکھ رہا تھا اور وہ آرام کرنا چاہ رہا تھا۔ لیکن اس سے پہلے سیما کو بتانا چاہ رہا تھا کہ اس کا اندازہ بالکل غلط تھا۔

حقیقت

عرفان اظہار

کہتے ہیں کہ حقیقت زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتی... اور یہ بھی سچ ہے کہ لوگوں کی حقیقت کبھی پتا نہیں چلتی... ایسے ہی چہروں کا احاطہ کرتی تحریر... جو اپنے قول و فعل اور دل و دماغ میں یکسر مختلف تھے... غیر معمولی انداز میں کامیابی کا سفر طے کرنے والوں کا پُرالمیہ ماجرا...

مغرب سے موصول شدہ ایک تیکھے انداز و اطوار کی روداد

''ہائے ہنی، میں گھر آگیا۔'' جارج نے اپنا بریف کیس ایک کرسی پر اور اپنی چابیاں اور ڈرائیونگ کی عینک کچن کی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''میں یہاں ہوں، ڈیئر۔ ذرا کاؤنٹر پر رکھا ہوا کریب ہیپر تو میرے پاس لے آؤ۔''

جارج نے جب گریسی کو لیونگ روم کی کھڑکی کے سامنے ایک سیڑھی پر موجود پایا تو چلتے چلتے رک گیا۔

''گریسی، تمہارا بازو! تمہیں معلوم ہے کہ ڈاکٹر نے تمہیں اس بارے میں احتیاط کرنے کو کہا ہے۔''

''اوہ، وہ بوڑھا پاگل۔'' گریسی نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ ''وہ تو چاہتا ہے کہ میں بستر پر پڑی رہوں اور دن بھر کوئی کام نہ کروں۔ میرا بازو اچھا ہو گیا ہے۔ یہ دیکھو!'' اس نے اپنا بازو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا اور پھر کھڑکی کے اوپری کنارے کے نیچے کریب ہیپر کا پردہ

لگانے کا عمل برقرار رکھا۔ "اور میرا بقیہ جسم تو اس سے کہیں زیادہ تیزی سے صحت یاب ہو چکا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے... لیکن تم کام کرنے کے معاملے میں حد سے زیادہ تجاوز نہ کرنا۔" جارج نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

گریسی نے نظریں اٹھا کر جارج کی طرف دیکھا اور اس کی فکرمندی پر بے ساختہ ہنسنے لگی۔ "تم بالکل نہ گھبراؤ۔ اگر صفائی ستھرائی اور کھانے پکانے کے کام میں عمدگی سے گزر رہی ہوں تو یہ چھوٹی سی سیڑھی مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔"

جارج نے کریب پیپر گریسی کو تھما دیا اور پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ "یہ عمدہ تاثر دے رہا ہے لیکن تم یہ اندرونی سجاوٹ کیوں کر رہی ہو؟"

"جارج آرتھر فلٹن! پلیز مجھ سے یہ مت کہنا کہ تم بھول چکے ہو اس سال ہم ہیلووین بلاک پارٹی کی میزبانی کر رہے ہیں اور وہ بھی گزشتہ سال کی اس منت سماجت اور عاجزی کے بعد جو تم نے مجھے رضامند کرنے کے لیے کی تھی۔" گریسی نے اپنی انگلی سے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ لیکن جارج اس کی مسکراہٹ دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہی ہے۔

"مجھے دھیان ہی نہیں رہا کہ مہینا ختم ہونے کو ہے۔ ...... میں یقیناً سوچنے سے زیادہ اپنے کاموں میں الجھا رہا ہوں۔" جارج نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم ڈرنک لوگی؟"

جب گریسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو جارج اپنے لیے جام انڈیلنے لگا۔ پھر اس نے نگاہیں اٹھا کر گریسی کی طرف دیکھا تو وہ اسے تکے جا رہی تھی۔

"جارج، کیا دفتر میں معاملات ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں؟ تم نے گزشتہ شب کہا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن اب تمہارے لہجے میں وہ یقین نہیں ہے۔" گریسی سیڑھی سے نیچے اتر آئی اور جارج کے ہاتھ سے اس کا جام لے لیا۔

جارج نے اپنے لیے دوسرا جام تیار کر لیا اور پھر وہ دونوں آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

"ہنی، سب کچھ ٹھیک ہے۔ یا کم از کم ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہو جائے گا سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ یا تو سب کچھ ٹھیک ہے یا پھر ٹھیک نہیں ہے۔ کیا سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"اب بالکل ایسی بات بھی نہیں ہے۔ نیا منیجر پیٹر بہت شدت کے ساتھ میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ مجھے تو خدشہ تھا کہ کہیں وہ مجھے ملازمت سے برخاست نہ کر دے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں بے داغ ہوں۔ وہ آج سہ پہر شکاگو کے لیے روانہ ہو چکا ہوگا۔" جارج نے اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے کہا اور بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اتار لیا۔ اسے یہ گھونٹ آگ کے گولے کے مانند نیچے معدے میں جاتا ہوا محسوس ہوا۔

"کیا تمہیں یقین ہے؟ میں جانتی ہوں کہ فرینک کے غائب ہونے اور اس کی جگہ اس نئے سیلز منیجر کے آنے سے تم بڑی آزمائش میں پڑ گئے ہو۔ لیکن ہنی اگر تم سے یہ ملازمت چھوٹ جاتی ہے تو میں کسی نہ کسی جگہ کام کرنے واپس چلی جاؤں گی۔ میں کام نہ کرنے کو مس کر رہی ہوں۔ کاش میں انہیں اس بات کی اجازت نہ دیتی کہ وہ مجھے ریٹائر کر دیں۔" گریسی نے اپنا جام نیچے رکھ دیا اور اپنی پوری توجہ جارج پر مرکوز کر دی۔

"فرینک کے غائب ہونے کے بارے میں... ایک ڈیولپمنٹ ہوئی ہے۔ پولیس ہر ایک سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ وہ تو ایک قانونی اکاؤنٹنٹ کو بھی لے آئے تھے۔ جب فرینک غائب ہوا تو ایک بہت بڑی رقم بھی غائب تھی، گریسی!"

جارج نے اپنا جام دوبارہ بھر لیا اور لیونگ روم میں ٹہلنے لگا۔ "جو بات میں نے تمہیں کبھی نہیں بتائی، وہ یہ تھی کہ فرینک برسوں سے میرے بیشتر اکاؤنٹس کو اپنے تصرف میں لا رہا تھا۔ ابتدا میں تو یہ صرف ایک یا دو ہی تھے۔ وہ یہی کہا کرتا تھا کہ وہ انہیں ہاؤس اکاؤنٹ میں منتقل کر رہا ہے۔ ہر مرتبہ جب بھی میرا کوئی اچھا اکاؤنٹ مضبوط ہو جاتا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ ہم کچھ رقم پس انداز کر سکتے ہیں تا کہ کہیں گھومنے پھرنے جا سکیں تو... فرینک وہ اکاؤنٹ لے اڑتا تھا۔ میں اس کی ٹیم میں سب سے بہترین سیلزمین ہوں لیکن میرا کمیشن گرتا جا رہا ہے۔ جب فرینک نے گزشتہ گرمیوں میں نئی کشتی خریدی اور چند ماہ قبل اپنے گھر کی نئے سرے سے تزئین و آرائش کی تو مجھے شبہ ہو گیا اور تب میں نے کھاتے چیک کرنا شروع کر دیے۔ میں نے دریافت کیا کہ ہر مرتبہ وہ چند ماہ تک انتظار کرتا ہے اور پھر وہ اکاؤنٹ اپنے پاس ٹرانسفر کر لیتا ہے۔"

"اوہ ڈیئر! اچھا تو یہ بات تھی۔ جس نے تمہیں اس قدر بدحواس کر دیا تھا۔ ادھر میں یہ سوچتی تھی کہ فرینک اتنا عمدہ شخص ہے کہ میرے اسٹروک کے بعد اس نے میرا کتنا خیال رکھا اور مجھے پھول بھجوائے تھے۔ وہ ایک بار میری عیادت کے لیے اسپتال بھی آیا تھا... آپ کو لوگوں کی حقیقت کبھی پتا نہیں چلتی، ہے نا؟"

"ہاں، میرا خیال بھی یہی ہے۔ وہ میری رقم چرا رہا تھا اور مجھ سے کہتا تھا کہ میں اور محنت کروں۔ میں سخت محنت

کررہا تھا۔ لیکن اس کی طرزِ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے۔''

''کاش تم نے یہ سب مجھے پہلے بتایا ہوتا۔ میں اپنے اخراجات میں کمی کرسکتی تھی۔''

''اوہ نو! ہمارا حساب کتاب ٹھیک ہی چل رہا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہم کبھی بھی آگے نہیں بڑھ سکے۔ مجھے بھی اپنے لیے کشتی خریدنے یا مکان کی تزئین نو کے قابل ہونا چاہیے تھا۔ افسوس، اس نے مجھ سے الگ تھلگ جو کچھ کمایا، اس رقم سے ہم اپنے لیے ایک بڑا مکان خرید سکتے تھے اور پھر بھی سیر وتفریح پر جانے کے لیے رقم کی بچت کر سکتے تھے۔'' یہ کہہ کر وہ ایک اور جام تیار کرنے کے لیے بار کی طرف پلٹ گیا۔

''جارج، کیا تمہیں واقعی تیسرے جام کی ضرورت ہے؟ میں جانتی ہوں کہ تم اَپ سیٹ ہو لیکن ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے...''

''نہیں، میرے خیال سے نہیں۔ میں اس وقت آٹو پائلٹ پر آچکا ہوں۔'' اس نے جھک کر گریسی کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کپڑے تبدیل کرتا ہوں جب تک تم بھنا ہوا کھانا تیار کرلو۔ آج رات کھانے میں کیا ہے؟''

''چانپیں ہیں۔ سب کچھ ڈی فراسٹ ہے اور سلاد بھی تیار ہے۔ اگر تم چاہو گے تو ہم فرش پر کھانا کھائیں گے۔''

''ہاں یہ عمدہ رہے گا۔'' جارج یہ کہہ کر کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔

گریسی اٹھی اور اس نے سیڑھی ایک طرف رکھ دی۔

☆☆☆

رات کے تین بجے جب گریسی سو رہی تھی تو جارج چپکے سے بیڈ پر سے نیچے اتر آیا۔ وہ دبے پاؤں باتھ روم میں گیا اور کام کرتے کا وہ لباس پہن لیا جو اس نے بیڈ پر جانے سے پہلے ایک طرف تیار رکھ دیا تھا۔ پھر جاگنگ شوز پہن کر آہستہ قدموں سے زینے کے راستے نچلی منزل پر آگیا اور گیراج میں چلا گیا۔ اچھی بات یہ تھی کہ وہ گزشتہ ہفتے دروازے کو تیل دے چکا تھا اس لیے کوئی چرچراہٹ نہیں ہوئی۔

اس نے گیراج کے دروازے کے پاس رکھی ہوئی فلیش لائٹ اٹھائی اور دوسری طرف چلا گیا جہاں ریک کے برابر دیگر اوزاروں کے ساتھ بیلچہ بھی نفاست سے رکھا ہوا تھا۔ تختے پر دستی اوزار سجے ہوئے تھے۔ اس کے نیچے شیلف پر ایک اضافی ترپال بھی جو لپٹی ہوئی تھی۔

جارج نے بیلچہ اور ترپال اٹھالیے اور مکان کے عقبی صحن میں چلا گیا۔ اس نے احاطے کی جانب بیس فٹ کے فاصلے تک قدم بڑھائے اور پھر کھودنا شروع کردیا۔

''جارج کیا یہ تم ہو؟'' گریسی کی سرگوشی کے مانند دبی آواز ابھری تو بیلچہ جارج کے ہاتھوں سے گر گیا۔ وہ تیزی سے گھوما اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

بالآخر اس کی نگاہ گریسی کے چہرے پر پڑی جو ان کی دوسری منزل کے بیڈروم کی کھڑکی سے باہر نکلا ہوا تھا۔

گریسی نے اپنا سر مزید باہر نکال لیا۔ ''یہ تم ہی ہوتا، ہنی؟ تم کیا کررہے ہو؟''

''شش... تم پڑوسیوں کو نیند سے جگا دوگی۔ میں ایک منٹ میں اوپر آتا ہوں۔''

جارج نے اپنے اوزار واپس گیراج میں رکھ دیے اور گریسی کے پاس چلا گیا جو نیچے کچن میں آچکی تھی۔

''تم رات کے تین بجے وہاں باہر کیا کررہے تھے؟'' گریسی نے تشویش سے پوچھا۔

''مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں نے سوچا کہ بلاک پارٹی کے لیے تحائف کے آئٹمز زمین میں چھپانے کا کام ابھی سے شروع کردیا جائے۔ سوان کے لیے گڑھا کھود رہا تھا۔ پارٹی کا تھیم آئٹم مالِ غنیمت ہے، ہے نا؟''

''یس ڈیئر، لیکن ہمیں آدھی رات کو چیزیں گڑھوں میں چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں چند پڑوسیوں کو پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ ہم اپنے عقبی صحن میں نئے پودے اور جھاڑیاں کاشت کرنا چاہتے ہیں اور تم ایک پختہ صحن بنانے والے ہو اس لیے ہم کھدائی کررہے ہیں۔ ہم دن کی روشنی میں جو کچھ کریں گے، اس پر انہیں کسی قسم کی حیرانی نہیں ہو

حقیقت

پڑوسن کا اخبار زیادہ دلچسپ ہے!

گی۔ راشیل اپنے دونوں لڑکوں کو جمعرات کو ہمارے یہاں بھیج رہی ہے۔ وہ گڑھے کھود کر مٹی نکال دیں گے۔ تم فکر مت کرو۔ جمعے تک سب کچھ تیار ہو جائے گا۔''

جارج کے حلق سے جواب میں صرف ایک غراہٹ سی بلند ہو کر رہ گئی۔ جب وہ دوبارہ سونے کے لیے بیڈ پر پہنچے تو جارج کے پیٹ میں مروڑ سا اٹھتا رہا۔ وہ باقی تمام رات بیڈ پر لیٹا جاگتا رہا۔

صبح کے اخبار میں صفحۂ اول پر فرینک کی تصویر نمایاں طور پر چھپی ہوئی تھی۔ حاشیے میں تصویر کے ساتھ ایک ہیجان انگیز کہانی بھی بیان کی گئی تھی۔ گریسی پورا آرٹیکل پڑھنے کے بعد اپنے شوہر کی جانب متوجہ ہوئی۔

''جارج ڈیئر، آرٹیکل میں لکھا ہے کہ فرینک نے ڈھیر ساری رقم کا غبن کیا ہے۔ کیا یہ تمہارے اکاؤنٹس کی رقم تھی؟''

''اوہ نہیں۔ ہمارے اکاؤنٹس سے اسے کمیشن ملتا تھا۔ اس نے یقیناً کمپنی کے اکاؤنٹس سے بھی رقوم چوری کی ہوں گی۔ میرا خیال ہے کہ کسی نے آڈیٹرز کی رپورٹ افشا کر دی ہوگی کیونکہ ہمیں اس بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا گیا تھا۔'' جارج نے کافی کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کہا اور اخبار اٹھا لیا جو گریسی نے اس کی جانب بڑھا دیا تھا۔

اس نے آرٹیکل پر سرسری نگاہ دوڑائی اور اس کے ہونٹوں سے سیٹی کی آواز نکل گئی۔ ''واؤ، دس لاکھ ڈالر سے زیادہ کی رقم! میرا خیال ہے کہ اب تو وہ اس کی تلاش میں پورا زور لگا دیں گے۔''

''آرٹیکل میں لکھا ہے کہ اس نے یورپ کے لیے ہوائی جہاز کا ایک ٹکٹ خریدا ہوا تھا۔ اس کی آخری منزل قازقستان تھی۔'' گریسی نے بتایا۔

''ہوں۔ پھر تو اس کی واپسی خوش قسمتی سے ہی ہو گی۔ اس لیے کہ امریکا کے ساتھ ان کا حوالگی ملزم کا کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب میرے نئے منیجر پیٹر کو مجھ پر یقین کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔''

جارج کو اپنے پیٹ کی مروڑ کی کیفیت میں خاصی بہتری محسوس ہوئی اور اسے سکون آ گیا۔ گزشتہ کئی ہفتوں کی بے چینی کے بعد اسے پہلی بار قرار آیا تھا لیکن ابھی ایک کام کو نمٹانا باقی رہ گیا تھا۔

اس رات جارج جب بھی بیڈ پر سے کھسکنے کی کوشش کرتا، گریسی کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ ''جارج اطمینان سے پڑے رہو۔ تمہارے بار بار کروٹیں بدلنے سے مجھے کبھی بھی نیند نہیں آئے گی۔''

بدھ کی رات ڈنر کے بعد جارج نے نیند کی ایک گولی پیس کر گریسی کے مشروب میں چپکے سے ملا دی۔ لیکن گریسی نے مشروب پینے سے انکار کر دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ رات کو سونے سے پیشتر پیا جانے والا مشروب مجھے ہلکی نیند کا عادی بنا رہا ہے۔ آج رات میں مشروب پیے بغیر سونے جا رہی ہوں۔''

جارج دل ہی دل میں اپنی بیوی کو کوسنے لگا لیکن ظاہر میں مسکراتے ہوئے اسے سونے کے لیے بستر پر بھیج دیا۔ ''میں کاؤچ پر سو جاؤں گا، گریسی۔ شاید میری وجہ سے تمہاری نیند خراب ہوتی ہے۔''

گریسی چند ہی منٹ بعد لوٹ آئی۔ اس کے ہاتھوں میں تکیے، چادر اور کمبل تھے۔ ''تمہیں میرا کتنا خیال ہے، ڈیئر، جبھی تو میں تم سے اتنا پیار کرتی ہوں۔'' گریسی نے شب بخیر کہا اور سونے کے لیے بیڈ پر چلی گئی۔

جارج رات میں ایک بار پھر اپنے اوزار لینے کے لیے گیراج میں چلا گیا۔ اس نے کھدائی۔۔۔ سے قبل ایک بار پھر بیس فٹ کا فاصلہ ناپا اور پھر کھدائی شروع کر دی۔ جلد ہی اس کا بیلچہ ترپال کے سخت پلاسٹک سے ٹکرا گیا۔ اس نے ترپال کے خاکے کے اطراف میں احتیاط سے مٹی ہٹانا شروع کر دی۔ پھر اس نے مٹی میں دبے لپٹے ہوئے ترپال کو گڑھے سے باہر کھینچ کر فالتو ترپال کے اوپر ڈال دیا اور اس وزنی ترپال کو گھسیٹتا ہوا گیراج میں لے گیا۔

اس نے وہ لپٹا ہوا ترپال اوزاروں کے شیلف کے نیچے چھپا دیا۔

واہ! اس نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔ یہ کام بھی ہو گیا۔ اب میں پارٹی ختم ہونے کے بعد اسے دوبارہ گڑھے میں دفنا دوں گا۔

جارج نے جمعے کی سہ پہر دفتر سے چھٹی کر لی تا کہ آخری لمحات کی تیاری میں گریسی کا ہاتھ بٹا سکے۔ اس نے پارٹی کے خزانے باہر صحن کے گڑھوں میں دفنانے میں گریسی کی مدد کی۔ وہ اس بات پر خاصا خوش تھا کہ ایک دن قبل پڑوسن راشیل کے بیٹوں نے اس کے حصے کا خاصا کام نمٹا دیا تھا۔ اب کوئی بھی تازہ کھدی ہوئی اس ریت کے بڑے سے ڈھیر پر کوئی توجہ نہیں دے سکتا تھا جو احاطے کے پاس موجود تھی۔

پھر جارج نے گریسی کے ساتھ مل کر مکان کے اندر اور صحن میں وہ اشارے اور کلیو نصب کر دیے جو خزانہ تلاش کرنے والوں کو بھٹکا سکتے یا ان کی راہنمائی کر سکتے تھے۔ یہ خزانے کی تلاش کا ایک دلچسپ کھیل تھا اور ہیلووین پارٹی کا

ایک روایتی حصہ تھا۔

ان کی آخری تیاری مکان کے اندر آئٹمز کو چھپانا تھا جو پارٹی کے ان شرکا کے لیے تھے جو خزانے کی تلاش میں صحن کی کھدائی میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے۔

اس رات کھانے پینے کا دور چلتا رہا اور ان کے پڑوسی مختلف اقسام کی ڈشیں اور مشروبات لاتے رہے۔

آدھی رات کے قریب گریسی نے ہر جوڑے یا واحد فرد میں وہ کلیو اور اشارے تقسیم کر دیے جو خزانے کی تلاش میں مدد دے سکتے تھے۔ پھر ان سے کہا۔ ''جاؤ اور مالِ غنیمت تلاش کرو۔''

جارج نے پہلے ہی بہت سے بیلچے مستعار لے رکھے تھے تاکہ ہر کوئی جو باہر صحن میں کھدائی کرنے کا خواہش مند تھا، اس کھیل میں بھرپور شرکت کر سکے۔ وہ کچن ہی میں رک گیا اور اپنے دوستوں سے باتیں کرنے لگا جبکہ گریسی باہر چلی گئی اور خزانے کی تلاش کے کھیل کا جائزہ لینے لگی۔

اس وقت جارج کے ہاتھ سے مشروب کا جام گرتے گرتے بچا جب چند منٹ بعد اس نے کسی کو یہ چیختے ہوئے سنا۔ ''ارے، سب لوگ ادھر دیکھیں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے بلیک بیرڈ کی باڈی تلاش کر لی ہے۔ اسے باہر کھینچنے میں کوئی میری مدد تو کرے۔''

گریسی نے جب وہ ترپال دیکھی تو ہنسنے لگی۔ ''مبارک ہو! ہاں، یہی بلیک بیرڈ ہونا چاہیے۔ تمہیں آج رات گرانڈ پرائز ملے گا۔''

بہت سے لوگ دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے ترپال کو باہر کھینچنا شروع کر دیا جبکہ دیگر گڑھے کے اندر سے مٹی ہٹانے میں مصروف ہو گئے۔

جارج کو انہیں روکنے میں بہت دیر ہو گئی اور وہ اس وقت بے ہوش سا ہونے لگا جب اس نے ترپال کی تہ کھلنے کے بعد اس کے اندر سے پارٹی کے ڈھانچے کے بجائے اپنے سابقہ باس کے چہرے کو عیاں ہوتے دیکھا۔

جارج نے سہارے کے لیے گریسی کا بازو تھاما تو وہ اس کی جانب گھوم گئی۔ ''جارج، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ تم صحیح نہیں لگ رہے ہو؟''

☆☆☆

پولیس نے پارٹی کے شرکا کو اپنے اپنے گھر جانے کی اجازت دے دی۔

دو پولیس افسر جارج کے ساتھ باہر موجود تھے جبکہ دیگر لونگ روم میں گریسی سے سوالات کر رہے تھے۔

''مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ترپال کے اندر کیا ہے۔ پڑوسن کے ان دو لڑکوں نے وہ ترپال گیراج میں تلاش کی تھی۔ میں نے انہیں پارٹی کھیل کے راز میں شریک کرتے ہوئے اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ وہ اس لپٹی ہوئی ترپال کو باہر گڑھے میں دفن کر دیں۔ میرا خیال تھا کہ میں اس طرح جارج کو بھی حیران کر دوں گی۔''

''اور تمہیں یقین ہے کہ حال ہی میں کوئی اور تمہارے صحن کی طرف نہیں آیا تھا... حتیٰ کہ رات گئے بھی؟''

''اوہ نہیں، جارج ہی وہ واحد فرد تھا جو رات گئے ادھر گیا تھا... اوہ مائی گاڈ! اس کا مطلب ہے...''

''ہاں مسز جارج۔ ہمیں یقین ہے کہ تمہارے شوہر نے اپنے باس کو قتل کر دیا تھا اور کھاتوں میں اس طرح ہیرا پھیری کر دی تھی کہ یہ ظاہر ہو جیسے کارپوریٹ اکاؤنٹس میں غبن اس کے باس نے کیا ہے۔ جارج کے سابقہ باس فرینک سے متعلق وہ کہانی ہم نے اخبار میں سازش کے طور پر چھپوائی تھی تاکہ ہمیں اس غبن کو ثابت کرنے کے لیے وقت مل جائے۔''

گریسی نے نظریں اٹھا کر پولیس افسر کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''آپ کو لوگوں کی حقیقت کبھی پتا نہیں چلتی، ہے نا؟''

☆☆☆

پولیس جارج کو حراست میں لے کر چلی گئی۔

پولیس کے جانے کے بعد گریسی اپنے بیڈروم میں آ گئی۔ بستر پر لیٹنے سے پہلے گریسی نے اپنا جیولری بکس چیک کیا جس کے اندر اس نے شہر سے باہر واقع ایک جمنازیم کے لاکر کی چابی چھپائی ہوئی تھی۔ اس نے وہاں اپنی رجسٹریشن ایک فرضی نام سے کرائی تھی اور چھ ماہ کی آزمائشی مدت کا کرایہ بھی نقد جمع کرا چکی تھی۔ اس نے لاکر میں کام کے چند ملبوسات کے علاوہ ایک بڑا سا جمنازیم بیگ بھی محفوظ کیا ہوا تھا۔

اس جمنازیم بیگ میں دس لاکھ ڈالر سے زیادہ کی رقم نقدی کی صورت میں موجود تھی۔ اس نقد رقم کا بیگ اس نے اس وقت دریافت کیا تھا جب گیراج میں پہلی بار لپٹی ہوئی ترپال چھپی دیکھی تھی اور تلاشی لینے پر لاش اور رقم کا عقدہ کھلا تھا۔

وہ سوچنے لگی کہ جارج کو یہ وضاحت کرنے میں کتنی دشواری پیش آئے گی کہ وہ رقم کہاں غائب ہو گئی جبکہ فرینک کی لاش بدستور ترپال میں لپٹی ہوئی تھی۔

وہ یہ جملہ بار بار دہراتے ہوئے نیند کی آغوش میں چلی گئی کہ... ''آپ کو لوگوں کی حقیقت کبھی پتا نہیں چلتی... ہے نا؟''

ہینز نے اپنے دائیں جانب دیکھا۔ انجیلا اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سیٹ بیلٹ باندھنے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا اور اس سے کہنا بھی بیکار تھا۔ جواب میں وہ کوئی اس طرح کی بات کہتی۔ ”کیا تم کسی حادثے کے بارے میں سوچ رہے ہو۔“ وہ ہر کام اپنے طریقے سے کرتی تھی۔ ہینز اسے تھوڑے عرصے سے ہی جانتا تھا اور لوگوں کی اس بارے میں یہی رائے تھی کہ وہ ایک خودمختار عورت ہے اور کچھ لوگ اسے کتیا کہہ کر پکارتے تھے۔ کوئی اسے کچھ بھی کہے لیکن ایک بات پر سب متفق تھے کہ اس کے میئر بننے کے بعد شہر کے حالات کافی بہتر ہو گئے ہیں۔ اس سے پہلے ڈیموکریٹک پارٹی کئی عشروں سے اس اہم منصب پر قابض تھی۔ انجیلا نے لبرل ڈیموکریٹس کے پلیٹ فارم سے انتخابات میں حصہ لیا۔ اس کے مخالفین کا خیال تھا کہ انجیلا کے پاس خوب صورت ہونے کے سوا کوئی خوبی نہیں لیکن انتخابات جیتنے کے صرف چھ ماہ کے اندر وہ اتنی مقبول ہو گئی کہ مخالف پارٹی کا چیئرمین بھی اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

اور اب وہی انجیلا اس کی کار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے سینڈل اتارے اور نیم دراز ہو کر اپنے پاؤں ڈیش بورڈ پر رکھ دیے جس سے اس کی ٹانگیں عریاں ہو گئیں۔ ایک لمحے کے لیے ہینز کے ہاتھ کپکپائے اور اس نے مضبوطی سے اسٹیئرنگ وہیل سنبھال لیا۔ یہ نظارہ ہی ایسا تھا کہ کوئی پارسا شخص بھی اس سے نظریں نہیں ہٹا سکتا تھا۔ ہینز کو دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ یہ عورت سرتاپا پُرکشش ہے۔

سٹی ہال میں ہونے والا استقبالیہ اس کی توقع سے زیادہ طویل ثابت ہوا، اور پھر ان دونوں کا ٹکراؤ پارکنگ لاٹ میں ہوا۔ لیکن وہ اس طرح ملے جیسے یہ کوئی اتفاق نہیں بلکہ پہلے سے طے شدہ ملاقات ہو۔ ان کے درمیان مختصر گفتگو ہوئی اور انہوں نے مختلف ترقیاتی منصوبوں مثلاً نئے تکمیل کے

ان رنگین و پرنشاط لمحوں کی سوغات... جس کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی...

اتفاقات حسین ہی نہیں... سنگین بھی ہوتے ہیں... وہ بے حد خوش تھا... حسنِ اتفاق سے اسے ایک طرح دار حسینہ کی قربت مل گئی... لمحوں نے کروٹ لی اور یک بیک...... وہ اس پر بارش کی طرح مہربان ہوتی چلی گئی... اور پھر ایک اور اتفاق نے اس کی زندگی کو شدید سنگینی سے دوچار کر دیا...

بیچارہ

سکندر نسیم

میدان، اس کی کمپنی کا زیرِ تعمیر آفس کمپلیکس اور اسٹالیر ویلڈ کے بارے میں تبادلہ خیال کیا کیونکہ اس کی کمپنی کے سٹی کونسل کے ساتھ دو بڑے معاہدے ہوئے تھے اس لیے فطری طور پر ان کے درمیان اس سلسلے میں گفتگو ہوتی رہتی تھی۔

اچانک ہی انجیلا نے اپنے پرس سے سیل فون نکالا اور بولی۔ ''مجھے اپنے لیے ایک ٹیکسی منگوانا ہوگی۔''

''کیا میں تمہیں اپنی گاڑی میں لفٹ دے سکتا ہوں۔'' بینز کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ وہ بھول گیا تھا کہ کسی عام عورت سے نہیں بلکہ شہر کی میئر سے بات کر رہا ہے۔

انجیلا نے حیرت سے اسے دیکھا اور اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''او کے۔''

بینز نے اپنی بیوی کا نمبر ملایا لیکن اس سے رابطہ نہ ہو سکا۔ اس نے پیغام چھوڑ دیا۔ ''مجھے گھر آنے میں کچھ دیر ہو جائے گی۔ راستے میں پیٹر کے پاس رکوں گا۔''

بہتر ہوتا کہ وہ فون کر کے پیٹر کو بھی بتا دیتا۔ وہ گھر پر اکیلا ہی ہوگا۔ جب سے اس کی بیوی ایلی مری تھی، وہ اپنا بیشتر وقت گھر پر ہی گزارتا تھا لیکن یہ اس کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ انجیلا پہلے ہی بتا چکی تھی کہ اس کا شوہر ویک اینڈ گزارنے آرڈینس گیا ہوا ہے اور اس کا بیٹا بھی رات کو دیر سے گھر آئے گا۔ گویا ہر طرح سے حالات ان کے لیے سازگار تھے۔

اس نے انجیلا کی طرف دوبارہ دیکھا اور عین اسی لمحے وہ بھی اس کی جانب گھومی۔ دونوں جانب سے نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔ وہ جھینپتے ہوئے بولا۔ ''آگے سے دائیں جانب۔''

''ہاں اور اس کے بعد بائیں طرف۔ گویا تم جانتے ہو کہ میں کہاں رہتی ہوں؟''

''یقیناً تم میئر کی رہائش گاہ میں ہی رہتی ہوگی۔ وہ مکان ہماری کمپنی نے ہی پندرہ سال پہلے بنایا تھا۔''

''تم جانتے ہو کہ ابھی میرا گھر جانے کا موڈ نہیں ہے۔'' وہ بولی۔ اگلے موڑ سے پہلے اس نے کہا۔ ''بہت گرمی ہے۔''

واقعی سال کے ان دنوں میں اتنی گرمی نہیں ہوتی لیکن پچھلے ایک ہفتے سے ہوا میں نمی کا تناسب بڑھ گیا تھا اور گرمی سے لوگ بے حال ہو رہے تھے۔ اسی مناسبت سے مردوں نے شارٹس اور عورتوں نے ڈھیلی فٹنگ والے کپڑے پہننا شروع کر دیے تھے۔ ایک اخبار نے اس گرمی کو خاموش قاتل قرار دیا تھا کیونکہ یہ بوڑھے لوگوں کے لیے خطرناک ہو سکتی تھی۔

''واقعی بہت گرمی ہے۔'' انجیلا نے دوبارہ کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یہ گویا ایک طرح سے براہِ راست دعوت تھی اور ایسی جرأت صرف وہی کر سکتی تھی۔ زیادہ پینے کی وجہ سے وہ گاڑی نہیں چلا سکتی تھی لیکن اس وقت وہ اپنے ہوش و حواس میں تھی۔

''چلو ساحل پر چلتے ہیں، مزہ آجائے گا۔''

''تم تیرنا چاہتی ہو؟'' بینز نے پوچھا۔

''شاید۔''

پارکنگ لاٹ میں بہت کم روشنی تھی اور سب لوگ وہاں سے جا چکے تھے اور پارکنگ میں کوئی کار نہیں تھی۔ وہ جگہ بالکل پُرسکون لگ رہی تھی۔ بینز نے گھڑی دیکھی۔ سوا گیارہ بج رہے تھے۔ ''تم گھر جانا چاہ رہے ہو؟'' انجیلا نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''شاید تمہارے سونے کا وقت ہوگیا ہے۔''

اس نے اپنا گلا صاف کیا اور خجل ہوتے ہوئے بولا۔ ''نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

انجیلا نے اپنا ہاتھ اس کی ران پر رکھا تو بینز کے پورے بدن میں کرنٹ دوڑنے لگا۔ اس نے اپنے بکھرے حواس مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ وہ اور انجیلا اس وقت تنہا تھے۔ ایسے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا لیکن اس کا جسم دماغ کی نہیں مان رہا تھا۔ اس کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ اس نے اپنی سیٹ بیلٹ کھولی اور انجیلا کی طرف جھک گیا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے پیچھے ہٹی اور پھر اس کے مزید قریب آگئی۔

اس کے بعد وہ کار سے باہر آگئی۔ ایک لمحہ کے لیے رکی پھر اس کی جانب کا ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم آرہے ہو؟''

پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے بینز کو باہر کھینچ لیا اور سمندر کی طرف دوڑنے لگی۔ وہ بھی اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ اس کے قدم دو تین مرتبہ لڑکھڑائے لیکن وہ سنبھل گیا۔ آگے ایک تنگ راستہ تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچا اور اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ لڑکھڑا کر گری اور اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔

☆☆☆

فیڈور اور بینیٹ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے فٹ پاتھ پر ٹہل رہے تھے۔ وہ اس طرح کئی گھنٹے گزار سکتے تھے۔ اسکول میں ہونے والی پارٹی میں جانا بے کار تھا۔ وہاں وہی دوست ہوتے جن کی شکلیں روزانہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ان لوگوں کے بغیر کچھ وقت گزارا جائے اور وہ دونوں ایسی ہی تنہائی چاہتے تھے۔ آدھی رات بیت چکی تھی، ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی اور دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک جگہ رک کر فیڈور نے بینیٹ کو اپنی طرف کھینچا اور

اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ بھی اپنے ہاتھوں سے اس کا سر سہلانے لگی۔

''میں واقعی تمہیں پسند کرتی ہوں۔'' لڑکی نے سرگوشی میں کہا۔

''کتنی زیادہ۔'' فیڈور نے پوچھا۔

''یہ میں نہیں بتا سکتی۔'' اس نے شوخی سے کہا۔

فیڈور نے ایک بار پھر اسے گلے سے لگایا اور وہ دونوں آگے بڑھنے لگے۔ وہ ایک چھوٹے سے کار پارکنگ پہنچے جہاں صرف ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی لائٹس روشن تھیں اور ڈرائیور کی طرف کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ ایک بی ایم ڈبلیو کار تھی۔ فیڈور نے اس میں جھانک کر دیکھا۔ ''اس میں تو کوئی نہیں ہے۔''

''یہ حیرانی کی بات ہے۔'' بینیٹ نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ڈرائیور کہاں چلا گیا؟''

''ممکن ہے کسی لڑکی کے ساتھ ٹیلوں کے پیچھے ہو۔'' فیڈور بے اختیار بول پڑا۔

بینیٹ کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ فیڈور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ موسم گرما کے آغاز میں باپ نے اسے ایک خالی میدان میں اپنی رینالٹ کار چلانے کے لیے دی تھی۔ ابتدا میں اسے گیئر بدلنے میں تھوڑی سی مشکل ہوئی لیکن اس نے جلد ہی اس پر قابو پالیا۔ باپ نے وعدہ کیا تھا کہ اگلے سال جب وہ امتحان پاس کرے گا تو وہ اسے ڈرائیونگ اسکول میں داخلہ دلوا دے گا۔

''اس میں تو چابیاں بھی لگی ہوئی ہیں۔'' اس نے اگنیشن سوئچ آن کیا اور کار اسٹارٹ ہوگئی۔ بینیٹ اس کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔

''چلو، ایک چکر لیتے ہیں۔''

فیڈور بولا۔ ''بالکل نہیں۔''

''کم آن فیڈور، صرف ایک منٹ کے لیے۔ اسی پارکنگ لاٹ میں ایک چکر لیں گے۔''

''میرے پاس تو لائسنس بھی نہیں ہے۔'' اس نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

''اس وقت کوئی لائسنس نہیں مانگے گا۔'' وہ اپنا چہرہ اس کے قریب لاتے ہوئے بولی تو وہ اس کے قرب کی گرمی سے پگھل گیا اور ریورس لگا کر گاڑی پارکنگ لاٹ سے باہر نکال لی۔

''تمہیں ڈرائیونگ تو آتی ہے نا؟'' بینیٹ نے پوچھا۔
''یقیناً تم دیکھتی جاؤ۔'' اس نے پہلا گیئر ڈال کر گاڑی آگے بڑھائی۔ درختوں کی قطار کے پاس پہنچ کر اس نے اسٹیئرنگ گھمایا۔ گاڑی کا اسپینشن لاجواب تھا۔
''بہت مزہ آرہا ہے۔'' بینیٹ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ''بس یونہی چلاتے رہو۔''
فیڈور کو خود بھی بہت مزہ آرہا تھا۔ ایک قیمتی کار اور پہلو میں خوب صورت لڑکی۔ ایسے مواقع زندگی میں بہت کم ملتے ہیں۔ پھر کیوں نہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے۔ اس نے بینیٹ کی طرف دیکھا۔ چاند کی روشنی میں اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔
دو منٹ کے بعد وہ مرکزی شاہراہ پر آگئے۔ فیڈور نے کہا۔ ''بہتر ہے کہ ہم واپس چلیں۔ مجھے گاڑی موڑنے کے لیے کوئی جگہ دیکھنی چاہیے۔'' یہ کہہ کر اس نے گاڑی دائیں جانب کر کے انڈیکیٹر آن کر دیا۔ ذرا سا آگے گاؤں جانے کے لیے ایک موڑ تھا لیکن وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ وہاں ٹریفک پولیس ہوسکتی ہے۔ بہتر ہے کہ ان سے دور ہی رہا جائے۔ آگے ایک موڑ تھا جہاں سے وہ یوٹرن لے سکتا تھا۔ اس نے رفتار آہستہ کی لیکن عین اس وقت عقب میں ایک ہارن کی آواز سنائی دی۔ وہ ذرا سا اچھلا۔ عقب میں ایک کنورٹیبل کا انجن غرا رہا تھا اور اس میں دولڑکے سوار تھے۔
بینیٹ نے اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ اتارا، اور چلاتے ہوئے بولی۔ ''کمینے۔''
فیڈور کی ٹانگیں کپکپانے لگیں اور اس کی ہتھیلیاں پسینے سے تربتر ہوگئیں۔ اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھ پھسلنے لگے۔
''ہمیں واپس چلنا چاہیے۔'' بینیٹ غصے سے بولی۔
فیڈور نے سوچا کہ شاید وہ اسے متاثر نہیں کرسکا۔ اس نے بے دلی سے سوچا پھر بڑی احتیاط سے گاڑی موڑ لی اور گاڑی کو پہلے گیئر میں ڈالنے لگا لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ ایک زوردار آواز آئی اور انجن بند ہوگیا۔
''کیا ہوا؟'' بینیٹ نے پوچھا۔
''کچھ نہیں، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' اس نے دوبارہ چابی گھمائی تو گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔ اس نے پہلا گیئر ڈال کر کلچ پر سے پاؤں ہٹا لیا۔ اچانک ہی پیچھے سے تیز روشنی پڑی۔ گاڑی نے ایک جھٹکا لیا اور زوردار ٹکر کی آواز آئی اور وہ دونوں اپنی جگہ پر منجمد ہوکر رہ گئے۔
فیڈور کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ گاڑی کو کس طرح پارکنگ لاٹ لے کر واپس جائے۔ بینیٹ اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتی تھی بلکہ وہ روئے جارہی تھی۔
''وہ بہت تیز ڈرائیونگ کر رہا تھا۔'' فیڈور نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے نہیں دیکھ سکا اور اچانک ہی اس نے گاڑی کو ٹکر ماردی۔''
وہ جیسے تیسے گاڑی کو پارکنگ لاٹ میں اس جگہ لے آیا جہاں وہ پہلے کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر اسٹیئرنگ صاف کیا پھر وہ کار سے باہر آگیا لیکن بینیٹ اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔ گرمی کے باوجود اس پر کپکپاہٹ طاری تھی۔
''باہر آجاؤ۔ ہمیں فوراً یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ وہ کسی وقت بھی واپس آسکتے ہیں۔'' فیڈور نے کہا پھر وہ گھوم کر کار کی دوسری جانب گیا اور دروازہ کھول کر بینیٹ کا بازو کھینچنے لگا۔
''ہمیں کچھ کرنا چاہیے تھا۔'' وہ ناک میں سے آواز نکالتے ہوئے بولی۔
''تم پاگل ہوگئی ہو۔'' فیڈور نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم تصور کرسکتی ہو کہ ہم کس مشکل میں ہوتے؟''
''لیکن ممکن ہے.....'' اس نے کہنا شروع کیا۔
''بالکل نہیں۔ اسے ہلکی سی چوٹ آئی ہوگی۔ اچھی بات یہ ہے کہ اس نے ہیلمٹ پہن رکھا تھا۔ وہ ٹھیک ہی ہوگا، مجھ پر بھروسا رکھو لیکن یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ ہم کار سے اتر کر اسے دیکھتے اور اس معاملے میں ملوث ہوجاتے۔''
☆☆☆
وہ دونوں اس طرح جڑے ہوئے تھے جیسے کبھی الگ نہ ہونا چاہتے ہوں۔ ہینز اور انجیلا ڈگمگاتے قدموں سے کار کی طرف آئے۔ کار کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں اور ڈرائیور کی طرف کا دروازہ پورا کھلا تھا۔ ہینز ٹھٹک کر اپنی جگہ کھڑا ہوگیا۔ اس نے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالا لیکن کار کی چابیاں نہیں تھیں۔ وہ تیزی سے کار کی طرف لپکا۔ چابیاں اگنیشن میں لگی ہوئی تھیں۔
''کیا کوئی گڑبڑ ہے؟'' انجیلا نے قریب آکر پوچھا۔ وہ کار سے باہر آگیا اور اپنے دونوں بازو اس کی گردن میں ڈال دیے۔ خاموشی کا ایک لمحہ آیا اور گزر گیا۔ وہ انجیلا سے مستقبل کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن فی الوقت یہ مناسب نہیں تھا۔ وہ کار کی طرف جھکا اور اس کا سیدھا ہاتھ بونٹ پر گیا۔ بڑی عجیب بات تھی کہ انجن ابھی تک گرم تھا۔ شاید گرمی کی وجہ سے اسے ٹھنڈا ہونے میں زیادہ وقت لگے۔

''ہمیں اب چلنا چاہیے'' ہینز نے کہا اور انجیلا نے تائید میں سر ہلا دیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد انہوں نے ایمبولینس کے سائرن کی آواز سنی۔ اپنے گھر سے سو میٹر کے فاصلے پر انجیلا نے کہا کہ وہ یہیں اتر جاتی ہے۔ ہینز نے اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی لیکن انجیلا نے اسے روک دیا اور بولی۔ ''یہ ٹھیک نہیں ہے۔''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، انجیلا دروازہ کھول کر باہر جا چکی تھی۔ پانچ منٹ بعد وہ بھی اپنے گھر پہنچ گیا۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ اس کی بیوی میرین سو چکی ہے۔ اس نے اپنے لیے وہسکی کا ایک گلاس بنایا اور ٹیرس پر چلا گیا اور آنکھیں بند کر کے انجیلا کے تصور میں کھو گیا۔ وہ ابھی تک اس کی قربت کے سحر میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے گلاس خالی کیا اور شاور لینے کے بعد خاموشی سے اپنے بستر پر چلا گیا۔ میرین نے کوئی حرکت نہیں کی، پانچ منٹ بعد اس کی آواز ابھری۔ ''دیر ہو گئی۔''

''ہاں، راستے میں ایک بار میں رک گیا تھا۔'' اسے یہ بہانہ غیر ضروری لگا لیکن اس کے ذہن میں یہی بات آسکی تھی۔

''پیٹر کیسا ہے؟''

''ہاں وہ ٹھیک ہے۔'' ہینز نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ ''شب بخیر۔''

☆☆☆

فیڈور کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے دیکھا کہ اسکرین پر بینیٹ کا نام آرہا تھا۔

''تم نے کچھ سنا۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

''اس موٹر بائیک والے کی بات کر رہی ہو۔ ابھی کچھ معلوم نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے کہ سوموار کے اخبار سے ہی کچھ پتا چل سکے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ ہمیں پولیس کے پاس جانا چاہیے۔'' بینیٹ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''پولیس کے پاس، وہ کیوں؟'' فیڈور چونکتے ہوئے بولا۔

''ہماری گاڑی سے اس کی ٹکر ہوئی ہے فیڈور اور یہ جرم ہے۔''

''اس نے ہمیں ٹکر ماری، ہم نے نہیں۔ اگر ہم اپنا منہ بند رکھیں تو کبھی کوئی نہیں جان سکے گا کہ اس کار میں ہم دونوں تھے۔ امکان یہی ہے کہ اس موٹر سائیکل سوار نے ہمیں نہیں دیکھا ہوگا۔ اس لیے وہ بھی کچھ نہیں کہہ سکے گا۔''

کچھ دیر تک دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بولا پھر بینیٹ نے پوچھا۔ ''کیا آج ہم کہیں مل سکتے ہیں؟''

''مجھے ہوم ورک کرنا ہے۔'' وہ بولا۔ ''اور میری مما چاہتی ہیں کہ سہ پہر میں ان کے ساتھ نانی کے پاس جاؤں۔''

اچانک ہی بجلی چمکی اور چند لمحوں میں آسمان بادلوں سے بھر گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہو گئی۔ فیڈور نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اتنی تیز بارش ہو رہی تھی کہ سڑک کے پار مکانات بھی نظر نہیں آرہے تھے۔

''ٹھیک ہے۔ اب سوموار کو اسکول میں ملاقات ہو گی۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

آدھے گھنٹے بعد بینیٹ نے پھر اسے فون کے ذریعے پیغام بھیجا۔ ''ہمیں پولیس کے پاس جانا چاہیے۔''

اس نے جوابی پیغام میں کہا۔ ''اس بات کو بھول جاؤ اور مجھ پر بھروسا کرو۔''

☆☆☆

ہینز نے انجیلا کو فون کرنے کے لیے کئی بار ریسیور اٹھایا لیکن ہر مرتبہ نمبر ڈائل کیے بغیر واپس کریڈل پر رکھ دیا۔ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ ہوا، وہ محض ایک رات کا ملاپ تھا۔ اسے یاد تو رکھا جاتا ہے لیکن بار بار دہرانا ممکن نہیں۔ اسے امید تھی کہ وہ بھی اس رات کو یاد رکھے گی لیکن یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ میرین کچن میں مصروف تھی۔ ہینز نے اپنے دوست پیٹر کو فون کیا اور جلدی جلدی اسے سارا واقعہ سنانے کے بعد کہا۔ ''میں نے میرین کو یہی بتایا ہے کہ تمہارے ساتھ تھا۔''

''گویا مجھے جائے وقوعہ سے تمہاری عدم موجودگی کی شہادت دینا ہوگی۔''

''یہی سمجھ لو۔''

''مسٹر ہینز۔'' اس کی سیکریٹری نے انٹرکام پر کہا۔ ''پولیس کا فون ہے۔ کیا تم ابھی بات کر سکتے ہو یا انہیں کہہ دوں کہ وہ بعد میں فون کریں۔''

''مجھے لائن دو۔ ابھی بات کر لیتا ہوں۔''

ہلکی سی کلک کے بعد دوسری جانب سے ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ ''میں جان کمبر بول رہا ہوں۔ کیا میں ہینز برگ مین سے مخاطب ہوں۔''

''میں ہینز برگ مین ہی ہوں۔ بولو کیا بات ہے؟''

''مسٹر برگ مین، میرا تعلق پولیس سے ہے اور میں ایک نظر تمہاری کار دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''میری کار! کیوں؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

''میں آدھے گھنٹے میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔'' جان کمبر نے مزید کوئی بات کیے بغیر فون بند کر دیا۔

ہینز کے ذہن میں پہلی بات یہی آئی کہ کار میں انجیلا

کی موجودگی کی کچھ نشانیاں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً اس کے بالوں کا گچھا یا پرفیوم کی خوشبو وغیرہ۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا پارکنگ لاٹ تک گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر پسنجر سیٹ پر ہاتھ پھیرا اور کچھ سونگھنے کی کوشش کی لیکن اسے ایسی کوئی علامت نہیں نظر آئی پھر اس نے کار کے گرد ایک چکر لگایا تو اسے ایک بڑا سا ڈینٹ اور پسنجر سائڈ کے عقبی حصے میں گہری خراشیں نظر آئیں جبکہ دائیں جانب پیچھے کی لائٹ بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ لگ رہا تھا جیسے کار کو کسی نے پیچھے سے ٹکر ماری تھی لیکن کہاں؟ اس پارکنگ لاٹ میں تو یہ ممکن نہیں۔ گھر میں وہ اپنی گاڑی پورچ میں کھڑی کرتا ہے اور کل وہ پورے دن کہیں نہیں گیا۔ پرسوں البتہ اس نے گاڑی ضرور چلائی تھی لیکن یہ کب ہوا؟ کیا پولیس یہی معلوم کرنے کے لیے آرہی ہے؟ اس طرح کے کئی سوالات اس کے ذہن میں سر اٹھانے لگے۔

دفتر میں واپس آکر وہ اپنی میز پر بیٹھا اور شاپنگ سینٹر کی فائل دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد سیکریٹری نے اسے بتایا کہ مسٹر کمبر استقبالیہ پر اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

''تم سے مل کر خوشی ہوئی ہینز برگ مین۔'' اس نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیوں نہ ہم پہلے کار دیکھ لیں۔''

وہ دونوں کار تک گئے۔ کمبر نے گھوم پھر کر بی ایم ڈبلیو کا جائزہ لیا اور ڈینٹ کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ کیسے لگا؟''

ہینز نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ''لگتا ہے کہ کسی نے اس وقت ٹکر ماری جب گاڑی کہیں پارک ہوئی ہوگی۔ میں نے بھی ابھی ہی دیکھا ہے۔''

کمبر نے اس جگہ انگلی پھیری جہاں خراشیں پڑی ہوئی تھیں اور بولا۔ ''لگتا ہے کہ یہ زیادہ پرانی نہیں ہیں۔''

بوندا باندی شروع ہونے لگی تو ہینز نے کہا۔ ''ہمیں اندر جانا چاہیے۔''

کمبر نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور بولا۔ ''تم ہفتے کے روز نصف شب کے قریب کلب اسٹریٹ سے تو نہیں گزرے تھے؟''

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے لیکن ضرور کوئی سنجیدہ بات ہے۔ پولیس محض چند خراشیں دیکھنے کے لیے کسی کے دروازے پر نہیں آتی۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''ہفتے کے روز؟''

''ہاں، ہفتے کی شب اس علاقے سے ایک کار تیز رفتاری سے گزر رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے ڈرائیور کو کسی کی تلاش ہے۔ ایک عینی شاہد کا کہنا ہے کہ وہ بی ایم ڈبلیو تھی۔ عین اس وقت ایک موٹر سائیکل سوار کار سے ٹکرا گیا۔ اسے شدید چوٹیں آئیں۔ اس لیے ہم اس علاقے کی تمام بی ایم ڈبلیو کاروں کو چیک کر رہے ہیں۔''

ہینز کچھ نہیں بولا۔ وہ ابھی تک کمبر کی بات نہیں سمجھ پایا تھا۔

☆☆☆

لنچ کے وقت فیڈور اور بینیٹ کی ملاقات ہوئی تو وہ بولی۔ ''میں نے ٹی وی پر یہ خبر دیکھی ہے۔ ایک چوبیس سالہ لڑکا وہ موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ وہ اسپتال میں ہے اور اسے بہت زیادہ چوٹیں آئی ہیں۔ یہ سب ہماری غلطی سے ہوا۔''

''اس میں ہماری کوئی غلطی نہیں ہے۔'' فیڈور نے کہا۔ ''ہماری کار کی رفتار برائے نام تھی اور تمام لائٹس جل رہی تھیں۔ اس نے ہمیں ٹکر ماری، یہ سو فیصد اسی کی غلطی ہے۔''

''اگر ہم وہاں نہ جاتے تو یہ واقعہ پیش نہ آتا۔'' بینیٹ نے کہا۔

''لیکن اس سے ہماری غلطی تو ظاہر نہیں ہوتی۔'' اس نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ وہ کار سے اتر کر گیا ہے۔ وہ لڑکا زخمی حالت میں سڑک پر پڑا ہوا تھا اور دس میٹر کے فاصلے پر اس کی موٹر سائیکل کا پہیا ابھی تک گھوم رہا تھا۔ اگر وہ مر گیا تو وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے اور زندہ رہا تو کوئی نہ کوئی فون کر کے ایمبولینس اور پولیس کو بلا لے گا۔ اوہ میرے خدا، پولیس۔ اگر اس کے والدین کو معلوم ہو گیا تو وہ اسے مار ڈالیں گے۔

''وہ بے وقوف انتہائی تیز رفتاری سے بائیک چلا رہا تھا۔''

''لیکن۔'' بینیٹ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''ہمیں پولیس کے پاس جانا چاہیے۔''

فیڈور نے دیکھا کہ بینیٹ کی بہترین دوست وویان ان دونوں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ چنانچہ اس نے بینیٹ کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور دونوں وہاں سے چل دیے۔

دوسرے دن پولیس آفیسر کمبر نے ہینز کو مزید تحقیقات کے لیے پولیس اسٹیشن بلایا۔ ایک نوجوان آفیسر اسے دفتر واپس چھوڑنے آیا۔ ہینز نے اپنی سیکریٹری کم کو بتا دیا کہ وہ ایک میٹنگ میں مصروف ہے لہٰذا اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ اس نے اپنا سیل فون بھی بند کر دیا۔ پھر اس نے کمپنی کی کار نکالی اور کئی گھنٹے تک بے مقصد ڈرائیونگ کرتا رہا کیونکہ اس کی اپنی کار پولیس اسٹیشن میں بند تھی۔ ساری دوپہر بارش ہوتی رہی۔ اس نے گاڑی ایک کیفے کے سامنے روکی، اپنے لیے کافی اور سینڈوچ کا آرڈر دیا اور اپنے بکھرے ہوئے خیالات

کو مجتمع کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

ساڑھے چار بجے وہ واپس دفتر آیا تو سیکریٹری نے اسے مطلع کیا کہ مسٹر کبر اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا وہ انہیں فون کرلے۔ کبر نے اسے پولیس اسٹیشن آنے کے لیے کہا تاکہ اس سلسلے میں مزید بات کی جاسکے۔ اس بار کبر نے اسے گاڑی کی پیشکش نہیں کی۔ مجبوراً ہینز کو ٹیکسی کے ذریعے جانا پڑا۔ اس مرتبہ کبر کے پاس ایک اور شخص بھی موجود تھا جس نے اپنا تعارف مولڈر کہہ کر کروایا۔ اس کے بعد وہ فوراً ہی مطلب کی بات پر آگئے اور ہینز کو بتایا گیا کہ تباہ شدہ موٹر سائیکل پر رنگ کے نشانات بی ایم ڈبلیو کے رنگ سے ملتے ہیں۔

''لیکن اس رنگ کی تو کئی بی ایم ڈبلیو گاڑیاں شہر میں ہوں گی۔'' ہینز نے کہا۔

''یہ رنگ کے دھبے تمہاری کار سے ہی لگے ہیں اور یہ مت بھولو کہ تمہاری کار پر ڈینٹ اور خراشیں بھی پڑی ہوئی ہیں۔''

ہینز کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ کسی نے میری کار کو اس وقت ٹکر ماری جب یہ کہیں کھڑی ہوئی ہوگی۔''

''یقیناً یہ واقعہ حال ہی میں پیش آیا ہے۔ حیرت ہے کہ تم نے آج سے پہلے اس کا نوٹس نہیں لیا؟ کیا تم بتا سکتے ہو کہ ہفتے کے روز نصف شب کے قریب تم کہاں تھے؟''

''ایک پرانے دوست پیٹر لینگر کے پاس۔''

انہوں نے پیٹر کا نام لکھا اور اس کا پتا و فون نمبر پوچھنے لگے۔ ہینز نے سوچا کہ پولیس اسٹیشن سے نکلتے ہی اسے پیٹر کو فون کرنا ہوگا پھر اسے احساس ہوا کہ اگر اس پر شک کیا جارہا ہے تو شاید وہ اسے نہ جانے دیں۔ ایسی صورت میں اسے میرین کو فون کرنا ہوگا کہ وہ اس کے لیے کپڑے، ٹوتھ پیسٹ اور برش لیتی آئے۔

''گویا تم سٹی ہال کی تقریب ختم ہونے کے بعد اپنے دوست سے ملنے گئے تھے؟'' لگتا تھا کہ وہ پورا ہوم ورک کر چکے تھے۔

''ہاں، وہ میرا پرانا دوست ہے۔ اس کی بیوی کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے اور اب وہ تنہا ہے۔''

''اور وہ چیپل اسٹریٹ پر رہتا ہے۔'' کبر نے ہینز کو معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے کہا کیونکہ جس جگہ یہ حادثہ ہوا تھا۔ وہ راستے میں پڑتی تھی۔

☆☆☆

''کیا کوئی گڑبڑ ہے؟'' میرین نے پوچھا۔ اس وقت وہ اپنی پسندیدہ آرام کرسی میں بیٹھا وسکی کے گھونٹ لے رہا تھا۔

''نہیں، کچھ نہیں۔''

''تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔ لگتا ہے کہ کوئی بات تمہارے دماغ میں گردش کررہی ہے۔''

اس نے میرین کو بتانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس سے پہلے کہ کل یا پرسوں یہ خبر اخبار میں آجائے چنانچہ اس نے میرین کو بھی وہی کہانی سنائی جو وہ پولیس کو بتا چکا تھا کہ وہ سٹی ہال کی تقریب سے فارغ ہوکر پیٹر سے ملنے گیا اور وہاں سے گھر آگیا اور جہاں تک اس کے علم میں ہے، اس دوران کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا لیکن یوں لگتا ہے کہ کسی موٹر سائیکل سوار نے کہیں میری کار کو ٹکر ماری ہے اور اب وہ انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں ہے۔

''یہ واقعہ کیسے پیش آیا۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن ایسا ہی ہوا ہے۔'' اور اچانک ہی اس کی سمجھ میں آگیا کہ یہ سب کیسے ہوا ہوگا۔ یوں لگا جیسے کوئی نادیدہ شاہد اس کے کان میں سرگوشی کررہا ہے۔ جب وہ انجیلا کے ساتھ ٹیلوں کی آڑ میں مصروف تھا تو کوئی شخص اس کی کار لے کر سیر کرنے چلا گیا اور راستے میں کہیں موٹر سائیکل نے اس کی گاڑی کو ٹکر ماردی۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ واپس اپنی کار کے پاس آیا تو اس کا انجن خاصا گرم تھا۔ جس کسی نے بھی یہ حرکت کی تھی، وہ اس امید پر کار کو واپس اسی جگہ چھوڑ کر چلا گیا کہ سارا الزام کار کے مالک پر آئے گا۔

''خدا اسے غارت کرے۔'' وہ اپنی ہتھیلی پر مُکّا مارتے ہوئے بولا لیکن میرین کا کہنا تھا کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ اس سے ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے۔

''میں اس موضوع پر بات کرتے کرتے تھک چکا ہوں۔'' اس نے میرین سے کہا اور کھانا کھا کر اپنے ہوم آفس میں چلا گیا۔ میرین اس کے لیے کافی بنا کر لائی۔ کافی ختم کرنے کے بعد اس نے پیٹر کو فون کیا جس نے بتایا کہ وہ خود ہی اسے فون کرنے والا تھا کیونکہ پولیس والے ابھی ابھی اس کے پاس سے گئے ہیں۔

''پھر تم نے کیا کہا؟''

''میں نے تمہاری بات کی تائید کردی لیکن میں نہیں سمجھتا کہ تم نے یہ کہانی پولیس کے لیے گھڑی ہوگی۔''

''ہاں، دراصل میں نے میرین کو یہی بتایا تھا کہ دیر سے گھر آؤں گا کیونکہ مجھے پیٹر سے ملنے جانا ہے، تم تو اسے

جانتے ہو۔"

"لیکن پولیس کیوں آئی تھی؟" پیٹر نے پوچھا۔ "کیا تم کسی مشکل میں ہو؟"

ہینز نے اسے سب کچھ سچ سچ بتا دیا کہ جب وہ ساحل پر کسی کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا تو کوئی شخص اس کی کار لے کر چلا گیا اور ایک حادثے میں موٹر سائیکل سوار زخمی ہو گیا۔

"اور یہ واقعہ اس جگہ پیش آیا جو تمہارے گھر سے زیادہ دور نہیں ہے جبکہ میں تمہارے پاس نہیں آیا تھا۔"

"اور اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ تم ہفتے کی شب میرے پاس نہیں آئے تھے تو میرے ساتھ کیا ہو گا۔ یہی کہ میں نے پولیس سے جھوٹ بولا تاکہ جائے حادثہ سے تمہاری غیر موجودگی ثابت کی جا سکے۔" ہینز نے اس کی آواز میں برہمی محسوس کی۔ "اس طرح تو میں بھی بعد از جرم اعانت کا مرتکب ٹھہرایا جاؤں گا۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو۔ تمہیں نہیں معلوم تھا کہ اس کا حادثے سے کوئی تعلق ہے۔ تم نے سوچا ہو گا کہ میرین کی ناراضی سے بچانے کے لیے میری مدد کر رہے ہو۔"

"لیکن اب میں جھوٹا سمجھا جاؤں گا۔"

ہینز نے ایک گہری سانس لی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے اور کیا سوچے۔ ساری باتیں اس کے دماغ میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ اس کے لیے سیدھا بیٹھنا مشکل ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے اپنے پرانے دوست سے کہا۔ "تم وہی کرو جو تمہیں کرنا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے انجیلا کا فون نمبر تلاش کرنا شروع کیا۔ ہفتے کی رات جو کچھ ہوا، اس کے بارے میں ان کے ذہن میں کوئی ابہام نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اگر وہ اس حادثے کی ذمے داری سے اپنے آپ کو نہیں بچاتا تو نہ جانے اسے کتنے برس جیل میں رہنا پڑے۔ اب صرف ایک شخص ہی اس کی مدد کر سکتا تھا، جس نے اس کی کار چرائی تھی لیکن وہ بھی اس چوری کا اقرار نہیں کرے گا۔ ہینز کو اس بات کا پورا یقین تھا۔

میرین کو بھی جلد یا بدیر حقیقت کا پتا چل جاتا اور وہ یہ سنتے ہی آپے سے باہر ہو جاتی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے چیخنے چلانے سے نہیں روکے گا اور جب تک اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو جاتا، وہ ایک لفظ بھی نہیں کہے گا۔ اس نے وہسکی کی بوتل نکالی۔ اپنے لیے ایک گلاس بھرا۔ نیچے جا کر برف نکالی۔ اس دوران میرین اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ وہسکی کے چند گھونٹ لینے کے بعد اس میں انجیلا کو فون کرنے کی ہمت پیدا ہو گئی۔

"ہیلو۔" ایک نوعمر لڑکے کی آواز سنائی دی۔

"میرا نام ہینز برگ مین ہے اور میں تمہاری ماں سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

"میں اسے بلاتا ہوں۔"

وہ تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتا تھا کہ لڑکا اپنی ماں کے پاس کارڈلیس فون لے کر گیا ہے۔ اس کے کانوں میں آواز آئی۔ "مما، تمہارا فون، کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔"

وہ نہیں سن سکا کہ جواب میں انجیلا نے کیا کہا البتہ اسے لڑکے کی آواز سنائی دی۔ "کیا تم دوبارہ اپنا نام بتانا پسند کرو گے؟"

"ہینز برگ مین۔ مجھے اس سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔"

"ہینز برگ مین۔" لڑکے نے دہرایا۔ "وہ تم سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔"

ایک منٹ بعد اسے انجیلا کی آواز سنائی دی۔ "میں نہا رہی تھی۔ کہو کیا بات ہے؟"

"وہ سوچنے لگا کہ اگر وہ نہا رہی تھی تو اس نے یہ بات اسے کیوں بتائی، اس نے اسے حادثے کے بارے میں بتایا لیکن اسے یوں لگا جیسے اسے یہ خبر مل چکی ہے۔

"ہمیں پولیس کے پاس جانا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ ہم ایک ساتھ جائیں اور انہیں سچ بتا دیں۔"

"میں نہیں جانتی کہ تم کس بارے میں بات کر رہے ہو۔" اس نے زبردستی قہقہہ لگانے کی کوشش کی۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کس بارے میں بات کر رہا ہوں۔ ساحل کے کنارے خالی پارکنگ لاٹ، تم سمندر کی طرف بھاگیں، میں نے تمہارا تعاقب کیا اور پھر ...."

"یقیناً تم نے کوئی خوب صورت خواب دیکھا ہے اور پھر سے تمہاری کیا مراد ہے۔ کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ ہم نے وہاں کچھ کیا تھا؟"

"ہاں، ہم نے بہت کچھ کیا تھا۔"

"یہ تمہارے ذہن کی اختراع ہے۔"

"بہت ہو چکا انجیلا۔ اب یہ مذاق ختم کرو، ہمیں ...."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے انجیلا نے رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ کچھ دیر ریسیور کو دیکھتا رہا پھر پوری قوت سے چلاتے ہوئے کہا۔ "کتیا ....!"

☆☆☆

آخری پیریڈ ختم ہونے کے بعد فیڈور اور بینیٹ کی ملاقات ہوئی تو اس نے پوچھا۔ ''کیا تم نے اخبار میں خبر دیکھی؟''

فیڈور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بینیٹ نے کہا۔ ''انہوں نے اس بے چارے کو گرفتار کرلیا ہے جبکہ اس نے کچھ نہیں کیا۔''

''ہم نے بھی کچھ نہیں کیا۔'' فیڈور نے کہا۔

بینیٹ نے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا اور بولی۔ ''لیکن ہم اس کی کار لے گئے تھے۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو ....''

''یہ کیا تم نے اگر مگر لگا رکھی ہے۔ میں اس سے زیادہ نہیں سن سکتا۔'' فیڈور نے برہمی سے کہا۔

''ہمیں پولیس کو بتا دینا چاہیے۔ میں رات کو سو نہیں سکتی اور اسی کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ وہ بے چارہ جیل میں ہے جبکہ وہ بالکل بے قصور ہے۔'' اس نے فیڈور کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تم نہیں چاہو گے کہ وہ یہ سزا بھگتے۔''

''تمہارا خیال ہے کہ میں جیل چلا جاؤں۔''

''تم جیل نہیں جاؤ گے اگر تم پولیس کو بتا دو کہ یہ حادثہ کس طرح پیش آیا تھا اور اس میں کس کی غلطی تھی۔''

''تم یہ کس طرح کہہ سکتی ہو؟''

''میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔'' بینیٹ نے اعتراف کیا پھر اس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ ''ہم تمہاری مما سے بات کرسکتے ہیں۔ وہ تمام قانونی معاملات سے واقف ہیں۔ چلو اُن سے کہتے ہیں۔''

فیڈور کچھ ہچکچا رہا تھا لیکن بینیٹ نے کچھ اس طرح اسے دیکھا کہ اسے اس کی بات ماننا پڑی۔ وہ ہار مانتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ وہ شام چھ بجے تک گھر آجائے۔''

☆☆☆

''نہیں، میں کسی سے بھی کوئی بات نہیں کروں گی۔'' فیڈور کی ماں نے کہا۔

''کیا تم سچ بتانا نہیں چاہتیں؟'' بینیٹ حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں نہیں سمجھتی کہ یہ کوئی مناسب بات ہوگی۔ خاص طور پر فیڈور کے لیے۔ اس کے پاس تو لائسنس بھی نہیں ہے اور تم شارع عام پر سفر کررہے تھے۔ یہ قانون کی سنگین خلاف ورزی ہے۔ تم جانتی ہو کہ بغیر لائسنس ڈرائیونگ کرنا جرم ہے اور پھر اس سے ایکسیڈنٹ بھی ہوگیا۔''

''یہ حادثہ اس کی غلطی کی وجہ سے نہیں ہوا۔'' بینیٹ نے احتجاج کرتے ہوئے کہا لیکن اس کی ماں نے سنی ان سنی کر دی اور بولی۔

''اس کے بعد وہ پولیس کو اطلاع دیے یا ایمبولینس کو فون کیے بغیر جائے حادثہ سے فرار ہوگیا۔ میں نہیں جانتی کہ جج اس جرم کی کیا سزا تجویز کرے گا لیکن مجھے اندازہ ہے کہ تم اور فیڈور بہت بڑی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔''

''لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اس بے گناہ آدمی پر الزام ڈال دیا جائے۔''

''پیاری لڑکی، زندگی میں سب کچھ صحیح نہیں ہوتا۔ کیا یہ جائز ہوگا کہ فیڈور کا مستقبل صرف اس لیے تباہ ہوجائے کہ اس احمق موٹر سائیکل سوار نے یہ دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی کہ فیڈور کس طرف جا رہا تھا اور اس کی کار سے ٹکرا گیا۔''

بینیٹ نے قالین پر نگاہیں جمادیں جیسے اسے امید ہو کہ فیڈور کی ماں کے سوال کا جواب وہاں لکھا ہوگا۔

''ہاں، یہی مناسب رہے گا کہ پولیس کو کچھ نہ بتایا جائے۔'' بینیٹ نے آہستہ سے کہا۔ فیڈور کی ماں نے جو تصویر اسے دکھائی وہ بڑی بھیانک تھی۔ اگر پولیس کو بتا دیا جاتا تو فیڈور پر ایک نہیں کئی الزام لگ جاتے۔ کار چوری کا الزام۔ بغیر لائسنس گاڑی چلانے کا الزام۔ پولیس کو اطلاع دیے یا ایمبولینس کو فون کیے بغیر جائے وقوعہ سے بھاگ جانے کا الزام۔ یہ سارے الزامات بہت سنگین تھے اور فیڈور کا مستقبل تباہ ہو جاتا۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی اور اسے کھونا نہیں چاہتی تھی چنانچہ فیڈور کی ماں کی بات اس کی سمجھ میں آگئی۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر گفتگو کا رخ دوسرے موضوعات کی طرف مڑ گیا۔ وہ اسکول کی باتیں کرتے رہے۔ نیا سال ابھی شروع ہوا تھا لیکن پڑھائی زور و شور سے ہو رہی تھی۔ وہ اپنے پروجیکٹس اور اسائنمنٹ کی باتیں کرنے لگے۔ ساڑھے چھ بجے بینیٹ نے کہا کہ وہ گھر جانا چاہتی ہے۔ وہ جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو کافی پُرسکون اور مطمئن تھی۔ اس نے فیڈور کی ماں سے کہا۔ ''ہم سے باتیں کرنے کا شکریہ میڈم۔''

''میڈم۔'' فیڈور کی ماں چونکتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں مجھ سے اتنا پُرتکلف ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم مجھے صرف انجیلا کہہ سکتی ہو۔''

دراز دست

رو بینہ رشید

خدا کی طرف سے برائی کبھی نہیں آتی... وہ ہمیں عقل اور علم کے دریا سے اسی لیے سرفراز کرتا ہے کہ ہم غلطیوں اور ہلاکت خیز گڑھوں سے بچتے رہیں... اس کے باوجود عقل فہم، ذی ہوش نادان انسان ایسی راہوں کا انتخاب کر بیٹھتا ہے... جس کا نتیجہ صرف اور صرف تباہی کی صورت میں نکلتا ہے... دوستی کے خوب صورت رشتے کی آبیاری خلوصِ نیت... اپنائیت' قربانی اور جاں شناسی سے کی جاتی ہے... تبھی یہ بندھن اٹوٹ بندھن میں بندھتا ہے... ایسی ہی تین دوستوں کی کہانی جو یک جان دو قالب تھیں... ایک ہی ساز پر تینوں کے دل دھڑکتے تھے... مگر اچانک ہی ان کے جسم و جاں کا تعلق درہم برہم ہو گیا... وہ ایک دوسرے سے جدا کر دی گئیں... تار تار لمحوں کی زخم زخم اور دریدہ کہانی...

جذبوں... رشتوں اور نفرتوں کی زنجیر سے بندھی ایک قاتل کہانی...

کمرا نیم اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ لڑکی کمرے کے عین درمیان کھڑی تھی۔ اس کی عمر سولہ سترہ سال کے لگ بھگ تھی۔ روشن آنکھیں، سنہری رنگت اور چمکتا ہوا چہرہ اس مدھم روشنی میں بھی نمایاں نظر آرہا تھا۔

اس نے آہستہ سے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ اس کا رخ کمرے میں موجود صوفے کی طرف تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی صوفے کے قریب پہنچی۔ اس کے

ہاتھوں میں کچھ تھا جسے اس نے محبت سے سینے سے لگا رکھا تھا۔ صوفے کے سامنے پہنچ کر وہ رک گئی اور اس نے ہاتھ میں موجود چیز کو بائیں ہاتھ کی جانب رکھی گول میز پر اچھال دیا۔ وہ ایک بڑا اور خوب صورت پھول تھا جو دیکھنے میں اصلی محسوس ہورہا تھا مگر درحقیقت اسے مخمل سے تیار کیا گیا تھا۔ پھول گویا ہوا میں اڑتا ہوا میز پر رکھے بڑے سے کارڈ سے ٹکرایا جس پر بڑے بڑے حروف میں 2016ء مبارک کے حروف چمک رہے تھے۔ پھول کے وزن سے وہ کارڈ زمین پر جا گرا۔ لڑکی نے ایک قدم آگے بڑھایا پھر گردن کو عجیب سے انداز میں گھما کر زمین پر پڑے کارڈ اور پھول کو دیکھا اور پھر اچانک ہنسنا شروع ہوگئی۔ اس کی آنکھیں حلقوں میں دیوانہ وار حرکت کررہی تھیں۔ مسلسل بے طرح ہنسنے کی وجہ سے اس کی گردن کی رگیں پھول سی گئی تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گری اور بے حس و حرکت ہوگئی۔

کمرے میں یکلخت گہری خاموشی چھا گئی۔ اس سکوت کو صوفے پر تشریف فرما دو رکنی ناظرین کی زوردار تالیوں نے توڑا تھا۔

''زبردست، بہت ہی اچھا... زویا قسم سے تو تو اداکارہ ہی بننا، کتنا غضب کا پرفارم کرتی ہے۔ ایسے ہی تو ٹیچر ہر بار تجھے ہی ڈرامے کی ہیروئن نہیں بنا دیتیں۔ مدھوبالا ہے تو ہماری...'' عینی صوفے سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی زمین پر گری زویا بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''میں تو سچ میں ڈر ہی گئی تھی۔'' نتاشا اب تک صوفے پر جمی بیٹھی تھی۔ ''لائٹ کھولو عینی۔'' وہ لرزتی آواز میں بولی۔ نتاشا دبلی پتلی سانولی سی لڑکی تھی۔ اس کے ملیح چہرے پر بلا کی کشش اور معصومیت تھی جبکہ عینی گوری رنگت اور خوب صورت بھوری آنکھوں کی مالک تھی۔ وہ دونوں بھی زویا کی ہم عمر تھیں۔

''ڈرپوک کہیں کی۔'' زویا ہنستے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ ''اس بار ٹرافی میٹرک کلاس کو ہی ملے گی۔ دیکھ لینا... یوں بھی یہ ہمارا آخری سال ہے اسکول میں۔''

''ہاں پھر تو کالج ہوگا، زبردست لائف ہوگی۔'' عینی صوفے پر گرتے ہوئے بولی۔

''تو اب کیا کمی ہے تیرے پاس؟'' زویا رشک بھرے لہجے میں بولی۔ ''موبائل اور اپنا الگ کمپیوٹر بھی... سب کچھ تو ہے... ہماری طرح نہیں کہ بمشکل تھوڑا ٹائم ملتا ہے کمپیوٹر کو استعمال کرنے کے لیے...''

''ہاں وہ تو ہے۔'' عینی ہنس کر بولی۔ ''مگر پابندیاں تو ہیں نا، اسکول میں تو ایک کلاس بھی نہیں چھوڑ سکتے، کالج میں تو لڑکیاں جب چاہیں کلاسیں بنک کرتی ہیں۔''

''خیر یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔'' زویا نے اسے گھورا۔

''اچھا اچھا دادی اماں، تو لیکچر... چلو فلم دیکھتے ہیں، ریہرسل تو ہوگئی نا۔''

''نا بابا... تم لوگ دیکھو، مجھے آج جلدی گھر جانا ہے۔'' زویا بولی۔

''کیوں یار! ابھی تو صرف چار ہی بجے ہیں ہم تو چھ سات بجے تک ریہرسل کرتے ہیں نا۔'' نتاشا بولی۔

''ہاں مگر کل امی کا ہاتھ کٹ گیا تھا۔ اس لیے آج کھانا میں بناؤں گی۔'' زویا نے بتایا۔

''اچھا... سگھڑ بی بی... پھر تو تم جاؤ اور جو کچھ بنانا کل اسکول میں بھی لے کر آنا۔'' عینی بولی۔

زویا کو واقعی جلدی تھی۔ وہ چند لمحوں بعد ہی بیگ اٹھائے باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

وہ تینوں بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ پہلی جماعت سے ایک ساتھ پڑھ رہی تھیں۔ ان کے شوق، مشاغل حتیٰ کہ پسند ناپسند بھی تقریباً ایک ہی جیسی تھیں۔ ان کی دوستی نے ان کے گھر والوں کو بھی تعلق کے رشتے میں باندھ دیا تھا۔

عینی کے والد اس کے بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے، اس کی امی ایک بیوٹی پارلر میں کام کرتی تھیں۔ نتاشا کے والد ڈاکٹر تھے۔ اس کی تین بہنیں اور بھی تھیں جبکہ زویا دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اس کے والد تعمیراتی شعبے سے منسلک تھے اور ان کا شمار اچھے آرکیٹکٹس میں ہوتا تھا۔

تینوں ہی ہر سال اسکول اسٹوڈنٹ ویک میں پیش پیش ہوتی تھیں۔ اس سال کے سالانہ ڈرامے میں انہیں بہترین کردار ملے تھے۔ عینی کے گھر پر ایک ملازمہ کے سوا کوئی نہیں ہوتا تھا اس لیے ریہرسل کے لیے اس کے گھر کا انتخاب کیا گیا تھا۔ تینوں اسکول سے ساتھ آتیں، ریہرسل اور کبھی کبھار ہوم ورک بھی ساتھ ہی کرلیا کرتیں۔ پھر نتاشا اور زویا اپنے گھر کی راہ لیتیں۔ ان دونوں کے گھر قریب قریب تھے مگر آج زویا کو جلد نکلنا پڑا تھا۔ اس کا گھر عینی کے مکان سے آٹھ دس منٹ کی مسافت پر تھا۔ اندرونی رہائشی علاقہ ہونے کی وجہ سے اس وقت وہاں بہت کم آمدورفت

تھی۔ درمیان میں آنے والا میدان تو بالکل ہی سنسان پڑا تھا۔ زویا کو نہ جانے کیوں عجیب سا خوف محسوس ہوا۔ وہ تیزی سے لمبے لمبے قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ پانچ منٹ میں وہ گھر کے اندر تھی۔

''کیا ہو گیا زویا؟ اتنا ہانپ کیوں رہی ہو؟ کیا بھاگتے ہوئے آئی ہو؟'' رخشندہ نے بیٹی کو تشویش سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تیز تیز آئی ہوں مما، ڈر لگ رہا تھا۔'' وہ پانی پیتے ہوئے بولی۔

''ڈر... وہ کیوں؟ نتاشا ساتھ نہیں تھی؟'' انہوں نے فکرمندی سے پوچھا۔

''نہیں مما... وہ چھ بجے تک نکلے گی۔ میں آج جلدی آگئی ہوں نا۔''

''وہ کیوں بھلا؟''

''اس لیے کہ میری مما کے ہاتھ میں درد ہے اور آج کھانا میں بناؤں گی۔'' وہ ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

''میری پیاری بیٹی۔'' رخشندہ نے مسکرا کر اسے خود سے لپٹا لیا۔ یہ بیٹیاں بھی اللہ کی رحمت ہیں۔ بظاہر کمزور مگر کتنی بڑی طاقت... وہ سوچ کر رہ گئیں۔

''اگلے دو گھنٹے وہ کچن میں مصروف رہی تھی۔ اسے نتاشا اور عینی کا خیال آرہا تھا۔ وہ دونوں مزے سے فلم دیکھ رہی ہوں گی، اس نے کچن سے نکلتے ہوئے سوچا۔

''مما اب میں فزکس کا ہوم ورک کر رہی ہوں، کچھ یاد بھی کرنا ہے کل ٹیسٹ ہے اور آپ کو تو پتا ہے نا کہ فزکس کی ٹیچر کیسی خطرناک، زومبی سے کم نہیں ہیں۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''بہت بُری بات ہے زویا، استاد کا احترام کرو گی تو ہی کچھ سیکھ پاؤ گی۔'' ماں کی تنبیہ پر وہ آنکھیں گھماتے ہوئے کمرے میں گھس گئی مگر پانچ منٹ بعد ہی دوبارہ باہر نکل آئی۔

''اب کیا ہوا؟ ہو گئی پڑھائی؟'' رخشندہ نے اسے گھورا۔

''نہیں مما... گڑبڑ ہو گئی ہے۔''

''کیا ہو گیا؟''

''مجھے واپس جانا پڑے گا میں فزکس کی کتاب اور کاپی دونوں عینی کے گھر پر بھول آئی ہوں۔ اسے کام کرنے کے لیے باہر نکالیں پھر شاید واپس رکھنا بھول گئی۔''

وہ سر پر ہاتھ مار کر بولی۔

''اسی لیے کہتی ہوں حواسوں میں رہا کرو۔''

''اب تو ہو گیا نا... میں ابھی جا کر لے آتی ہوں۔''

''ٹھہرو... اب اتنی شام گئے اکیلی جاؤ گی کیا؟ تھوڑی دیر میں احمر آجائے تو اس کے ساتھ چلی جانا۔''

''مگر مما...''

''بس آنے ہی والا ہو گا وہ۔ بحث مت کرو، میں اس وقت تمہیں اکیلے بھیجنے سے رہی۔ یہ تو تم جانتی ہی ہو۔'' وہ حتمی انداز میں بولیں۔

زویا تنک کر سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ احمر اس کا بڑا بھائی تھا۔ وہ یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا اور یہ اس کی واپسی کا وقت ہی تھا۔

چند لمحوں بعد ہی باہر سے موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ زویا اچھل کر کھڑی ہو گئی اور باہر کی جانب لپکی۔

''ارے زویا، اسے اندر تو آنے دو۔ ہاتھ منہ دھو لے کچھ کھا پی لے۔'' رخشندہ کہتی رہ گئیں۔

''نہیں مما... نو ٹائم... کل ٹیسٹ ہے تیاری بھی کرنی ہے۔ ہم آتے ہیں ابھی۔'' وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

وہ چند لمحوں میں عینی کے گھر پہنچ گئے تھے۔ موٹر سائیکل رکتے ہی وہ تیزی سے اتری۔ عینی کے گھر کا باہر کا دروازہ معمول کے خلاف صرف بھڑا ہوا تھا۔ زویا نے حیرت سے دروازے کو دیکھا پھر مڑ کر بھائی کی جانب نظر ڈالی جو اسے ہی گھور رہا تھا پھر اس نے اندر قدم رکھنا چاہا۔

''رکو، میں بھی آرہا ہوں۔'' احمر نے آخری لمحے میں فیصلہ کیا۔ ''تمہاری یہ دونوں احمق سہیلیاں ہیں بھی گھر میں کہ نہیں؟ اور اگر ہیں تو آخر یہ اتنا اندھیرا کیوں کر رکھا ہے؟''

''آجایئے بھائی۔'' زویا بولی۔ ''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔''

لمحے بھر میں وہ چھوٹا سا پورچ عبور کر کے لاؤنج میں داخل ہو گئے۔

''عینی! نتاشا، کہاں ہو تم دونوں؟ یہ دروازے کیوں کھلے ہیں، ماسی آنٹی آپ کہاں ہیں؟'' زویا نے زور سے پکارا مگر اس کی صدا بیکار ثابت ہوئی۔ احمر نے اندر داخل ہو کر بلب کا سوئچ دبایا۔ سکوت اتنا تھا کہ کچ کی ہلکی سی آواز نے بھی زویا کو ڈرا دیا تھا۔ اچانک ہونے والی روشنی کے

جھماکے کے بعد جب اس کی آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو جو منظر اس کے سامنے تھا، اسے دیکھ کر وہ ساکت سی رہ گئی۔
سامنے رکھا کین کا بڑا سا صوفہ اپنی جگہ سے خاصا آگے آیا ہوا تھا۔ تینوں کرسیاں زمین پر لڑھکی ہوئی تھیں۔ گول میز پر بچھا کڑھائی دار میز پوش زمین پر پڑا تھا اور اس پر رکھا لیمپ کرچیوں کی شکل میں بکھرا پڑا تھا۔
''یہ... یہ سب کیا ہے؟'' احمر بڑبڑایا۔ ''اور وہ دونوں کہاں ہیں؟''
''پتا نہیں بھائی...'' زویا روہانسی آواز میں بولی۔ ''وہ شاید اندر والے کمرے میں ہوں یا اوپر... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''
''تم میرے پیچھے آؤ...'' احمر بولا۔
زویا سے چلا تک نہیں جا رہا تھا۔ خوف کی شدید لہر نے گویا اس کے جسم کو جما سا دیا تھا۔ یہاں یقیناً کچھ بہت غلط ہوا تھا۔
احمر نے چند قدم آگے بڑھ کر پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ بہن کو اپنی جگہ جما دیکھ کر وہ پلٹا اور اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھا۔
وہ دو قدم ہی چلے تھے کہ ایک قدرے ہلکا سا کھٹکا سنائی دیا۔ وہ دونوں ہی آواز سن کر اپنی جگہ ساکت سے ہو گئے۔
''کوئی ہے...'' احمر بے ساختہ بولا۔
''عینی ہو گی... عینی... نتاشا یہ میں ہوں زویا اور بھائی بھی ہیں۔ کہاں ہو تم لوگ جواب دو۔'' وہ زور سے بولی۔ اس کی تیز آواز کے بعد یکدم خاموشی سی چھا گئی اور پھر کسی کے قدموں کی تیز آواز سنائی دی جیسے کوئی بھاگ رہا ہو۔ احمر اور زویا وہیں کھڑے کچھ نہ سمجھ پانے والے انداز میں کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ گیٹ کے بند ہونے کی آواز نے انہیں چونکایا۔
''کوئی ہے باہر...'' زویا لرزتی آواز میں بولی۔
''آؤ میرے ساتھ۔'' احمر اسے تقریباً کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لے گیا۔
گیٹ کھلا ہوا تھا جبکہ احمر کو اچھی طرح یاد تھا کہ اندر آنے کے بعد اس نے دروازے پر لگا لوہے کا کھٹکا لگایا تھا۔ وہ لپک کر باہر نکلا مگر وہاں کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا، وہ جو کوئی بھی تھا اسے اس علاقے کے بارے میں خاصی معلومات تھیں اور وہ لمحے بھر میں منظر سے غائب ہو چکا تھا۔
احمر چند لمحے سڑک کو گھورتا رہا پھر سر جھٹکتا ہوا اندر واپس آیا۔
''یہاں اندر کوئی موجود تھا بھائی۔'' زویا جی جان سے لرز رہی تھی۔
''ہاں۔'' احمر آہستگی سے بولا۔ زویا خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی، اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔
''یعنی، نتاشا... وہ کہاں ہیں؟'' وہ اچانک بڑبڑائی۔
''وہ کہاں ہیں ان کے ساتھ کیا ہوا ہے؟'' پھر اس سے قبل کہ احمر کچھ سمجھ پاتا، وہ تیزی سے اندر کی طرف بھاگی۔
''زویا... زویا رکو۔'' احمر اس کے پیچھے لپکا۔ لاؤنج کے درمیان پہنچ کر وہ اسے روکنے میں کامیاب ہو پایا۔
''پاگل ہو گئی ہو... اندر خطرہ ہو سکتا ہے تم باہر چلو ہم پولیس کو کال کر رہے ہیں۔''
''بھائی... شاید وہ اندر کے کمروں میں ہوں۔'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ''شاید انہیں ہماری ضرورت ہو۔'' گلے میں آپھنسنے والے آنسوؤں نے زویا کو آگے بولنے نہیں دیا۔
''اچھا... آؤ۔'' احمر ایک لمحے اسے دیکھتا رہا پھر اس کا بازو تھام کر بیڈ روم کی طرف بڑھا۔ اندر داخل ہو کر روشنی کرتے ہی جو منظر ان کی آنکھوں کے سامنے تھا، اسے دیکھ کر زویا کے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی تھی۔
بستر سے تھوڑا سا آگے زمین پر عینی پڑی ہوئی تھی۔ اس کے اردگرد خون کا تالاب سا بنا ہوا تھا۔ اس کے سر پر کسی بھاری چیز سے شدید چوٹ لگائی گئی تھی جس کی وجہ سے اس کا چہرہ بھی کسی حد تک مسخ ہو گیا تھا اس کے باوجود اس کی کھلی آنکھوں میں درد اور خوف کے تاثرات جمے ہوئے تھے۔ اس کا پورا وجود ہی ٹوٹا پھوٹا محسوس ہو رہا تھا۔
''عینی... عینی...'' زویا پوری شدت سے لرز رہی تھی۔ احمر نے اسے سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ اب تک چکرا کر زمین پر گر چکی ہوتی۔ ''یہ... یہ... سب کیا ہو گیا۔ ابھی تو میں اسے ٹھیک چھوڑ کر گئی تھی۔ عینی اٹھ جاؤ... بھائی دیکھیں اسے۔'' وہ دیوانوں کی طرح بولے جا رہی تھی۔
''تم خود کو سنبھالو زویا۔'' احمر اسے گلے سے لگا کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مجھے اسے دیکھنے دو... شاید یہ بچ سکتی ہو۔''
احمر، عینی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا مگر عینی کا ہاتھ تھامتے ہی اسے اپنے بدترین خدشات کی سچائی کا احساس ہو

اس ڈمی چوکیدار کو دیکھ کر کوئی نہ کوئی انسان ادھر ضرور آئے گا...... کئی روز ہو گئے مزے کا کھانا کھائے!

گیا۔ وہ مایوسی سے کھڑا ہو گیا۔

''کک کیا ہوا بھائی؟'' زویا اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''زویا...'' وہ اسے کندھوں سے تھام کر اپنے قریب لایا۔ ''عینی مر چکی ہے گڑیا... یہاں نتاشا بھی تھی نا... وہ... وہ کہاں ہے؟''

''ہاں... نتاشا کہاں ہے؟'' زویا چند لمحے عینی کو دیکھتی رہی پھر نتاشا کی تلاش میں باہر نکلی، احمر اس کے ساتھ تھا۔ نیچے موجود دوسرے بیڈروم میں بھی وہ موجود نہیں تھی۔ وہ اور احمر بھاگتے ہوئے اوپری منزل پر موجود کمرے میں پہنچے مگر نتاشا کا کہیں پتا نہیں تھا۔

''وہ... وہ کہاں گئی بھائی...'' زویا نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے گھر جا چکی ہو، اس کے جانے کے بعد کوئی یہاں گھسا ہو؟'' احمر بولا۔

''نہیں، وہ تو سات بجے جانے والی تھی۔'' زویا نے سر ہلایا پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ کچن کی طرف بڑھی۔

''میں پولیس کو کال کر رہا ہوں۔'' احمر جیب سے موبائل نکالتے ہوئے بولا مگر اگلے ہی لمحے وہ اچھل سا گیا۔

''بھائی...'' کچن کی طرف سے آنے والی زویا کی زوردار چیخ نے اسے حد سے زیادہ ڈرا دیا، وہ تیزی سے کچن کی طرف لپکا۔ زویا دروازے پر بُت بنی کھڑی تھی۔

اندر کا منظر دیکھ کر احمر کا دل بھی ہل سا گیا۔ کچن کے عین درمیان نتاشا پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سر کے پچھلی جانب بھی گہرا زخم نظر آ رہا تھا۔ اس کا ایک پیر اس کے جسم کے نیچے غیر قدرتی انداز میں مڑا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ڈر کر بھاگی ہو اور پیر مڑ جانے کی وجہ سے گر گئی ہو جس کے بعد سفاک قاتل نے اسے اپنا نشانہ بنایا ہو۔

احمر بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھا اور نتاشا کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ دل ہی دل میں اسے کافی عرصے سے پسند کرتا آ رہا تھا۔ اس وقت اس کی یہ حالت دیکھ کر اسے خود پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔ اس کا ذہن چلا چلا کر ہر امید سے انکاری ہو رہا تھا مگر دل ناممکن کے ممکن ہونے کی آس لگائے ہوئے تھا۔

''یہ... یہ زندہ ہے... نتاشا زندہ ہے سانس لے رہی ہے۔ ہمیں فوراً کچھ کرنا ہوگا۔'' وہ زور سے چلّایا۔ پھر اس نے موبائل کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا، سیل وہاں نہیں تھا۔

''زویا میرا موبائل لاؤنج میں گر گیا ہے... اسے اٹھا لاؤ ہمیں فوراً ایمبولینس کو بلانا ہے، جلدی کرو زویا فوراً فون ملاؤ... عینی کے لیے ہم اب کچھ نہیں کر سکتے مگر نتاشا کو بچانے کی کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔'' وہ تیزی سے بولا۔

زویا نے جواب میں سر ہلایا اور لاؤنج کی طرف بھاگی۔

نتاشا زندہ تھی، اس خیال نے اس کے اندر طاقت سی بھر دی تھی۔ پولیس اسٹیشن اور ایمبولینس اور گھر پر فون کرنے کے بعد وہ پھر کچن کی طرف بھاگی... اسے نتاشا کو روکنا تھا۔ ہر صورت میں، عینی کے بعد وہ اسے بھی کھو دینے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر... اچانک اس کے ذہن میں

ایک خیال نے کروٹ لی، نتاشا ہی تو بتا سکتی تھی کہ یہاں آخر ہوا کیا تھا؟

☆☆☆

ایس پی جعفر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا شمار ڈپارٹمنٹ کے بہترین افسران میں ہوتا تھا۔ ایک معصوم لڑکی کے اس طرح کے بہیمانہ قتل اور دوسری کے شدید زخمی ہونے کی خبر نے اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔ وہ خود دو بیٹیوں کا باپ تھا۔

نتاشا کو اسپتال لے جایا جا چکا تھا جبکہ عینی کی لاش کو بھی ضروری فرانسک مرحلوں سے گزرنے کے بعد لے جایا جا رہا تھا۔

عینی، نتاشا اور زویا کے والدین موقع واردات پر پہنچ چکے تھے۔ نتاشا کے گھر والے تو آتے ہی اسپتال کی طرف بھاگے تھے جبکہ زویا کی والدہ عینی کی ماں کے پاس بیٹھی تھیں۔ وہ ایک کرسی پر سرنیوڑائے بیٹھی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ وہاں کسی کو جانتی ہی نہ ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔

"آپ کو کچھ درکار ہے؟" رخشندہ نے ان کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

"میں... میں عینی کو دیکھ لوں، اسے سردی زیادہ لگتی ہے اور سوتے میں چادر اتار کر پھینک دیتی ہے۔" وہ نہایت سادگی سے بولیں۔ رخشندہ اور وہاں موجود تمام ہی افراد انہیں دیکھتے رہ گئے پھر رخشندہ کو جیسے ہوش سا آیا۔

"کیسے بھابی... آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

"عینی کے کمرے میں۔"

"نہیں آپ وہاں نہیں جا سکتیں۔" انہوں نے نرمی سے ان کے بازو تھامتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیونکہ وہ وہاں نہیں ہے۔ وہاں پولیس ہے ان کی تحقیقات چل رہی ہیں۔"

"تو... تو پھر... میری عینی کہاں ہے؟" وہ پریشان ہو کر بولیں۔ "میری بیٹی بہت جلدی ڈر جاتی ہے رخشندہ اتنا سا دل ہے ننھا سا اس کا... میں اس کو لے کر آتی ہوں۔"

"نہیں بھابی۔" رخشندہ روتے ہوئے بولیں۔ "وہ یہاں نہیں ہے وہ اپنے رب کے حضور جا چکی ہے بھابی۔ انسانوں کے درندے بن جانے کی شکایت لے کر... وہ اب نہیں ہے بھابی... نہیں ہے۔"

"رخشندہ... کیوں... کیوں کیا ایسا میری بیٹی کے ساتھ۔" وہ اب چلا چلا کر رو رہی تھیں۔ سوال کر رہی تھیں۔

"کیوں ہوا ایسا؟ میری بچی نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟ میرے پاس تو صرف وہ تھی نا... کیوں...؟" وہ روتے روتے بے ہوش ہو گئی تھیں۔ رخشندہ اور زویا نے بمشکل انہیں بستر پر لٹایا پھر یہی طے کیا گیا کہ ان کے بھائی کے اسلام آباد سے آنے تک انہیں زویا کے گھر لے جایا جائے گا ان کی کیفیت عجیب تھی کبھی وہ سب بھول جاتیں اور عینی کی باتیں کرتیں جیسے وہ ابھی آ جائے گی اور کبھی یوں تڑپ تڑپ کر روتیں کہ سنبھالنا مشکل ہو جاتا انسان کتنے خواب دیکھتا ہے، ارادے، منصوبے بناتا ہے یہ جانے بغیر کہ وہ ان سب کے پورے ہونے تک خود بھی باقی رہ پائے گا کہ نہیں۔ واپسی کا سفر تو طے ہے ہی صرف اس کا شیڈول مسافر کے علم میں نہیں ہوتا مگر پھر کمال یہ ہے کہ جانے والا سامان پیک کرنا تک بھول جاتا ہے۔

عینی کے ماموں اسلام آباد سے آ گئے تھے اور پوسٹ مارٹم کے بعد اسے سپرد خاک بھی کر دیا گیا تھا۔ دوسری طرف نتاشا اسپتال میں موت سے لڑ رہی تھی۔ وہ دو بار ضد کر کے اسپتال بھی ہو آئی تھی مگر صرف شیشے سے ہی نتاشا کو پٹیوں اور نلکیوں میں جکڑا دیکھ پائی تھی۔ وہ آئی سی یو میں تھی اور اب بھی خطرے میں تھی۔

زویا خود سکتے کی سی کیفیت میں تھی۔ اس کی سمجھ میں اب تک کچھ نہیں آ رہا تھا، کوئی بات کرتا تو ہوں ہاں میں جواب دیتی ورنہ خاموش بیٹھی رہتی۔ اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں بیٹھی دیوار کو گھور رہی تھی کہ کسی کے تیز تیز بولنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"نہیں میں اس کی اجازت فی الحال آپ کو نہیں دے سکتا... میری بیٹی بہت بری حالت میں ہے، اسے سخت صدمہ پہنچا ہے، وہ دونوں اس کی عزیز ترین سہیلیاں تھیں اور وہ صرف دو گھنٹے پہلے انہیں چھوڑ کر آئی تھی، کیا آپ اس کی ذہنی کیفیت نہیں سمجھ سکتے؟ اس وقت وہ بیان دینے یا آپ کی مدد کرنے کی حالت میں نہیں ہے۔" وہ اپنے بابا کی آواز بھی دو لمحوں بعد پہچان پائی تھی۔ ہمیشہ نرم اور مدھم لہجے میں گفتگو کرنے والے بابا اس وقت خاصے غصے میں تھے۔

"میں سمجھتا ہوں احمد صاحب مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ سمجھیں۔ زویا کا بیان بہت ضروری ہے۔ ایک بچی جا چکی ہے دوسری کی جان دہرے خطرے میں ہے۔"

"دہرا خطرہ...؟"

''جی، دوہرا خطرہ... نتاشا اس واردات کی مینی گواہ بھی ہے۔ اس لیے قاتل اسے ختم کرنے کی کوشش بھی کرسکتا ہے۔'' ایس پی جعفر نرمی سے کہہ رہا تھا۔

''میں آپ کی کیفیت سمجھ رہا ہوں، میں بھی بیٹیوں کا باپ ہوں اور اس بچی کی خون میں بھری لاش مجھے اب تک راتوں کو جگا رہی ہے۔ دوسری اور سب سے اہم بات یہ ہے احمد صاحب کہ ہماری تحقیقات کی روشنی میں خود زویا بھی خطرے سے باہر نہیں ہے۔''

''کک کیا...؟ زویا کو کیا خطرہ ہے؟'' اس بار احمد صاحب کا لہجہ بدل گیا۔

''دیکھیے وہ جو کوئی بھی تھا، وہ ان بچیوں کے معمولات سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان اوقات میں یہ تین بچیاں وہاں ہوں گی۔ شاید ان میں سے کوئی ایک اس کو جانتی بھی ہو، اس روز اس کے حساب سے وہاں تین لڑکیاں موجود ہونی چاہیے تھیں۔ یہ زویا کی خوش قسمتی تھی کہ وہ وقت سے پہلے گھر آگئی۔ اگر یہ کوئی نفسیاتی مریض ہے تو وہ اپنے ادھورے کام کو پورا کرنے کی کوشش کرسکتا ہے۔''

''اوہ... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' بابا کی آواز میں اب تشویش ہی تشویش تھی۔

''ہمیں زویا کی حفاظت کے مکمل انتظامات کرنے ہوں گے۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

زویا ایس پی کے جملے کے مکمل ہونے سے پہلے کمرے سے نکل آئی تھی۔

''میں نے سب سنا ہے ایس پی صاحب! میں آپ کی پوری مدد کروں گی۔ مینی کو تو میں نے کھو دیا مگر نتاشا... اگر ہم اسے بچا سکتے ہیں اور اس... اس بُرے انسان کو سزا دلا سکتے ہیں جس نے یہ سب کیا ہے۔'' وہ بمشکل بول پا رہی تھی۔ ''مگر مسئلہ یہ ہے کہ مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے بیٹا، میں آج تمہارا بیان نہیں لے رہا ہوں۔ تم اچھی طرح سوچو... ان دونوں بچیوں نے کوئی بات تم سے کی ہو، کوئی ایسی بات جو اس سارے مسئلے میں ذرا بھی مدد کرسکتی ہو۔ تم یاد کرنے کی کوشش کرو۔ ہم کل بات کریں گے، ٹھیک ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ ''اور اب جب تم نے پوری بات سن لی ہے تو تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ تم اکیلے باہر نہیں جاؤ گی، سمجھ گئی ہو نا؟''

''جی...'' وہ جواب میں صرف یہی کہہ پائی۔

''فی الحال مجھے تم سے صرف ایک ہی بات کا جواب چاہیے۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

''جی...''

''مینی کے گھر میں جو ملازمہ کام کرتی تھی، اس کا کہنا ہے کہ تمہارے جانے کے تھوڑی دیر بعد مینی نے اسے چھٹی دے دی تھی... تمہیں کچھ یاد ہے کہ جب تم وہاں تھیں وہ موجود تھی کہ نہیں...؟''

''وہ اس وقت تو تھی، اس نے ہی ہمیں کھانا دیا تھا۔'' زویا فوراً بولی۔ ''مگر مینی اسے چھٹی کیوں دے گی وہ تو رات تک گھر پر رہتی تھی۔''

''ہاں... مگر اس کا بیان یہ ہے کہ مینی نے اسے زبردستی چھٹی دی تھی۔ خیر دیکھتے ہیں، میں چلتا ہوں تم سوچو، کل بات کریں گے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ زویا کچھ دیر وہیں بیٹھی بابا کو ماں اور بھائیوں کو ہدایات دیتے ہوئے دیکھتی رہی پھر اٹھ کر کمرے میں آگئی۔

اسے ایس پی صاحب کی بات سن کر ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ عجیب سی بے چینی کی کیفیت تھی۔ بس خیالات کی بھرمار تھی۔ اس روز آخر اس کے جانے کے بعد وہاں کیا ہوا تھا؟ مینی نے ماسی آنٹی کو چھٹی کیوں دی ہوگی؟ وہ بہت ڈرپوک تھی اس لیے آنٹی کے آنے سے پہلے بھی ماسی کو جانے نہیں دیتی تھی پھر اس دن ایسا کیا ہوا کہ اس نے اسے چھٹی دے دی؟ اور وہ شخص؟

وہ کون تھا؟ ایس پی صاحب نے کہا کہ وہ ان کے معمولات جانتا تھا ایسا کون ہوسکتا تھا؟

کون...؟ کیوں اور کیسے...؟

اس کے اردگرد بے شمار سوالیہ نشان رقص کر رہے تھے۔ اسے ان سب کے جواب تلاشنے تھے۔ مینی کے لیے... نتاشا کے لیے اور خود اپنے لیے بھی...

سوچتے سوچتے اس کا وجود تھک سا گیا تھا۔ اچانک ایک خیال نے کسی تیز سیٹی کے مانند اس کے ذہن کو جھنجوڑ ڈالا، اسے حادثے سے چار دن پہلے کی دوپہر یاد آگئی۔

''یہ تو آج کل ہر وقت اپنے فون میں گھسی کیا کرتی رہتی ہے؟'' زویا نے ریہرسل کے دوران مینی کو میسج پر لگے دیکھ کر چڑ کر پوچھا تھا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' وہ جواب میں کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

''نہیں... زویا ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' نتاشا نے اس کی تائید کی۔ ''کل بھی تو کلاس میں بیگ کے اندر ہی اندر موبائل چیک کر رہی تھی۔''

''اسکول لے کر آئی تھی سیل فون؟'' زویا نے اسے گھورا۔ ''ٹیچر کو پتا چل جاتا تو ضبط ہو جاتا، منع ہے نا؟''

''ارے، کیسے پتا چلے گا۔ میں نے بند کر کے رکھا تھا۔'' عینی بے پروائی سے بولی۔

''مگر رکھا ہی کیوں؟ اسکول میں کیا ضرورت تھی؟''

''یہ ایک بات... بتادوں گی بعد میں... مگر اس شرط پر کہ تو لیکچر نہیں دے گی مجھے...''

''بتانا... کیا چھپا رہی ہے؟ بول نا...'' نتاشا اس کی کرسی پر ہی بیٹھتے ہوئے بولی۔

''اگلے ہفتے بتاؤں گی... وعدہ...''

''تو آج بتانے میں کیا مسئلہ ہے؟'' نتاشا مصر ہی ہو گئی تھی۔

''ابھی مجھے بتانے کی اجازت نہیں ہے۔'' اس نے شوخی سے آنکھیں نچائیں۔

''کس کی اجازت نہیں ہے؟ کس نے منع کیا ہے تجھے؟ وہ بھی ہمیں بتانے سے؟'' اس کی بات پر زویا اچھل پڑی تھی۔

''عینی، میں سنجیدگی سے پوچھ رہی ہوں تم کسی غلط چکر میں تو نہیں پڑ گئی ہو نا۔''

''نہیں زویا... بس اب اس موضوع پر اب کوئی بات نہیں ہوگی۔ یہ ایک سرپرائز ہے۔ میں خود بتادوں گی تم دونوں کو...'' عینی سیل کو بند کر کے دراز میں ڈالتے ہوئے بولی تھی۔

''تو سچ کہہ رہی ہے نا؟'' زویا مسلسل اسے دیکھ رہی تھی۔

''ہاں سچ بالکل سچ... دیکھ نتاشا اس کا بوا کو... پیچھے پڑ گئی ہے میرے...'' عینی، نتاشا کے پیچھے چھپتے ہوئے بولی۔ پھر بات آئی گئی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ان چار پانچ دنوں میں ٹیسٹ اور فنکشن کی مصروفیت میں یہ بات ان سب کے ذہنوں سے نکل گئی تھی۔

سیل فون... عینی کے پاس جدید سیل فون تھا۔ تمام ایپس اور سروسز سے لیس... وہ اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتی تھی مگر اس شام... اس شام اس کے ٹوٹے پھوٹے خون میں ڈوبے وجود کے آس پاس اس کا سیل فون موجود نہیں تھا۔

زویا بستر سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

اس کے سوالوں کا جواب شاید اس سیل میں دستیاب ہوسکتا تھا۔

کوئی پیغام... واٹس ایپ پر کوئی میسج، کسی تصویر یا وڈیو کی شکل میں...

عینی کا سیل فون وہ خاموش گواہ ہوسکتا تھا جو اس روز پیش آنے والے خوفناک حادثے کی تفصیلات فراہم کرسکے یا پھر وہ راستہ جس پر چل کر اس سب کے پیچھے موجود انسان نما خون آشام درندے کا سراغ لگایا جاسکے اور... وہ ایک مضبوط ثبوت بھی تو ہوسکتا تھا۔

عینی کا سیل فون کہاں تھا؟ بے چینی اسے بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ عینی کی اس بربریت سے موت نتاشا کی المناک حالت اور خود اس کی زندگی، ذہنی سکون کے لیے اسے وہ سیل درکار تھا۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اسے کس سے پوچھنا چاہیے۔ کون مدد کرسکتا تھا؟

اس شام عینی کے گھر سب سے پہلے وہ اور بھائی پہنچے تھے۔ وہ تیزی سے کمرے سے نکلی اور احمر کے کمرے کی طرف لپکی وہ کمپیوٹر پر کام میں مصروف تھا۔

''کیا ہوا زویا؟'' وہ اسے وحشت کے عالم میں اپنے دروازے پر دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ ''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں بھائی، میں ٹھیک ہوں۔ آپ سے ایک بات پوچھنی ہے۔'' وہ اندر آتے ہوئے بولی۔

''پوچھو۔''

''بھائی اس روز... وہاں عینی کے گھر...'' وہ بولتے بولتے اٹک سی گئی۔ لمحے بھر میں اس روز اس گھر کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گویا فاسٹ فارورڈ میں ریوائنڈ ہو گیا تھا۔

''ہاں بولو زویا۔'' احمر اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔

''بھائی، تب وہاں عینی کے اردگرد یا کمرے میں کوئی سیل فون نظر آیا تھا؟'' بالآخر آواز نے الفاظ کا ساتھ دیا۔

''فون...'' احمر دو لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ ''نہیں... مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''بھائی، عینی کے پاس ایک فون تھا، وہ اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ اسے وہیں کہیں ہونا چاہیے اس کے گھر میں...''

''اچھا... پہلے تم یہاں بیٹھو'' وہ اسے پاس رکھی کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولا۔ ''اس کے فون کو وہیں ہونا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی کمرے میں گر گیا ہو یا اس بستر کے نیچے کہیں پڑا ہو۔ ہم اس وقت اتنے پریشان تھے اس لیے نہ دیکھ پائے ہوں مگر پولیس نے پورے گھر کی تلاشی لی تھی۔ ہر چیز کی جانچ پڑتال کی تھی انہیں یقیناً وہ فون مل گیا ہو

گا۔"

"آپ کو یقین ہے؟"

"دیکھو، اس بارے میں کوئی بات تو نہیں ہوئی ہے مگر ظاہر ہے کہ اس کا فون گھر میں ہی ہوگا اور اب اسے پولیس کی تحویل میں ہونا چاہیے۔" احمر بولا۔

"ہم ایس پی صاحب سے اس بارے میں پوچھ سکتے ہیں؟" زویا نے سوال کیا۔

"ہاں کیوں نہیں، وہ کل آئیں گے تم سے بات کرنے تو کل ان سے پوچھ لیں گے مگر کیا تمہارے خیال میں اس فون میں کوئی خاص بات ہے۔ کوئی ایسی بات جس سے کوئی سراغ مل سکے؟"

"پتا نہیں بھائی، مگر پچھلے کچھ عرصے سے عینی ہر وقت کسی کو میسجز کرتی تھی۔ پتا نہیں کسے؟ اس نے کہا تھا کہ وہ جلد ہی بتا دے گی اور وہ سرپرائز ہوگا۔" زویا کی آنکھیں بھر آئیں۔ "میں نے سوچا شاید اس کے فون سے کچھ پتا چل سکے۔"

"یہ بہت اہم بات ہے مجھے یقین ہے کہ اس کے فون سے کچھ معلومات ملیں گی۔" احمر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تم اب آرام کرو زویا، رات بھی بہت ہو گئی ہے اور ہاں ایک بات غور سے سنو۔" وہ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ زویا خاموشی سے اس کی جانب دیکھتی رہی۔

"تمہیں پریشان ہونے یا ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ وہ جو بھی ہے تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر پائے گا۔ میں ہوں تمہارے ساتھ، بابا ہیں، امی اور ہم سب ہیں۔"

"جی بھائی، مجھے معلوم ہے۔ مگر وہاں عینی اور اسپتال میں نتاشا اکیلے ہیں۔" وہ چند لمحوں بعد بولی پھر چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

"نہیں... ہمیں وہاں کوئی موبائل نہیں ملا۔ نہ عینی کا، نہ نتاشا کا، کسی کا بھی نہیں۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ اس کے پاس موبائل تھا؟" ایس پی جعفر اس کی پوری بات سن کر بولا۔

"بالکل... سو فیصد، سر عینی کے پاس موبائل تھا۔" زویا نے ایک معروف کمپنی کا نام اور ماڈل بتاتے ہوئے کہا۔ "وہ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ اسے تصویریں اور وڈیوز بنانے کا بہت کریز تھا۔ اکثر تو بتائے بغیر ہی وڈیو اور پکچر بنا لیتی تھی۔" زویا سانس لینے کو رکی۔ "اور سر، نتاشا کے پاس فون نہیں تھا، نہ ہی میرے پاس ہے۔"

زنانہ نشانہ

"اچھا اور تمہارا کہنا ہے کہ وہ کچھ عرصے سے موبائل کا بہت استعمال کر رہی تھی؟"

"جی، وہ زیادہ تر ایس ایم ایس اور واٹس ایپ پر لکھتی تھی۔"

"تم تینوں اتنی قریبی دوست ہو، اس نے پھر بھی تم دونوں کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ یہ کچھ عجیب بات نہیں ہے؟" ایس پی اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"جی... ہم نے کہا تھا مگر اس نے کہا تھا کہ وہ ایک ہفتے بعد بتا دے گی۔"

"اور... اور کیا کہا تھا؟ پوری بات یاد کرنے کی کوشش کرو، زویا۔"

"اور... اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اسے ابھی اجازت نہیں ہے اور یہ کہ وہ ہمیں جلد ہی سرپرائز دے گی۔" زویا نے سوچتے ہوئے کہا۔

"کس کی اجازت؟"

"میں نے بھی یہ پوچھا تھا مگر وہ بات ٹال گئی تھی۔"

"پھر تم نے اس سے دوبارہ نہیں پوچھا؟"

"نہیں، ہم لوگ اس ہفتے بہت مصروف رہے تھے۔ اس لیے موقع ہی نہیں ملا۔"

"کیا نتاشا کو بھی معلوم نہیں؟"

"نہیں۔"

"تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ مجھے ضرور بتاتی، مگر..."

"مگر کیا...؟" ایس پی اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

''ہوسکتا ہے اس شام میرے گھر آجانے کے بعد عینی نے اسے بتادیا ہو۔'' زویا ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''ہم...'' ایس پی کا چہرہ سوچ میں ڈوبا نظر آرہا تھا۔

''اب تصویر کچھ کچھ واضح ہورہی ہے۔ عینی کی فون پر کسی ایسے شخص سے بات تھی، جس کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا۔ شاید اس شام اس نے اسے ہی گھر بلایا ہو۔ اس شخص کے کہنے پر ہی عینی نے ملازمہ کو چھٹی دے دی ہو گی۔ جیسا کہ تم سب نے بتایا کہ عینی بہت ڈرتی تھی مگر اس روز اسے یہ اطمینان تھا کہ نتاشا اس کے ساتھ موجود ہے اور وہ جو کوئی بھی تھا عینی کو اس پر پورا یقین ہوگا۔ آنے والے کو یقین تھا کہ گھر پر صرف تین نوعمر لڑکیوں کے سوا کوئی نہیں ہو گا۔ شاید عینی کی بھی اس سے یہ پہلی ملاقات ہوگی۔''

''اگر اس روز میں نے مما کے لیے جلدی آنے کا فیصلہ نہ کیا ہوتا تو شاید میں بھی عینی اور نتاشا کی طرح اس کا شکار بن چکی ہوتی۔'' زویا کا چہرہ زرد ہورہا تھا۔ ''کاش میں کتابیں لینے جلدی چلی جاتی تو وہ دونوں بچ جاتیں... شاید...'' وہ سسکی سی لے کر بولی۔

''نہیں... اگر ایسا ہوتا تو وہ درندہ تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑتا۔'' ایس پی جعفر کا چہرہ غصے سے سرخ ہورہا تھا۔

''اب سوال یہ ہے کہ عینی کا موبائل کہاں گیا؟'' احمر بولا۔ ''مکمل تلاشی کے بعد بھی اگر وہ برآمد نہیں ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مکان پر نہیں ہے۔''

''وہ مل نہیں سکا کیونکہ وہ وہاں تھا ہی نہیں۔'' ایس پی بولا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ یقیناً اس شخص کو معلوم تھا کہ عینی کے موبائل سے اس کا سراغ لگایا جاسکتا ہے اس لیے وہ موبائل ساتھ لے گیا۔''

''جی۔'' احمر نے سر ہلایا۔ ''یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔''

''زویا تمہارے پاس عینی کا نمبر ہے؟''

''جی ہے، میں دیتی ہوں۔'' زویا کے نمبر لکھ کر دینے کے دوران ہی ایس پی نے دفتر فون ملالیا تھا۔

''ہاں اکرام، یہ نمبر لکھو، مجھے اس کے بارے میں مکمل رپورٹ درکار ہے یہ فون اس وقت کہاں ہے؟ بند ہے یا آن ہے؟ پچھلے ایک ماہ میں اس فون سے کس کو کالز کی گئی ہیں اور مجھے ایس ایم ایس کا ریکارڈ بھی چاہیے۔''

''وہ فون ساتھ لے گیا ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ ہم اسے اس نمبر سے کھود نکالیں گے۔ شکریہ زویا۔ تم مزید سوچو اور اگر تمہیں کسی بھی حوالے سے کچھ بھی یاد آئے تو فوراً مجھے بتاؤ۔''

''کیا ہم اسے ڈھونڈ پائیں گے؟ کیا واقعی عینی کا قاتل پکڑا جاسکے گا سر؟'' اس خیال نے اس کے وجود میں طاقت سے بھر دی۔

''انشاء اللہ، وہ ضرور پکڑا جائے گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔'' ایس پی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''مگر اس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ہر وقت ضرورت ہوگی۔''

''میں سب کچھ کروں گی سر، ہر وہ کام جو آپ کہیں گے۔ بس وہ پکڑا جائے اسے سزا مل جائے۔'' زویا کی آواز رُندھ گئی۔

☆☆☆

ایس پی کے جانے کے بعد وہ اسی ادھیڑبن میں الجھی رہی تھی۔ عینی گزشتہ مہینے ڈیڑھ سے کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ فون پر اس کی مصروفیت بھی بہت بڑھ گئی تھی پھر واقعی یہ عجیب بات تھی کہ دن رات ساتھ رہنے کے باوجود ان دونوں کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ تینوں ایک دوسرے سے کبھی کچھ نہیں چھپاتی تھیں مگر اس بار کچھ ایسا خاص تھا جس کی وجہ سے اس نے ان دونوں کو کچھ بھی بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

اور وہ خود بھی... کتنی آسانی سے اس کی جانب سے بے نیاز ہوگئی تھی۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا۔

ٹیسٹ، ڈرامے، ہنسی مذاق، کھیل کود میں اسے یہ دھیان ہی نہیں رہا کہ عینی کی زندگی میں کیا ہورہا ہے۔ کاش اس نے اپنی آنکھیں کھول لی ہوتیں۔

کاش اس دن جب عینی ان سے بعد میں بات کرنے کی ٹال مٹول کررہی تھی وہ ضد اور جھگڑا کرکے اسے اسی وقت بتانے پر مجبور کردیتی... کاش...

شاید اس طرح کچھ بدل جاتا... شاید اس طرح اس کو تکلیف دہ انداز میں دنیا سے رخصت نہ ہونا پڑتا۔ زویا کی آنکھیں بھر آئیں۔

ہم کل پر کتنا یقین رکھتے ہیں جبکہ کل جب تک آج کا لبادہ نہ پہن لے صرف ایک خیال ہی ہوتا ہے۔ دور سے بہت قریب نظر آنے والا خیال...'' اس نے گہری سانس لی۔ ''کبھی کبھی یہ خیال حقیقت کا لباس پہن ہی نہیں پاتا۔ اسے کل سے آج بننے کا بورڈنگ پاس نہیں مل پاتا اور وقت کی فلائٹ چھوٹ جاتی ہے پھر کاش اور شاید زندگی بھر دل پر خراشیں لگاتے رہتے ہیں اور بسا اوقات پچھتاوے کے

ناخن اتنے تیز نکلتے ہیں کہ وقت کا مرہم بھی ان خراشوں کو مندمل نہیں کر پاتا۔

''زویا... زویا...'' رخشندہ کی آواز گویا اسے ہوش کی دنیا میں لے آئی۔

''جی مما۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہ دیکھو... کون آیا ہے تم سے ملنے...'' وہ بیٹی کے قریب آتے ہوئے بولیں۔

''کون ہے مما؟'' اس کی آواز میں کوئی جذبہ نہیں تھا۔

''میں اور کون...'' مسکراتی ہوئی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''اوہ لبنیٰ آنی...'' وہ بستر سے کھڑی ہوگئی۔

لبنیٰ اس کی مما کی کزن تھیں خاندان کی پہلی پی ایچ ڈی خاتون۔ وہ مقامی یونیورسٹی میں پڑھاتی تھیں۔ ان کی عمر چونتیس پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ دبلی پتلی نازک سی جسامت اور معصوم و ملیح چہرے کی مالک، لوگ انہیں اکثر طالبہ ہی سمجھتے تھے۔ زویا کی وہ پسندیدہ خالہ تھیں۔ وہ بچپن سے ہی ان جیسا بننے کی کوشش کیا کرتی تھی اور ان کی ہر بات بہت آسانی سے سمجھ اور مان بھی لیا کرتی، زویا کی حالت دیکھتے ہوئے رخشندہ نے لبنیٰ کو فون کر کے بلایا تھا۔

''کیسی ہو زویا؟'' وہ اسے گلے سے لگاتے ہوئے بولیں۔

''ٹھیک ہوں آنی میں تو... مگر نتاشا اور منی...'' لفظ اس کے حلق میں اٹک سے گئے۔

''اونہوں... میری گڑیا تو بہت ہمت والی ہے نا۔'' وہ اس کی آواز میں آنسو محسوس کرتے ہوئے بولیں۔ ''ویسے ہمت والے لوگ بھی اگر کبھی رو لیا کریں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہوتا۔'' ان کے ان الفاظ کے ساتھ ہی زویا کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ انہوں نے اسے کچھ دیر خاموشی سے رونے دیا پھر خود سے الگ کر کے اس کے آنسو پونچھے اور بستر پر بٹھا دیا۔ رخشندہ اسے روتا دیکھ کر آگے بڑھیں مگر لبنیٰ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔

''جو ہوا بہت ہی بُرا ہوا بیٹا مگر اب تمہیں ہمت کرنا ہو گی زویا اس سب سے باہر آنا ہوگا ورنہ... تم کبھی اپنی زندگی کی طرف لوٹ پاؤ گی اور نہ ہی نتاشا کی مدد کر پاؤ گی۔'' وہ نرم لہجے میں بولیں۔

''میں یہ سب کرنا چاہتی ہوں اس سب سے باہر آنا بھی چاہتی ہوں اور نتاشا کی مدد بھی کرنا چاہتی ہوں مگر کچھ ہو نہیں پا رہا... نتاشا آنکھیں ہی نہیں کھول رہی اور میں جب بھی آنکھیں بند کرتی ہوں تو منی کی خون میں ڈوبی حالت... اس کی آنکھوں میں جما خوف، دہشت اور درد میری نظروں کے سامنے آجاتا ہے آنی۔ اس نے اپنے آخری لمحے کس طرح گزارے ہوں گے۔ میں جب سوچتی ہوں نا تو میرا دل لرز جاتا ہے اس شام وہ گھر... جہاں ہم نے اتنے اچھے دن اور شامیں ساتھ گزاریں، اتنے مزے کیے، اتنی تفریح کی، دعوتیں اڑائیں وہی گھر اس شام ان کے لیے ہانٹیڈ ہاؤس بن گیا ہوگا۔ کتنا ڈری ہوں گی وہ؟ کوشش تو کی ہوگی نا خود کو بچانے کی... مگر بچ نہیں سکیں۔'' وہ روتے روتے کہے جا رہی تھی۔ ''صرف ایک چھوٹی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا... اتنی بڑی... سزا، مان لیتی ہوں کہ اس کی غلطی تھی اس نے کسی اجنبی پر یقین کر لیا اور اس حد تک کہ اسے گھر میں بلا لیا۔ شاید اس اجنبی نے قاتل نے اس سے یہ کرنے کو کہا ہوگا مگر اس نے یہ تو سوچا بھی نہیں ہو گا، وہ اپنے گھر میں تھی۔ اس کی دوست بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس شہر میں اور اس محلے میں وہ پیدا ہوئی تھی۔ اسے تو یقین ہوگا نا کہ وہ یہاں اپنے گھر میں محفوظ ہے۔''

''ہاں زویا، یہی سوچا ہوگا۔ بعض اوقات ایک چھوٹی سی غلطی انسان کی زندگی برباد کر دیتی ہے۔ منی نے یہ سب سوچا بھی نہیں ہوگا جو ہو گیا۔'' وہ تاسف سے بولیں۔

''اور... آنی، نتاشا... اس کی تو غلطی بھی نہیں تھی وہ تو صرف اپنی دوستی میں شکار بن گئی پھر اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟''

''یہ سوچنا ضروری ہے بیٹا... کاش منی نے بھی سوچا ہوتا، تم جانتی ہو کہ منی کی سب سے بڑی غلطی کیا تھی؟''

''اس قاتل پر بھروسا کرنا۔'' زویا گالوں پر پھیلے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''نہیں بیٹا اس کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اسے جو نہیں کرنا چاہیے تھا وہ اس نے کیا جبکہ وہ خود سمجھتی تھی کہ یہ غلط ہے اور اسے یہ نہیں کرنا چاہیے۔ آپ دو دلوں کے ساتھ جب بھی جیتے ہیں، پریشان رہتے ہیں۔ مصیبتوں میں پھنستے رہتے ہیں۔ تم نے قرآن پڑھا ہے نا، وہ بھی کہ اللہ نے نہیں بنائے کسی انسان کے سینے میں دو دل... دو راستوں پر ایک ساتھ نہیں چلا جاتا بیٹا، ہم ہمیشہ وہی بات چھپاتے ہیں جو ہم خود جانتے ہیں کہ درست نہیں ہے ورنہ جس چیز کو ہم صحیح سمجھتے ہیں وہ تو ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں نا۔ وہ بچی جانتی تھی کہ وہ غلطی کر رہی ہے اگر جانتی نہ ہوتی تو فوراً تم لوگوں کو یا اپنی

ماں کو بتاتی... بتاتی نا؟ وہ سمجھتی تھی، ذہن کے کسی گوشے میں اسے احساس تھا کہ وہ غلط ہے مگر وہ برائی کے ٹرانس میں آگئی اور دوسری غلطی اس کی امی سے ہوئی، انہوں نے اپنی زندگی اپنی بیٹی کے لیے وقف کر رکھی تھی مگر اسے سب کچھ فراہم کرنے کی کاوش میں خود اس سے دور ہوگئیں۔''

''ان کی مجبوری تھی آنٹی... کام کرنا۔''

''ہاں بیٹا! مگر قریب رہنے کے لیے ہر وقت ساتھ رہنا ضروری نہیں ہوتا، صرف ایک دوسرے کو سمجھنا اور ذہنی طور پر، قربت ضروری ہے۔ بچے کو یہ یقین اور اعتماد دینا کہ وہ اپنی ماں سے ہر بُری سے بری بات بھی شیئر کرسکتے ہیں۔ کوئی ہے جو ان کی ہر بات کو سمجھ سکتا ہے اور بُرے سے بُرے حالات یا قصور میں بھی ان کی مدد کرسکتا ہے۔ ماں کا عہدہ بہت ڈیمانڈنگ ہوتا ہے اسے نہ صرف بچوں کو جینے کا قرینہ بھی سکھانا ہوتا ہے بلکہ ان کے لیے کسی بھی ہنگامی صورتِ حال میں زندگی کی جانب لے جانے والا دروازہ یا لائف سیونگ ڈرگ بھی بننا پڑتا ہے۔ وہ سائبان جو بچوں کو ان کی اپنی غلطیوں کی تپتی دھوپ اور پریشانیوں کی برسات سے بچا سکے۔ ماں سے زیادہ کوئی اولاد سے پیار نہیں کر سکتا۔ یہ تو طے ہے مگر ذرا سی بھول سب کچھ بکھیر ڈالتی ہے۔'' لبنیٰ افسردگی سے بولیں۔ ''اللہ عینی کی امی کو صبر عطا کرے۔''

''آمین۔'' زویا دھیرے سے بولی۔

''نتاشا کے بارے میں ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں۔ سر پر لگنے والی شدید چوٹ کی وجہ سے وہ کوما میں ہے۔ ڈاکٹر اگر بہت پراُمید نہیں تو نا اُمید بھی نہیں ہیں۔ اسے کبھی بھی ہوش آسکتا ہے۔ ہم سب کو اس وقت کا شدت سے انتظار ہے اور اس شام وہاں کیا اور کیسے ہوا یہ بھی صرف وہ ہی بتا سکتی ہے۔ پولیس کے مطابق اس کی زندگی کو شدید خطرہ ہے وہ قاتل اسے ختم کرنے کی کوشش بھی کرسکتا ہے اسی لیے اسے سخت حفاظتی انتظامات میں رکھا گیا ہے۔'' زویا نے بتایا۔

''اللہ اسے اپنی امان میں رکھے۔ اور ہم سب کی مدد فرمائے، زویا تمہیں اللہ کا بہت شکر گزار ہونا چاہیے اس نے تمہیں بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہونے سے بچا لیا بچے...'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔ ''چلو تم منہ ہاتھ دھوکر باہر آؤ ہم مل کر چائے پیتے ہیں۔ میں آج بہت تھک گئی ہوں اور ہاں تمہیں پتا ہے نا کہ میں تمہارے ساتھ کچھ دن سوؤں گی۔ اپنا کمرا شیئر کرلو گی نا مجھ سے؟'' وہ مسکرائیں۔

''جی ہاں آنٹی، مجھے بہت اچھا لگے گا۔'' وہ بھی جواباً مسکرائی۔ وہ اس حادثے کے بعد پہلی بار اس طرح مسکرائی تھی۔ دروازے پر کھڑی رخشندہ نے اطمینان کی سانس لی۔

ان دونوں کے جانے کے بعد زویا بھی وضو کے لیے باتھ روم کی جانب بڑھی۔ واقعی اس قیامت کی شام سے اب تک اس نے اپنے رب سے صرف شکایتیں کی تھیں، آنسو بہائے تھے شکر کا ایک سجدہ بھی نہیں کیا تھا۔ نماز پڑھ کر وہ کافی دیر سجدے میں پڑی رہی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس پر سے کوئی بھاری بوجھ اُتر گیا ہو۔

چائے پیتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک ہی خیال چکرا رہا تھا۔ عینی کے فون نمبر سے پولیس کو کیا معلوم ہوا ہوگا؟ کیا کوئی ایسا سراغ مل پایا ہوگا جو اس نامعلوم گھٹاٹوپ اندھیرے میں تھوڑی بہت ہی سہی روشنی کرسکے۔

☆☆☆

''اس کے فون نمبر سے سارا ریکارڈ مل گیا ہے گزشتہ ماہ میں ایک نمبر ایسا ملا ہے جس سے عینی کے فون پر مسلسل کال کی جاتی رہی ہے اسی نمبر سے اسے میسج بھی بھیجے جاتے رہے ہیں، ہم نے اس نمبر کو ٹریس کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ تحقیقات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ نمبر تین سال پہلے لاہور سے کسی ماہ جبین نامی کسی خاتون کے نام پر جاری کیا گیا تھا۔ اس وقت سم کے حصول کے لیے کسی خاص طریقۂ کار یا معلومات نہیں لی جاتی تھیں، لہٰذا تفتیش کی گاڑی صرف نام پر آکر رک گئی ہے جس دکان سے یہ سم لی گئی تھی وہ بند ہو چکی ہے۔''

ایس پی جعفر کے لہجے میں قدرے مایوسی سی تھی۔ زویا، لبنیٰ کے ساتھ نتاشا کے اسپتال آئی تھی وہیں ایس پی سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔

''اوہ، اس کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ اس نمبر کو استعمال نہیں کر رہا؟'' لبنیٰ نے پوچھا۔

''جی، وہ بہت زیادہ چالاک ہے، عینی کا فون اڑا لینے کے باوجود اسے اندازہ ہوگا کہ ہم اس کا نمبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اس لیے اس نے وہ سم دوبارہ استعمال ہی نہیں کی غالباً اسے توڑ کر کہیں پھینک دیا ہوگا یہی وجہ ہے کہ ہم اس کی لوکیشن ٹریس ہی نہیں کر پائے۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پولیس اس وقت بالکل اندھیرے میں ہے؟''

''فی الحال مگر ایسا رہے گا نہیں۔ تفتیش جاری ہے

1 2 3
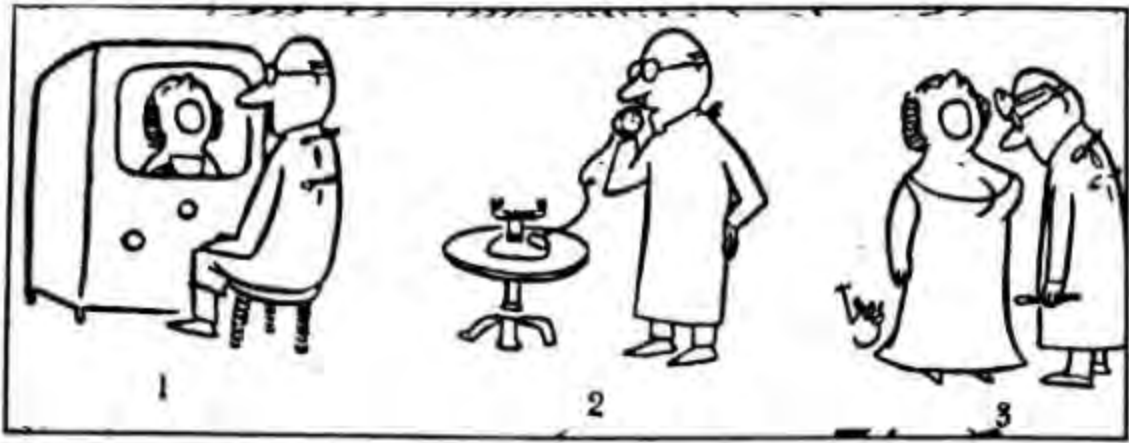
باپ رے! فون پر شکایت کرنا غضب ہو گیا   یہ تو خود ہی پہنچ گئی

یوں بھی وہ کب تک چھپا رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ نتاشا پر حملے کی کوشش ضرور کرے گا صرف وہ ہی اس کے خلاف ثبوت اور گواہ ہے۔ یہی کوشش اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوگی۔"

"اور اگر اس نے ایسا نہ کیا ایس پی صاحب تو کیا یہ دونوں بچیاں اسی طرح خوف کے عالم میں زندگی گزاریں گی اور عینی کو بھی انصاف نہیں ملے گا؟" آنی نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ایسا نہیں ہوگا ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں اور جیسے ہی کچھ سامنے آتا ہے میں آپ کے علم میں لاؤں گا۔" ایس پی نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "اس وقت تک آپ کو زویا کا بہت خیال رکھنا ہے اور زویا تمہیں کچھ اور یاد آیا؟"

"نہیں سر۔" وہ سر ہلا کر بولی۔

اس کی ساری توجہ نتاشا کی طرف تھی۔ کھڑکی کی دوسری جانب آئی سی یو کے خاص بیڈ پر وہ اس کے سامنے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں اور جسم کے مختلف حصوں سے نلکیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ دل البتہ دھڑک رہا تھا۔ زویا اس کے قریب جانا چاہتی تھی اس سے بات کرنا چاہتی تھی مگر اس وقت یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ سب جو کبھی ان کا معمولی تھا اب اچانک ناممکن بن کر رہ گیا تھا۔ زویا چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر کوریڈور کی طرف چل دی۔ اسے اس وقت نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا اور نہ کچھ سنائی دے رہا تھا۔ نہ آنی کی آواز جو اسے پکار رہی تھی نہ ایس پی جعفر کا رکنے کا مشورہ... اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے اور وہ جلد از جلد وہاں سے دور چلی جانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

اسی لمحے کوریڈور کی دوسری جانب وہ کھڑا تھا۔ وہ تیس بتیس سال کا قدرے طویل القامت شخص تھا۔ اس کے سیاہ بال اس کے ماتھے تک آرہے تھے۔ جسمانی طور پر وہ خاصا مضبوط نظر آرہا تھا۔ یوں جیسے وہ باقاعدہ ورزش کا عادی ہو، اس نے گہرے نیلے رنگ کی جینز اور قدرے ڈھیلی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پیروں میں جاگرز نما قیمتی جوتے تھے۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت خاصی متاثر کن تھی۔ سیاہ گاگلز میں چھپی اس کی آنکھیں زویا پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ اسی بے خودی کے عالم میں چلتی ہوئی اس کے سامنے سے گزر گئی تھی۔

زویا کے جانے کے چند لمحے بعد اس نے چشمہ اتارا، وہ آنکھیں کسی نارمل انسان کی آنکھیں نہیں تھیں۔ ان میں بھوک، وحشت اور عجیب سی دیوانگی ناچ رہی تھی۔

☆☆☆

"زویا کیا دیوانگی ہے یہ؟ کہاں بھاگی جا رہی ہو؟" لبنیٰ نے اسے گیٹ سے تھوڑا پہلے آلیا تھا۔

"آنی میں نتاشا کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی۔ میں اس کے قریب تک نہیں جا سکتی پتا نہیں اب وہ ٹھیک ہو گی بھی کہ نہیں؟" وہ بمشکل بول پا رہی تھی۔

"ہو گی، ضرور ہو گی۔ یقین رکھو زویا... جو بہترین کوشش ہو سکتی ہے وہ اس کے لیے ہو رہی ہے۔" وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولیں۔ "تم خود کو سنبھالو، ڈاکٹر اگر تمہیں اس کے پاس جانے کی اجازت دے دیں تو کیا تم اس طرح اس کے سامنے جاؤ گی؟ اس طرح بات کرو گی؟ ویسے میرے پاس تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔"

"اچھی خبر؟" زویا کے قدم رک گئے۔

"ہاں ایک طرح سے اچھی خبر ہی ہے ہم ابھی یہی بات کر رہے تھے کہ تم بھاگ لیں، اور مجھے بھی دوڑنا پڑا۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس کے زخم کی حالت اب ٹھیک ہے وہ

شاید کل یا ایک دو روز میں وہ تمہیں نتاشا سے بات کرنے کی اجازت دے دیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ نتاشا غالباً بات سن سکتی ہے بس ری ایکٹ نہیں کر سکتی۔ شاید تمہاری موجودگی اس کے لیے طاقت بن سکے... اگر تم اس طرح اس کے سامنے روئیں تو اس کا نیگیٹیو اثر بھی ہو سکتا ہے۔''

''میں نہیں روؤں گی۔ بالکل نہیں روؤں گی آنی، آئی پرامس۔'' وہ اپنے گالوں کو ہتھیلیوں کی پشت سے پونچھتے ہوئے بولی۔ ''اور کیا کہا ڈاکٹر نے، کیا چل کر پوچھیں اندر؟''

''نہیں، اب ہم چلتے ہیں وہ کل ہمیں فون کریں گے۔'' لبنیٰ نے اس کا ہاتھ تھاما اور گیٹ کی طرف قدم بڑھائے۔

ابھی وہ گیٹ تک پہنچے ہی تھے کہ اسپتال سے دھماکے کی آواز آئی۔ وہ دونوں تقریباً اچھل ہی گئی تھیں۔ اسپتال کی عمارت میں کہیں دور سے دھواں سا پھیلتا محسوس ہو رہا تھا بظاہر کوئی توڑ پھوڑ تو نظر نہیں آ رہی تھی مگر اس دھماکے کی آواز اور پھر دھوئیں نے لوگوں میں بُری طرح بھگدڑ مچادی تھی۔

لوگ چیختے چلاتے دروازے کی طرف لپکے تھے۔ ایسے میں بزرگ اور بچے گر رہے تھے، عورتیں چلا رہی تھیں۔ لمحہ بھر میں اسپتال میں قیامت کا سا سماں ہو گیا تھا۔ لبنیٰ نے لمحے بھر میں حواس قابو میں کر کے زویا کو کمر سے پکڑ کر دروازے کے باہر گھسیٹ لیا تھا۔

''یہ... یہ کیا ہو گیا آنی؟ کیا کوئی بم پھٹا ہے؟'' زویا کی سانس پھول رہی تھی۔

''پتا نہیں... بم تو نہیں لگتا کیونکہ عمارت کو کچھ نہیں ہوا ہے پھر بھی یقیناً کچھ بُرا ہوا ضرور ہے اور اس سے بھی برا یہ کہ لوگ دوسروں کو کچلتے ہوئے بھاگ رہے ہیں۔'' لبنیٰ افسوس سے بولی۔

''بہرحال تم تیز چلو، ورنہ اس بھگدڑ سے ہمیں بھی چوٹ لگ سکتی ہے۔''

''نہیں آنی۔'' زویا سڑک پر آ کر لبنیٰ کا ہاتھ جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

''کیوں؟''

''آنی نتاشا اسپتال میں ہے آپ سب ہی تو کہہ رہے تھے کہ اس کی جان کو خطرہ ہے اور اب یہ دھماکا... پتا نہیں اندر کیا ہوا ہے؟ وہ کیسی ہے؟ کہیں یہ سب اس کی جان لینے کو تو نہیں کیا جا رہا؟''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میرے دل میں اس طرح کے وسوسے آ رہے ہیں مگر اس صورت میں بھی اس وقت تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے بیٹا، چلو یہاں سے۔''

''نہیں آنی، ہم بھاگ نہیں سکتے، ہر بار اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

''اچھا رکو، میں ایس پی کو کال کر کے ان سے نتاشا کی خیریت اور تفصیلات معلوم ہو سکتی ہے۔'' انہوں نے نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ زویا نے سر ہلایا۔

کافی گھنٹیوں کے بعد جب فون ریسیو نہیں ہوا تو لبنیٰ نے جواب طلب نگاہوں سے زویا کو دیکھتے ہوئے فون بند کر دیا۔

''میں تھوڑی دیر میں پھر کوشش کرتی ہوں، ہو سکتا ہے کہ وہ مصروف ہوں مگر کسی بھی صورت میں ہمارا یہاں اس طرح کھڑا رہنا مناسب نہیں ہے۔ نہ ہی ان حالات میں تم اندر اسپتال میں جا کر نتاشا کی کوئی مدد کر سکتی ہو پلیز میری بات مانو اور یہاں سے چلو فی الحال۔'' وہ زویا کا بازو پکڑ کر بولیں۔

ابھی زویا جواب بھی نہ دے پائی تھی کہ لبنیٰ کا فون بج اٹھا۔

''اوہ، ایس پی صاحب، جی آپ کیسے ہیں؟ نتاشا ٹھیک ہے نا؟ اسپتال میں کیا ہوا ہے؟'' لبنیٰ نے فون ریسیو کرتے ہی سوالات کی بارش کر دی۔

''جی۔'' وہ چند لمحے چپ چاپ دوسری طرف سے دیے جانے والے جواب سنتی رہیں مگر ان کا چہرہ واضح طور پر پیلا سا پڑ گیا تھا۔

''جی ہاں، ہم گیٹ سے باہر ہی نکلے ہیں اور فوراً گھر کے لیے روانہ ہو رہے ہیں... اچھا جیسے آپ مناسب سمجھیں میں انتظار کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا اور خالی خالی نظروں سے زویا کو دیکھنے لگیں۔

''کیا ہوا ہے آنی؟ نتاشا ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں، نتاشا بالکل ٹھیک ہے زویا۔'' انہوں نے آہستگی سے جواب دیا۔

''شکر ہے خدا کا۔'' زویا نے گہری سانس لی۔ ''پھر آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟ اور ہمیں کس کا انتظار کرنا ہے۔''

''وہ انسپکٹر کامران کو بھیج رہے ہیں وہ ہمیں گھر پہنچا دیں گے۔'' وہ اسی طرح کھوئے کھوئے لہجے میں بولیں۔

''مگر کیوں؟ ہم چلے جائیں گے نا۔'' وہ غور سے لبنیٰ کا چہرہ دیکھ کر بولی۔ ''کیا بات ہے آنی... آپ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں۔''

لبنیٰ اس کی بات کا جواب دینے ہی لگی تھی کہ ایک تیز رفتار پولیس کار ان کے سامنے آکر رکی۔

''بی بی میں انسپکٹر کامران ہوں آپ کو ڈی ایس پی صاحب نے کال کیا ہوگا۔'' کار سے ایک مضبوط کاٹھی کا ادھیڑ عمر پولیس افسر باہر نکل آیا تھا۔

''جی۔'' لبنیٰ کے جواب سے پہلے وہ ان کے لیے دروازہ کھول چکا تھا۔

''آپ کا یہاں اس طرح کھڑے رہنا خطرناک ہے۔ پلیز اندر بیٹھیے آپ کو گھر پہنچانے کی ذمے داری میری ہے۔''

چند لمحوں میں کار گھر کی طرف اڑی جارہی تھی۔

''یہ سب کیا ہورہا ہے آنی؟'' آپ یک دم اتنی پریشان نظر آرہی ہیں؟ سچ بتایئے نتاشا ٹھیک ہے نا؟'' زویا کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

''جی، زویا بی بی، نتاشا ٹھیک ہے۔'' اس کے سوال کا جواب انسپکٹر نے دیا تھا۔ ''حملہ تو بہت پلاننگ سے کیا گیا تھا مگر وہ پھر بھی کامیاب نہیں ہوسکا۔''

''حملہ؟'' زویا کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔

''ہاں، دھماکے والا بم جو صرف آواز پیدا کرتا ہے کو پھاڑ کر اسپتال میں بھگدڑ پیدا کرنا اور دھوئیں کے بم پھاڑ کر لوگوں کو ڈرانے کی یہ کوشش اصل میں نتاشا کو مارنے کی سازش ہی تھی۔'' وہ بولا۔

''اوہ... پھر...؟''

''ایس پی جعفر علی نے جان پر کھیل کر نتاشا کو بچالیا ہے۔ وہ اس وقت شدید زخمی ہیں گولی ان کی گردن میں لگی ہے بس دعا کریں کہ وہ بچ جائیں۔''

☆☆☆

ایس پی جعفر کو گولی لگنے کی خبر نے گھر پر سب کو ہی تشویش زدہ اور پریشان کردیا تھا۔ بابا فون پر پولیس والوں، ڈاکٹر اور نتاشا کے خاندان والوں سے گفتگو میں مصروف ہو گئے تھے۔

''یہ معاملہ ایک واردات سے زیادہ پیچیدہ اور پریشان کن ہے جو آدمی پولیس سے بھرے اسپتال میں اس قدر گڑبڑ مچا سکتا ہے وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔'' وہ فون سے فارغ ہوکر صوفے پر آبیٹھے۔ ''جانتے ہیں آپ لوگ اس کے ان دھماکوں کے چکر میں دو افراد کچل کر ہلاک اور کتنے ہی زخمی بھی ہوئے ہیں ایک تو ہم قوم نہیں بھیڑ بنتے جارہے ہیں ایک دوسرے سے بے نیاز صرف اپنے لیے تحفظ چاہنے والا ریوڑ... ذرا سی گڑبڑ ہمارے اندر کے خوف کو دل و جان پر طاری کردیتی ہے اور پھر ہم اپنے اردگرد چلتے پھرتے لوگوں کو اپنے جیسا انسان سمجھنا چھوڑ دیتے ہیں۔'' وہ افسوس سے کہہ رہے تھے۔ ''میں بہت پریشان ہوں۔ ایس پی جعفر بہت فرض شناس افسر ہے اب نہ جانے اس کی جگہ کون اس کیس کو دیکھے گا بہرحال اب ایک بات طے ہے کہ اب ہمیں اور زیادہ محتاط رہنا پڑے گا جب تک وہ ذلیل انسان پکڑا نہیں جاتا، زویا اکیلے کہیں نہیں جائے گی۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی صاحب۔ اس میں بہت خطرہ ہے اور احتیاط ہر صورت میں بہتر ہے۔'' لبنیٰ نے کہا۔

''اور اگر وہ کبھی پکڑا نہ گیا بابا...'' زویا جو تب سے خاموش تھی اچانک بولی۔ ''پھر کیا میں ساری زندگی اسکول نہیں جاؤں گی، کچھ بھی نہیں کروں گی؟'' اس کے لہجے میں کچھ ایسی عجیب بے بسی تھی جس نے بابا کے دل کو چیر سا دیا تھا۔

''نہیں میری جان ایسا کیوں ہوگا۔'' وہ اسے خود سے لپٹاتے ہوئے بولے۔ ''تم اسکول جاؤ گی۔ بہت کچھ کرو گی بس جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا میں، احمر یا تمہاری ماں تمہارے ساتھ ہوں گے۔ تمہیں چھوڑنے لانے کے لیے... ٹھیک ہے نا، اس سے ہم بھی مطمئن رہیں گے۔''

رات خاصی دیر کے بعد بالآخر ایس پی کے خطرے سے باہر آنے کی خبر ملی تھی۔ اسپتال پر نفری بڑھا دی گئی تھی اور نتاشا کے خاندان سے دو افراد کو آئی سی یو میں رہنے کی اجازت دی گئی تھی۔ سب اس سب کے بعد ہی سونے لیٹے تھے مگر زویا کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ بستر پر لیٹے کروٹیں بدلتے تھک گئی تو اٹھ کر لاؤنج میں رکھے کمپیوٹر پر جابیٹھی۔ وہ اور احمر کمپیوٹر پر وقت گزارنے کے لیے روز لڑا کرتے تھے۔ اور اب کتنے ہی دن سے یہ کمپیوٹر استعمال ہی نہیں ہوا تھا۔ گیمز میں دل نہ لگا تو اس نے فیس بک کھولا۔ اس نے عینی اور نتاشا تینوں نے ایک سال قبل فیس بک پر پیجز بنائے تھے۔ اور اسے استعمال بھی کرتی تھیں۔ زویا کو روزانہ ایک سے ڈیڑھ گھنٹے تک کمپیوٹر استعمال کرنے کی اجازت تھی جسے وہ ایف بی یا گیمز میں گزارتی تھی۔ گزشتہ دس دنوں سے تو زندگی ہی اتھل پتھل ہوگئی تھی۔ اسے فیس بک کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ پیج کھلتے ہی اسے نئی دوستی کی کئی ریکویسٹ نظر آئیں۔ فیس بک پر اس کے ساتھ اسکول کی سہیلیاں اور چند کزنز وغیرہ ایڈ تھیں۔ احمر نے اسے سیکیورٹی

کی سیٹنگ بھی کر دی تھی پھر بھی دو چار ریکویسٹ آہی جاتی تھیں۔ اس نے وقت گزاری کے لیے ریکویسٹ دیکھنا شروع کیں۔ پہلی دو ریکویسٹ دو لڑکوں کی تھیں جنہیں اس نے ڈیلیٹ کر دیا پھر ایک مشہور اداکارہ کی ریکویسٹ تھی۔ اسے دیکھ کر زویا حیران ہوئی پھر اسے عینی کی بات یاد آئی کہ لوگ مشہور لوگ کی پکس اور نام لگا کر جعلی اکاؤنٹ کھول لیتے ہیں یقیناً یہ جعلی ہے ورنہ یہ مجھے کیوں ریکویسٹ بھیجے گی۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے وہ ریکویسٹ بھی ڈیلیٹ کر دی، چوتھی اور آخری ریکویسٹ عجیب سی تھی۔ آئی ڈی کی کور پک پر ایک خوفناک ماسک کی تصویر لگی ہوئی تھی جس سے خون ٹپک رہا تھا اور آئی ڈی کا نام بھی بہت عجیب سا تھا Love to kill۔ اس نام اور پکچر کو دیکھ کر وہ سہم سی گئی۔ آخر یہ کون ہے عجیب سا انسان اور اس نے مجھے کیوں ریکویسٹ بھیجی ہے اس تصویر اور نام سے کوئی کیوں دوستی کرے گا، وہ بڑبڑائی اور اسے بھی ڈیلیٹ کر دیا اس تصویر اور آئی ڈی نے اس کی طبیعت کو مکدر سا کر دیا تھا۔ لاگ آف ہونے سے پہلے اس نے میسج کو چیک کیا۔ اس کے ان باکس میں دو میسج تھے۔ ان میں سے ایک اس کی اسکول کی دوست کا تھا اور دوسرا میسج Love to kill کی طرف سے تھا اس نے ڈرتے ڈرتے اسے کھولا۔

”وہ پھولوں کی طرح تروتازہ ہے
شبنم کی طرح نرم و نازک ہے
بہت ہی خوب صورت...
صرف میرے لیے...
کیونکہ میں ہی ہوں اس کا چاہنے والا
اس کی نزاکت کو محسوس کرنے والا۔“

اس عجیب سی نظم نے اسے اور الجھا دیا تھا۔ پہلے وہ میسج کو بھی ڈیلیٹ کرنے لگی تھی پھر اس نے اسے چھوڑ دیا اور لاگ آؤٹ ہو گئی۔

سونے تک وہ بھیانک ماسک، اس سے ٹپکتا خون اور میسج کے وہ بے سروپا جملے اس کے حواس پر طاری رہے تھے۔

☆☆☆

اگلی صبح خاصی دھماکا خیز ثابت ہوئی تھی، تمام اخبارات میں اسپتال میں ہونے والی واردات، ہنگامے اور بھگدڑ کی تفصیلات کی خبریں شائع ہوئی تھیں۔ نامعلوم ملزم نے اسپتال کے درمیانی حصے میں دھماکا کرنے والے کھلونا بم کا استعمال کیا تھا۔ بند جگہ میں آواز اور زیادہ شدت سے محسوس ہوئی تھی اور ساتھ ہی دھوئیں کے شیل چلائے تھے جس سے یکدم بھگدڑ مچ گئی تھی۔

حالات کی وجہ سے لوگوں کا ذہن فوری طور پر بم یا خودکش حملے کی طرف گیا تھا جس کی وجہ سے عام لوگ، مریض حتیٰ کہ ڈیوٹی پر تعینات سپاہی بھی اسپتال سے نکل بھاگے تھے اور یہی اس سارے ڈرامے کا مقصد بھی تھا۔ اسی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر وہ آئی سی یو میں داخل ہو گیا تھا۔ مگر ایس پی جعفر وہاں موجود اور مستعد تھا، اس نے اسے دیکھتے ہی گولی چلا دی تھی۔ جواباً چلنے والی گولیوں سے وہ زخمی ہو گیا تھا مگر ملزم کو بہر طور فرار ہونا پڑا تھا۔ چند اخبارات کا دعویٰ تھا کہ ملزم بھی زخمی ہوا ہے مگر اس کی کوئی مستند اطلاع نہیں تھی۔ اس واقعے کو بجا طور پر عینی کے بہیمانہ قتل سے جوڑا گیا تھا اور مختلف سوالات اٹھائے گئے تھے۔ ایس پی جعفر علی نے فوری کارروائی کر کے اس کے عزائم کو جس طرح ناکام بنایا تھا، اس کی بھی خوب تعریف کی گئی تھی اور انہیں دیگر پولیس والوں کے لیے مثال قرار دیا جا رہا تھا۔

زویا کی توجہ اس ساری تفصیل میں سے صرف ایک لفظ پر مرکوز تھی۔ ایس پی صاحب نے اسے ”دیکھ“ کر گولی چلائی تھی جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اب وہ اسے شناخت کر سکتے تھے۔ یعنی عینی کا قاتل اب ایک انجانا چہرہ نہیں رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایس پی صاحب ہوش میں آ کر اس کا اسکیچ بنوا سکتے ہیں۔ ٹی وی پر چلنے والے پولیس کے ڈراموں سے اتنا تو وہ جان ہی چکی تھی۔ وہ اس کا اسکیچ دیکھنا چاہتی تھی۔ کیا اس نے زندگی میں بھی اس قاتل کو دیکھا ہو گا؟ وہ مسلسل سوچے جا رہی تھی۔

پولیس کا کہنا تھا کہ وہ ان کے معمولات سے واقف تھا، کیا وہ اسے جانتی ہو گی؟

یہ سوال جہاں اسے دہشت زدہ کر رہا تھا، وہیں وہ اس کے جواب کے حصول کے لیے بہت بے چینی محسوس کر رہی تھی۔

شام تک ایس پی جعفر کو ہوش آ گیا تھا۔ زویا ان سے فوری طور پر ملنا چاہتی تھی مگر گھر میں کوئی بھی اسے اسپتال لے جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”یہ مناسب نہیں ہو گا بیٹا... اس وقت تو کسی طور بھی نہیں۔“ بابا نے اسے سمجھایا۔

”بابا وہ ہمارے لیے اتنا کچھ کر رہے ہیں تو کیا ہمیں ان کو دیکھنے بھی نہیں جانا چاہیے؟“

”کل جو کچھ اسپتال میں ہوا ہے، اس کے بعد تو یہ

خطرے کے منہ میں کودنے والی بات ہے۔'' وہ بولے۔

''تو اب کیا میں ساری عمر منہ چھپا کر ایک کونے میں بیٹھی رہوں گی بابا۔ جب میں یہ کر رہی تھی تو آپ سب ہی مجھے ہمت سے کام لینے کو کہہ رہے تھے اور اب جب میں اس سب کا سامنا کرنے کو تیار ہوں تو آپ ہی مجھے روک رہے ہیں... میں ان سے بات کرنا چاہتی ہوں بابا، انہوں نے اس حملہ آور کو دیکھا ہے، وہ اس کا حلیہ بتا سکتے ہیں... شاید... اس سے مجھے کچھ یاد آجائے۔'' اس نے کہا۔

''شاید واقعی میں نے اسے دیکھا ہو۔''

''اگر یہ بات ہے تو تم کو ضرور ایس پی سے بات کرنی چاہیے مگر اس کے لیے وہاں جانا ضروری نہیں ہے۔'' لبنیٰ بولیں۔ ''تم ان سے فون پر بھی بات کر سکتی ہو اگر وہ کر سکیں، تمہیں اس سب کو فیس کرنا ہے جرأت کے ساتھ مگر عقل کے ساتھ بھی... ہے نا؟''

''جی آنی! ٹھیک ہے فون پر ہی سہی...'' وہ دھیرے سے بولی۔

ایس پی صاحب سے رابطہ رات گئے جا کر ہو پایا تھا۔ زویا کی بات سن کر ایک لمحے کو دوسری طرف سکوت سا طاری ہو گیا۔ ''بتایئے سر کیسا تھا وہ؟ آپ نے تو اسے دیکھا تھا نا؟ اس میں ایسی کیا بات تھی جسے دیکھتے ہی آپ نے گولی چلا دی؟ آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہی مجرم ہے؟''

''زویا! اسے دیکھنے کے ایک سیکنڈ میں ہی میں کیا کوئی بھی سمجھ سکتا تھا کہ وہ اسپتال کے عملے یا عام مریضوں وغیرہ میں سے نہیں ہے۔'' وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولے۔

''کیا مطلب؟ یعنی وہ اتنا بھیانک ہے؟'' زویا پھریری سی لے کر بولی۔

''نہیں مگر اس وقت لگ رہا تھا۔''

''میں سمجھی نہیں سر، ویسے کیا آپ اس کا اسکیچ بنوا رہے ہیں؟ اس طرح اسے پکڑنے میں آسانی ہو گی۔ اگر وہ ہمیں جانتا ہے تو شاید کبھی سامنا ہوا ہو... یا پھر اسکیچ دیکھ کر مجھے یاد آجائے۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ایسے حالات میں یہی پریکٹس ہوتی ہے اور 10 میں سے 8 مرتبہ یہ عمل کامیاب بھی ہو جاتا ہے یا پھر کامیابی کی کوشش میں اہم کردار ادا کرتا ہے مگر اس بار یہ ممکن نہیں ہے۔'' ان کی آواز میں تھکاوٹ سی تھی۔

''کیوں سر؟''

''کیونکہ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ پایا۔'' وہ ہلکی آواز میں بولے۔

''کیا...؟''

''ہاں زویا، میں نے اسے دیکھتے ہی گولی چلائی کیونکہ جب وہ آئی سی یو میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں ریوالور موجود تھا۔ میں دھماکوں کی آواز سے ہی سمجھ گیا تھا کہ نتاشا کو لاحق خطرہ اسپتال کے اندر آ گیا ہے اور میں اس کے حوالے سے کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ میں اس کا اسکیچ نہیں بنوا سکتا... کیونکہ اس نے اپنے چہرے پر ماسک پہن رکھا تھا۔''

''ماسک...؟'' زویا زور سے بولی۔ اس کے ذہن میں نہ جانے کیوں فیس بک کی ماسک والی آئی ڈی گھوم گئی۔

''ہاں، اور ماسک بھی ایسا کہ انسان اسے دیکھتے ہی دہشت زدہ ہو جائے۔ انتہائی خونخوار، سفاک اور بھیانک چہرے کا ماسک جس کے دہانے سے خون کے قطرے ٹپکتے نظر آ رہے تھے مگر تم پریشان نہ ہونا، ہم اس ماسک کے بارے میں تفتیش شروع کر چکے ہیں شاید اب یہی ماسک ہمیں اس تک پہنچانے میں مددگار ثابت ہو گا۔''

وہ بہت کچھ کہہ رہے تھے مگر زویا گویا کچھ سن ہی نہیں رہی تھی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے خون ٹپکاتا ہوا بھیانک ماسک لہرا رہا تھا اور LOVE TO KILL کی بازگشت اس کی سماعت میں دھماکے کر رہی تھی۔

''کیا یہ وہی تھا؟''

اس قدر مماثلت... اتفاق کیسے ہو سکتی تھی؟

اگر یہ وہی تھا تو وہ اسے بار بار پیغامات کیوں بھیج رہا تھا؟

کیوں؟ سوالیہ نشان پھیلتے پھیلتے اس کے اعصاب پر طاری ہوتا جا رہا تھا اور پھر کمرا، خون، فون سے آتی ایس پی جعفر کی ہیلو ہیلو کی پکار، اس کے اردگرد موجود پیار کرنے والے چہروں کی فکر اور سب کچھ دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔

☆☆☆

جب اس کی آنکھ کھلی تو سب اس کے اردگرد موجود تھے۔

''بیٹا، کیا ہوا ہے زویا؟ کس بات کی ٹینشن ہے بیٹا؟ ایسا کیا کہا انہوں نے؟ بولو بیٹا۔'' اس کے سنبھلنے کے بعد بابا نے پوچھا۔

زویا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کیا اسے سب کو اس آئی ڈی کے بارے میں بتانا چاہیے؟ اور اگر وہ غلط سمجھ رہی ہو تو؟ پھر اسے یقین تھا کہ اگر اسے غلط فہمی بھی ہوئی ہو، وہ دو مختلف باتوں کو ملانے کی غلطی بھی کر رہی ہو تب بھی بابا اور گھر والے اس کی حفاظت کے خیال سے اسے پھر کمپیوٹر بھی استعمال نہیں کرنے دیں گے۔

''کچھ نہیں بابا... پتا نہیں کیوں چکر سا آگیا تھا۔'' وہ بمشکل بولی۔

''مسلسل اتنا کچھ ہو بھی تو رہا ہے۔ انسان کے اعصاب جواب دے ہی جاتے ہیں تم آرام کرو زویا... اور کچھ بھی مت سوچو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' رخشندہ بیٹی کا سر سہلاتے ہوئے بولیں۔

''ہاں، ویسے بھی اب رات ہو چلی ہے، کل بھی تم بہت دیر سے بھی سوئی تھیں چلو اب سو جاتے ہیں۔'' لبنیٰ نے کہا۔

''مگر ایس پی صاحب زویا سے بات کرنا چاہتے ہیں انہوں نے کہا تھا کہ ہوش میں آتے ہی بات کروایئے۔'' احمر نے کہا۔

''بات کرو گی زویا؟'' بابا نے پوچھا۔

''آپ کر لیجیے بابا... میں اب ٹھیک ہوں بس تھکن سی ہو رہی ہے۔'' وہ بولی۔

''ٹھیک ہے تم آرام کرو۔'' ان کے جواب پر وہ دھیرے سے بولی اور کمرے کی طرف چل دی۔ وہ اس وقت صرف سوچنا چاہتی تھی۔

کسی کو بھی کچھ بتانے سے پہلے اسے خود یہ سب سمجھنا تھا، کسی نتیجے پر پہنچنا تھا۔ وہ مزید سوالات یا گفتگو سے بچنے کے لیے آنی کے بستر پر آنے سے پہلے ہی آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔

یہ سب کچھ بہت الجھا ہوا تھا۔

عینی کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ بہت ہی برا تھا۔ یہی الجھن کم نہیں تھی کہ ایسا اس کے ساتھ کیوں اور کس لیے ہوا۔

مگر جو کچھ ان دو دنوں میں ہو رہا تھا، وہ اس سے زیادہ سوال کھڑے کر رہا تھا۔ اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ معاملہ رکنے والا نہیں ہے۔ وہ جو بھی تھا غالباً اپنا ادھورا کام مکمل کرنے کے لیے بہت زیادہ سنجیدہ تھا اس حد تک کہ اس نے پولیس کی موجودگی کے باوجود اسپتال جیسی بھیڑ بھاڑ والی جگہ پر اس قدر ہنگامہ کھڑا کرنے کا خطرہ مول لیا تھا۔

پھر اگر وہی اسے فیس بک پر پیغامات بھیج رہا تھا تو پھر

کتابی شکاری — ٹرافیاں بازار سے مل جاتی ہیں

یہ معاملہ بہت ہی توجہ طلب تھا مگر وہ اس بارے میں کچھ بھی کہنے یا بتانے سے پہلے اس کی یقین دہانی چاہتی تھی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ سراسر غلط سمجھ رہی ہو کوئی اور بھی اس قسم کے ماسک کا کور بنا سکتا تھا اور ایسی آئی ڈی رکھ سکتا تھا۔ اس نے سوچا۔

آنی کے سونے کے بعد بھی وہ سب لوگوں کے اپنے کمروں میں جانے اور سونے کے بعد تک بستر پر لیٹی رہی پھر وہ کمرے سے نکلی اور لاؤنج میں رکھے کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھی۔ کمپیوٹر آن ہونے تک وہ اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔ اس کا ذہن 100 میل فی گھنٹا کے حساب سے دوڑے جا رہا تھا۔ کبھی اس کے تصور میں عینی کا مسکراتا، شرارتی چہرہ آجاتا، کبھی اس کی خون میں لتھڑی لاش منظر پر چھا جاتی تو کبھی ڈھیروں پٹیوں میں چھپی بے حس و حرکت تماشا نظر آتی۔

فیس بک پر لاگ ان کرتے ہوئے بھی وہ عجیب سی الجھن میں پھنسی ہوئی تھی۔ ایک طرف وہ سب کچھ جاننا چاہتی تھی تو دوسری طرف سخت خوف زدہ بھی تھی۔

اگر وہ واقعی وہی ہوا تو...؟

اس کا اس طرح اسے میسیج کرنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟

کیا وہ اس کی اگلی شکار تھی؟ یہ سوچ ہی اسے دہشت زدہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

لاگ ان ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے ریکویسٹ اور میسیجز کے فولڈر پر نظر ڈالی۔ ان میں ایک ریکویسٹ اور ایک پیغام موجود تھا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے ماؤس کو گھمایا... ایرو اب ریکویسٹ کے اوپر تھا۔ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھنے کے بعد اس نے فولڈر پر کلک کیا، اگلے لمحے وہ سُن سی رہ گئی۔

اس کے سامنے وہی انتہائی دہشت ناک اور خوف زدہ کردینے والا ماسک تھا جس کے ہونٹوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ بالکل ویسا ہی جیسا ایس پی نے بتایا تھا۔ اس کے نیچے سرخ رنگت میں LOVE TO KILL کے الفاظ چمک رہے تھے۔

وہ خالی خالی نظروں سے اس کی کور پکچر اور آئی ڈی کو گھورتی رہی۔ اس کا دل اور دماغ چلا چلا کر کہہ رہے تھے کہ یہ وہی ہے۔ سوال پھر وہی تھا کہ اسے اس طرح ریکویسٹ بھیجنے سے اس کا مقصد کیا ہوسکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس سرعت سے اسے تلاش کررہی تھی اور زویا سے بھی رابطے میں تھی۔ زویا یہ سب پولیس کو بتا سکتی تھی۔ اس کے باوجود اس کی ریکویسٹ کی موجودگی کے دو ہی مطلب ہوسکتے تھے یا تو وہ یہ تھا ہی نہیں۔ یہ مشکل تھا لیکن یہ ایک اتفاق بھی ہوسکتا تھا اور یا پھر وہ جو بھی تھا، وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ کسی سے بھی نہیں ڈرتا اور اس کا دوسرا اور واضح مقصد یہی تھا کہ وہ زویا کے پیچھے تھا۔ زویا کا ہاتھ لرزنے لگا۔

اس کے میسیج کے فولڈر میں بھی ایک پیغام موجود تھا۔ اس نے کلک کیا اور وہ فولڈر بھی کھل گیا۔

جو کچھ اسکرین پر سامنے آیا تھا، اس پر نظر پڑتے ہی زویا کی آنکھیں دہشت سے پھیل سی گئی تھیں۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کا سارا وجود کسی پتھر کے مانند جامد و ساکت ہوگیا تھا جو کچھ اس کی نظروں کے سامنے تھا، اسے اس پر یقین نہیں آرہا تھا۔

اس کے سامنے LOVE TO KILL کا دوسرا پیغام تھا۔

''ادھورا کام اذیت ہوتا اور منزل تک نہ پہنچنا ناکامی... مجھے ناکامی سے نفرت ہے اور میری اصل منزل تم ہو... صرف تم...''

☆☆☆

دہشت کے پہلے دھچکے کے بعد سنبھلتے ہی زویا نے LOVE TO KILL کا ایف بی صفحہ کھولا۔ صفحے پر اس کی آئی ڈی اور دو کور پکچرز کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ یقینی بات تھی کہ اس صفحے پر خاص سیکیورٹی لگی ہوئی تھی۔ جس کا مطلب یہی تھا کہ اس کی فرینڈ شپ ریکویسٹ کو ایکسیپٹ (قبول) کیے بغیر اس کے بارے میں کچھ جانا نہیں جاسکتا تھا۔

زویا نے گہری سانس لی۔ دو لمحے سوچتی رہی پھر فرینڈ شپ ریکویسٹ فولڈر کھول کر اس کی ریکویسٹ کو کنفرم کردیا اب وہ LOVE TO KILL کے دوستوں میں شامل ہوچکی تھی اس بار جب وہ اس کے صفحے پر گئی تو اسے وہاں موجود پوسٹ اور کافی کچھ نظر آیا۔

اس کا دل ڈرم کی طرح بج رہا تھا، اس کی سانس پھول رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس تک پہنچ گئی ہے اور اسے اس کے بارے میں اب سب کچھ نہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہوجائے گا۔

زویا نے اباؤٹ کے بٹن پر کلک کیا مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ نہ ہی پورے صفحے پر LOVE TO KILL کی کوئی تصویر موجود نہیں تھی۔ اس نے جو چند پوسٹ کی ہوئی تھیں وہ بھی عام ہی تھیں۔ اگر اس کے اور دوست تھے تب بھی کوئی ایسی سیٹنگ کی گئی تھی کہ زویا انہیں نہیں دیکھ پارہی تھی۔

زویا نے مایوسی سے سر ہلایا، یہ طے تھا کہ اس صفحے کے ذریعے اس تک نہیں پہنچا جاسکتا تھا۔ لاگ آؤٹ ہوتے ہوئے اچانک ایک خیال نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

وہ عینی کا فیس بک پیج بھی تو کھول سکتی تھی۔ وہ تینوں ایک دوسرے کے پاس ورڈ جانتی تھیں۔ انہوں نے ایک ساتھ ہی فیس بک پر اکاؤنٹ بنائے تھے۔ نتاشا نے چند ماہ کے بعد فیس بک کا استعمال بہت کم کردیا تھا۔ اس کے گھر کے کمپیوٹر میں کچھ خرابی ہوگئی تھی جس کی وجہ سے وہ فیس بک استعمال نہیں کرپاتی تھی۔ بس کبھی عینی کے گھر جمع ہوتے تو وہ تینوں اپنے اپنے صفحے کھولتے تھے۔

اس نے ذہن پر زور دیا... اسے عینی کا پاس ورڈ پوری طرح یاد نہیں آرہا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اسے یاد آگیا۔ عینی کی تاریخ پیدائش ہی اس کا پاس ورڈ تھی وہ اس کے آگے چند لفظ لگاتی تھی، ان کی ترتیب کے بارے میں وہ تھوڑی کنفیوز تھی۔ زویا نے اس کی آئی ڈی لکھ کر پاس ورڈ ڈالا مگر وہ غلط نکلا۔ اس نے حرفوں کی ترتیب تھوڑی سی بدل کر پھر پیج کھولنے کی کوشش کی۔ اس بار بھی اس کی کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ اس کے ماتھے پر پسینا آگیا۔

شاید وہ عینی کا پیج نہیں کھول پائے گی۔ اس نے دکھ سے سوچا۔

اس نے ایک آخری کوشش کے طور پر حرفوں کی

ترتیب بدلی اور لاگ ان کو کلک کیا۔ اگلے لمحے عینی کا پیج اس کے سامنے تھا۔ وہ کامیاب ہو گئی تھی۔ زویا مسکرائی۔ عینی کے صفحے پر یادوں کا خزانہ بکھرا ہوا تھا۔ تصویریں، لطیفے، چھیڑ چھاڑ، کارٹونز... وہ چند لمحوں کے لیے مبہوت سی رہ گئی۔

انہوں نے جس آخری پوسٹ پر ایک ساتھ کمنٹس کیے تھے، وہ دوستی پر ہی تھی۔ عینی نے لکھا تھا۔ ''توڑیں گے دم اگر تیرا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔'' اور اس میں ان دونوں نے ٹھیک کیا تھا اور واقعی وہ دونوں آخری لمحے تک ساتھ رہے تھے۔ زویا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اسے جب سے اپنی زندگی یاد تھی۔ وہیں سے عینی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے گالوں پر پھسل آنے والے آنسوؤں کو صاف کیا اور عینی کے پیج کا جائزہ لیا۔ اس پر ایسا کچھ نہیں تھا جس سے اس بارے میں کچھ معلوم ہو پاتا۔

زویا کو یقین تھا کہ عینی کے پیج سے اسے LOVE TO KILL کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم ہو پائے گا۔

فرینڈز لسٹ میں جانے سے پہلے اس نے عینی کے چیٹ میسجز کو کھولا۔

دہشت کا دوسرا جھٹکا پہلے سے زیادہ شدید اور ساکت کر دینے والا تھا۔ عینی کے میسجز میں LOVE TO KILL کے کئی پیغام موجود تھے جو شاید ان کی آخری چیٹ پر مشتمل تھے۔

یہ اس واردات سے پچھلی والی رات کو ہونے والی چیٹ تھی اس میں LOVE TO KILL نے عینی سے کہا تھا کہ وہ ایک دو دن میں ہی اس سے ملنا چاہتا ہے کیونکہ اس کے بعد ہو سکتا ہے کہ اسے شہر سے باہر جانا پڑ جائے اور وہ کئی مہینوں کے بعد واپس آئے۔ عینی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ فوراً ہی کچھ کرے گی جس پر اس نے اس سے کہا تھا کہ وہ لوگ پریکٹس کے لیے جمع ہوتے ہیں وہ تب ہی اسے بھی بلا سکتی ہے، اس طرح وہ اس کی سہیلیوں سے بھی مل لے گا۔ عینی نے جواباً لکھا تھا کہ وہ موقع ملتے ہی اسے ایس ایم ایس کرے گی جس کے جواب میں اس نے تحریر کیا کہ وہ اس سے زیادہ دور نہیں ہوگا وہ جیسے ہی کہے گی، وہ پندرہ بیس منٹ میں پہنچ جائے گا مگر ملاقات میں ان تینوں کے سوا کسی اور کو نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے مطابق اس کی سہیلیاں تو اس کی رازدار ہو سکتی ہیں مگر کسی اور کی موجودگی عینی کو بدنام کر سکتی ہے اور وہ اس کی عزت پر کوئی بات نہیں آنے دینا چاہتا۔

زویا نے نفرت سے اس کے پیغام کو دیکھا۔ عزت کی

بات وہ کر رہا تھا جس نے عزت کے ساتھ اپنی عینی کی زندگی کو بھی چھین لیا تھا اور وہ بھی اس قدر تکلیف دہ اور دہشت کے عالم میں... اس بُری طرح... وہ جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔

عینی کے الفاظ کی وارفتگی سے یہ لگ رہا تھا کہ وہ اکثر اس سے بات کرتی ہوگی مگر وہاں صرف ایک چیٹ تھی۔ زویا کے ذہن میں ابھرنے والے اس سوال کا جواب چیٹ کے آخری جملے میں موجود تھا جس میں LOVE TO KILL نے عینی کو تاکید کی تھی کہ وہ اس کی اس چیٹ (گفتگو) کو پڑھنے کے بعد ڈیلیٹ (مٹانا) کردے کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ لوگ عینی پر کبھی انگلی اٹھائیں۔ عینی نے لکھا تھا کہ وہ ہمیشہ ایسے ہی کرتی ہے اور اس کی ہر چیٹ کو مٹا دیتی ہے مگر پتا نہیں کیوں... اس نے اس آخری چیٹ کو ڈیلیٹ نہیں کیا تھا۔

زویا کو اس شخص سے انتہائی نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے کس قدر چالاکی سے عینی کو اپنے جال میں پھانسا تھا اور کس قدر مکاری سے اپنے بچاؤ کو ممکن بنایا تھا اور وہ سادہ دل لڑکی اس کی کسی چال کو سمجھ نہیں پائی تھی۔

اس ایک چیٹ کے علاوہ اس کے پورے صفحے پر LOVE TO KILL کے حوالے سے کچھ بھی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ وہ اس کے فرینڈز لسٹ پر بھی نہیں تھا۔ یقیناً اس نے عینی کو مارنے کے بعد اسے پوری طرح بلاک کر دیا تھا تاکہ اگر کبھی کوئی عینی کا صفحہ کھول بھی لے تو اس سے اس کا تعلق نہ جوڑ پائے۔ یہ الگ بات ہے کہ عینی وہ آخری چیٹ نہیں مٹا پائی اور یوں حقیقت کھل کے سامنے آگئی تھی۔ زویا کو اب سو فیصد یقین تھا کہ یہ وہی ماسک والا تھا جس نے اسپتال میں حملہ کیا تھا اور اب وہی اسے بھی پیغامات بھیج رہا تھا۔

وہ نتاشا کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔

اور زویا یقیناً اس کا نشانہ تھی۔

اسے یہ سب ایس پی جعفر اور سب کو بتانا تھا شاید یہ سب تفتیش میں مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔

اس نے عینی کے فیس بک پیج پر موجود چیٹ کو کاپی کر کے ڈیسک ٹاپ پر محفوظ کر لیا تھا۔ کمرے میں واپس آکر اس کی نظر سامنے لگے وال کلاک پر گئی۔ صبح کے چار بج رہے تھے، اس کی آنکھوں سے نیند اب بھی غائب تھی۔ بستر پر لیٹتے ہوئے اس کا خیال تھا کہ شاید وہ صبح تک سو نہیں پائے گی مگر پھر نہ جانے کس وقت نیند کی مہربان دیوی نے اسے اپنی بانہوں میں پناہ دے دی تھی۔

ابھی اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ کسی نے اسے جھنجوڑ کر جگا دیا۔

''زویا... زویا اٹھو بیٹا...'' دور سے آتی آواز آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی، اس کی آنکھ کھلی تو آنی اس پر جھکی ہوئی تھیں۔

''آنی کیا ہوا...؟ آپ رات کو کیوں جاگ رہی ہیں؟''

''رات...؟ بیٹا صبح کے 10 بجے ہیں، اسپتال سے اچھی خبر آئی ہے زویا...'' وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

''اچھی خبر؟ کیسی اچھی خبر؟'' اس نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے آنی کو دیکھا۔

''اسپتال سے فون آیا تھا نتاشا کو ہوش آگیا ہے زویا...''

''کیا...؟'' وہ اچھل کر اٹھ بیٹھی۔

''ہاں... اسے ہوش آگیا ہے۔ پر وہ کچھ بول نہیں پا رہی ہے۔ ڈاکٹرز کا خیال ہے کہ تمہاری موجودگی اس کے لیے مددگار ثابت ہوگی۔''

''اور شکر ہے اللہ کا، میں تیار ہو رہی ہوں۔ ہم ابھی چلیں گے نا...'' زویا تیزی سے بستر سے نکلتے ہوئے بولی۔

اس لمحے عینی کا فیس بک پیج، اس کے پیغامات LOVE TO KILL سب کچھ اس کے ذہن سے نکل گیا تھا۔

وہ بس فوراً نتاشا کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

نتاشا کا چہرہ پیلا ہو رہا تھا۔

وہ بمشکل آنکھیں کھول رہی تھی۔ ان آنکھوں میں عجیب سے تاثرات تھے جن میں خوف و دہشت، بے یقینی ملی ہوئی تھی۔ سر پر بندھی پٹیوں اور گلے میں موجود کالر کی وجہ سے وہ اپنے سر کو حرکت نہیں دے پا رہی تھی۔ اس کا ایک بازو پلاسٹر میں تھا اور دوسرے پر بھی چوٹوں کی وجہ سے پٹیاں موجود تھیں۔ اس کی ایک ٹانگ تین جگہ سے فریکچر تھی اور اس وقت پلاسٹر میں تھی۔ تکلیف گویا اس کے چہرے پر تحریر تھی۔

زویا دروازے پر کھڑی اسے یک ٹک دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نتاشا کی حالت دیکھ کر آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ رخشندہ اور باقی سب کمرے میں چلے گئے تھے مگر اس کے اندر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

''مجھے معلوم ہے بیٹا کہ تم تکلیف میں ہو، اس سب کو یاد کر کے تمہیں زیادہ تکلیف ہوگی مگر تمہارا بولنا، سب کچھ بتانا بہت ضروری ہے اگر تم نہیں بولو گی تو ہم اس تک کیسے پہنچیں گے۔ تم سمجھ رہی ہو نا؟'' ڈی ایس پی باقر بہت نرمی

سے کہہ رہا تھا۔

''ہاں بیٹا تم جو جانتی ہو، جو یاد آتا ہے سب بتا دو تاکہ اسے پکڑا جا سکے۔ یہ تمہاری حفاظت کے لیے بہت ضروری ہے نتاشا...'' اس کی امی اس کا ہاتھ تھام کر بولیں۔

''اور زویا کے لیے بھی...''

''زویا... زویا کہاں ہے؟'' رخشندہ کو اچانک اس کا خیال آیا وہ دروازے کی طرف لپکیں۔

''ارے تم یہاں کیوں کھڑی رہ گئیں زویا؟'' انہوں نے اسے خود سے لپٹاتے ہوئے اور اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''تم بھول گئیں آنی نے گھر پر کیا سمجھایا تھا اگر تم روؤ گی تو وہ اور زیادہ پریشان ہو گی بیٹا، اس کی طبیعت خراب ہے۔ بہت زخمی ہے وہ، پھر جو کچھ اس پر بیتی ہے وہ بھی جانتی ہو تمہیں ہمت کرنا ہو گی، اس کے سامنے خود پر کنٹرول رکھنا ہو گا ڈاکٹر نے بہت شرائط کے ساتھ اس سے بات کرنے کی اجازت دی ہے۔ زیادہ اسٹریس اس کے لیے بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔ وہ دوبارہ کوما میں بھی جا سکتی ہے۔ اسے تو یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ عینی نہیں رہی ہے۔ سمجھیں نا تم...'' ان کی بات سن کر زویا نے سر ہلایا اور اپنے آنسو رگڑ کر صاف کیے۔

''گڈ گرل... چلو آؤ اندر... تمہاری موجودگی سے اسے ہمت ملے گی شاید وہ تمہیں آسانی سے سب کچھ بتا سکے۔''

زویا ان کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں داخل ہوئی۔ نتاشا نے اسے دیکھ کر بے ساختہ اٹھنے کی کوشش کی مگر ڈاکٹر اور اس کی امی نے اسے روک لیا۔

''نتاشا...'' زویا اس کی طرف بڑھی اور اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نتاشا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر زویا کے لیے بھی خود پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

''نتاشا... پلیز مت روؤ۔ مت ڈرو... یہاں دیکھو سب لوگ ہیں تمہارے گھر والے، میرے گھر والے، پولیس والے، ڈاکٹرز... اب تم بالکل محفوظ ہو، کوئی بھی تمہیں انگلی نہیں لگا سکتا۔ ٹھیک ہے نا۔'' وہ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

نتاشا کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی مگر آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

''آرام سے... خود پر زیادہ پریشر مت لو۔'' ڈاکٹر، نتاشا کے ساتھ لگی مشینوں پر نظر رکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں... گھبراؤ نہیں نتاشا... اگر اس وقت تم سے نہیں بولا جا رہا تو کوئی بات نہیں۔ ہم بعد میں بات کر لیں گے۔ مگر تم پریشان مت ہو۔'' زویا اسے دلاسا دیتے ہوئے بولی۔

نتاشا نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔

''زویا... زویا... عینی...'' وہ بمشکل بول پائی تھی۔

زویا ایک لمحے کو کچھ بول نہیں پائی پھر دھیرے سے بولی۔

''وہ بھی ٹھیک ہے۔''

''نہیں...'' نتاشا نے سر ہلانے کی ناکام کوشش کی، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''کیا کہہ رہی ہو تم...'' زویا بولی۔

''میرا خیال ہے کہ بہت ہو گیا ہے اب اسے آرام کرنے دیں۔'' ڈاکٹر بولا۔

''ڈاکٹر صاحب اب وہ بول پائی ہے ہو سکتا ہے کہ کچھ بتا پائے۔'' ڈی ایس پی نے کہا۔

''ہو سکتا ہے مگر یہ اس کی اپنی صحت کے لیے بہت خطرناک ہو سکتا ہے، اس کی حالت بگڑ سکتی ہے میں نے آپ کو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ تھوڑی سی بات کر سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے صرف ایک دو باتیں اور کرنے دیں۔''

''اوکے اگر مجھے لگا کہ معاملہ بڑھ رہا ہے تو آپ کو فوراً رکنا ہو گا۔''

''عینی نہیں ہے...'' نتاشا بمشکل بولی۔

''کیا کہہ رہی ہو... وہ بھی اسپتال میں ہے۔'' زویا اس سے نظر چرا کر بولی۔

''نہیں زویا... اس نے اسے مار ڈالا تھا تم جھوٹ بول رہی ہو... وہ مر گئی ہے۔'' اس کی سانس پھول رہی تھی اور سینے میں ہلکے ہلکے جھٹکے سے لگ رہے تھے۔

''تم کو کیسے پتا ہے؟'' ڈی ایس پی نے پوچھا۔ ''تم اس کو پہچان سکتی ہو؟ کیسا تھا وہ؟... نتاشا...''

نتاشا ان سوالوں کا جواب نہیں دے پائی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کھنڈا ہوا تھا۔ جیسے اسے وہ سب کچھ نظر آ رہا ہو۔ زویا کے ہاتھ پر اس کی گرفت سخت ہو گئی تھی۔

''تم نے اس کا چہرہ دیکھا تھا نا وہ کیسا نظر آتا تھا۔ اس نے یہ سب کیوں کیا؟ اس شام وہاں کیا ہوا تھا؟ بولو نتاشا... بیٹا ہمت کرو۔''

''اس نے... اس نے عینی کو مار ڈالا... وہ عینی کو بار

بار جو کرنے کو کہہ رہا تھا وہ منع کر رہی تھی۔'' وہ ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں بولی۔ ''اس نے مار ڈالا۔ وہ گری، ہر طرف خون ہی خون تھا۔''

''کیوں؟ کیوں کیا اس نے یہ سب؟ کس لیے... نتاشا یاد کرو... کیسا تھا وہ؟ تم جانتی ہو اس کو؟ پہلے بھی دیکھا تھا؟'' ایس پی نے نرمی سے پوچھا۔

''نہیں... نہیں جانتی... نہیں دیکھا تھا مگر بہت بہت بُرا تھا۔'' وہ اٹک اٹک کر بولی۔ ''عینی بہت چیخ رہی تھی میں کمرے سے بھاگی مگر وہ میرے پیچھے آیا۔ اس نے میرے سر پر کچھ مارا... میں گر گئی تھی۔ بہت درد تھا۔ بہت سخت درد... اب بھی ہو رہا ہے... وہ کراہی... میں... میں اس چوٹ سے زمین پر گری... میرا پیر... میرا پیر مڑ گیا تھا ہاتھ میں بھی چوٹ لگی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ عینی سے نمٹ کر آئے گا۔ پھر مجھے دیکھے گا۔ اور میرے سر پر پھر کچھ مارا تھا۔ وہ بہت غصے میں تھا۔''

''کیوں... وہ کیا کرنے کو کہہ رہا تھا۔ اسے کیا چاہیے تھا بولو نتاشا...'' ڈی ایس پی نے پوچھا۔

''بس آفیسر... اس سے زیادہ نہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''صرف ایک سوال... بولو نتاشا... ذہن پر زور دو، وہ کیا کرنے کو کہہ رہا تھا۔ اسے کیا چاہیے تھا؟ عینی نے کیا کرنے سے انکار کیا تھا؟ اسے کیا درکار تھا؟'' ڈی ایس پی کے مسلسل سوال نتاشا کو ہیجان میں مبتلا کر رہے تھے۔ اس کی سانسیں پھول رہی تھیں۔ آنکھیں خوف اور ذہنی دباؤ کی وجہ سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا، اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی پھر اپنا لرزتا ہوا چوٹوں سے بھرا ہاتھ ہلایا۔ اس کی انگلی کا رخ زویا کی طرف تھا۔

''وہ... وہ زویا کا پوچھ رہا تھا اور جب اسے معلوم ہوا کہ وہ تو چلی گئی ہے تو وہ غصے میں آ گیا۔ اس نے عینی کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ وہ رو رہی تھی۔ چیخ رہی تھی۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ زویا کے گھر فون کر کے اسے بہانے سے بلائے... عینی نے منع کر دیا۔ اس... اس نے کہا کہ وہ زویا کو مرنے نہیں دے گی۔'' نتاشا بے حال ہو گئی۔ اب اس سے بولا تک نہیں جا رہا تھا۔

''بس سب باہر چلیں۔'' ڈاکٹر نے تیزی سے آگے آتے ہوئے کہا۔

سب فوراً کھڑے ہو گئے مگر زویا، نتاشا کا ہاتھ تھامے وہیں بے حس و حرکت بیٹھی رہی تھی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ کس طرح آنی نے اس کے ہاتھ سے بے ہوش نتاشا کا ہاتھ الگ کیا اور اسے سہارا دے کر کمرے سے باہر لے آئیں۔

☆☆☆

''سب کچھ اب زیادہ الجھ گیا ہے۔'' ایس پی جعفر ساری بات سن کر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ڈی ایس پی باقر نتاشا کے کمرے سے نکل کر ان کو ایس پی جعفر کے کمرے میں لے گیا تھا۔ ایس پی اب خاصی بہتر حالت میں تھا۔ اس کی گردن پر بڑا بینڈیج موجود تھا زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے کمزوری چہرے پر عیاں تھی مگر وہ ذہنی طور پر بالکل مستعد تھا اور اس وقت اسپتال کے بیڈ کے سرہانے کو خاصا بلند کروا کر کھانے کی سلائیڈ میز کو ورکنگ ٹیبل بنا کر دفتر سجائے بیٹھا تھا۔

''اب تو منظر کچھ یوں بن رہا ہے کہ اس کا اصل ٹارگٹ شروع سے ہی زویا تھی اس کے لیے اس نے عینی کو پھانسا تھا۔ اس سے محبت کا تعلق جوڑا تھا مگر اس کا نشانہ زویا ہی تھی جب وہ وہاں پہنچا تو زویا کو نہ پا کر اس کا دماغ گھوم گیا۔ ان دونوں بچیوں کو بھی شاباش ہے کہ انہوں نے آخری دم تک دوستی نبھائی اور زویا کو فون نہیں کیا۔ اس نے نتاشا کو زخمی کر کے ڈالا۔ عینی کو ڈرایا، دھمکایا، تشدد کیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا۔ شاید وہ وہیں تھا جب زویا اور احمر وہاں پہنچے اور اسے بھاگنا پڑا۔ اگر یہ وہاں نہ پہنچتے تو وہ نتاشا کو بھی ختم کر کے وہاں سے نکلتا۔''

''جی ہاں سر، ایسا ہی ہوا ہے کیونکہ جب ہم پہنچے تو وہ وہیں تھا، ہم نے اس کے بھاگنے کی آواز سنی تھی۔ میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ میں نے زویا کو اکیلے نہیں جانے دیا آخری لمحے میں مجھے خیال آیا کہ اندر اندھیرا ہے... ورنہ نہ جانے کیا ہو گیا ہوتا۔'' احمر گویا لرز کر بولا۔

''سچ ہے جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ زویا کو شام تک وہیں رکنا تھا مگر ماں کی بیماری کی وجہ سے جلد نکل آئی۔ دوسری بار وہ ایک گھنٹے بعد ہی کتابیں لینے جا رہی تھی مگر اجازت نہ ملی اور تیسری بار جب وہ احمر کے ساتھ وہاں پہنچی اور احمر نے آخری لمحے میں اس کے ساتھ اندر جانے کا فیصلہ کیا۔ قدرت نے ہر قدم پر زویا کا ساتھ دیا۔'' ایس پی بولا۔ ''مگر ایسا ہمیشہ ہو، یہ بھی ضروری نہیں ہے اگر اس کا نشانہ زویا ہے تو وہ پیچھے نہیں ہٹے گا۔ اس طرح کے نفسیاتی مریض اپنے ٹارگٹ کو کبھی نہیں بھولتے اور اس کا صرف ایک ہی مطلب ہے وہ یہ کہ زویا شدید خطرے میں ہے۔ ہمیں

اپنے پلان پر دوبارہ نظرثانی کرنا ہوگی۔''
''ہمیں کیا کرنا ہوگا؟'' بابا سخت پریشان ہو گئے۔
''سب سے پہلے تو آپ یاد دیکھیے کہ ابھی یا پہلے کبھی کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے جس میں زویا بھی شامل رہی ہو۔ کوئی دشمنی یا کوئی ایسا شخص جس پر آپ کو شک ہو؟''
''نہیں مجھے تو ایسی کوئی بات یاد نہیں آرہی ایس پی...'' وہ پیشانی مسلتے ہوئے بولا۔ ''ہماری کوئی ایسی دشمنی نہیں ہے۔ سیدھی سادی زندگی ہے... پتا نہیں یہ کون ہے جو میری بچی کا دشمن بن گیا ہے۔''
''آپ زیادہ پریشان نہ ہوں، بس ہمیں بہت محتاط ہونا پڑے گا اور آپ اکیلے نہیں ہیں ہمارا ڈپارٹمنٹ آپ کے ساتھ ہے اگر آپ جائیں گے تو ہم آپ کے گھر پر سیکیورٹی بھی لگا دیں گے۔''
''مگر کب تک ایس پی؟ ابھی تو کچھ معلوم ہی نہیں ہے کہ وہ کون ہے کہاں سے حملہ آور ہوگا؟'' آنی بولیں۔
آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر یاد رکھیں کہ مجرم ہمیشہ کوئی نہ کوئی غلطی کرتا ہے اور آخرکار پکڑا جاتا ہے۔ یہی قدرت کا قانون ہے، ہمیں بھی جلد ہی کوئی سراغ ملے گا... بس ہمیں اتنا محتاط کہ وہ زویا تک نہ پہنچ پائے۔''
''آپ کچھ غلط کہہ گئے ہیں ایس پی صاحب'' زویا کی آواز نے ان سب کو چونکا دیا ''وہ مجھ تک پہنچ پائے یا نہیں... یہ تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی مگر میں اس تک پہنچ کر رہوں گی۔''
''پاگل ہو گئی ہو تم۔'' رخشندہ نے تڑپ کر بیٹی کو تھام لیا۔
''نہیں، مما! میں سچ کہہ رہی ہوں میں کسی حد تک اس تک پہنچ گئی ہوں۔''
اس کے اس انکشاف سے کمرے میں ایک لمحے کے لیے سکوت سا طاری ہو گیا۔

☆☆☆

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسی آئی ڈی سے تمہیں بھی پیغام بھیجے جا رہے ہیں جس سے عینی سے بات کی جا رہی تھی اور اس کا کور پکچر وہ ہی ماسک ہے جو میں نے تمہیں پہلے بتایا تھا؟''
ایس پی جعفر زویا کی پوری بات سن کر خوشی کے عالم میں بیڈ سے نیچے اتر آیا تھا۔
''یہ بہت بڑا سراغ ہے اور ہم اس کے ذریعے ہی اس تک پہنچ جائیں گے۔ باقر تم لیپ ٹاپ لاؤ زویا یہیں

مشکوک

پولیس نے ایک دیہاتی سے کہا۔ ''آپ کے اردگرد اگر کوئی مشکوک شخص رہتا ہے تو پولیس کو فوری اطلاع کریں۔''
دیہاتی نے جواب دیا۔ ''میرا پڑوسی وقت پر دفتر جاتا ہے۔ کام ایمانداری سے کرتا ہے۔ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں۔ رشوت نہیں لیتا۔ جھوٹ نہیں بولتا اور ٹریفک کے اصولوں کی پابندی کرتا ہے۔ اس کو چیک کریں...... وہ مجھے پاکستانی نہیں لگتا۔''

زاہد صادق... لاہور

اپنا اور عینی کا فیس بک پیج.... کھولے گی۔ میں وہ ماسک دیکھنا چاہتا ہوں اس کے علاوہ عینی کے ساتھ چیٹ اور زویا کے بکس میں موجود میسج اور یہ سب کے سب بہت اہم ہیں اور ہوسکتا ہے کہ اس فیس بک پیج سے اس کا آئی پی ایڈریس نکالا جاسکے ہم اس طرح اس تک پہنچ سکتے ہیں۔''
''آپ کا اگلا قدم کیا ہوگا؟ کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ میں زویا کو کسی اور شہر اپنے عزیزوں کے پاس بھیج دوں، جب خطرہ کم ہو جائے تو اسے واپس بلا لیا جائے'' بابا نے پوچھا۔
''نہیں۔'' زویا اور ایس پی ایک ساتھ بولے۔
''نہیں احمد صاحب، اس طرح آپ زویا کو مزید خطرے میں ڈال دیں گے۔ یہاں آپ اور ہم ہیں جو اس کی حفاظت کی کوشش کر رہے ہیں وہاں ایسی کوئی گارنٹی نہیں ہوگی اور یہ کوئی حل بھی نہیں ہے۔ اس کیس میں آسیب گھر میں نہیں ہے کہ گھر بدل لیا جائے۔ یہاں آسیب اس کے پیچھے ہے اور میں اپنا خدشہ ظاہر کر چکا ہوں، ہمارا سامنا ایک نفسیاتی مریض سے ہے۔ خطرہ صرف اس کی گرفتاری یا موت کی صورت میں ہی ٹل سکتا ہے۔''
''میں اور ہم بہت خوفزدہ ہیں ایس پی صاحب۔'' احمد صاحب ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''زویا کو ذرا بھی کچھ ہو یہ ہم تصور میں بھی نہیں سوچنا چاہتے۔''
''میں سمجھتا ہوں... میں خود دو بیٹوں کا باپ ہوں اور زویا میری تیسری بیٹی ہے، میں اس کے تحفظ کے لیے ہر حد تک جاؤں گا۔'' ایس پی نے جواب دیا ''میں یہ نہیں کہہ

سکتا کہ آپ بے فکر رہیں آپ کو بھی بہت محتاط رہنا ہوگا۔ لیکن ہمیں کچھ بھی کر کے اس درندے کو پکڑنا ہوگا ورنہ وہ مزید نہ جانے کتنی عینی اور نتاشا کی جانوں سے کھیل جائے گا اور احمد صاحب ہر بیٹی اپنے باپ کو اور خاندان کو اتنی ہی پیاری ہوتی ہوگی نا جتنی آپ کے لیے زویا ہے۔"

"جی بابا... اور آپ یقین کریں کہ میں بالکل خوفزدہ نہیں ہوں اب... ہاں مقروض ہوں عینی کے پیار کی... بابا اس نے اتنا کچھ سہا مگر مجھے فون نہیں کیا... وہ سمجھ چکی تھی کہ وہ اس صورت میں ہم تینوں کو ختم کرے گا... بابا ہمیں اسے پکڑنا ہوگا۔"

"شکریہ زویا میں تمہاری ہمت کے لیے تمہارا مشکور ہوں... اس راستے میں ہمیں اس کی سب سے زیادہ ضرورت پڑنے والی ہے۔"

LOVE TO KILL کی کور فوٹو دیکھ کر ایس پی کا چہرہ نفرت سے بھر گیا تھا۔

"یہ... یہ ہی ہے وہ ماسک جو اس نے پہن رکھا تھا۔ میں نے کہا تھا یا مجرم کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرتا ہے اور وہ ہی اس کے لیے کافی ہوتی ہے۔" زویا نے اپنی آئی ڈی کھولی تو میسج بکس میں اس کا ایک اور پیغام موجود تھا۔

"دوست بنانے کا شکریہ... مگر دوست ملتے بھی تو ہیں۔"

زویا نے ایس پی کی طرف دیکھا، اس نے سر ہلایا پھر ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا "تم اس کو میسج بھیجو زویا کہ تم اس سے ملنا چاہتی ہو۔"

"آپ کے ذہن میں کیا ہے؟" آنی نے پوچھا۔

"اس کا خاتمہ اور اس کے لیے ہمیں ہانکا لگانا پڑے گا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اور اس ہانکے میں آپ قربانی کا بکرا میری بیٹی کو بنائیں گے، میں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔" رخشندہ نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"زویا ہم سب کی بیٹی ہے مسز احمد اور یہ ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ زویا کے لیے ہی کر رہے ہیں۔ اگر آپ کے پاس اس سے بہتر یا قابلِ عمل پلان موجود ہے تو بتائیے۔" ایس پی نے ان کی طرف دیکھا۔

"مجھے یہ نہیں معلوم مگر اس سب میں بہت خطرہ ہو سکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے مما... مگر اس سب کے نتیجے میں سب کچھ ٹھیک بھی ہو سکتا ہے، وہ پکڑا جا سکتا ہے۔ عینی کے قاتل کو سزا مل سکتی ہے میرے اور نتاشا کے سر پر لٹکتی اس تلوار سے نمٹا جا سکتا ہے آپ سوچیے کیا میں ساری زندگی گھر کے اندر بیٹھی رہوں گی اور اس نے عینی کو تو اس کے اپنے گھر میں مار ڈالا تھا... مما مجھے کچھ نہیں ہوگا، ایس پی انکل صحیح کہہ رہے ہیں... یہ ہی میں نے بھی سوچا تھا۔" زویا ماں کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "اور مجھے یقین ہے کہ آپ سب کے ساتھ ہوتے، ایس پی انکل کے ہوتے ہوئے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

"جیتی رہو بیٹی۔" ایس پی نے کہا۔ "آپ سب ہم پر اعتماد کیجیے پلیز!"

"آپ کا پلان کیا ہے؟" احمد نے پوچھا۔

"زویا اسے ملنے کے لیے بلائے گی اور پھر ہم اسے پکڑ لیں گے... یہ دیکھنے میں خاصا آسان اور سادہ لگ رہا ہے مگر جس قدر وہ چالاک ہے اس حساب سے ہمیں بہت محتاط رہ کر سب کچھ کرنا ہوگا۔"

"میں اسے کل ہی ملنے کو کہوں؟" زویا نے پوچھا۔

"نہیں... اتنی تیز رفتاری اسے مشکوک کر دے گی تم صرف ملنے کے لیے رضامندی کا اظہار کرو گی۔ اس کے بعد وہ کیا کہتا ہے کتنی جلدی ملنا چاہتا ہے، یہ سب اس پر چھوڑ دینا۔ اس کے پہلے پلان پر ہم منع کریں گے تاکہ اسے بالکل شک نہ ہو اور پھر مان جائیں گے سمجھ گئی نا اور تم اس کو کوئی میسج مجھ سے بات کیے بغیر نہیں بھیجو گی... سمجھ گئی نا؟"

"جی..."

"ہمیں مجبوراً یہ سب کرنا پڑ رہا ہے مگر میں تمہیں ذرا سے خطرے میں بھی نہیں ڈالنا چاہتا۔"

زویا نے وہیں LOVE TO KILL کو ملنے کی بابت میسج بھیجا۔ انہوں نے چند لمحے اس کے جواب کا انتظار کیا جب کوئی جواب نہیں ملا تو وہ لاگ آف ہو گئی۔

اب اگلا میسج اس کے جواب آنے کے کم از کم دو گھنٹے بعد دینا ہے تاکہ اسے تم پر شک نہ ہو۔" ایس پی نے تاکید کرتے ہوئے کہا "میسج دیکھتے ہی تم مجھے بتاؤ گی۔"

"ٹھیک ہے ایس پی انکل... میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں... بس اسے پکڑا جانا چاہیے اسے نہایت سخت سزا ملنی چاہیے۔ شاید اس سے عینی کی روح کو سکون مل سکے۔"

شام تک اس کا کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ رخشندہ اسے لمحے بھر کو بھی تنہا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ وہ ان کے خوف کو سمجھ رہی تھی مگر عجیب بات یہ تھی کہ اب اسے ذرہ بھر بھی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ڈر کی جگہ ایک عجیب بلکہ الگ قسم کے

حوصلے نے لے لی تھی۔ اس کے ساتھ گہرا دکھ تھا۔ عینی نے اپنی جان دے کر بھی اس کی حفاظت کی تھی لاکھ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑے گا مگر وہ زویا کو بلانے کا وقت لے سکتی تھی مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے آخری پوسٹ کو سچ کر دکھایا تھا... توڑیں گے دم اگر تیرا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔'' اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

عینی میں وعدہ کرتی ہوں وہ مرے گا ضرور پکڑا جائے گا میں بھی اس دوستی کو کبھی نہیں توڑوں گی... وہ دل ہی دل میں بولی۔

رات وہ کافی جلد سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ پچھلی رات کی نیند اور سارے دن کے اعصاب شکن انتظار نے یوں بھی اسے تھکا ڈالا تھا۔ رخشندہ اس کے سونے تک وہیں بیٹھی رہی تھیں۔

صبح اس کی آنکھ کسی مسلسل آواز سے کھلی تھی۔ کہیں بہت دور کوئی بہت جانی پہچانی دھن بج رہی تھی پھر آہستہ آہستہ آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی وہ اپنے کمرے میں ہی تھی اسے اس دھن کو شناخت کرنے میں ایک لمحہ لگا تھا۔ موسیقی خوبصورت سروں میں ہیپی برتھ ڈے ٹو یو گنگنا رہی تھی۔ زویا نے سلیپرز میں پاؤں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلی... ان کا لاؤنج گھر کے درمیان... بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہاں دن میں بھی لائٹ جلانا پڑتی تھی۔ اس وقت لاؤنج کی لائٹ بند تھی شاید سب سو رہے ہیں۔'' اس نے سوچا اور آگے بڑھ کر سوئچ دبایا۔

کھٹ کی آواز کے ساتھ ہی کمرا روشنی اور آوازوں سے بھر گیا تھا۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو زویا۔ سالگرہ بہت مبارک۔'' بابا نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

لاؤنج کو بہت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ سامنے دیوار پر رنگ برنگے حروف میں اس کے نام کے ساتھ سالگرہ مبارک تحریر تھا۔ شاید اسی لیے رخشندہ اسے کمرے میں لے گئی تھیں۔ وہ مسکرائیں اور مما کے گلے لگ گئی۔

وہ خود اپنی سالگرہ کو بھول گئی تھی۔ ایک لمحے کو اس کا دل خوشی سے بھر گیا اسے اللہ نے ماں باپ، پیار کرنے والے بھائیوں کی شکل میں جو تحفہ دیا تھا وہ کیسے اس کا شکر ادا کر سکتی تھی؟ اس نے دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر ادا کیا۔

پھر اس کے سینے میں درد کی لہر سی اٹھی تھی۔ عینی اور

نتاشا ہمیشہ اس کی سالگرہ کی صبح اس کے گھر آتے تھے۔ اور وہ ان کے گھر جایا کرتی تھی۔ اب شاید کبھی بھی سب کچھ پہلے جیسا نہیں ہو سکتا، اور شاید یہ درد بھی ہمیشہ اسی طرح رہنے والا ہے، اس نے سوچا۔ دوپہر میں اس نے LOVE TO KILL کا پیغام دیکھا۔

"میں تم سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہو رہا ہوں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے ہمیشہ سے یہ ہی میری آرزو تھی۔ آج مل سکتی ہو؟ آج تو تمہاری سالگرہ بھی ہے نا؟ شام میں کہیں؟ جگہ طے کر لیتے ہیں تم صرف ہاں کہو۔"

زویا کے میسج کو دیکھتے ہی احمر نے ایس پی جعفر کا فون ملایا۔

"ہاں میں نے بھی ابھی یہ میسج دیکھا ہے۔" زویا کے "ایف بی کا پاس ورڈ وہ گزشتہ روز لے چکا تھا" وہ صرف ایک لمحے کو آن لائن ہوا تھا، یوں لگتا ہے کہ یہ پیغام ابھی اس نے پہلے لکھ لیا تھا بعد میں یہاں کاپی کیا ہے وہ میسج بھیجتے ہی آف لائن ہو گیا تھا وہ چیٹنگ کرنا نہیں چاہتا۔ وہ بہت چالاک انسان ہے، اسے خطرہ ہوگا کہ کہیں کوئی اس طرح اسے ٹریس نہ کر لے۔ میں نے اسی لیے اس کے پیغام کا جواب نہیں دیا کہ کہیں لفظوں، انداز یا کسی بھی اور چیز سے وہ مشکوک نہ ہو، تم خود اس کے میسج کا جواب دو گی۔"

"کیا جواب دوں؟" زویا نے پوچھا۔

"منع کر دو، لکھ دو کہ آج ممکن نہیں ہے۔ گھر والوں کا پروگرام ہے اور یہ بھی لکھو کہ تم نے ضد کر کے سالگرہ پر موبائل لیا ہے اور تم اسے کل اپنا نمبر دو گی اور کل ہی ملنے کا پروگرام بھی بتاؤ گی۔"

"ٹھیک ہے... مگر میرے پاس موبائل نہیں ہے۔" اس نے بتایا۔

"مل جائے گا، ابھی ہمارا ایک انسپکٹر ایک سم دے کر جائے گا، اسے تم کسی بھی موبائل میں لگا کر اپنے پاس رکھو گی۔ اس سے ہم اسے ٹریس کرنے کی کوشش کریں گے اور تم بھی ہمیں نظر آتی رہو گی۔"

"ٹھیک ہے۔" زویا بولی۔

"اور ہاں، سالگرہ مبارک، تمہارا تحفہ بھی ساتھ آ رہا ہے میں چاہوں گا کہ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا تم اسے ضرور استعمال کرو۔"

"کیا چیز ہے؟" زویا نے پوچھا۔ "اور آپ نے خوامخواہ کیوں تکلیف کی۔"

"تم کو میں نے بیٹی کہا ہے اس لیے یہ بات آئندہ مت کہنا اور یہ تحفہ بزرگ کی دعا ہے حفاظت کے لیے پہنے رکھنا۔" ان جملوں کے ساتھ فون بند ہو گیا تھا۔

"جعفر صاحب بہت اچھے انسان ہیں۔" بابا کے تبصرے کے بعد اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی تھی۔ اس دوران ہی سب کے سامنے زویا نے LOVE TO KILL کے پیغام کا جواب دے دیا تھا۔

دوسری طرف مکمل خاموشی تھی لہٰذا وہ لاگ آؤٹ ہو گئی تھی۔ اب اسے صرف انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

ایس پی جعفر کا تحفہ خوب صورت سلور ٹاپس تھے ان میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ زویا کو وہ دیکھتے ہی پسند آئے تھے اور رخشندہ نے اسی وقت اس کی بالیاں اتار کر انہیں اس کے کانوں میں پہنا دیا تھا۔ زویا نے انہیں حیرت سے دیکھا تھا۔ کیونکہ یہ بالیاں ان کی امی کا تحفہ تھیں اور وہ زویا کو انہیں اتارنے کی اجازت بہت مشکل سے دیتی تھیں۔

"جعفر بھائی نے کہا ہے کہ یہ حفاظت کے لیے ہیں۔ انہیں پہن لو زویا۔"

ماں کا دل عجیب ہوتا ہے بچے کی حفاظت کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اگر انہیں آج کوئی یہ کہتا کہ ان کی بیٹی کی حفاظت کے لیے انہیں کتنا ہی مشکل کام کرنا ہے تو وہ کر جاتیں یہ تو صرف اپنی من پسند بالیاں اتار کر ٹاپس پہنانا تھا۔

انسپکٹر کی لائی سم کو رخشندہ کے فون میں ڈال دیا گیا تھا اور ایس پی کے مشورے کے مطابق زویا نے اس کا نمبر بھی LOVE TO KILL کو میسج کر دیا تھا۔

☆☆☆

وہ پورا دن انتظار میں گزر گیا تھا۔ اگلی صبح فیس بک پر اس کا پیغام موصول ہوا تھا۔ جس میں اس نے زویا کو شام میں ساحلِ سمندر پر بنے ایک ریسٹورنٹ میں بلایا تھا۔

ایس پی کے کہنے کے مطابق زویا نے اس ملاقات کے لیے ہاں کر دی تھی۔

"مگر یہ اکیلے وہاں کیسے جائے گی؟" رخشندہ اس پلان کو ماننے کے لیے بمشکل راضی ہوئی تھیں مگر اس مدعے پر انہیں سخت اعتراض تھا۔ "ایک طرف تو ہمیں اتنا محتاط رہنا ہے کہ ہم اسکول بھی اکیلا نہ بھیجیں اور اب اسی سے ملنے اتنی دور اکیلا بھیجنا ہے؟"

"وہ صرف بظاہر اکیلی ہو گی، راستے میں اور ریسٹورنٹ میں بھی اس کے گرد ہمارے لوگ ہوں گے پھر

اس کا موبائل، اس کی سم ہمیں اس کی ہر حرکت کے بارے میں انفارمیشن دیتی رہے گی۔'' ایس پی جعفر نے بابا، احمر اور رخشندہ کو بمشکل سمجھایا۔

زویا بالکل خوف زدہ نہیں تھی، ایک تو اس نے ڈراموں وغیرہ میں اس ساری اسٹریٹجی کو کامیاب ہوتے دیکھا تھا دوسرے وہ اس شخص کو پکڑوانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔

ملاقات کے لیے شام ساڑھے چار بجے کا وقت طے ہوا تھا اور پروگرام کے مطابق زویا کو چار بجے گھر سے نکلنا تھا۔ اس نے ریسٹورنٹ تک رکشے کے ذریعے جانا تھا کیونکہ انہیں LOVE TO KILL کو یہی تاثر دینا تھا کہ وہ گھر والوں سے چھپ کر اس سے ملنے جارہی ہے۔

''ٹھیک ہے، اسے جانے دیں، پولیس یقیناً اردگرد ہوگی اور میں بھی موٹر سائکل پر تھوڑے فاصلے پر وہیں رہوں گا۔ پہلے رکشے کے ساتھ اور پھر ریسٹورنٹ میں۔'' احمر بولا۔

''مگر...'' ایس پی نے کچھ کہنا چاہا۔

''پلیز ایس پی صاحب، یہ بات آپ کا ماننا ہوگی۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''میں کوئی بے وقوف ہیرو نہیں ہوں جو بیچ میں کود جائے گا مگر مجھے میری بہن کے لیے اتنا کرنے دیجیے۔ میں ہیلمٹ پہن لوں گا اور یوں میرا پہچانا جانا بھی ناممکن ہوگا۔''

''ٹھیک ہے پر بہت محتاط رہنا ہوگا اسے شک نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ ساری محنت ضائع ہوجائے گی۔'' ایس پی نے بادلِ ناخواستہ اجازت دیتے ہوئے کہا۔

زویا پانچ میں پانچ کم پر ریسٹورنٹ پہنچ گئی تھی۔ وہ اسے نہیں جانتی تھی اس لیے سامنے موجود میز پر جا کر بیٹھ گئی۔ پروگرام کے مطابق اسے خود زویا سے رابطہ کرنا تھا۔ یہاں تنہا بیٹھ کر اسے تھوڑا عجیب لگ رہا تھا۔ اسے تو اس شخص کا نام تک معلوم نہیں تھا جس سے ملنے وہ یہاں تک آئی تھی۔

دس منٹ کے انتظار کے بعد اسے ایک شاندار شخصیت کا مالک شخص اپنی طرف آتا نظر آیا۔ وہ کہیں سے بھی قاتل نہیں لگ رہا تھا۔

''ایکسکیوزمی... آپ زویا احمد ہیں؟'' وہ اس کے قریب پہنچ کر معذرت خواہانہ انداز میں گویا ہوا۔

''جی... اور آپ...؟''

''میں وقاص کا دوست ہوں... جس کو آپ سے

یہاں ملنے آنا تھا۔ کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟'' اس نے شائستگی سے پوچھا۔

''جی ضرور۔'' تو اس کا نام وقاص ہے۔ اس نے سوچا۔ ''وہ خود نہیں آئے؟''

''نہیں، اس کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا ہے اسپتال میں ہے وہ...''

''اوہ... بہت افسوس ہوا۔'' زویا کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اب کیا کرے... سارے وقت کے ضائع ہونے کا افسوس الگ تھا اور اب پتا نہیں کب مل پاتا وہ؟

''جی... مگر وہ آج ہی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اسپتال میں تھوڑی بہت گفتگو تو ہو ہی سکتی ہے نا... اگر آپ کو ٹھیک لگے تو میں آپ کو اسپتال لیے چلتا ہوں۔''

زویا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، ایک لمحے وہ اس کو دیکھتی رہی۔

''شاید آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے کوئی بات نہیں، میں چلتا ہوں۔'' وہ کھڑا ہونے لگا۔

''نہیں یہ بات نہیں ہے۔'' وہ بالآخر بولی۔ ''میں چلتی ہوں آپ کے ساتھ۔'' اس نے لمحے بھر میں فیصلہ کر لیا تھا۔ پولیس اور بھائی سب تو اس کے ساتھ تھے ایسے میں یہ چانس لینا اسے ٹھیک لگ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر چلیں۔'' اس نے کہا۔

زویا بھی کھڑی ہو گئی۔ اس کے پیچھے چلتے اس کے ذہن میں ایک ہی خیال گونج رہا تھا۔ پولیس والے اور احمر اسے دیکھ رہے ہوں۔ ویسے تو وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے فون سے بھی اس پر نظر رکھی جا رہی ہے مگر پھر بھی اس کا دل ڈرم کی طرح بج رہا تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اسے اردگرد کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ 'شاید وہ فاصلے پر ہوں' اس نے سوچا اور گاڑی میں بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ کار اس کے بیٹھتے ہی چل پڑی تھی۔

☆☆☆

''یہ غلط ہوا ہے۔'' ایس پی جعفر نے اپنے ہاتھ پر دوسرے ہاتھ سے مکا مارتے ہوئے کہا۔ اس کی نظر سامنے موجود کمپیوٹر کی اسکرین پر جمی تھی۔ جہاں ایک ہرا نقطہ سفر کر رہا تھا یہ نقطہ درحقیقت زویا کا موبائل تھا جو ان کے سفر کی سمت اور پوزیشن بتا رہا تھا۔ ایس پی کے کان پر بلیوٹوتھ موجود تھا اور وہ مسلسل اس پر کسی کو ہدایات دے رہا تھا۔

''ٹھیک ہے اسے نظر سے اوجھل نہ ہونے دینا اور... احمر تم کہاں ہو؟ کیا وہ کار تمہاری نظر میں ہے؟ گڈ، مگر اس سے خاصے فاصلے پر رہنا، اس کو ہرگز شک نہیں ہونا چاہیے۔ زویا اس کار میں ہے اور اس لڑکے کے بارے میں ہمیں اب کچھ نہیں معلوم... بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ساری ٹیم بہت فاصلے سے پیچھے رہے گی۔ متبادل کے طور پر موبائل سے ٹریسنگ ہو رہی ہے کنٹرول روم آپ کے ساتھ ہے گا اور جہاں یہ رکیں گے لوکیشن بتا دی جائے گی۔ آپ سب نے وہاں پہنچنا ہے۔ فی الحال دور سے پیچھا کریں اگر ممکن ہو۔'' سب کو ہدایات دے کر اس نے گہری سانس لی۔

'یہ شخص بہت زیادہ چالاک ہے ضرورت سے زیادہ... سب کچھ کے باوجود اسے شک تھا اس لیے اس نے جگہ بدل دی۔ شکر ہے کہ انہوں نے پلان بی بھی موبائل کی صورت میں پہلے ہی شامل کر رکھا تھا ورنہ بہت مشکل پیش آتی۔ اس نے کان میں لگے بلیوٹوتھ کو آن کیا۔ اب وہ اس معاملے میں ذرا بھی غلطی یا کوتاہی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

''اسپتال کتنی دور ہے؟ ہم کافی آگے نہیں آ گئے؟'' زویا نے پوچھا۔

''ہاں، آ تو گئے ہیں مگر ابھی بھی حالات کنٹرول میں نہیں ہیں۔'' وہ شیشے میں دیکھ کر بولا۔

''کیا مطلب...'' زویا نے چونک کر پوچھا۔

''کچھ نہیں، اصل میں اسپتال میں وزیٹر کا وقت 6 بجے شروع ہو گا تو اسی لیے میں لمبا چکر لے کر جا رہا ہوں وہیں یاد آ جاتا تو کچھ دیر وہیں بیٹھ جاتے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

زویا پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔ اس کا دل بہت بے چین ہو رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس سے بڑی غلطی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''وہ گاڑی ڈیفنس بلاک 8 سے گزر کر آگے بنی کچی سڑک کے درمیان.... رک گئی ہے۔'' کنٹرول روم کا یہ میسج پولیس ٹیم کی دونوں گاڑیں اور احمر کے کانوں تک ایک ساتھ پہنچا تھا۔ وہ سب تیزی سے اسی طرف چل پڑے۔

سڑک خاصی ویران تھی اس جگہ پر رکنے کا سگنل خطرے سے کم نہیں تھا۔ ڈی ایس پی باقر اس ٹیم کے ساتھ موجود تھا اور تیزی سے اس طرف جا رہا تھا۔ چند لمحوں میں انہیں اپنے پیچھے سیاہ ہیلمٹ میں موٹر سائیکل سوار بھی نظر آنے لگا تھا، اس کا مطلب تھا کہ احمر بھی وہاں پہنچ گیا ہے۔

''ہیلو... ہم عین اس سڑک تک پہنچ گئے ہیں مگر یہاں کوئی کار نہیں ہے۔'' وہ مذکورہ سڑک پر پہنچ کر رک گئے تھے۔

''مگر وہ یہیں پر موجود ہیں یہیں اسی جگہ پر نشاندہی مل رہی ہے۔'' اسے حتمی جواب ملا تھا۔

ڈی ایس پی باقر گاڑی سے باہر نکل آیا۔ وہاں دور دور تک کوئی بھی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں کسی گاڑی یا شخص کے چھپنے کا امکان ہو۔ اس کے باہر نکلتے ہی احمر بھی اس کے قریب آگیا۔

''ڈی ایس پی صاحب یہاں تو کار کا کچھ پتا نہیں ہے۔'' وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا۔

''میں بھی یہی دیکھ رہا ہوں، کنٹرول روم سے یہی بتایا جا رہا ہے کہ اسی سڑک پر نشاندہی ہے۔'' وہ بولا اور آگے کی طرف چل دیا۔

سڑک پر خالی الذہنی کی کیفیت میں آگے بڑھتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگی تھیں۔

وہ ہو گیا تھا جس کا خدشہ ہوتے ہوئے بھی وہ سب بہت پُرامید تھے۔ احمر اس کے ساتھ ہی تھا۔ ڈی ایس پی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ بھی گھبرا گیا۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں اس نے بھی سامنے کی طرف دیکھا۔

جو منظر وہاں نظر آیا، اس نے اس کو بھی ساکت سا کر دیا تھا اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا سا محسوس ہوا۔ سڑک کے عین درمیان زویا کو دیا گیا موبائل پڑا تھا۔

☆☆☆

''تت تم کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ کیوں پھینک دیا میرا موبائل؟'' وہ بہت خوف زدہ تھی۔

''اس لیے کہ مجھے تم سے اب جو باتیں کرنی ہیں، وہ صرف میرے اور تمہارے درمیان رہنی ہیں... اور ہو سکتا ہے کہ یہ موبائل اسے کسی اور تک پہنچا دیتا۔'' وہ مسکرایا۔ ''پھر اب تم مجھ تک آچکی ہو اب تمہیں کس سے رابطہ کرنا ہے؟ لہٰذا موبائل بیکار تھا.. اس لیے پھینک دیا۔''

''مگر... ہمیں تو اسپتال جانا تھا نا؟'' وہ بمشکل بولی۔

''ہاں... مگر کیوں جانا تھا؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''وہ... LOEV TO KILL میرا مطلب ہے وقاص سے ملنے...'' وہ ہکلائی۔

''تو مل لو نا... میں ہی ہوں وقاص اور LOVE TO KILL'' وہ ہنسا۔

''تم...؟'' زویا بھونچکا سی رہ گئی۔

''ہاں... میں ہی ہوں وہ زویا... جس سے ملنا تھا تم کو... اور جس کو ملنا تھا تم سے۔''

''تو پھر یہ ساری کہانی؟ وہ سب کیوں کیا تھا؟''

''وہ سب ضروری تھا، مجھے صرف تمہیں اپنے ساتھ لے کر جانا تھا اس لیے۔''

''مطلب؟''

''مطلب ہو سکتا ہے کہ تم اکیلی نہ ہوتیں۔ تمہارے آگے پیچھے پولیس یا کوئی ساتھ آتا... ویسے ایسا لگا نہیں... مگر ناممکن تو نہیں تھا نا۔''

''کیوں؟'' کیا کیا ہے ایسا تم نے؟'' زویا نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''غلط کچھ نہیں کیا مگر لوگوں کو غلط یا صحیح کا فرق ہی تو نہیں معلوم۔''

''اور تمہیں معلوم ہے؟'' زویا نے بے اختیار پوچھا۔

''ہاں مجھے معلوم ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔ ''اسی لیے میں نے غلط کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''تم... تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' زویا خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تم کو میں یاد ہوں؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

''نہیں۔'' زویا بے ساختہ بولی۔

''مجھے یقین تھا مگر میں تمہیں جانتا ہوں اور کافی وقت سے تم سے ملنا چاہتا تھا۔''

''کیسے جانتے ہو تم مجھے؟'' زویا واقعی حیران رہ گئی۔

''یہ سال بھر پرانی بات ہے زویا، تم سب اپنے اسکول کے ساتھ پکنک پر گئے تھے۔ یاد آیا... وہاں میں بھی تھا... تم مجھے اچھی لگی تھیں اس کے بعد میں تمہارے پیچھے چلتا رہا تھا... تم نے مجھے ڈانٹا تھا اور پھر اپنی ٹیچر سے شکایت کر دی تھی... یاد آیا تم کو؟''

زویا کو واقعی وہ سب یاد آگیا تھا۔ وہ سچ کہہ رہا تھا مگر اسے اس کی شکل یاد نہیں تھی۔

''تم تو شکایت کر کے چلی گئیں، تمہاری ٹیچر نے مجھے بہت ذلیل کیا۔ وہاں موجود لوگوں سے ذلیل کروایا۔ پولیس کے حوالے کرنے کی کوشش بھی کی... جانتی ہو؟'' وہ مسکرا کر بولا۔

''نہیں مجھے یہ سب نہیں معلوم... مگر کیا صرف اس بات پر میرے پیچھے لگ گئے تم نے صنی سے دوستی کی، اسے مار ڈالا... نتاشا کو اس طرح زخمی کیا۔ صرف اس بات

پر...؟'' زویا جذباتی ہو کر بولتی چلی گئی۔
''دیکھا ٹھیک تھا نا میرا اشک، تم میرا اشکار کرنے آئی تھیں... ہے نا... پولیس کو پیچھے لگا کر لائی ہوگی مگر تمہیں اندازہ نہیں ہوگا کہ یہ لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ نہ میرا پیچھا کر سکتے ہیں اور نہ مجھے پکڑ سکتے ہیں۔ جینئس ہوں میں... جینئس۔'' وہ ہنس کر بولا۔
زویا ساکت سی بیٹھی رہی۔ اس سے غلطی ہو چکی تھی۔
''نہیں میں نے اس بات پر یہ سب نہیں کیا، اس بات پر میں صرف تمہارا پیچھا کر رہا تھا۔ کیونکہ تم مجھے اچھی لگی تھیں۔ ان سب لڑکیوں سے... جنہیں جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' آخری جملے تک پہنچتے پہنچتے اس کا لہجہ زہریلا ہو گیا تھا۔
''تم نے عینی کو کیوں مارا؟'' زویا بول اٹھی۔
''کیونکہ وہ بھی ایسی ہی تھی۔ ان ہی لڑکیوں میں شامل، غلط... تم خود بتاؤ... ان جیسی بے حیا لڑکیوں کو جینے کا حق ہے۔''
''تم یہ فیصلہ کرنے والے کون ہو؟ اور عینی ایسی بالکل نہیں تھی؟'' وہ چلائی۔
''ایسی ہی تھی وہ... صرف دو دن لگے تھے مجھے اس کو اپنے چکر میں لانے کے لیے۔'' وہ نفرت سے بولا۔ ''اور وہ بھی پہلی نہیں تھی اس سے پہلے میں لاہور میں ایسی ہی دو لڑکیوں کو ٹریفک کے حادثے میں جہنم میں پہنچا چکا ہوں۔ اس عینی کی تو غلطی بھی ڈبل تھی اسی لیے ڈبل ٹربل ہوئی اسے۔'' وہ مسکرایا جیسے وہ سب یاد کر کے لطف اٹھا رہا ہو۔ ''میں نے اس سے کئی بار کہا کہ وہ تمہیں فون کرے مگر وہ انکار کرتی رہی اور جب ہتھوڑا اس کے سر پر پڑا اور اس کا سرخ سرخ خون بہتا نظر آیا تو یقین جانو بہت لطف آیا مجھے۔''
''تم پاگل ہو، ذہنی مریض ہو... دوسروں کو تکلیف پہنچا کر تمہیں مزہ آتا ہے... میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔'' زویا نے اس کا گلا پکڑ لیا تھا۔
اس اچانک حملے سے وہ گڑبڑا سا گیا تھا نتیجے میں گاڑی لہرا کر سڑک سے اتر گئی تھی۔ اس نے بمشکل اسے سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے زویا کا ہاتھ موڑ کر اسے سیٹ پر دھکا دے دیا۔
''میں نہیں چھوڑوں گی تمہیں قاتل...'' زویا نے اس کے ہاتھ کو دانتوں سے جکڑ لیا۔
''تم شاید اتنی دیر بھی زندہ نہیں رہنا چاہتیں جتنی مہلت میں تمہیں دے رہا ہوں۔'' وہ اس کے منہ پر تھپڑ مار کر اسے دھکیلتا ہوا بولا۔
زویا کا سر دروازے سے ٹکرایا تھا۔ چہرے پر پڑنے والے زوردار تھپڑ نے اس کے حواس گم کر دیے تھے۔
وقاص نے اتنی دیر میں گاڑی ایک طرف روک لی تھی۔
''میں نے تمہیں ان سب سے الگ سمجھا تھا اس لیے میں نے تمہارا پیچھا کیا۔ عینی سے بھی اس لیے دوستی کی کیونکہ تم سے رابطہ ناممکن تھا۔ وہ میرے پیچھے پڑ گئی تو مجھے غلط کو ختم کرنا پڑا۔ ادھورا کام مجھے سخت ناپسند ہے۔ نتاشا کو میں ختم نہیں کر سکا اور اس کو ختم کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ اس نے میرا چہرہ دیکھ لیا ہے۔''
''میں نے بھی تو اب تمہارا چہرہ دیکھ لیا ہے۔'' زویا دھیرے سے بولی۔
''ہاں، تم نے بھی دیکھ لیا ہے... موت کا چہرہ دیکھنے والے واپس نہیں آتے... معلوم ہے نا تم کو...؟'' وہ ہذیانی ہنسی ہنس کر بولا۔ ''تم بھی ان سب ہی جیسی ہو جھوٹی، مکار اور دغاباز، تم نے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کی، تمہیں اس کی سزا تو ملے گی ہی... تم سے نمٹ کر میں اس نتاشا کا کام بھی تمام کروں گا۔''
''پولیس تمہیں پکڑ لے گی تم بچ نہیں سکو گے۔'' زویا بولی۔
''کیسے... ان کی ساری بھاگ دوڑ تمہارے اردگرد تھی نا... اور اب وہ تمہیں بھی کھو چکے ہیں۔ کیسے پکڑیں گے وہ مجھے؟''
زویا خاموشی سے اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔
''نہیں ہے نا جواب... کیونکہ نہیں پکڑ سکتے۔'' وہ مزے سے بولا۔ ''چلو اب باہر آ جاؤ۔''
''مجھے نہیں اترنا۔'' خوف اس کے رگ و پے میں اتر چکا تھا۔ وہ کہہ تو بالکل سچ رہا تھا۔ پولیس اور احمر سب اسے کھو چکے تھے۔ موبائل وہ بہت دور پیچھے کہیں پھینک چکا تھا اور اب اس ویرانے میں اس نیم پاگل شخص کے ساتھ وہ اکیلی تھی جو اسے مار دینے کے لیے یہاں لایا تھا۔
''اترنا تو تمہیں پڑے گا۔'' وہ گھوم کر اس کی جانب والا دروازہ کھولتا ہوا بولا۔
''تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟''
''کیونکہ یہ میرا کام ہے، تم جانتی ہو کہ ایسی ہی ایک لڑکی کی وجہ سے میرا پورا خاندان تباہ ہو گیا... بہت پیار کیا تھا میں نے اسے اور اس نے مجھے دھوکا دیا... مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ دکھ اور بدنامی نے میرے ماں باپ کی جان لے لی، باقی بچا میں تو میں نے تب ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میری جنگ غلط کے خلاف ہے۔ عورتیں غلط ہوتی ہیں، دھوکا دیتی

ہیں، بے وقوف بناتی ہیں جیسے تم نے بنایا۔'' وہ اسے گھسیٹ کر کار سے نکالتا ہوا بولا۔

''سب... سب ایسا نہیں کرتے۔ میری تو مجبوری تھی۔ عینی نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا، وہ شاید تم سے پیار کرنے لگی تھی۔''

''بکواس مت کرو۔'' وہ اسے زمین پر پٹختے ہوئے بولا۔

''نہیں تم غلط کر رہے ہو، تم خود غلط ہو، سراسر غلط۔''

وہ یہ کہتے ہوئے زمین پر آگے کو سرکی اور کھڑی ہو کر تیزی سے سامنے کی جانب دوڑی، وہ بھی گالی دے کر اس کے پیچھے لپکا تھا۔ زویا جان لگا کر بھاگ رہی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟ وہ تو اب یہ بھی کچھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کہاں ہے بس وہ دوڑے جا رہی تھی۔ اچانک اس کا پیر ابھری ہوئی زمین پر اور پھر کسی پتھر پر پڑا وہ زور سے زمین پر گری۔ اس سے قبل کہ وہ اٹھ پاتی وہ اس کے سر پر آپہنچا تھا۔

''کیا سمجھ رہی تھیں تم؟'' وہ اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''بچ جاؤ گی اس طرح بھاگ کر... نہیں بچ سکتیں میں LOVE TO KILL ہوں، یہی میرا شوق ہے اور یہی میرا کام... میں تمہیں ختم کر کے چھوڑوں گا۔ مجھے ادھورے کام سے نفرت ہے۔'' وہ اسے گھسیٹتا ہوا گاڑی کے پاس لایا اور اندر سے رسی نکال کر اس کے پیر باندھ دیے۔ زویا کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ ایک تو گرنے کی وجہ سے اسے سخت چوٹ لگی تھی پھر وقاص کے تھپڑ اور گھسیٹ کر اتنی دور لانے کی وجہ سے اس کی آواز تک نہیں نکل پا رہی تھی۔ وہ زمین پر بندھی پڑی تھی اور بے بسی سے وقاص کو گاڑی کی ڈکی سے ہتھوڑا نکالتے دیکھ رہی تھی۔

وقاص ہتھوڑا لے کر اس کی طرف مڑا، اس کی کی آنکھیں وحشت سے بھری ہوئی تھیں وہ اس وقت اتنا خوفناک لگ رہا تھا کہ زویا نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں پھر اگلے لمحے ہی وہ چونکی اور زور سے چلائی۔

''کوئی مدد کرے میری... یہ مجھے مار ڈالے گا... پلیز میری مدد کرو۔''

''کوئی نہیں کرے گا مدد... سوائے میرے۔'' وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ''بہت درد ہو رہا ہے نا...؟ بس تھوڑا سا اور ہو گا پھر تمہیں کچھ پتا نہیں چلے گا۔'' وہ سفاکی سے ہنسا۔ ''سچ پوچھو تو تمہیں مار کر زیادہ اچھا نہیں لگے گا مجھے... مگر کیا کروں تم نے مجبور کر دیا۔ دھوکا دے کر یہاں تک آ گئیں۔ جھوٹ بولے، اب مرنا ہی پڑے گا تمہیں...'' وہ ہتھوڑے کو دونوں ہاتھوں سے بلند کرتے ہوئے بولا۔

زویا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ موت اس کی آنکھوں کے عین سامنے تھی شاید ایک یا دو لمحوں کے فاصلے پر...

اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ لرز رہی تھی۔ اسے مما، بابا، احمر اور سب کے چہرے نظر آ رہے تھے۔ سب کچھ غلط ہو گیا تھا۔ اس نے ہتھوڑے کو نیچے آتا دیکھا... اور کلمہ پڑھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ لمحہ بھر میں اسے ہلکے سے دھماکے اور ہتھوڑا گرنے کی آواز سنائی دی۔

اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ وقاص اس کے سامنے اسی طرح کھڑا تھا سر سے بلند ہوتا ہوا ہتھوڑا اس سے ذرا فاصلے پر پڑا تھا۔

وقاص کی آنکھیں قدرے پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر بے یقینی، دہشت اور تکلیف کے تاثرات نمایاں تھے۔

زویا کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

وقاص چند لمحے یونہی کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر گھٹنوں کے بل گرا اور اس کے پیروں میں ڈھیر ہو گیا۔ زویا خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے اوپر دیکھا۔

سامنے ایس پی جعفر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ریوالور تھا جس میں سے دھوئیں کی ہلکی سی لکیر نکل رہی تھی، وہ تیزی سے اس کی جانب لپکا، اس کے ساتھ دو پولیس والے تھے۔ جنہوں نے لمحہ بھر میں زویا کے پیر ہاتھ کھول کر اسے کھڑا کر دیا۔

''شکر ہے آپ آ گئے۔'' زویا بمشکل بولی۔

''آپ کو کیسے پتا چلا... اس نے تو موبائل بھی پھینک دیا تھا۔''

''ہاں، میں نے کہا تھا نا کہ ہر پلان کا پلان بی ہوتا ہے۔ میرا پلان بی یہی تھا کہ میں مسلسل تمہارے ساتھ رہوں۔'' ایس پی اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''کیسے...؟'' زویا نے حیرت سے پوچھا۔

''ایسے...؟'' اس نے مسکرا کر زویا کے کان کو پکڑتے ہوئے کہا۔ ''ان بُندوں میں مائیکرو فون فٹ ہے زویا جس سے میں تم دونوں کی ہر بات سن پا رہا تھا اور اس میں جی پی ایس بھی موجود ہے یوں میں تم تک پہنچ گیا۔''

زویا جواباً ہولے سے مسکرائی... اس بار اس کی مسکراہٹ میں زندگی تھی۔

اشارہ

کاشف زبیر

وقت کی بساط پر بعض لوگ اپنے آپ کو سب سے بڑا کھلاڑی سمجھتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ جب بازی پلٹتی ہے تو پھر ہر چال مات کی طرف لے جاتی ہے... دولت و انمول خزانوں پر فخر و غرور کے ساتھ بیٹھے ایسے ہی شاطر کا عیارانہ کھیل... اس کا ہر داؤ ٹھیک نشانے پر بیٹھتا تھا... کامرانیوں اور کامیابیوں نے اسے خودسر اور ہٹ دھرم بنا دیا تھا... اس نے باریک بینی اور مشاہدات و تجربات کا نچوڑ اپنے اس آخری مقصد میں سمو دیا تھا... لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ دولت و اقتدار کا نشہ دراصل ایک ایسا غیرمرئی رشتہ ہے جو دوسرے افراد کے خیالوں اور خواہشوں کو اس کی اپنی خواہشات اور سوچوں سے مربوط کردیتا ہے...

آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرتا سفرنا تمام، سرورق کی پُراثر کہانی

ستاون سالہ شفیع اللہ شیخ سفید ترشی ہوئی داڑھی اور سلیقے سے بنے ہوئے بالوں کے ساتھ ایک متین اور جاذبِ نظر شخصیت کا مالک تھا۔ آنکھوں پر ریم لیس عینک تھی۔ متوسط قد و قامت تھی۔ وہ اس وقت گہرے تھری پیس سوٹ میں اپنے خاندان کے ہمراہ ناشتے کی میز پر تھا۔ مہاگنی سے بنی اس بڑی میز کے گرد کم سے کم پچاس افراد کی گنجائش تھی اور اس پر درجنوں ڈشیں رکھی جاسکتی تھیں مگر فی الحال وہاں صرف آٹھ افراد تھے۔ شفیع، اس کے دو بیٹے احمر اور ظفر، ان کی بیویاں شرمین اور سونیا، شفیع کی بیٹیاں مونا اور رینا، آٹھواں فرد مونا کا شوہر باسط احمد تھا۔ باسط کا خاندان دوسرے شہر میں آباد تھا مگر مونا سے شادی کے بعد وہ اس شہر میں شفٹ ہوگیا تھا اور شفیع پیلس میں ہی رہتا تھا۔ تقریباً ڈھائی ہزار گز پر بنا ہوا یہ پیلس تین عمارتوں پر مشتمل تھا۔ مرکزی پیلس جو رہائش کے لیے مخصوص تھا۔ اس کے ساتھ ہی گیسٹ ہاؤس کی عمارت تھی اور ایک طرف تقریبات کے لیے مخصوص پارٹی ہاؤس تھا۔

وہ آٹھوں شفیع اللہ کے خاندان کے افراد ہی نہیں بلکہ اس کی بہت بڑی بزنس ایمپائر کے شراکت دار بھی تھے۔ ایس ایس گروپ کے متعدد کاروبار تھے۔ سیمنٹ اور اسٹیل ملز تھیں۔ ٹیکسٹائل کا بزنس بھی تھا۔ ہوٹلوں کی ایک چین تھی۔ سب سے نیا بزنس ہوٹل کا تھا مگر مختصر عرصے میں اس نے بھی خاصی ترقی کی تھی اور ملک میں اس چین کے چھ ہوٹل کھل چکے تھے۔ ساتویں ہوٹل کا آج کے دن افتتاح تھا جو دارالحکومت میں ایک پوش علاقے میں تعمیر ہوا تھا۔ کسی بزنس میں یہ سرمایہ اربوں سے کم نہیں تھا۔ لیکن ایس ایس گروپ کا اصل بزنس بینکنگ اور اسٹاک تھے۔ شفیع نے آغاز ان ہی شعبوں سے کیا تھا۔ اس کا باپ شاہد احمد شیخ ایک اسٹاک بروکر تھا۔ اس کے مرنے کے بعد شفیع نے بٹوارے میں اس کی فرم مانگی تھی جو اس کے بہن بھائیوں نے بہ خوشی اس کے حوالے کردی تھی۔

بہ ظاہر یہ ایک غلط فیصلہ تھا کیونکہ شفیع کے حصے میں اصل مالیت سے کم وراثت آئی تھی مگر چند سال بعد اس کے

بہن بھائی اس پر رشک اور حسد کرنے لگے تھے۔ اسٹاک مارکیٹ میں ایس ایس بروکر کا ایک نام تھا اور جلد شفیع نے اس نیک نامی میں اضافہ کیا۔ لوگ آنکھ بند کر کے اس پر بھروسا کرتے تھے اور اپنا سرمایہ اس کے حوالے کرتے تھے۔ ایمان داری اس ملک میں ایک برائی ہی سہی لیکن اس کے قدردانوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ اس لیے جب اس نے اپنا بینک کھولا تو بغیر کسی کوشش کے اسے اکاؤنٹس ملنے لگے اور ایک سال میں بینک کے ابتدائی سرمائے سے چار گنا زیادہ رقم ڈیپازٹس میں آچکی تھی۔ اب ایس ایس بینک ایک نام بن گیا تھا جو اپنے کاروباری مفاد کے ساتھ ساتھ اپنے گاہکوں کے مفاد کا خیال بھی رکھتا تھا۔

شفیع اللہ نے ملک کو زرمبادلہ میں خود کفیل کرنے کے لیے ایک اسکیم تیار کی اور بہت جلد اس میں بھی کامیاب رہا۔ اس کی اسکیم کے ذریعے زرمبادلہ کی صورت میں خطیر سرمایہ پاکستان آنے لگا۔

شفیع اللہ نے بینک کے بعد دوسرے کاروباروں کی طرف بھی توجہ دی۔ اس کے پاس اضافی سرمایہ تھا اور وہ اسے یوں استعمال کرنا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ دوسروں کو بھی فائدہ ہو۔ اس کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ نئے کاروبار قائم کیے جائیں۔ شروع میں وہ اکیلا تھا پھر اس کے بیٹے شامل ہو گئے۔ بیٹیاں بڑی ہوئیں اور انہوں نے تعلیم مکمل کی تو وہ بھی بزنس میں شامل ہو گئیں۔ شفیع اللہ نے دوسرے کاروبار ان میں بانٹ دیے تھے مگر بینک اور اسٹاک فرم اپنے ہاتھ میں رکھی تھی۔ احمر اور ظفر اسٹیل، سیمنٹ اور ٹیکسٹائل دیکھتے تھے جبکہ مونا اور اس کا شوہر باسط چین ہوٹل بزنس کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ رینا ابھی پڑھ رہی تھی اور اس کا ایم بی اے کا آخری سمسٹر شروع ہونے والا تھا۔

دانیال اس کا یونیورسٹی فیلو اور منگیتر تھا۔ یہ رشتہ ان کی پسند سے ہوا تھا۔ دانیال کا تعلق ایک تاجر گھرانے سے تھا۔ یہ لوگ شفیع اللہ کی طرح امیر نہیں تھے مگر شریف اور تہذیب یافتہ لوگ تھے اس لیے بیگم و شفیع اللہ نے بہ خوشی یہ رشتہ منظور کر لیا تھا۔ ظفر، احمر اور باسط اس رشتے کے حامی نہیں تھے۔ ان کے خیال میں دانیال اور اس کا خاندان اس معیار کا نہیں تھا۔ مگر شفیع اللہ نے ان کی مخالفت کی پروا نہیں کی تھی۔ رینا اور دانیال کے لیے اس کا ارادہ تھا کہ وہ انہیں آئی ٹی بزنس میں اپنی صلاحیتیں آزمانے کا موقع دے گا۔ اس مقصد کے تحت اس نے ایک آئی ٹی فرم قائم کر لی تھی اور اس نے ابتدائی طور پر کام کا آغاز بھی کر دیا تھا۔ دانیال سوفٹ ویئر انجینئرنگ کر رہا تھا۔ یہ اس کا آخری سال تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ایک سال کے لیے وہ امریکا جا کر اپنے شعبے میں مزید تعلیم حاصل کرے گا اور اس کے بعد ہی عملی میدان میں قدم رکھے گا۔

شفیع اللہ کی شادی اس وقت ہو گئی تھی جب وہ بائیس سال کا تھا۔ اس نے ابھی ایم کام مکمل کیا تھا اور کامرس کے شعبے میں پیشہ ور کورس کرنے لندن جا رہا تھا۔ اس کے باپ

نے جانے سے پہلے اس کی شادی کر دینا مناسب سمجھا تھا۔ شفیع اللہ کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کی بیوی سعدیہ سیدھی سادی، گھر و شوہر میں خوش رہنے والی عورت تھی۔ وہ اس وقت بھی ویسی ہی رہی جب شفیع اللہ اپر کلاس سے اٹھ کر اعلیٰ طبقے تک پہنچ گیا۔ یہ وہ کلاس ہے جہاں آ کر انسانی قدریں، سوچیں اور معیار بدل جاتے ہیں۔ جہاں انسان اپنے مذہب، تہذیب اور ثقافت سے برائے نام ہی متعلق رہ جاتا ہے۔ لیکن شفیع اللہ کے گھر کا ماحول تبدیل نہیں ہوا تھا کیونکہ سعدیہ نے اسے بدلنے سے انکار کر دیا تھا۔

شفیع اللہ نے بیوی کی رائے کا احترام کیا۔ وہ خود بھی اقدار پسند آدمی تھا مگر اسے زمانے کے ساتھ چلنا پڑتا تھا۔ گھر کے حوالے سے مشکل پیش آئی تو اس نے گھر اور اپنی کاروباری زندگی دونوں کو الگ کر دیا۔ اس نے کبھی گھر میں پارٹی نہیں دی۔ کسی ایسے فرد کو گھر مدعو نہیں کیا جس سے اس کا صرف کاروباری تعلق ہو۔ وہ جن پارٹیوں اور محفلوں میں جاتا تھا، سعدیہ نے ایک دو بار کے بعد وہاں جانے سے انکار کر دیا تو شفیع اللہ نے اسے مجبور نہیں کیا۔ سعدیہ نے خود کو گھر اور خاندان والوں تک محدود کر لیا تھا۔ اس کی ساری توجہ اپنے چار بچوں کی پرورش پر تھی اور نصف درجن نوکروں کے ہوتے ہوئے بھی وہ ان کے سارے کام خود کرتی تھی۔ شفیع اللہ بیٹوں کو بورڈنگ میں بھیجنا چاہتا تھا مگر سعدیہ نے اجازت نہیں دی۔ احمر اور ظفر نے اپنے شہر کے اعلیٰ ترین اسکول میں تعلیم حاصل کی۔

اسکول کی تعلیم کے ساتھ ہی وہ گھر میں آنے والے ایک استاد سے دین کی تعلیم بھی حاصل کرتے تھے اور ان کی تربیت ان کی ماں نے کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جوانی میں بھی ان مشاغل میں نہیں پڑے جو ان کی کلاس کے نوجوانوں میں عام تھے اور جب وہ عملی زندگی میں آئے تب بھی انہوں نے اپنا کردار مضبوط رکھا تھا۔ سعدیہ نے ان کی تعلیم مکمل ہوتے ہی ان کی شادیاں کر دیں۔ اسی طرح مونا کی جیسے ہی تعلیم مکمل ہوئی اس کی شادی بھی کر دی گئی۔ سعدیہ کے نزدیک بچوں کو خرابی سے بچانے کا یہ سب سے موثر طریقہ تھا۔ رینا کا رشتہ بھی سعدیہ نے اپنی زندگی میں طے کر دیا تھا۔ اسے دانیال پسند آیا تھا مگر اسے رینا کی شادی کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ کچھ عرصے سے ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ تھی، دوائی لیتی رہتی تھی مگر کبھی اسے زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس دن اتوار تھا اور وہ سب ناشتے کی میز پر تھے کہ بات کرتے کرتے اچانک ہی سعدیہ چکرا کر نیچے گر پڑی۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ شفیع اللہ اسے اسپتال لے گیا۔

سعدیہ کو آئی سی یو میں ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔ ڈاکٹرز نے اڑتالیس گھنٹے اہم قرار دیے مگر اسے چوبیس گھنٹے گزارنے کا موقع بھی نہیں ملا اور بے ہوشی کی حالت میں دوسرے برین ہیمرج نے اس کی جان لے لی۔ شفیع اللہ کے لیے شریکِ حیات کی جدائی کا صدمہ سہنا آسان نہیں تھا۔ سعدیہ صرف پچپن برس کی تھی اور دیکھنے میں اپنی عمر سے کم ہی لگتی تھی۔ شفیع اللہ نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ یوں اچانک اس کا ساتھ چھوڑ جائے گی۔ وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہا تھا لیکن اس موقع پر رینا نے اپنی عمر اور بساط سے بڑھ کر باپ کو سہارا دیا۔ وہ یونیورسٹی سے آنے کے بعد زیادہ وقت باپ کے ساتھ گزارتی تھی۔ اس کی دل جوئی کا نتیجہ یہ نکلا کہ شفیع اللہ جلد سنبھل گیا اور اپنے کاموں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

چند دن پہلے سعدیہ کی پہلی برسی تھی۔ یہ دن گھر والوں نے خود منایا تھا، انہوں نے سعدیہ کے لیے قرآن خوانی کی تھی۔ شفیع اللہ باقاعدگی سے ہر دوسرے ہفتے سعدیہ کی قبر پر جاتا تھا جبکہ بیٹوں نے ابتدائی چند مہینے کے بعد جانا چھوڑ دیا تھا مگر شفیع اللہ نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ فطری عمل ہے۔ انسان مرنے والوں کو جلد بھول جاتا ہے چاہے وہ اس کے ماں باپ ہی کیوں نہ ہوں۔ بیٹیاں بھی قبرستان نہیں گئی تھیں کیونکہ سعدیہ نے مرنے سے پہلے وصیت کی تھی کہ وہ قبرستان یا اس کی قبر پر نہ آئیں۔ رینا ماں سے زیادہ نزدیک تھی اور وہ اس پابندی پر سب سے زیادہ روئی تھی۔ سعدیہ کی دوسری وصیت تھی کہ اس کی قبر کچی رکھی جائے اور اس پر کتبہ نہ لگایا جائے اگر وہ نشانی چاہتے تھے تو منفرد رنگ والا پتھر لگا دیں۔ شفیع اللہ نے اس وصیت کو بھی پورا کیا تھا ورنہ بیٹے ماں کی قبر پختہ بنوانا چاہ رہے تھے۔ بیوی کی موت نے شفیع اللہ کو کسی حد تک بدل دیا تھا۔ اس نے سعدیہ کے نام پر بے سہارا عورتوں کی مدد کے لیے ایک فاؤنڈیشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

☆☆☆

ناشتے کی میز پر شفیع اللہ کے سامنے ایک اُبلا ہوا دیسی انڈا، دو عدد شہد لگے توس، ایک گلاس بالائی نکلا ہوا دودھ اور اس کے بعد کافی تھی۔ اس کا برسوں سے یہی معمول رہا تھا۔ اگرچہ میز پر کئی طرح کی چیزیں تھیں جو اس کے بچے شوق سے کھاتے تھے۔ جیسے حلوہ پوری، چنوں کا سالن، پائے اور کلیجی، کئی طرح کے کیک وغیرہ۔ مگر شفیع اللہ کے

نزدیک یہ سب سلو پوائزن تھا جو آہستہ آہستہ انسان کی جان لے لیتا ہے۔ بہرحال یہ دوسروں کی چوائس تھی۔ شفیع اللہ کسی کی ذاتی زندگی میں ایک حد سے زیادہ دخل اندازی کا قائل نہیں تھا چاہے وہ اس کی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔ کھانے پینے میں صرف رینا اس پر گئی تھی۔ وہ ابھی سے صحت بخش چیزیں لیتی تھی، اگر کوئی دوسری چیز لیتی بھی تو بس چکھنے کی حد تک۔ شفیع نے آخر میں کافی کا مگ اٹھایا۔ احمر نے پوچھا۔ ''پاپا بینک کے معاملے کا کیا ہوا؟''

''کون سے معاملے کا؟'' شفیع اللہ نے انجان بن کر کہا حالانکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ احمر کا اشارہ کس معاملے کی طرف تھا۔ احمر نے گہری سانس لی۔

''پاپا انجان مت بنیں، آپ جانتے ہیں میں ضیا حامد کی بات کر رہا ہوں۔''

''اس کا کیا ہونا ہے۔ میں نے بتایا تو تھا کہ میں نے انکار کر دیا ہے۔''

''اس لیے کہ اب وہ اقتدار میں نہیں ہے۔'' احمر کا لہجہ تیز ہو گیا۔

شفیع اللہ نے غور سے اسے دیکھا۔ ''تم جانتے ہو ایسا نہیں ہے، میں نے زندگی میں کبھی ان سیاست دانوں کے لیے کچھ نہیں کیا۔ نہ ان کے خوف سے اور نہ لالچ سے۔ ضیا کسی زمانے میں میرا دوست بھی تھا۔ مگر میں نے کبھی اس بات کی پروا بھی نہیں کی۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں نے یہ اسکیم خالص اپنے ملک اور اس کے لوگوں کی مدد کے جذبے سے شروع کی تھی۔ میں اسے ضیا حامد جیسے گندے انسان کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

ظفر، مونا اور دوسرے خاموش رہے تھے لیکن رینا نے باپ کی حمایت کی۔ ''پاپا نے ٹھیک کیا، ایسے گھٹیا شخص کے لیے کچھ کرنے سے بہتر ہے کہ پاپا بینک ہی بند کر دیں۔''

ظفر نے پہلی بار زبان کھولی۔ ''بات صرف بینک تک محدود نہیں رہے گی۔ ہمارا بیشتر کاروبار اسی شہر میں ہے اور یہاں وہ بہت مضبوط ہے۔ وہ چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔''

شفیع اللہ نے بیٹوں کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم لوگ خوفزدہ ہو؟''

''لازمی بات ہے پاپا۔'' ظفر کے بجائے اس کی بیوی سونیا بولی۔ ''وہ ہمیں تباہ کر سکتا ہے۔''

''کوئی کسی کو تباہ نہیں کر سکتا جب تک اوپر والا نہ چاہے۔'' شفیع اللہ نے جواب دیا۔ ''ویسے بھی وہ زیادہ عرصے یہاں رہنے والا نہیں ہے اور وہ جلد یہاں سے اپنا بوریا بستر گول کر لے گا۔''

''پاپا اکیلا بھیڑیا زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔'' احمر نے خبردار کرنے والے انداز میں کہا لیکن شفیع اللہ نے اس کی بات نظرانداز کر کے پوچھا۔

''تیاری مکمل ہے ہمیں بارہ بجے روانہ ہونا ہے۔''

آج دارالحکومت میں ان کے نئے ہوٹل کی افتتاحی تقریب تھی جس میں اعلیٰ سرکاری و سیاسی افراد کے ساتھ بزنس کمیونٹی کے خاص لوگ بھی شامل تھے۔ مونا نے کہا۔

''تیاری مکمل ہے پاپا۔''

''تم دونوں کو وہیں ہونا چاہیے تھا۔'' شفیع اللہ نے مونا اور باسط کی طرف دیکھا۔

''جی پاپا لیکن کل رات مونا کا چیک اپ تھا اس لیے ہم یہاں آگئے اب آپ کے ساتھ جائیں گے۔''

باسط کی بات پر مونا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ ماں بننے والی تھی۔ یہ اس کی پہلی خوش خبری تھی۔ احمر کے دو بیٹے تھے اور ظفر کی ایک بیٹی تھی۔ مونا کو شادی کے دو سال بعد خوشخبری ملی تھی۔ شفیع اللہ مسکرانے لگا پھر اس نے گھڑی دیکھی اور کافی کا مگ رکھتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ''میں دفتر سے وہیں آؤں گا۔ فاؤنڈیشن کا پیپر ورک فائنل کرنا ہے۔''

رینا اٹھی اور والد کو بریف کیس تھمایا۔ ماں کے بعد باپ کو دفتر کے لیے رخصت کرنے کی ذمے داری اس نے سنبھال لی تھی۔ وہ اسے چھوڑنے باہر پورچ تک آئی جہاں اس کی نئے ماڈل کی بی ایم ڈبلیو کھڑی تھی اور ڈرائیور کی وردی میں نور علی موجود تھا۔ وہ صرف ڈرائیور ہی نہیں شفیع اللہ کا باڈی گارڈ بھی تھا اور اس نے دو مواقع پر اپنی جان کی بازی لگا کر اسے محفوظ رکھا تھا۔ ایک بار ڈاکو اسے اغوا کرنے آئے تھے اور دوسری بار ٹارگٹ کلرز نے اسے مارنے کی کوشش کی تھی۔ دوسرے واقعے میں نور علی شدید زخمی ہوا تھا۔ اگر شفیع ملک کے بہترین اسپتال میں اور بہترین طبی سہولتوں کے ساتھ اس کا علاج نہ کراتا تو شاید اس کا بچنا مشکل ہوتا۔ اس کے بعد سے نور علی اس کی زندگی کا ایک لازمی جزو بن گیا تھا۔ وہ ہر جگہ اس کے ساتھ ہوتا تھا اور شفیع اللہ کے واقف کار مذاق میں اسے اس کا ہمزاد قرار دیتے تھے۔

دوسرے دولت مندوں کی طرح شفیع اللہ بھی اب بلٹ پروف گاڑی استعمال کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ یہ جدید

ترین گاڑی اس نے خاص طور سے اجازت لے کر اور بہت مہنگے داموں باہر ملک سے منگوائی تھی۔ گھر سے نکلتے ہوئے جدید ترین بلٹ پروف جیکٹ پہنتا تھا۔ اسے اسلحہ اچھا نہیں لگتا تھا مگر اس نے ایک چھوٹا پسٹل لیا تھا اور اس کا لائسنس بھی بنوایا تھا۔ نشانے بازی میں نور علی اس کا استاد تھا۔ اب اگر موقع آتا تو وہ پستول اعتماد سے استعمال کر سکتا تھا۔

''پاپا۔'' رینا نے جھجک کر کہا۔ ''دانی بھی ساتھ جائے گا۔''

شفیع اللہ ٹھٹکا پھر اس نے سر ہلایا۔ ''شیور کیوں نہیں بیٹا، سوری کہ میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔ کیا آپ نے اسے مدعو کیا ہے؟''

''جی پاپا۔'' رینا خوش ہوگئی۔ ''میں نے آپ کی طرف سے ہی انوائٹ کیا ہے۔''

''گڈ گرل۔'' شفیع اللہ نے اس کا سر چوما اور گاڑی کی عقبی نشست پر آگیا اور نور علی نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا۔ جب گاڑی وسیع و عریض شفیع پیلس سے نکل رہی تھی تو وہ ضیا حامد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

ضیا حامد، شفیع اللہ کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس کے چہرے پر کدورت اور نفرت کے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ اس براق سفید فرنیچر والے کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ اس نے خود بھی سفید سوٹ پہنا ہوا تھا۔ تقریباً بیس فٹ طویل اور پندرہ فٹ چوڑے اس کمرے میں بڑا لیدر صوفہ سیٹ تھا، دبیز قالین، شیشے کی چیزیں سب سفید تھیں۔ دیواروں کا رنگ بھی سفید تھا۔ ایک طرف کی پوری دیوار شیشے کی تھی مگر اس کے آگے سفید ہی پردے تھے۔ ضیا اس ماحول کا ایک حصہ لگ رہا تھا۔ واحد شے جو سفید نہیں تھی وہ سامنے بوتل میں موجود رنگین پانی تھا۔ اس رنگین پانی کا کچھ حصہ ایک دودھیا شیشے والے بلوریں جام میں تھا۔ اس کے اثرات ضیا کی آنکھوں سے جھلک رہے تھے مگر وہ نشے میں نہیں تھا۔

ضیا حامد سرخ و سفید رنگت اور دلکش نقوش والا آدمی تھا اس کی عمر پچپن کے آس پاس تھی مگر اس نے خود کو اتنا سنبھال کر رکھا تھا کہ وہ چالیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ کسی قدر ورزشی جسامت پر ہر لباس اچھا لگتا تھا۔ اس کے گھنے سیاہ اور گھنگھریالے بال گردن سے نیچے آرہے تھے، نفاست سے تراشی ہوئی مونچھیں۔ اس کی آنکھوں کا اصل رنگ براؤن تھا مگر وہ باہر جاتے ہوئے لائٹ براؤن کلر کے لینس لگا لیتا تھا جس سے اس کی شخصیت کی دلکشی بڑھ جاتی تھی۔ اس وقت تاثرات سے قطع نظر وہ اچھا اور خوش رُو لگ رہا تھا۔ اس نے جام سے ہلکی سی چسکی لی اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ وقت بہت سستی سے گزر رہا تھا۔ دن کا دوسرا پہر شروع ہونے والا تھا، گیارہ بج کر باون منٹ ہو رہے تھے مگر وہ جب گھڑی کی طرف دیکھتا اسے لگتا کہ سوئیاں اسی جگہ رک گئی ہیں۔

زمانۂ طالب علمی سے وہ سیاست کے چکر میں پڑ گیا تھا اور اس نے اس میدان میں بہت دھکے بھی کھائے تھے۔ کئی بار جیل گیا اور اس کی زندگی کے چار سال سے کچھ اوپر کا وقت جیل میں گزرا تھا مگر اس نے یہ وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ اس نے اسے استعمال کیا۔ اس نے جیل میں رہ کر ماسٹر کیا اور ایک کتاب لکھی جس میں اس نے اپنے سیاسی نظریات کچھ اس انداز میں بیان کیے کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی کتاب نوجوان طبقے میں مقبول ہوتی گئی اور جب اسے جیل سے رہائی ملی تو اس کے استقبال کے لیے ہزاروں افراد کا ہجوم سینٹرل جیل کے باہر موجود تھا۔ اس وقت تک وہ ایک مقبول سیاسی جماعت کا مقامی لیڈر تھا۔ مگر اس استقبال نے ضیا کا ذہن بدل دیا اور اس نے محسوس کیا کہ اگر اس نے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا تو وہ میدانِ سیاست میں ہمیشہ دوسروں کا محتاج رہے گا۔ اپنی سیاسی زندگی سے اس نے ایک ہی سبق سیکھا تھا کہ اگر طویل مدتی فائدہ نظر آرہا ہے تو اس موقع سے فائدہ اٹھانے سے کبھی مت چوکو چاہے عارضی نقصان کیوں نہ ہو۔

ضیا نے اپنی پارٹی چھوڑنے کا اعلان کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی پارٹی نے عوام کے لیے کچھ نہیں کیا تھا اس لیے وہ پارٹی چھوڑ رہا ہے۔ حالانکہ اس کی پارٹی کی حکومت پر گرفت نہایت مضبوط تھی۔ ضیا کا پارٹی چھوڑنا بہ ظاہر خسارے کا سودا تھا۔ اس نے اہم ترین صوبے میں آنے والے الیکشن سے پہلے نچلی سطح پر پارٹی کو منظم کیا اور دیوانے تلاش کیے جو نظریات کے نام پر سیاست کی بھٹی کا ایندھن بنتے ہیں اور ان دیوانوں نے دیوانہ وار کام کر کے چند سالوں میں اس کی پارٹی کو گھر گھر پہنچا دیا۔ الیکشن ہوئے اور سابق حکومت اپنی ناقص کارکردگی کے باوجود دھاندلی کے بل بوتے پر الیکشن جیتنے میں کامیاب رہی۔ ضیا کی پارٹی نے اس میں حصہ نہیں لیا لیکن جب ہارنے والوں نے دھاندلی کے خلاف احتجاجی تحریک شروع کی تو اس نے پوری شدت سے اس میں حصہ لیا اور میڈیا کی توجہ حاصل کر لی۔

احتجاج کے نتیجے میں الیکشن کالعدم قرار پائے اور نئے سرے سے الیکشن ہوئے جس میں ضیا کی پارٹی نے بھرپور حصہ لیا اور اپوزیشن کی جماعت کے بعد دوسری بڑی جماعت بن کر سامنے آئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب ڈھائی سال بعد دوبارہ عام انتخابات ہوئے تو ضیا کی پارٹی نے اکثریت حاصل کر لی اور بنا کسی کی مدد کے حکومت بنالی۔ ضیا وزیراعظم بن گیا۔ یہاں سے اس نے اپنا اصل کھیل شروع کیا۔ اس نے نہایت چالاکی اور ہوشیاری سے مال کمانا شروع کر دیا۔ شروع کے ایک سال تو وہ محتاط رہا اور اپنی ساکھ کی فکر بھی کرتا رہا لیکن جیسے جیسے معاملات پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی، اس کی کرپشن کی رفتار بھی بڑھتی گئی۔

منتخب نمائندوں اور مخلص پارٹی سیاست دانوں کے بجائے اس نے اپنے آس پاس ایسے لوگ جمع کر لیے جو خود بھی کرپٹ تھے اور اس کی مدد بھی کرتے تھے۔ حکومت کے آخری سالوں میں ضیا کی حکومت پر بے شمار الزامات لگے۔ اس کی بدعنوانی کی داستانیں سامنے آئیں کہ اس کے وفادار ساتھیوں کے لیے اس کا دفاع کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ پارٹی مخلص لوگوں سے خالی ہونے لگی۔ ورکرز پہلے ہی ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پانچ سال بعد جب الیکشن ہونے لگے تو ضیا کے لیے مختلف حلقوں کے لیے امیدوار تلاش کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ الیکشن کی نگرانی عدلیہ اور فوج کر رہی تھی اس لیے دھاندلی کرنی بہت مشکل ہو گئی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ضیا کی پارٹی کو بدترین شکست کا سامنا کرنا اور وہ بہ مشکل چند حلقوں میں کامیابی حاصل کر سکی تھی۔ ضیا کی سابق پارٹی ایک بار پھر اقتدار میں آ گئی تھی۔

نئی آنے والی حکومت بدترین اقتصادی حالات سے نمٹ رہی تھی۔ جو ضیا کے دور کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی مگر ساتھ ہی وہ ضیا کے خلاف کیسز کی تیاری بھی کر رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے گرد گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اپنے بیوی بچوں کو اور بیشتر اثاثے پہلے ہی ملک سے باہر بھیج چکا تھا جب وہ خود اقتدار میں تھا۔ اب یہاں سے اپنے باقی رہ جانے والے اثاثے منتقل کر رہا تھا۔ اس نے اربوں نہیں کھربوں روپے جمع کر لیے تھے۔ دورانِ اقتدار تو اسے مشکل پیش نہیں آئی مگر اب اسے اندازہ ہوا کہ بنا اقتدار کے یہ کام آسان نہیں۔ منی ٹرانسفر پر نہ صرف ملک میں بلکہ ملک سے باہر بہت سی پابندیاں تھیں۔ جہاں رقم منتقل کی جاتی وہاں بھی اس سے سوال کیا جاتا۔ ضیا نے مالیاتی ماہرین کی ایک ٹیم جمع کی ہوئی تھی جو اس کے لیے راستے تلاش کر رہی

تھی اور ان کی مدد سے رقم بیرونِ ملک منتقل کی جا رہی تھی۔

رقم کی منتقلی کا ایک راستہ بینکنگ چینل بھی تھا مگر مرکزی بینک کی سخت نگرانی اور قوانین کی وجہ سے یہ راستہ بھی مشکل ہو گیا تھا۔ جب تک بینک کی اعلیٰ ترین انتظامیہ اس کام میں ملوث نہ ہو۔ اس کے ایک ماہر مالیات نے اسے ایس ایس بینک کی رقم منتقلی کی اسکیم کی طرف توجہ دلائی۔ اگرچہ اسے بیرونِ ملک سے رقم منگوانے کے لیے شروع کیا گیا تھا مگر اس کے توسط سے بڑے پیمانے پر رقم بیرونِ ملک ٹرانسفر بھی کی جا سکتی تھی۔ شفیع اللہ نے یہ اسکیم اس کے دورِ حکومت میں وزارتِ خزانہ کو پیش کی تھی مگر اسے انکار کر دیا گیا کیونکہ اس وقت ضیا حامد اس اسکیم کی افادیت کا درست اندازہ نہیں کر پایا تھا۔

ضیا، شفیع اللہ سے اچھی طرح واقف تھا اور وہ ان چند افراد میں سے تھا جن سے ضیا شدید نفرت کرتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ ملک کے ان چند بڑے سرمایہ داروں میں سے تھا جس نے ضیا کا ساتھ دینے سے انکار کیا تھا اور اس کے دورِ حکومت میں اپنے سارے نئے پروجیکٹ روک دیے تھے کیونکہ وہ رشوت دینے اور بدعنوان لوگوں سے ہاتھ ملانے کو تیار نہیں تھا بلکہ اس نفرت کی وجہ خاصی پرانی تھی۔ اس کی جڑیں زمانۂ طالب علمی میں ملتی تھیں۔ دونوں یونیورسٹی فیلو تھے۔ اگرچہ شعبے الگ تھے مگر ان میں اچھی سلام دعا تھی۔ لیکن جب دونوں نے طلبا سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تو وہ آپس میں حریف بن گئے اور ضیا کو اولین شکست شفیع اللہ کے ہاتھوں نصیب ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ زیادہ مقبول ہے اور شفیع اللہ سیدھا سادا لڑکا تھا مگر جب نتیجہ آیا تو شفیع اللہ طلبا یونین کا صدر بن گیا تھا۔ اس دن سے وہ ضیا سے نفرت کرنے لگا تھا۔ جب وہ اقتدار میں آیا اور اس نے اپنے طور پر شفیع اللہ پر احسان کرنے کی کوشش کی۔ یعنی اسے اپنے ساتھ شامل کرنا چاہا تو اس نے انکار کر کے اسے دوسری شکست دی تھی۔ ضیا کے خیال میں وہ شفیع اللہ کی مدد سے بہت بڑی رقم کما سکتے تھے مگر وہ نہ کما سکا اور اس کے بعد وہ ضیا کا ناپسندیدہ ترین آدمی بن گیا۔

بہرحال اب ضیا کا مفاد آڑے آ رہا تھا اور اس نے ایک مشترکہ جاننے والے کے توسط سے شفیع اللہ سے رابطہ کیا۔ لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ ضیا کو اسی کی امید تھی۔ اس نے اپنے مالی مشیر سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ نہیں مانے گا۔ اس لیے اس نے متبادل پلان پر پہلے ہی عمل درآمد شروع کر دیا تھا۔ معاملہ بہت بڑی رقم کا تھا اور یہ دو

ارب ڈالرز کے مساوی رقم تھی۔ اگر یہ نکل جاتی تو ضیا بے فکر ہو کر یہاں سے جا سکتا تھا۔ خاصے غور و خوض کے بعد اس نے سال بھر پہلے ایک منصوبہ تیار کیا تھا۔ بلکہ اس پر ابتدائی کام بھی مکمل کر لیا تھا۔ جب شفیع اللہ نے اس سے تعاون سے انکار کیا تو اس نے اپنے آدمیوں کو پلان پر عمل درآمد کا سگنل دے دیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اب شفیع اللہ اس کا کام کرے گا۔ اس بار وہ انکار کی جرأت نہیں کرے گا۔ تمام کام بہت صفائی سے ہوا تھا اور اس کا یقین اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ اس نے شام کی فلائٹ سے سیٹ بک کرالی تھی۔ فلائٹ بیرونِ ملک کی تھی۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جاتا۔ اس کے پیچھے صرف یہ ایک کوٹھی اور چند معمولی سے اثاثے رہ جاتے جن کی اسے زیادہ فکر نہیں تھی۔

☆☆☆

شفیع اللہ اپنے دفتر میں تھا۔ آنے والے دنوں میں اس کے بینک کی مزید چھ شاخیں ملک کے مختلف حصوں میں قائم ہونے جا رہی تھیں کیونکہ زرمبادلہ اسکیم کی وجہ سے بینک کا بزنس تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ بینک کے اکاؤنٹ ہولڈرز کو اس اسکیم کے تحت باہر سے زرمبادلہ منگوانے پر خصوصی رعایت دی جا رہی تھی اس لیے اکاؤنٹ کھلوانے کی رفتار میں تیزی آئی تھی اور مزید برانچوں کی ضرورت محسوس کی جانے لگی تھی۔ بینک کا ہیڈ آفس شہر کے مرکزی بزنس ایریا میں ایک چھ منزلہ بلڈنگ میں تھا۔ ایس ایس بینک نے برابر والا تقریباً دس ہزار گز کا پلاٹ خرید لیا تھا اور اب اس پر بلند ترین بلڈنگ کی تیاری کا منصوبہ تھا جس میں نہ صرف ایس ایس بینک کا ہیڈ آفس بلکہ بہت سے دوسرے کاروباری اور مالیاتی اداروں کے دفاتر بھی قائم ہوتے۔ بزنس کے لحاظ سے موجودہ عمارت اب کم پڑنے لگی تھی۔

یہیں بینک کا وہ مرکزی کمپیوٹر سسٹم تھا جو رقوم کی آن لائن منتقلی کرتا تھا۔ یہ سسٹم نہ صرف ساری دنیا کے مالیاتی مراکز سے رابطے میں رہتا تھا بلکہ ایس ایس بینک کی تمام برانچوں، اے ٹی ایمز اور مرکزی ڈیٹا کا دوسرے اے ٹی ایمز سے بھی رابطہ رکھتا تھا۔ اس سے بینک کے کسٹمر کو بہترین سروس ملتی تھی اور ایس ایس بینک کا ریکارڈ تھا اس کا اے ٹی ایم لنک کبھی ڈاؤن نہیں ہوتا تھا جیسے اس کی اے ٹی ایم مشینیں کبھی کیش سے خالی نہیں ہوتی تھیں۔ کسی بھی اے ٹی ایم کے گم یا چوری ہونے کی صورت میں ایک فون کال پر گاہک صرف تین منٹ میں اپنا کارڈ بلاک کرا سکتا تھا۔ اگر اس کے باوجود کارڈ کہیں استعمال کر لیا جاتا تو بینک انشورنس کی مدد سے گاہک کا نقصان پورا کرتا تھا۔ بینک میں کسٹمرز کے لیے یہ ساری سہولتیں شفیع اللہ نے ذاتی دلچسپی سے مہیا کی تھیں جو عام طور سے دوسرے بینک نہیں دیتے تھے۔

سعدیہ کے نام سے جو فاؤنڈیشن وہ قائم کر رہا تھا، اس کا خاکہ اس نے تیار کر لیا تھا۔ اس کے تحت ہر سال دو سو بے سہارا عورتوں کو منتخب کیا جاتا۔ انہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے ان کے پس منظر اور تعلیمی قابلیت کے لحاظ سے تعلیم و تربیت دلائی جاتی اور پھر انہیں ایس ایس گروپ میں نوکری مہیا کی جاتی یا انہیں کاروبار کرا دیا جاتا۔ آج شفیع اللہ اسی سلسلے میں کاغذی کارروائی کو حتمی صورت دینے جا رہا تھا۔ اس نے فاؤنڈیشن کے لیے این جی او کے ماہرین کی خدمات حاصل کی تھیں۔ گیارہ بجے شفیع اللہ ان کے ساتھ میٹنگ سے فارغ ہو کر ہیڈ آفس سے ائرپورٹ کی طرف روانہ ہوا تھا۔ راستے میں اس نے احمر کو کال کی اور پوچھا کہ وہ لوگ ائرپورٹ پہنچے یا نہیں۔ احمر نے بتایا کہ وہ سب روانہ ہو چکے ہیں اور ساڑھے گیارہ بجے تک وہ ائرپورٹ پہنچ جائیں گے۔

☆☆☆

رینا نے کار گیٹ کے سامنے روکی اور ہارن دیا تو کوٹھی کے اندر سے دانیال برآمد ہوا۔ اس نے ایک چھوٹا سا ہینڈ کیری اٹھا رکھا تھا، وہ اس نے عقبی نشست پر پھینکا اور خود فرنٹ سیٹ پر آ گیا۔ رینا نے اسے دیکھا اور کار آگے بڑھا دی۔ دانیال گھونگھریالے بالوں، صاف رنگت اور اچھے نقوش والا نوجوان تھا۔ گول سیاہ فریم والی عینک اس کی خوش روئی میں اضافہ کر رہی تھی۔ عمر پچیس کے آس پاس تھی۔ جینز اور پوری آستین کی ٹی شرٹ کے ساتھ اس نے براؤن جوگرز پہن رکھے تھے۔ رینا ہنسی۔ ''کسی ریس میں حصہ لینے جا رہے ہو؟''

دانیال نے نیچے دیکھا اور مسکرایا۔ ''جلدی میں یہی دستیاب ہوئے تھے۔ گھر میں صرف ماما کو بتایا ہے وہ تمہارا پوچھ رہی تھیں۔ اگر تم اندر آتیں تو وہ اتنی آسانی سے جانے نہیں دیتیں۔''

''مجھے ماما بہت اچھی لگتی ہیں مگر اس وقت ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رک سکتی۔ ہمیں بارہ بجے تک ائرپورٹ پہنچنا ہے۔''

''تم نے انکل سے پوچھ لیا تھا کہیں بے عزتی نہ ہو جائے؟''

''پاپا نے ویلکم کہا ہے۔'' رینا نے کہا اور موبائل نکال

کر شفیع اللہ کو کال کی۔ ''پاپا آپ کہاں ہیں... ہاں میں دانی کو لے کر پہنچ رہی ہوں۔

☆☆☆

ائرپورٹ پہنچ کر نور علی نے کار مرکزی ٹرمنل کی طرف لے جانے کے بجائے اس کا رخ ہینگرز کے مین گیٹ کی طرف کر دیا۔ گیٹ پر مخصوص پاس دکھانے پر گاڑی کو اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ مگر اندر آ کر نور علی نے گاڑی ایک طرف روک لی۔ شفیع اللہ کو باقی افراد کا انتظار تھا۔ وہی انہیں اندر لے جا سکتا تھا کیونکہ مخصوص پاس صرف ایک ہی تھا۔ چند منٹ بعد وہ سب بھی آ گئے اور شفیع اللہ انہیں اندر لے گیا۔ گاڑیوں کا یہ قافلہ ائرلائنز کے لیے مخصوص ہینگرز سے ذرا فاصلے پر نجی طیاروں کے ہینگرز تک پہنچا۔ ایک ہینگر میں شفیع اللہ کا ذاتی جیٹ طیارہ سیسنا سی ٹیشن تھری موجود تھا۔ اس نے پانچ سال پہلے یہ طیارہ ایک آسٹریلین ٹور فرم سے خریدا تھا۔ طیارہ اندر سے مکمل آراستہ تھا۔

دو جیٹ انجنوں والا یہ طیارہ دنیا کے چند سب سے زیادہ استعمال ہونے والے بزنس جیٹ میں سے ایک ہے۔ اس کے کشادہ کیبن کی آرائش استعمال کے لحاظ سے کی جا سکتی تھی۔ عام طور سے دو پائلٹس کے ساتھ گیارہ مسافر بھی اس میں سفر کر سکتے ہیں۔ جبکہ ایک فضائی میزبان کی گنجائش بھی ہوتی ہے۔

بزنس کے سلسلے میں شفیع اللہ اور اس کے خاندان کے افراد کو بہت زیادہ سفر کرنا پڑتا تھا خاص طور سے اندرونِ ملک وہ زیادہ سفر کرتے تھے۔ قومی ائرلائن اور نجی ائرلائن کا حال برا تھا۔ فلائٹ سیفٹی اور پابندیِ اوقات قصۂ پارینہ بن چکی تھی۔ ایسے میں یہ پرائیویٹ جیٹ ان کی کلاس کی بزنس فیملی کے لیے ناگزیر ہو گیا تھا۔ دو تجربے کار پائلٹس کے ساتھ ایک فضائی میزبان بھی اس طیارے کے عملے میں شامل تھی لیکن اس سفر کے لیے شفیع نے اسے لے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی البتہ طیارے کے دونوں پائلٹس کیپٹن زوہیر صدیقی اور اس کا ماتحت مشتاق حسن موجود تھے۔ وہ کئی گھنٹوں سے یہاں موجود تھے اور ان کی آمد سے پہلے طیارے کی مکمل چیکنگ کر چکے تھے۔ اس چیکنگ میں طیارے کی مشینری کا مکمل چیک شامل تھا۔ شفیع اللہ سیڑھی کے پاس پہنچا تو اندر سے کیپٹن صدیقی نمودار ہوا۔

''ویلکم آن بورڈ سر۔''

''شکریہ۔'' شفیع اللہ نے اوپر آتے ہوئے کہا۔

''سب ٹھیک ہے نا؟''

''بالکل سر...'' کیپٹن صدیقی کاک پٹ کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''ہم پانچ منٹ میں پرواز کریں گے۔''

شفیع اللہ کے پیچھے باقی سب تھے۔ ظفر کے بعد دانیال اندر آیا۔ اس نے گاڑی سے اترنے کے بعد شفیع اللہ سے ہاتھ ملایا تھا۔ البتہ دوسروں کی طرف اس نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ باقی سب اسے زیادہ پسند نہیں کرتے ہیں۔ اسی لیے اسے بھی ان کی پروا نہیں تھی۔ اس کے پیچھے رینا تھی اور اس نے آتے ہی بائیں طرف کی فرنٹ سیٹ پر قبضہ کر لیا کیونکہ یہاں سے نیچے کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ عقبی نشستیں زیادہ تر پردوں کے ساتھ تھیں اور ان سے نیچے کا منظر اتنا واضح نہیں دکھائی دیتا تھا۔ پچھلی بار جب تمام خواتین شاپنگ کے لیے دبئی گئی تھیں تو مونا نے اس سیٹ پر قبضہ کر لیا اور اس پر دونوں بہنوں میں لڑائی ہوئی تھی۔ بہ مشکل سونیا اور شرمین نے ان کی صلح کرائی تھی۔ آج رینا نے شاید اسی کا بدلہ لیا تھا۔ پیچھے آتی مونا نے احتجاج کیا۔ ''یہ بے ایمانی ہے۔''

''پہلے آیئے پہلے پایئے۔'' رینا ہنسی۔

آخری آدمی کے اندر آتے ہی کو پائلٹ مشتاق حسن نے ہینڈل کھینچ کر سیڑھی اور دروازہ اندر کر لیا۔ اسے لاک کر کے وہ کاک پٹ کی طرف بڑھ گیا جو پردے کے پیچھے تھا۔ تمام افراد کے بیٹھتے ہی کیپٹن صدیقی نے طیارے کے جیٹ انجن اسٹارٹ کر دیے اور مائیکروفون پر سیٹ بیلٹس باندھ لینے کی ہدایت کی۔ سب اپنی سیٹ بیلٹس باندھنے لگے۔ ان کے پاس مختصر ہینڈ کیری تھے جو مخصوص خانوں میں رکھ دیے گئے تھے۔ طیارہ ٹیکسی کرتا ہوا ہینگر سے باہر آیا۔ کیپٹن صدیقی ائرٹریفک کنٹرولر کو اپنا فلائٹ پلان بتا کر اس سے اجازت لے چکا تھا۔ اس نے ٹیک آف کی اجازت مانگی اور اے ٹی سی کی ہدایت پر طیارے کو مخصوص رن وے کی طرف لے گیا۔ رن وے پر آتے ہی طیارے نے رفتار پکڑ لی۔

چھتیس ہزار فٹ کے فلائٹ لیول پر آنے کے بعد طیارے کی پرواز ہموار ہو گئی۔ کیپٹن صدیقی نے سیٹ بیلٹ کھول لینے کا اعلان کیا۔ شفیع اللہ نے سیٹ بیلٹ کھولتے ہوئے طیارے کے باہر دیکھا۔ آسمان صاف تھا اور کہیں کہیں بادل تھے۔ البتہ دارالحکومت کے آس پاس ہلکی بارش جاری تھی مگر موسم بہت خراب نہیں تھا۔ سامنے میز پر تھرماس تھے جن میں چائے اور کافی تھی۔ اسی طرح پیک اسنیکس تھے وہ جو چاہتے خود سے لے سکتے تھے مگر فی الحال

کسی کا موڈ نہیں تھا۔ تقریباً سب نے اپنے موبائل نکال لیے تھے یا آپس میں بات کررہے تھے۔ شفیع اللہ سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے لیپ ٹاپ پر کچھ چیزیں چیک کرلے۔ اس نے بریف کیس سے مختصر سی ایپل کی ائر یک نکالی۔ یہ جدید ترین لیپ ٹاپ کسی فائل سے زیادہ موٹا نہیں تھا۔ لیکن اس سے پہلے شفیع اللہ اسے کھولتا رینا نے کہا۔

''پاپا آج نیو ایئر نائٹ بھی ہوگی۔''

''سو واٹ!'' شفیع اللہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہوٹل میں اس کی تقریب ہوگی؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم جانتی ہو میں ایسی تقریبات کا قائل نہیں ہوں۔''

''بزنس کے پوائنٹ آف ویو سے یہ اچھی بات ہوتی۔'' باسط نے آہستہ سے کہا۔

''برخوردار میرے نزدیک سب کچھ بزنس ہی نہیں ہے۔'' شفیع اللہ نے جواب دیا اور لیپ ٹاپ میز پر رکھا لیکن اس بار بھی اسے کھولنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس کے موبائل نے بیل دی تھی۔ شفیع اللہ نے موبائل اٹھایا۔ اس پر ایک اجنبی نمبر آرہا تھا اور وہ اجنبی نمبر سے کال ریسیو نہیں کرتا تھا اس لیے اس نے کال کاٹ دی۔ فوراً ہی رینا کے موبائل کی بیل بجی اور اس نے اجنبی نمبر کے باوجود کال ریسیو کرلی اور پھر موبائل شفیع اللہ کی طرف بڑھا دیا۔ ''پاپا کوئی آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

اس نے موبائل لے کر نمبر دیکھا اور اس کی پیشانی پر شکن آگئی۔ یہ وہی نمبر تھا۔ ''ہیلو، کون بات کررہا ہے؟''

''اہم بات یہ نہیں ہے کہ کون بات کررہا ہے۔'' دوسری طرف سے مشینی سی آواز آئی۔ ''اہم بات یہ ہے کہ وہ کیا بات کررہا ہے؟''

''اوکے، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''شفیع صاحب۔'' مشینی انداز میں آواز سنائی دی۔ ''تم اپنے سیسنا جیٹ طیارے میں سطح زمین سے چھتیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کررہے ہو۔ ایسے میں اگر طیارے میں موجود بم پھٹ جائے تو یقیناً تم سب کے چیتھڑے اُڑ جائیں گے۔''

شفیع اللہ کا دل ایک لمحے کو رکا مگر جب وہ بولا تو اس کا لہجہ نارمل تھا۔ ''بات واضح نہیں ہے۔''

''میں واضح کرتا ہوں۔ طیارے کے عقبی حصے میں جہاں آخری نشست ہوتی ہے۔ اس وقت وہاں نشست نہیں ہے۔ فرش پر موجود خانہ کھولو گے تو تمہیں ایک باکس ملے گا۔ باکس کا صرف ڈھکن کھولنا۔ اسے خانے سے نکالنے کی کوشش مت کرنا ورنہ یہ عمل اجتماعی خودکشی کہلائے گا۔ میں دو منٹ بعد تمہارے نمبر پر کال کرتا ہوں۔''

شفیع اللہ نے موبائل رینا کی طرف بڑھا دیا جو غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ جاننے میں ناکام رہی کہ کال کرنے والا کون تھا اور اس نے پاپا سے کیا بات کی تھی۔ وہ اٹھ کر کیبن کے آخری حصے کی طرف بڑھا۔ پردہ ہٹا کر واش روم کے پاس سے گزر کر وہ آخری حصے میں آیا۔ یہاں فرش میں چوکور آہنی جالی والی پلیٹیں فرش میں نصب تھیں۔ انہیں اسکرو کی مدد سے بند کیا گیا تھا مگر جہاں آخری نشست ہوتی ہے وہاں کا ایک خانہ بنا اسکرو کے تھا۔ اس نے گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے احتیاط سے اس کی فولادی جالی اٹھائی۔ اندر سرخ رنگ کا آئس بکس جیسا پلاسٹک کا بکس تھا۔ شفیع اللہ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر رک گیا۔ اگر کال کرنے والے نے غلط بیانی سے کام لیا اور اس میں موجود بم ڈھکن کھولتے ہی پھٹ جائے تو؟ مگر اس صورت میں اسے بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی، بم تو ٹائم کے لحاظ سے بھی بلاسٹ کیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ بھی ممکن تھا وہ اس کے ساتھ کھیل رہا ہو۔ ان سب کی موت کا انتظام وہ اس کے ہاتھ سے چاہتا ہو۔ بہرحال اسے تصدیق تو کرنی تھی۔ کسی قدر کشمکش کے بعد اس نے ہمت کر کے اللہ کا نام لے بکس کا ڈھکن کھول لیا اور کچھ نہیں ہوا۔ بکس میں موجود بم سامنے آگیا تھا۔

یہ عام بم نہیں تھا بلکہ جدید قسم کا بم تھا جس میں دو مختلف محلول الگ الگ شفاف ٹیوبس میں تھے۔ اگر انہیں تیسری خالی ٹیوب میں مکس کردیا جاتا تو بس ایک چنگاری کی دیر ہوتی اور بم پھٹ جاتا۔ تاروں کے گچھے تھے اور جدید ڈیجیٹل سرکٹ تھا جو بم کے فنکشن کو کنٹرول کرتا ہے۔ ایک طرف اسکرین تھی اور اس کے نیچے چھوٹا سا نمرک پیڈ تھا جس پر ایک سے لے کر صفر تک ہندسے تھے اور ایک بٹن انٹر کا تھا۔ اسکرین کے اوپری حصے پر ہندسے چمک رہے تھے۔ یہ ٹائمر تھا جو دو گھنٹے اور پندرہ منٹ کا وقت ظاہر کررہا تھا۔ ہر گزرتے لمحے وقت میں کمی ہورہی تھی۔ شفیع اللہ اس چیز کا ماہر نہیں تھا لیکن اس کی چھٹی حس نے بتایا کہ بم نہ صرف اصلی ہے بلکہ نہایت مہلک ہے۔ یہ اس طیارے کے ٹکڑے کردینے کے لیے کافی تھا۔ موبائل نے بیل دی تو وہ اچھل پڑا۔ اس نے جلدی سے موبائل نکال کر کال ریسیو کی۔

''یہ سب کیا ہے، تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟''

''سر میں نے کیا کیا ہے؟'' دوسری طرف سے اس کی سیکریٹری روبی کی آواز آئی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے نمبر دیکھا ہی نہیں تھا۔ بم کی موجودگی نے اس کے ہوش اُڑا دیے تھے۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''سوری، میں کوئی اور سمجھا تھا۔ تم نے کیوں کال کی ہے؟''

''سر آپ اپنی یو ایس بی بھول گئے۔''

''اسے اپنی تحویل میں رکھو، میں واپسی پر لے لوں گا۔'' شفیع اللہ نے کہا اور کال کاٹ دی۔ اسے خیال آیا اگر واپسی ہوئی تو۔۔۔ اب اس نے خود وہی نمبر ملایا جس سے کال آرہی تھی۔ دوسری بیل کے ساتھ ہی کال ریسیو کر لی گئی۔

''تم نے دیکھ لیا ہوگا؟'' مشینی آواز والے نے کہا۔ یقیناً وہ کوئی وائس چینجر استعمال کر رہا تھا۔

''ہاں، تم کیا چاہتے ہو؟''

''گڈ، ٹو دی پوائنٹ بات کرنے والے لوگ مجھے پسند ہیں اور میں خود بھی اسی طرح بات کرنا پسند کرتا ہوں۔ پہلے میں تمہیں کچھ پوائنٹس بتادوں تاکہ تم خودکشی سے بچ سکو۔ اول یہ بم دس ہزار فٹ کی بلندی پر آتے ہی خودکار انداز میں ایکٹی ویٹ ہو جاتا ہے۔''

''یہ ٹائم بم ہے؟'' شفیع اللہ نے بم کی طرف دیکھا۔ ''اس پر اسٹاپ واچ آرہی ہے اور وقت دو گھنٹے بارہ منٹ رہ گیا ہے۔''

''بالکل دو گھنٹے بارہ منٹ بعد یہ بم بلاسٹ ہو جائے گا۔ دراصل یہ ملٹی فنکشن بم ہے۔ تم اسے کمپیوٹرائزڈ بم بھی کہہ سکتے ہو۔ اب اگر طیارے نے ہائٹ لوز کی اور دس ہزار فٹ سے نیچے آیا تب بھی بم بلاسٹ ہو جائے گا۔ بم کو بکس سے یا بکس کو خانے سے نکالنے کی کوشش کا بھی بالکل یہی نتیجہ نکلے گا۔''

شفیع اللہ کا ذہن اب صورتِ حال جان کر سوچنے کے قابل ہوتا جا رہا تھا، اس نے سوال کیا۔ ''اسے ڈی ایکٹی ویٹ کرنے کا طریقہ؟''

''ایک مخصوص کوڈ جو نمرک پیڈ پر انٹر کیا جائے گا اور بم ڈی ایکٹی ویٹ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے۔'' بولنے والے کا انداز ڈرامائی ہو گیا۔ ''اس کوڈ کی ایک قیمت ہے جو تم ادا کر سکتے ہو، کیا تم ادا کرنا پسند کرو گے؟''

شفیع اللہ اس سوال کے ممکنہ جواب پر غور کرنے لگا۔ معاملہ صرف اس کی بلکہ اس کے پورے خاندان کی زندگی کا تھا۔ وہ ان کے لیے ذرا بھی رسک نہیں لے سکتا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے کہا۔ ''تم کیا چاہتے ہو تاوان؟''

''نہیں تم سے ایک چھوٹا سا کام ہے۔''

''کیسا کام؟''

''تم اپنے لیپ ٹاپ سے اپنے بینک کے کمپیوٹر سے رابطہ کرو گے۔ میں تمہیں کچھ مخصوص اکاؤنٹس اور ان کے پن نمبرز بتاؤں گا۔ تم ان اکاؤنٹس میں موجود رقم اپنے بینک کے ذریعے میرے بتائے ہوئے بین الاقوامی اکاؤنٹس میں ٹرانسفر کرو گے۔ جب یہ کام ہو جائے گا تو میں تمہیں ڈی ایکٹو کوڈ بتا دوں گا۔ ایک بات اور واضح کر دوں۔ اپنی طرف سے کوئی تکا مت لگانا کیونکہ غلط کوڈ انٹر کرنے کی صورت میں بم بلاسٹ ہو جائے گا۔''

''رقم کی بیرونِ ملک منتقلی کون سا مشکل کام ہے جس کے لیے تم نے یہ سب کیا ہے؟''

مشینی آواز والا ہنسا۔ ''اگر مشکل نہ ہوتا تو میں تم سے کہتا۔ تمام اکاؤنٹس مقامی ہیں۔ اگرچہ ڈالرز میں ہیں۔ لیکن ان سے ڈالرز بیرونِ ملک منتقل نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ تمہارے بینک کا سرور یہ کام آسانی سے کر سکتا ہے کیونکہ وہ بین الاقوامی سسٹم سے منسلک ہے۔''

''یہ کام آسان نہیں ہے۔''

''بہت آسان ہے، اگر تم ابھی سے شروع کر دو۔ واضح رہے کہ اکاؤنٹس کی تعداد ایک سو پچاس ہے اور جن اکاؤنٹس میں رقم ٹرانسفر کرنی ہے، وہ پہلے ہی ان میں ایڈ ہیں۔ ان کی تعداد بھی ایک درجن ہے۔''

''ایک سو پچاس اکاؤنٹس۔'' شفیع اللہ کی پریشانی بڑھ گئی۔ ''میں یہ کام اتنی جلدی نہیں کر سکتا۔''

''تمہارے پاس دو گھنٹے اور دس منٹ ہیں۔'' مشینی آواز والے نے کہا۔ ''جتنا وقت تم فضول میں ضائع کرو گے، وہ تمہیں موت کے قریب لے جائے گا۔ اپنا ای میل چیک کرو۔ اس میں تمہارے لیے ایک گفٹ بھی ہے۔''

کال کٹ گئی تھی اور شفیع اللہ تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس کا ذہن کہہ رہا تھا کہ یہ کام آسان نہیں ہے، اسے جلد از جلد سب کرنا ہوگا۔ وہ سب سے پہلے کاک پٹ میں آیا اور اس نے جھک کر کیپٹن صدیقی کے کان میں صورتِ حال واضح کی۔ کیپٹن صدیقی تجربے کار پائلٹ تھا۔ اس کے پاس فلائنگ کا تیس سالہ تجربہ تھا۔ وہ ہر قسم کی صورتِ حال میں طیارہ اُڑا سکتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا ہوں۔''

"بس تو اس کے مطابق فلائی کرو اور کسی سے اشارتاً بھی بات نہیں کرنی ہے۔"

کیپٹن صدیقی سے بات کر کے وہ باہر آیا تو تقریباً سب ہی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کا عقب میں جانا غیر معمولی نہیں تھا کیونکہ اس طرف واش روم تھا۔ البتہ کاک پٹ میں جانا چونکا دینے والا تھا۔ اگر شفیع اللہ کو کیپٹن سے کوئی بات کرنا ہوتی تو وہ انٹرکام پر بھی کر سکتا تھا۔ ظفر نے پوچھا۔ "اینی پرابلم پاپا۔"

شفیع اللہ اس کا سوال نظر انداز کر کے اپنی نشست پر آیا۔ اس نے لیپ ٹاپ آن کیا اور ای میل اوپن کیا۔ اس میں سب سے اوپر آنے والی ای میل کا عنوان تھا۔ "ڈونٹ سوسائڈ"۔ اس نے اسے اوپن کیا تو اس میں ایک چھوٹی سی ورڈ فائل تھی اور فائل میں ان ڈیڑھ سو اکاؤنٹس کے نمبرز اور پن کوڈز تھے جن میں رقم موجود تھی جبکہ اس کے ساتھ ایک درجن غیر ملکی اکاؤنٹس نمبرز اور ان کی تفصیلات بھی تھیں جن میں رقم منتقل کی جانی تھی۔ تمام اکاؤنٹس ایس ایس بینک کے تھے۔ ورڈ فائل کے علاوہ ایک تصویر بھی تھی۔ شفیع اللہ نے اسے کھولا تو اس میں ایک لڑکی نئے سال کے لوگو کے ساتھ بنے گلاب پر ہونٹ رکھ رہی تھی۔ گلاب ایک گفٹ ربن سے بندھا ہوا تھا۔ رینا اٹھ کر اس کے پاس آئی لیکن اس سے پہلے وہ کچھ کہتی، شفیع اللہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کیا۔ "ابھی مجھ سے بات مت کرو میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

ظفر اور احمر فکر مند ہو گئے۔ "پاپا پلین میں کوئی مسئلہ ہوا ہے؟"

شفیع اللہ جانتا تھا کہ ان لوگوں سے چھپانا بھی ممکن نہیں تھا اس لیے اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "ظفر، احمر، باسط اور دانیال تم سب طیارے کے عقبی حصے میں جا کر دیکھو مگر کسی چیز کو انگلی بھی مت لگانا۔ خواتین اپنی نشستوں پر رہیں۔"

یہ سنتے ہی وہ سب اپنی نشستوں سے اٹھتے ہوئے عقبی سمت میں لپکے۔ شرمین، سونیا، مونا اور رینا کے چہرے فق ہو گئے تھے۔ انہیں احساس ہو رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ اس دوران میں شفیع اللہ بینک کے سرور سے رابطہ کر رہا تھا۔ مگر اسے کچھ مشکل پیش آ رہی تھی اس نے سرور آپریٹر طاہر رحمان کو کال کی۔ طاہر رحمان اعلیٰ تعلیم یافتہ آئی ٹی اسپیشلسٹ تھا جو سرورز پر کام کرنے کا بین الاقوامی تجربہ رکھتا تھا اور اسی وجہ سے اسے اس جاب کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ "طاہر مجھے رقم کی بیرون ملک منتقلی کے لیے تمہاری اسسٹ کی ضرورت ہے۔"

"آئی ایم ہیئر سر۔" اس نے مستعدی سے کہا۔

"مجھے اپنے لیپ ٹاپ سے سرور سے رابطہ کرنے میں دشواری پیش آ رہی ہے سرور مجھے مکمل ایکسیس نہیں دے رہا ہے۔"

"سر کسی بھی دوسرے کمپیوٹر کے لیے سرور لاک ہے۔"

"اسے ان لاک کرو۔"

"میں کرتا ہوں سر، اس میں کچھ وقت لگے گا۔"

"کتنا وقت؟"

"دس منٹ۔" طاہر نے جواب دیا۔ "اس کے لیے کچھ نئی کمانڈز تیار کرنا ہوں گی اس میں وقت لگے گا۔"

"پانچ منٹ میں یہ کام کر کے مجھے اطلاع دو۔" شفیع اللہ نے کہا اور کال کاٹ دی۔ اس دوران میں وہ چاروں سب عقبی حصے میں موجود بم دیکھ کر آ چکے تھے اور ان کے چہرے خوف اور ہراس کا سماں پیش کر رہے تھے۔ احمر نے آتے ہی پوچھا۔

"پاپا یہ بم ہے نا؟"

یہ سنتے ہی شرمین، سونیا اور مونا کی چیخیں نکل گئیں۔ رینا نے گھبرا کر کہا۔ "بم... پلین میں؟"

"ہاں یہ بم ہے۔" شفیع اللہ نے سر ہلایا۔

"آپ کو فون کرنے والا کون ہے؟" یہ سوال ظفر نے کیا۔ "اسی نے یہ بم فٹ کیا ہے؟"

"ہاں اور ہمارے پاس وقت نہیں ہے، تم لوگوں نے دیکھ لیا ہے کہ بم میں ٹائمر ہے۔"

"طیارے کو واپس اتار لیتے ہیں۔" رینا بولی۔ عورتوں میں وہ واحد تھی جس کے حواس اب تک بحال تھے ورنہ باقی سب رو دھو رہی تھیں۔ اس کی بات سن کر شفیع اللہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ یہ بہت جدید بم ہے جو دس ہزار کی بلندی پر آنے کے بعد ایکٹو ہو گیا اور دس ہزار فٹ سے نیچے جاتے ہی بم پھٹ جائے گا۔ اسے چھیڑا بھی نہیں جا سکتا ہے۔ صرف مخصوص کوڈ انٹر کر کے ہی ڈی ایکٹی ویٹ کیا جا سکتا ہے۔"

"پاپا بم کو طیارے سے باہر پھینک دیتے ہیں۔" باسط نے کہا۔

"یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ بم کو بکس سے یا بکس کو خانے

سے نکالنے کی صورت میں یہ فوراً بلاسٹ ہو جائے گا۔ یہ بات بم لگانے والے نے بتائی ہے۔''

''یہ سب ان لوگوں کی غفلت کا نتیجہ ہے۔'' ظفر نے برہمی سے کاک پٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''اس کا فیصلہ زمین پر اترنے کے بعد ہی کیا جا سکے گا۔'' شفیع اللہ دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوا۔ ''فی الحال ہماری ساری توجہ اس پر ہونی چاہیے کہ کسی طرح اپنی جان بچائیں...''

''بم لگانے والا کیا چاہتا ہے؟'' دانیال نے پوچھا۔

''ہاں یہ کام کا سوال ہے، وہ چاہتا ہے کہ میں اس کے بتائے کچھ اکاؤنٹس سے رقوم بیرون ملک بینک کے سسٹم کے ذریعے منتقل کردوں۔ اس سسٹم کے تحت اکاؤنٹس سے اکاؤنٹس میں فوری رقم منتقل کی جا سکتی ہے اس کے علاوہ پورے ملک میں کوئی ایسا سسٹم نہیں ہے۔ تب ہی اس نے طیارے میں بم لگا کر اسے ہائی جیک کرلیا ہے۔''

''یہ کیا ہے پاپا؟'' رینا نے تصویر کی طرف اشارہ کیا جو اوپن تھی۔

''یہ بھی اسی نے بھیجی ہے۔'' شفیع اللہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اس کا کہنا ہے یہ گفٹ ہے۔''

''یہ اسی کا کام ہے۔'' ظفر نے کہا۔ وہ ٹہل رہا تھا اور بار بار اپنے بالوں میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔

''ضیا حامد کا۔'' احمر نے اس کی تائید کی۔ ''پاپا سے کہا تھا اس سے مت الجھیں۔ انجام دیکھ لیا نا۔''

''وہ کینہ پرور آدمی ہے۔'' باسط بولا۔ ''جس کا دشمن ہو جائے اسے کبھی معاف نہیں کرتا ہے۔''

''تم سب خاموش ہو گے کیا؟'' شفیع اللہ نے تیز لہجے میں کہا اور موبائل اٹھا لیا۔ اس نے طاہر کو کال کی۔ ''کام ہو گیا؟''

''دو منٹ اور سر۔'' اس نے ملتجی لہجے میں کہا۔ ''کمانڈز آسان نہیں ہیں۔''

''اوکے دو منٹ اور۔'' اس نے زیادہ زور دینا مناسب نہیں سمجھا اور موبائل رکھ دیا۔ مونا نے کہا۔

''پاپا ہمیں اتھارٹیز کو اطلاع دینی چاہیے۔ وہ ہمیں بچانے کے لیے کچھ تو کریں گے۔''

شفیع اللہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں پہلے ہی سوچ چکا ہوں۔ اس صورتِ حال میں زمین سے کوئی ہماری مدد نہیں کرے گا۔''

''پھر بھی اطلاع تو دینی چاہیے۔'' باسط نے اصرار کیا۔

کیونکہ بم لگانے والے نے اس حوالے سے انہیں کوئی دھمکی نہیں دی تھی اس لیے شفیع اللہ نے انہیں اجازت دے دی۔ ''تم لوگ اپنے طور پر جو چاہے کرو میری توجہ فی الحال اس کے مطالبے پر ہے۔ میرے نزدیک ہماری ایک یہی لائف لائن ہے۔''

دو منٹ بعد طاہر نے اسے اطلاع دی۔ ''سرور تیار ہے سر لیکن یہ صرف آپ کے لیپ ٹاپ کو قبول کرے گا۔ مجھے اس تک رسائی دیں۔''

شفیع اللہ نے لیپ ٹاپ بینک سرور سے شیئر کیا اور طاہر نے اس میں سیٹنگ کر دی۔ اس نے کہا۔ ''سر اب آپ سرور تک مکمل ایکسیز کر سکتے ہیں۔''

اس نے چیک کیا۔ سرور اسے مکمل رسائی دے رہا تھا۔ اس نے پہلے ایک بینک اکاؤنٹ اوپن کیا۔ یہ کامیابی سے کھل گیا۔ اس اکاؤنٹ میں ایک کروڑ اور بارہ لاکھ ڈالرز کی رقم موجود تھی۔ دانیال غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''آپ یہ رقم منتقل کر رہے ہیں؟''

''ہاں، اسی شرط پر بم ڈی ایکٹی ویٹ کوڈ ملے گا۔''

دانیال نے اگلا سوال کیا۔ ''کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ رقم کی منتقلی ایک مخصوص مدت بعد ریورس ہو جائے۔''

شفیع اللہ کے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے طاہر سے پوچھا اور اس نے کہا۔ ''ہمارے سسٹم میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے، لیکن ہم شامل کر سکتے ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''ہمیں بینکوں کو درخواست بھیجنی ہوگی کہ اگر رقم ایک خاص مدت میں اکاؤنٹ سے نہ نکالی جائے تو وہ ریورس ہو جائے گی۔''

''اس کام میں کتنی دیر لگے گی؟''

''یہ بات بین الاقوامی بینکنگ کے ماہرین ہی بتا سکتے ہیں۔''

دانیال سب سن رہا تھا، اس نے شفیع اللہ سے کہا۔ ''انکل آپ یہ کام کریں اور رقم کی منتقلی مجھے کرنے دیں۔ میں زیادہ تیزی سے یہ کام کرلوں گا۔ آپ یہ کام تیزی سے نہیں کر رہے ہیں۔''

شفیع اللہ نے اسے گھورا۔ ''کوئی گڑبڑ ہوئی تو...''

''نہیں ہوگی پاپا۔'' رینا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''میں دانی کو جانتی ہوں۔''

شفیع اللہ نے لیپ ٹاپ دانیال کی طرف بڑھا دیا اور

وہ اسے لے کر اپنی سیٹ پر چلا گیا۔ شفیع اللہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے گا۔؟ اگر کنٹرول ٹاور کو اس واقعے کے بارے میں بتایا جائے تب بھی وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا امکان بہت کم تھا کہ کال کرنے والے کا سراغ لگایا جا سکے۔ وہ یقیناً کوئی ایسی سم استعمال کر رہا تھا جس سے اس کی طرف اشارہ بھی نہ جا سکے اور وائس چینجر کی وجہ سے اس کی آواز اتنی بدل چکی تھی کہ اسے آلات کی مدد سے بھی شناخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کال کرنے والا یقیناً لوکیشن بھی بدل رہا ہوگا تاکہ قانون نافذ کرنے والے اس تک نہ پہنچ سکیں۔ شفیع اللہ جانتا تھا کہ اس ملک میں قانون کے محافظ نہ تو اتنے تربیت یافتہ ہیں اور نہ ہی ان کے پاس ایسے ذرائع ہیں کہ وہ منٹوں اور گھنٹوں کیا دنوں میں بھی جرم کرنے والے تک پہنچ سکیں۔

اسے اطلاع تو دینی تھی لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ اس صورت میں کہیں اس کا وقت نہ ضائع ہو جو وہ اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی بچانے میں استعمال کر سکتا ہے۔ وہ بم لگانے والے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ فرض کر لیا جائے کہ وہ اپنا کام بھی کروا لیتا ہے اور اسے درست کوڈ نہیں بتاتا (ضیا حامد ایسا ہی کرتا) تب وہ اسے کس طرح مجبور کر سکتا ہے کہ وہ درست کوڈ بتائے۔ سوچتے ہوئے اسے اکاؤنٹس کا خیال آیا اور اس نے دانیال سے کہا کہ وہ اکاؤنٹس نمبر والی ای میل کو اسے فارورڈ کر دے۔ دانیال نے مشکل سے پندرہ سیکنڈ میں یہ کام کر دیا۔ کی بورڈ پر برق رفتاری سے چلتی اس کی انگلیاں دیکھ کر شفیع اللہ نے دل ہی دل میں تسلیم کیا کہ وہ اس رفتار سے یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو کی بورڈ پر ایک دو انگلیوں سے ٹائپ کرتا تھا، اس طرح ٹائپ کرتا کہ انگلیاں نظر ہی نہ آئیں اسے نہیں آتا تھا۔ دانیال اسی طرح ٹائپ کر رہا تھا۔ ای میل جاتے ہی اس نے موبائل پر بینک کے اکاؤنٹ ہولڈرز کے ریکارڈ کے شعبے کے انچارج حمید الدین سے رابطہ کیا۔

''ایک ای میل تمہارے آفیشل میل پر فارورڈ کی ہے اس میں موجود اکاؤنٹس ہولڈرز کی پروفائلز چیک کرو اور اکاؤنٹس کی ٹرانزیکشن ہسٹری دیکھو۔ میں آدھے گھنٹے بعد دوبارہ کال کرتا ہوں۔''

ایس ایس بینک کی درجنوں برانچز زرمبادلہ میں اکاؤنٹس رکھتی تھیں اور ایسے اکاؤنٹس کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ اس لیے ان ڈیڑھ سو اکاؤنٹس کی طرف کس کا دھیان جا سکتا تھا، کال کر کے اس نے پوچھا۔ ''اسمارٹ فون میں جو وائس چینجر ہوتے ہیں ان کی تبدیل شدہ آواز کو دوبارہ تبدیل کیا جا سکتا ہے؟''

''بالکل۔'' اس نے جواب دیا۔ ''بہ شرط کہ معلوم ہو جائے کہ وائس چینجر سوفٹ ویئر کون سا ہے۔ ویسے اس قسم کے سوفٹ ویئر بہت زیادہ نہیں ہیں اگر یہ عام قسم کا وائس چینجر ہے تو اس کا توڑ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اب اس کی کال آئے تو آپ وائس ریکارڈ کر لیجیے گا۔''

احمر، ظفر اور باسط کاک پٹ میں تھے بلکہ اس کے دروازے پر جمع تھے کیونکہ کاک پٹ میں گنجائش نہیں تھی۔ احمر اور ظفر کے اصرار پر کیپٹن صدیقی نے ان سے کہا۔ ''جب تک شفیع صاحب نہیں کہیں گے میں کنٹرول ٹاور کو نہیں بتا سکتا۔''

ظفر واپس آیا اور اس نے شفیع اللہ سے کہا۔ ''پاپا کیپٹن سے کہیں کہ وہ کنٹرول کو اطلاع کر دے۔''

شفیع اللہ نے کہا۔ ''میں نے اس بارے میں غور کیا ہے، بہتر ہوگا ہم اس معاملے میں ذرا صبر سے کام لیں۔''

شرمین، سونیا اور مونا اپنی نشستوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ رینا اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ ظفر نے خبردار کرنے کے انداز میں کہا۔ ''پاپا ہمارے پاس ایک گھنٹا اور پچاس منٹ کا وقت رہ گیا ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے اتھارٹیز ہماری مدد کر سکیں گی۔'' شفیع اللہ کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''وہ ایک گھنٹا اور پچاس منٹ میں اس شخص تک پہنچ کر اس سے بم کو ناکارہ کرنے والا کوڈ لے سکیں گی۔ نہیں، ہمیں اس صورتِ حال سے خود ہی نمٹنا ہوگا۔''

احمر بھی کاک پٹ کی طرف سے آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''پاپا اس کے پیچھے ضیا حامد ہی ہے اور وہ اپنا مطالبہ پورا کرا کے بھی درست کوڈ نہیں بتائے گا۔''

رینا بولی۔ ''ہاں پاپا ہم اس پر بھروسا نہیں کر سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی حفاظت کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔''

''مثلاً ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''پاپا اگر ہم ویڈیو میں یہ سب بیان کر کے اور ضیا حامد کے نام کے ساتھ اپنے کسی جاننے والے کو بھیج دیں تو اس کے خلاف یہ اہم ثبوت بن جائے گا۔ کم سے کم وہ بھی آسانی سے نہیں بچے گا۔'' رینا نے آئیڈیا پیش کیا جو شفیع اللہ کو اچھا لگا۔

''خیال اچھا ہے۔ مجھے بھی خیال آیا تھا کہ وہ غلط کوڈ دے سکتا ہے مگر اس مسئلے کا حل تم نے پیش کیا۔ اس صورت میں وہ ہمیں غلط کوڈ دیتے ہوئے سوچے گا۔'' شفیع اللہ نے

کہا۔ ''لیکن ہم یہ دھمکی اسے کوڈ لینے کے وقت دے سکتے ہیں اس سے پہلے یہ بیکار ہوگی۔''

''پاپا وزیر داخلہ شبیر شاہ آپ کے اچھے دوست ہیں۔'' احمر نے کہا۔ ''آپ ان سے رابطہ کیوں نہیں کرتے؟''

''یہ خیال بھی اچھا ہے، لیکن میں پہلے ایک اور کال کرنا پسند کروں گا۔''

''رقم کی منتقلی شروع ہوگئی ہے۔'' دانیال نے کہا۔ اس کی انگلیاں بہت تیزی سے لیپ ٹاپ پر چل رہی تھیں اور وہ بہت تیزی سے ایک کے بعد ایک اکاؤنٹ کھول کر اس سے رقم بتائے ہوئے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر رہا تھا۔ طریقہ آسان تھا۔ دوسری طرف رینا نے ویڈیو والے آئیڈیے پر عمل درآمد شروع کر دیا تھا۔ پہلے خواتین یہ کام کر رہی تھیں۔ سب کے پاس اسمارٹ فونز تھے جو اعلیٰ درجے کی ویڈیو بھی بنا سکتے تھے اور تیز انٹرنیٹ کے ذریعے اس ویڈیو کو فوری کہیں بھی بھیجا جا سکتا تھا۔ وہ سب اپنی ویڈیو بناتے بول رہی تھیں اور وہاں اچھا خاصا شور تھا۔ اس لیے شفیع اللہ اٹھ کر طیارے کے عقبی حصے میں آیا اور اس نے...... بین الاقوامی بینکنگ کے ماہر رشید امجد کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''یس سر؟''

''رشید میں کچھ بین الاقوامی اور غیر ملکی بینکوں کے نام بتا رہا ہوں تم ان سے رابطہ کر کے ٹرانسفر کی ہوئی رقم کم سے کم مدت میں ریورس کرنے کے معاہدے کی بات کر دے۔''

رشید امجد کسی قدر حیران ہوا۔ ''لیکن کیوں سر؟''

''پہلے تم یہ کام کر لو اور سمجھ لو کہ یہ ہماری اور بینک کی زندگی و موت کا مسئلہ ہے۔'' شفیع اللہ نے کہا اور اسے بینکوں کے نام بتائے۔ رشید انہیں نوٹ کرتا گیا۔

''سر تھرو پروپر چینل میں خاصی دیر لگے گی کیا براہِ راست بات کی جا سکتی ہے؟''

''بالکل اور اگر اس کام میں تاخیر ہو تو مخصوص اکاؤنٹس کی بات بھی کرنا کہ ان میں آنے والی رقم واپس ہو سکے۔ مگر یہ سب انتہائی رازداری سے ہونا چاہیے۔ تم آگے اکاؤنٹس کی بات بھی رازداری کی شرط پر کرو گے۔''

''سر منی لانڈرنگ یا دہشت گردی کی فنانس کا حوالہ دیا جا سکتا ہے؟''

''کرپشن اور منی لانڈرنگ کا حوالہ دے سکتے ہو۔'' شفیع اللہ نے سوچ کر کہا۔ ''تم سب چھوڑ کر اسی وقت سے کام کا آغاز کر دو اور جب تک کام مکمل نہ ہو جائے سیٹ سے مت اٹھنا۔''

''میں سمجھ گیا سر۔''

شفیع اللہ نے کال کاٹ کر موبائل فون سے بم کی کئی تصاویر لیں اور انہیں شبیر شاہ کے موبائل نمبر پر واٹس اَپ کر دیا۔ اتفاق سے شبیر شاہ بھی اس کا یونیورسٹی فیلو رہا تھا اور طلبہ سیاست میں وہ بھی سرگرم تھا۔ یونیورسٹی کے بعد اس نے سیاست کو ہی پیشہ بنایا کیونکہ اس کا خاندان سیاسی تھا۔ عملی زندگی میں آنے کے بعد ان کا آپس میں رابطہ کم ہو گیا تھا مگر وقفوں سے رابطہ یا ملاقات بھی ہوتی رہی تھی۔ شفیع اللہ نے کال کی مگر شبیر شاہ نے کاٹ دی۔ وہ کہیں مصروف تھا۔ لیکن شفیع اللہ کے لیے تو یہ زندگی و موت کا مسئلہ تھا اس نے پھر کوشش کی اور اس بار شبیر شاہ نے کال ریسیو کر لی۔ ''یار شفیع میں ایک اہم میٹنگ میں ہوں۔''

''میں سمجھتا ہوں لیکن میں زمین اور آسمان کے درمیان موت کے گھیرے میں ہوں۔'' شفیع اللہ نے جواب دیا۔ ''میں نے تمہیں ایک بم کی تصاویر واٹس اپ کی ہیں جو میرے طیارے میں نصب ہے، اسے دیکھ لو میں ایک منٹ بعد پھر کال کرتا ہوں۔''

بم کے لفظ نے شبیر شاہ کو چونکا دیا۔ اس نے تیزی سے کہا۔ ''کال مت کاٹنا۔''

شفیع اللہ انتظار کرنے لگا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے شبیر شاہ لائن پر تھا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ یہ بم ہی ہے؟''

''اس قسم کا بھونڈا مذاق کون کرتا ہے؟'' شفیع اللہ نے جواب دیا۔ ''ویسے زیادہ بہتر ماہرین ہی بتا سکتے ہیں۔ مجھے تو یہ بم ہی لگ رہا ہے۔''

''مجھے پوری بات بتاؤ۔''

شفیع اللہ نے کم سے کم الفاظ میں شبیر شاہ کو ساری کہانی سنائی۔ وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا کیونکہ اس نے ضیا حامد کا نام لیا پھر شبیر شاہ نے کہا۔

''ذمے دار کو بعد کے لیے چھوڑو، ابھی تم سب کو بچانا اہم ہے۔''

''نمبر نوٹ کر لو جس سے مجھے دو بار کال آئی ہے۔ میں وہ لسٹ بھی تمہیں ای میل کر رہا ہوں جس سے رقوم بیرونِ ملک ٹرانسفر کی جاتی ہیں۔''

نمبر نوٹ کر کے شبیر شاہ نے پوچھا۔ ''کیا تم رقم ٹرانسفر کرو گے؟''

''مجبوری ہے اسی صورت میں مجھے بم ڈی ایکٹو

کرنے والا کوڈ ملے گا۔''

شبیر شاہ نے معاملے کے قانونی پہلوؤں کی بات کی۔ ''ایسا کر کے تم ایک مجرم کی مدد کرو گے۔''

''یہ کام میں اپنے لیے کر رہا ہوں اگرچہ جانتا ہوں کہ یہ سنگین جرم ہے۔'' شفیع اللہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں لسٹ ای میل کر رہا ہوں۔''

وہ واپس کیبن میں آیا اور اس نے دانیال سے لسٹ شبیر شاہ کے ای میل پر فارورڈ کرائی۔ اس وقت تک دانیال تیس اکاؤنٹس کی رقم ٹرانسفر کر چکا تھا۔ یہاں اس کی مجبوری تھی کہ بینک سرور ایک وقت میں ایک ہی اکاؤنٹ کو آپریٹ کرنے کی اجازت دے رہا تھا۔ وہ اکاؤنٹ پر لاگ ان کرتا اور رقم ٹرانسفر کر کے منتقلی مکمل ہونے کے پیغام کا انتظار کرتا اور پھر اس اکاؤنٹ کے لاگ آف ہوتے ہی دوسرا اکاؤنٹ کھولتا تھا۔ ایک اکاؤنٹ وہ تیس سیکنڈ سے بھی کم وقت میں آپریٹ کر رہا تھا۔ رینا اس کے پاس کھڑی نوٹ کر رہی تھی کہ وہ کتنے اکاؤنٹ آپریٹ کر کے رقم منتقل کر چکا ہے۔

آنے سے پہلے شفیع اللہ نے بم کا ٹائم دیکھا تھا اور اس کی مناسبت سے اپنی گھڑی میں وقت دیکھ کر یاد کر لیا تھا۔ گھڑی کے مطابق بم دو بج کر ستائیس منٹ بعد پھٹ جاتا اور اس وقت ایک بجنے میں آٹھ منٹ تھے۔ گویا ان کے پاس پچانوے منٹ رہ گئے تھے۔ چاروں خواتین ویڈیو تیار کر چکی تھیں مگر انہوں نے اسے آگے فارورڈ نہیں کیا تھا۔ شفیع اللہ نے انہیں شبیر شاہ سمیت چار مختلف ای میل ایڈریس دیے کہ وہ ویڈیو ان پر میل کر دیں۔ ان میں ایک ای میل اس کا بھی تھا۔

''پاپا میں سوچ رہی ہوں اپنی فرینڈز کو بھی بھیج دوں۔'' رینا نے کہا۔

''ہرگز نہیں، یہ بات جتنے کم لوگوں کے علم میں آئے، اتنا بہتر ہوگا۔'' شفیع اللہ نے منع کیا۔ ''اگر بات قبل از وقت کھل گئی تو ضیا حامد پر پھر کیا دباؤ رہ جائے گا کہ وہ ہمیں درست کوڈ دے بلکہ اس صورت میں وہ اگر درست کوڈ دے رہا ہوگا تب بھی رک جائے گا۔''

''پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' ظفر نے کہا۔ ''ہمیں یہ ویڈیوز بچا کر رکھنی ہیں۔ ہم انہیں ایسے پرسنز کو ہی بھیج سکتے ہیں جو انہیں اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ وہ انہیں بعد میں متعلقہ حکام تک پہنچا سکتے ہیں۔''

''اللہ نہ کرے، یہ تم بعد کی بات کیوں کر رہے ہو۔'' مونا نے گھبرا کر کہا اور روہانسی ہو گئی۔ ''مجھے اپنے بچے کی فکر ہے۔''

باسط اس کے پاس چلا آیا۔ ''فکر مت کرو کچھ نہیں ہوگا۔''

رینا جو دانیال کے ساتھ تھی، وہ بھی بہن کے پاس چلی آئی اور اسے تسلی دینے لگی۔ ظفر اور احمد بھی اپنی بیویوں کے پاس تھے۔ شفیع اللہ ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ مگر وہ سب کے ساتھ تھا۔ اس کے لیے کوئی زیادہ فکرمند نہیں تھا اور وہ سب کے لیے فکرمند تھا۔ اگر اسے فکر نہیں تھی تو اپنی ذات کی نہیں تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنا وقت گزار چکا تھا اور اب اسے ان کے لیے سوچنا تھا۔ اس کی کل کمائی یہی اولاد تھی۔ وہ ان کے بدلے بہ خوشی مرنے کو تیار تھا مگر اپنی زندگی میں انہیں مرتے دیکھنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ضیا حامد اسے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔ یونیورسٹی کی دوستی بھی محدود مدت کے لیے تھی۔ پھر جب وہ اقتدار میں آیا تو شفیع اللہ نے اس سے دور رہنے کی پوری کوشش کی۔ ضیا نے خود اس سے رابطہ کیا تھا۔ شفیع اللہ نے اسے انکار کیا تھا اور جب تک وہ اقتدار میں رہا شفیع اللہ اپنے اور اپنے خاندان کی سلامتی کے حوالے سے فکرمند رہا تھا۔ اس دور میں وہ خود بھی محتاط رہا تھا اور بچوں کو بھی محتاط رہنے پر مجبور کیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اس ملک میں چند ہزار میں ٹارگٹ کلر مل جاتا ہے جو کسی بھی شخص کو بہ آسانی نشانہ بنا سکتا ہے۔ صرف زندگی و موت پر پختہ ایمان ہی اسے ترکِ وطن سے روکے ہوئے تھا۔ یہ پانچ سال اس نے بہت مشکل سے گزارے تھے۔ پھر ضیا حامد کی پارٹی کو الیکشن میں بدترین شکست ہوئی اور وہ ایوانِ اقتدار سے رخصت ہوا تو شفیع اللہ کے ساتھ بہت سے دوسرے افراد نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔ یہ اس کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ ضیا حامد اس وقت وار کرے گا جب شفیع اللہ کے خیال میں وہ اس قابل نہیں رہا تھا۔ شاید یہ اس کی بھول تھی۔ وہ اب اقتدار میں نہیں تھا مگر اس کے پاس ذرائع کی کمی نہیں تھی۔ اس نے بہت صفائی سے شفیع اللہ کے طیارے میں بم نصب کرا دیا تھا۔ وہ کاک پٹ تک آیا اور اس نے پہلی بار کیپٹن صدیقی سے پوچھا۔

''بم کیسے آن بورڈ ہوا؟''

''سر ہمارا کام پرواز سے پہلے ان تمام فنکشنز کو چیک کرنا ہوتا ہے جن پر پرواز کا دار و مدار ہوتا ہے۔'' کیپٹن صدیقی نے جواب دیا۔ ''ہم عام طور سے کیبن کو سرسری سا

چیک کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ بم کہاں ہے اور اسے کیوں چیک نہیں کیا جا سکا۔"

"میرے ساتھ آؤ۔" شفیع اللہ اسے طیارے کے عقبی حصے میں لایا اور بم کا دیدار کرایا۔ "کیا اس جگہ کو چیک کرنا تمہاری ذمے داری نہیں ہے؟"

کیپٹن صدیقی نے نفی میں سر ہلایا۔ "سر طیارے کے یہ حصے صرف اوور ہالنگ اور صفائی کے دوران ہی چیک ہوتے ہیں۔"

"صفائی کس کی ذمے داری ہے؟"

"آف کورس ہینگر کے عملے کی۔ ہم ہینگر کی فیس ادا کرتے ہیں' اس میں طیارے کی دیکھ بھال اور صفائی بھی شامل ہے۔"

شفیع اللہ سوچ میں پڑ گیا۔ "تب یہ ہینگر کے عملے میں سے کسی کا کام ہے؟"

کیپٹن صدیقی نے بم دیکھا۔ "کوئی فرد اسے نصب نہیں کر سکتا ہے' یہ کام یقیناً کسی ماہر نے کیا ہے لیکن اسے یہاں تک لانے کا ذمے دار یقیناً عملے کا کوئی فرد یا افراد ہیں۔"

شفیع اللہ سوچ رہا تھا کہ اس کے بارے میں بعد میں تفتیش کی جا سکتی ہے۔ پہلا مرحلہ تو جان بچانے کا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "فیول کی کیا پوزیشن ہے؟"

"ہم نے مکمل ایندھن کے ساتھ پرواز کی تھی۔" کیپٹن صدیقی نے فیول میٹر پر نظر ڈالی۔ "اس وقت بھی طیارے میں گنجائش کا چوہتر فیصد ایندھن ہے۔"

"طیارہ اس فیول کی مدد سے کتنی دیر پرواز کر سکتا ہے؟"

"اس رفتار سے کم سے کم دو گھنٹے۔" کیپٹن صدیقی نے جواب دیا۔ "یہ اس رفتار سے ہے اگر اسے کم کر دیا جائے تو ہم سوا دو گھنٹے سے زیادہ وقت پرواز کر سکتے ہیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں، جلد از جلد دارالحکومت پہنچنے کی کوشش کرو کسی صورت میں شاید ہمیں فوری لینڈنگ کرنا پڑے۔" شفیع اللہ کہتے ہوئے باہر آیا اور اس نے مفروضہ ہائی جیکر کا نمبر ملایا مگر وہ بند جا رہا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ بم لگانے والا معمولی آدمی نہیں تھا اور اس کی ہر پہلو پر نظر تھی، اس نے یقیناً موبائل نمبر کے بارے میں بھی سوچا ہوگا۔ یقیناً اس کے پاس ایسے کئی نمبرز ہوں گے جو اس سے متعلق نہیں ہوں گے۔ اب وہ کسی نئے نمبر سے رابطہ کرے گا۔ شفیع اللہ اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا مگر اس کے پاس انتظار کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہائی جیکر سے تب ہی بات ہو سکتی تھی جب وہ خود رابطہ کرتا۔ دانیال اپنے کام میں لگا ہوا تھا اور اس نے پچاس اکاؤنٹس سے رقم آگے ٹرانسفر کر دی تھی۔ دس منٹ ہو گئے تھے اور وہ حمید الدین کو کال کرنے جا رہا تھا کہ شبیر شاہ کی کال آنے لگی۔ شفیع اللہ کو خیال آیا کہ اس نمبر کو فری رہنا چاہیے۔ ہائی جیکر کسی وقت بھی کال کر سکتا ہے، اس نے کال ریسیو کی اور شبیر شاہ سے کہا۔

"ایک نمبر نوٹ کر لو اب اس پر کال کرنا۔"

شبیر شاہ نے نمبر نوٹ کیا اور اس پر کال کی۔ شفیع اللہ نے دوسرا موبائل نکال کر کال وصول کی۔ شبیر شاہ نے کہا۔ "میں نے اپنے محکمے کے ماہرین کو دکھایا ہے اور انہوں نے اسے ایک خطرناک اور جدید ترین بم قرار دیا ہے جسے ناکارہ بنانا بہت ہی مشکل ہے۔"

"فون نمبر کا کیا ہوا؟"

"یہ کسی اکرم انصاری کے نام پر ہے۔ پولیس اسے تلاش کر رہی ہے۔"

"بیکار ہے اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔"

"پولیس کی گاڑی تو تفتیش سے چلتی ہے۔"

"لوکیشن نکالی ہے؟"

"اس میں کچھ وقت لگے گا۔"

شفیع اللہ نے کہا۔ "فی الحال میں نہیں چاہتا کہ ضیا حامد کو چھیڑا جائے۔ بات قبل از وقت کھل گئی تو وہ ہمیں درست کوڈ نہیں دے گا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر ہم نے ویڈیو میں یہ سارا واقعہ بیان کر کے اور ضیا حامد کو اس کا ذمے دار قرار دے کر مختلف جگہوں پر ای میل کر دی ہے، ان میں سے ایک تمہارا بھی ہے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا ہے۔" شبیر شاہ نے کہا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اس کی تشہیر نہ ہو۔ ائرپورٹ پر ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا ہے مگر اسے ریہرسل قرار دیا ہے۔ خوش قسمتی سے اگلے دو گھنٹے تک کوئی پرواز نہیں جا رہی ہے اور آنے والی پروازوں کو موسم کی خرابی کا کہہ کر دوسرے ائرپورٹس کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ اس وقت ائرپورٹ تمہارے لیے بالکل فری ہے۔"

"رقم کے بارے میں کسی سے بات کی ہے۔ جن بینکوں میں یہ رقم جا رہی ہے، وہ سب جنوبی امریکا کے ملکوں میں ہیں اور وہاں ایسے بینکوں کی بھرمار ہے کیونکہ کوئی مرکزی مالیاتی پالیسی نہیں ہے۔" شفیع اللہ نے کہا لیکن اس

نے شبیر شاہ کو یہ نہیں بتایا کہ ان بینکوں سے ٹرانسفر ریورس کرنے کی بات کی جارہی ہے۔ بات کرتے ہوئے اس نے گھڑی دیکھی۔ ''یہ سب بعد کی باتیں ہیں اصل بات یہ ہے کہ ہمارے پاس صرف تراسی منٹ رہ گئے ہیں۔''

''میں سول ایوی ایشن والوں سے بات کررہا ہوں۔ ائرفورس کو بھی پیغام بھیجا ہے کہ وہ اس مسئلے کا کوئی حل نکال سکتے ہیں تو نکالیں۔''

شفیع اللہ سمجھ رہا تھا کہ مسئلے کا حل شاید کسی کے پاس نہ ہو سوائے اس کے جس نے یہ بم لگایا تھا۔ اس نے کال کاٹ کر حمید الدین کو کال کی۔ ''تم نے اکاؤنٹس چیک کرلیے؟''

''جی سر۔'' حمید الدین نے کہا۔ ''یہ سارے اکاؤنٹس دو ہفتوں کے درمیان کھولے گئے ہیں۔ تمام میں اکاؤنٹ ہولڈر کا پتا دور دراز قصبوں اور اندرون صوبے کا ہے۔ تمام اکاؤنٹس ایک ہزار ڈالرز سے کھولے گئے۔ اس کے بعد ان میں وقفے وقفے سے نقد رقوم جمع کرائی جاتی رہیں۔ کسی بھی اکاؤنٹ سے کوئی رقم نہیں نکالی گئی۔ کسی بھی اکاؤنٹ ہولڈر نے چیک بک کی درخواست نہیں دی۔ ایک بار اکاؤنٹ کھلوانے کے بعد کسی بھی شخص نے اپنی برانچ کا وزٹ نہیں کیا۔ تمام اکاؤنٹس ایسی برانچز میں کھلوائے گئے جو چھوٹے شہروں میں ہیں۔''

''گڈ تم نے تقریباً تمام ہی سوالوں کے جواب دے دیے جو میں پوچھنا چاہتا تھا۔ ایک سوال ہے ان میں سے کوئی غیر ملکی ہے؟''

''نہیں تمام مقامی لوگ ہیں۔'' حمید الدین نے تصدیق کی۔ ''صورت سے یہ بہت نچلے طبقے کے افراد لگ رہے ہیں جن کے لیے شاید مقامی کرنسی میں اکاؤنٹ کھولنا بھی ممکن نہ ہو۔''

''اکاؤنٹس میں کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ رقم کتنی ہے؟''

''کروڑ ڈالرز سے کم کسی اکاؤنٹ میں نہیں ہے اور زیادہ سے زیادہ اماؤنٹ ایک کروڑ اڑتالیس لاکھ ڈالرز کا ہے۔''

یہ سن کر شفیع اللہ حیران و پریشان ہوگیا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ نظام حکومت کا شعبہ زوال پذیر تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ وقت ملک وقوم سے زیادہ اپنے بارے میں سوچنے کا ہے۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ اس کے مطابق اٹھتر منٹ باقی رہ گئے تھے۔ گویا زیادہ وقت نہیں رہا تھا۔

وہ دانیال کے پاس آیا۔ وہ جتنی تیزی سے رقم ٹرانسفر کررہا تھا، ایسا لگ رہا تھا کہ پون گھنٹے میں وہ ٹرانسفر مکمل کرلے گا۔ ٹرانسفر شروع ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ شفیع اللہ نے دوسرے موبائل سے رشید امجد کو کال کی۔ اس نے کہا۔ ''سر میری نصف درجن بینکوں کے صدور سے بات ہوئی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ باقاعدہ معاہدے کے تحت ہی ایسا ہوسکتا ہے۔ صرف زبانی کلامی کہنے پر وہ کسی بھی اکاؤنٹ سے رقم ریورس نہیں کرسکتے ہیں۔''

شفیع اللہ مایوس ہوا۔ ''گویا انہوں نے انکار کردیا ہے؟''

''تقریباً ایسا ہی ہے سر۔'' رشید امجد نے دبے لفظوں میں کہا۔ ''سر آپ جانتے ہیں بینکوں کی اولین ترجیح ان کے کسٹمرز ہوتے ہیں، وہ ان کے مفاد کو نقصان پہنچانے لگیں تو کسٹمرز بھاگ نہیں جائیں گے۔''

شفیع اللہ کی مایوسی اس حوالے سے بھی تھی کہ اگر ضیا حامد نے غلط کوڈ بتایا اور بم بلاسٹ ہوگیا یا سرے سے کوڈ ہی نہیں بتایا تو وہ اس کے باوجود بچ کر نکل جائے گا۔ ٹھوس ثبوت کے بغیر اسے روکنا مشکل تھا۔ باقی سب اپنی نشستوں پر خاموش اور مایوس بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے ستے ہوئے اور آنکھیں آنے والے وقت کے اندیشوں سے چھلک رہی تھیں۔ شفیع اللہ انہیں تسلی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے پاس تسلی کے لیے بھی الفاظ نہیں تھے۔ جو اس کے بس میں تھا، وہ کررہا تھا۔ اس نے اڑتے طیارے کے باہر روشن آسمان اور کہیں کہیں نظر آتے روئی جیسے بادلوں کی طرف دیکھا۔ شاید کچھ دیر بعد وہ یہ سب دیکھنے کے قابل نہیں رہے گا۔

اس نے اپنی زندگی میں کوئی غلط کام نہیں کیا تھا، کسی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ اس نے اپنی ذمے داریاں پورے ایمان کے ساتھ ادا کی تھیں۔ اس نے ٹیکس کا ایک روپیہ بھی چوری نہیں کیا تھا۔ کسی عام آدمی کے ساتھ زیادتی نہیں کی تھی بلکہ ہمیشہ ان کے کام آنے کی کوشش کی تھی مگر اس کے ساتھ ایسا ہورہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے تقریباً پورے خاندان کے ساتھ فضا میں بکھر جاتا اور ضیا حامد جیسے بدعنوان اپنی کالی کمائی اس کی مدد سے بیرون ملک منتقل کرکے آرام سے یہاں سے چلے جاتے اور باقی زندگی عیش و آرام سے گزارتے۔ یہ کیسی ناانصافی تھی۔ بیل نے اسے چونکایا اس کے موبائل پر اجنبی نمبر سے کال آرہی تھی۔ اس نے کال ریسیو کرنے سے پہلے وائس ریکارڈنگ آن کردی تھی۔ دوسری طرف سے وہی مشینی آواز آئی۔ ''تم نے کام شروع

گردیا ہے؟''
''یقیناً اور تم نے چیک کرلیا ہوگا؟''
''ہاں لیکن ابھی تک صرف چالیس فیصد رقم آئی ہے۔''
''یہ کام آسان نہیں ہے۔ ایک ایک اکاؤنٹ اوپن کرکے رقم ٹرانسفر کرنا پڑ رہی ہے۔ تصدیق میں بھی کچھ وقت لگتا ہے مگر اتنا وقت نہیں ہے کہ تصدیق کے لیے اکاؤنٹ اوپن رکھا جائے۔ سرور ایک وقت میں ایک اکاؤنٹ اوپن کرنے کی اجازت دے رہا ہے۔''
''خیر ابھی خاصا وقت ہے۔''
''تمہارے کام کے لیے۔'' شفیع اللہ نے تلخی سے کہا۔''ہمارے پاس بہت کم وقت رہ گیا ہے۔''
مشینی آواز نے قہقہہ لگایا جو کانوں کو بہت برا لگا تھا۔
''فکر مت کرو جیسے ہی ساری رقم منتقل ہوگی، میں تمہیں کوڈ بتا دوں گا۔''
''کیا ضمانت ہے کہ تم ایسا ہی کرو گے؟''
شفیع اللہ کے اس سوال کے جواب میں وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔''کوئی ضمانت نہیں ہے، تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا ہوگا۔''
''اعتبار اور تم پر۔'' شفیع اللہ نے تلخ لہجے میں کہا۔
اس نے پھر کروہ قہقہہ لگایا۔''اس کا مطلب ہے تم مجھے جانتے ہو؟''
''میں تمہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب تمہیں کوئی اور نہیں جانتا تھا۔ لوگوں نے اب جاکر تمہیں جانا ہے، تمہارا اصل روپ میں نے بہت پہلے دیکھ لیا تھا۔''
''دیکھا جائے تو تم نے بھی مجھے نہیں جانا ہے ورنہ مجھے یوں ہلکا نہ لیتے۔''
''میں نے تمہارے معاملے میں کبھی خود پر بھروسا نہیں کیا مجھے ہمیشہ اوپر والے پر بھروسا رہا ہے۔ اب بھی میں اسی پر ایمان رکھتا ہوں۔ جہاں تک تمہارا تعلق ہے' مجھے یقین ہے تم مجھے دھوکا دینے کی کوشش ضرور کرو گے۔''
وہ صورتِ حال سے لطف اندوز ہورہا تھا۔''فرض کرو میں تمہیں غلط کوڈ دے دوں یا سرے سے کوڈ ہی نہ دوں تو تم کیا کرلو گے۔ اول تو بم ٹھیک پینتیس منٹ بعد پھٹ جائے گا اور اگر اس پر ٹائمر نہ بھی لگایا جاتا تب بھی دس ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے آتے ہی یہ پھٹ جاتا۔ یعنی تمہارے پاس بچنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔''
''میں سمجھ رہا ہوں۔'' شفیع اللہ کا لہجہ پست ہوگیا۔
''تم مان کیوں نہیں لیتے کہ تم میرے رحم وکرم پر ہو؟''
''اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ ہمارے نصیب میں ایسی موت لکھی ہے تو ہم کیا کرسکتے ہیں؟''
''تم نصیب کے قائل ہو؟''
''شاید تم نہیں ہو لیکن جلد قائل ہو جاؤ گے جب موت کا فرشتہ تم سے ملنے آئے گا۔''
''کچی بات ہے، مجھے ان باتوں پر یقین نہیں ہے۔''
''میں جانتا ہوں اگر تمہیں یقین ہوتا تو تم اس حد تک نہ گرتے کہ اپنا وہ سارا امیج تباہ کرلیتے جو تم نے اس ملک کے کروڑوں لوگوں کے ذہنوں میں بنا لیا تھا۔ ضیا تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ تم نے اس ملک کی سیاست اور اچھے سیاست دانوں کو کتنا نقصان پہنچایا ہے اب لوگ شاید ہی کسی سیاست داں پر اعتماد کریں۔''
''عوام۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔''اس ملک کے لوگ اسی قابل ہیں کہ انہیں میرے جیسے حکمران ملیں۔''
''دیکھا جائے تو تم بھی ٹھیک کہہ رہے ہو جیسے لوگ ہوتے ہیں اس ملک کے حکمران بھی ویسے ہی ہوتے ہیں۔''
''خیر چھوڑو یہ ایک لمبی بحث ہے، یہ بتاؤ کہ میرا تحفہ کیسا لگا؟''
''تم نے ایک دن پہلے ہی بھیج دیا۔''
''ہاں کیونکہ شاید کل میرے پاس وقت نہیں ہوگا۔''
''یا شاید میں ہی نہیں ہوں گا۔''
''تم زیادہ ہی مایوس ہو رہے ہو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہیں بچنے کا چانس دوں گا۔''
''مجھے یقین نہیں ہے۔''
''او کے لیکن اس یقین کی بنیاد پر ٹرانسفر مت روکنا۔''
''میرا خیال ہے نصف سے زیادہ رقم جا چکی ہے۔''
شفیع اللہ نے دانیال کی طرف دیکھا تو اس نے سر ہلا کر اس کی بات کی تصدیق کی تھی۔''میں نے کہا نا کہ یقین مجھے تم پر نہیں بلکہ اپنے اللہ پر ہے۔ بائی دی وے اگر میں ابھی ٹرانسفر روک دوں تو؟''
''تو تم اس چانس سے محروم ہو جاؤ گے جو میں تمہیں دوں گا۔ میں اب آدھے گھنٹے بعد رابطہ کروں گا۔ مجھے امید ہے اس وقت تک ٹرانسفر کا کام مکمل ہو جائے گا۔''

☆☆☆

ضیا حامد بے حد خوش تھا۔ وہ ایک خاص سسٹم کی مدد

سے شفیع اللہ سے رابطہ کر رہا تھا۔ یہ ایک طاقتور ڈیجیٹل ٹرانسمیشن سسٹم تھا۔ جو بیس میل کے دائرے میں بہ خوبی کام کرتا تھا۔ اس کا سیکریٹری ایک گاڑی میں شہر کا چکر لگا رہا تھا اور اس کے پاس مختلف موبائلز سمیں تھیں۔ وہ کال ملاتا اور موبائل کو ٹرانسمیٹر سے منسلک کر دیتا۔ یہ سسٹم اس طرح کام کرتا تھا کہ سننے والے کو شبہ بھی نہیں ہوتا کہ کال کسی ذریعے سے اس تک آرہی ہے۔ ضیا اپنی کوٹھی میں موجود تھا اور ٹرانسمیٹر اس کے سامنے میز پر رکھا ہوا تھا۔ کال آنے کی صورت میں اسے ہاتھ بھی نہیں ہلانا پڑتا تھا۔ جب وہ کال کرنے یا منقطع کرنے کو کہتا تو اس کا سیکریٹری جو سن رہا ہوتا تھا، وہ کال ملاتا یا منقطع کر دیتا تھا۔ منصوبہ ضیا نے بنایا تھا مگر سارا کام اس کے آدمیوں نے کیا تھا اور بہت صفائی سے کیا تھا۔ اس نے کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا جو اس کی نشان دہی کر سکتا۔

دو ارب ڈالرز کچھ ہی دیر میں ان بینک اکاؤنٹس میں پہنچ جاتے جہاں سے وہ انہیں بہ آسانی نکلوا سکتا تھا۔ یہ سارے بینک جنوبی امریکا کے ایک ملک کے ایک ہی شہر میں تھے اور آنے والے دن میں اس کے آدمی چند گھنٹوں میں یہ رقم نکلوا لیتے۔ ضیا کے بیوی اور بچے اسپین میں تھے۔ کل تک وہ بھی ان کے پاس پہنچ جاتا۔ اس کی بیوی سمیرا تابانی ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور ضیا نے اسی وجہ سے اس سے شادی کی تھی۔ اسے سیاست میں اپنے سسرال سے بہت سپورٹ ملی تھی، خاص طور سے اسٹیبلشمنٹ سے اس کے روابط انہوں نے ہی کرائے تھے اور اسی وجہ سے وہ اقتدار کی آخری سیڑھی تک پہنچا تھا۔ نہایت حسین اور دلکش سمیرا عمر میں اس سے پندرہ سال چھوٹی تھی۔ چالیس سال کی عمر میں بھی اس نے خود کو اتنا سنبھال کر رکھا ہوا تھا کہ تیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ سمیرا سے اس کے تین بچے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ وہ بچپن سے زیادہ تر باہر رہے تھے۔ بیوی بچوں کا خیال آیا تو اس نے ٹرانسمیٹر کا مائک آف کرتے ہوئے موبائل سے سمیرا کو کال کی۔ اس نے کال کچھ دیر بعد ریسیو کی اور مرتعش لہجے میں بولی۔

''ضیا کیسے ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں، کیا ہوا تمہارا سانس کیوں پھولا ہوا ہے؟''

''بچوں نے تھکا دیا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہم لان میں فٹ بال کھیل رہے تھے۔''

''بچے کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہیں۔ کھیل رہے ہیں۔''

''تم لوگوں کے لیے ایک خوش خبری ہے۔'' ضیا حامد نے کہا۔ ''میں آج رات کی فلائٹ سے روانہ ہو رہا ہوں کل کسی وقت تمہارے پاس ہوں گا۔''

''ریئلی۔'' سمیرا نے چیخ ماری۔

''ہاں۔'' ضیا نے کہا۔ ''لیکن بچوں کو مت بتانا ان کے لیے سرپرائز ہوگا۔''

سمیرا کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے پوچھا۔ ''دوسرے معاملات کا کیا ہوا جن کی وجہ سے تم رکے ہوئے تھے؟''

''ان ہی کے نمٹنے پر تو میں آرہا ہوں۔''

''کب کی فلائٹ ہے اور یہاں کب تک پہنچ جاؤ گے؟''

''آج رات کی ہے لیکن کنیکٹنگ فلائٹ ہے، میرا خیال ہے دس بارہ گھنٹے لگ سکتے ہیں۔''

☆☆☆

سمیرا نے کال ختم ہونے کے بعد ظہیر کی طرف دیکھا۔ وہ بستر پر ایک چادر تلے تھا۔ کچھ دیر پہلے سمیرا بھی اسی چادر تلے اس کے پاس تھی مگر موبائل کی کال سننے اسے مڑ کر اس جہازی سائز بیڈ کے دوسرے کنارے تک آنا پڑا تھا۔ اس کا موبائل سائڈ دراز پر تھا۔ کمرا نیم تاریک تھا مگر روشنی اتنی ضرور تھی جو سمیرا کی بے لباسی کو واضح کرتی۔ ضیا حامد کی کال اور اس کی آمد کی خبر بچوں کے لیے سرپرائز ہو نہ ہو۔ سمیرا اور ظہیر الدین چودھری کے لیے ضرور سرپرائز تھی۔ سمیرا نے موبائل رکھ کر ظہیر سے کہا۔ ''وہ آرہا ہے، کل کسی وقت یہاں پہنچ جائے گا۔''

ظہیر نوجوان لڑکا تھا۔ اس کی عمر پچیس سے زیادہ نہیں تھی اور وہ اسپین میں آٹو موبائل انجینئرنگ پڑھ رہا تھا۔ اس کا تعلق ایک جاگیردار گھرانے سے تھا اور اس کی سمیرا سے ملاقات اسپین میں ہی ہوئی تھی۔ سمیرا پہلی ملاقات میں اس پر فدا ہو گئی، وہ تھا بھی مردانہ وجاہت کا نمونہ۔ مگر سمیرا کے مقابلے میں سادہ تھا۔ اس لیے سمیرا کو اسے اپنی طرف متوجہ کرنے اور اپنے جال میں پھنسا لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ جب سمیرا کی اس سے ملاقات ہوئی تو وہ سیاحت کے لیے یہاں آئی تھی۔ پھر اس نے ضیا کو مجبور کر کے یہیں اپنی مستقل رہائش اختیار کر لی۔ ان کا تعلق گزشتہ دو سال سے بہ خیر و خوبی چلا آرہا تھا کیونکہ ضیا کو حکومت اور در حقیقت کرپشن سے فرصت نہیں تھی جو وہ اپنی

بیوی کے شب و روز پر غور کرتا۔ بچے زیادہ تر بورڈنگ میں ہوتے تھے اس لیے سمیرا اور ظہیر کو کھل کھیلنے کا پورا موقع ملا تھا۔ اب ضیا کی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ درحقیقت اس کی سیاست ختم ہو گئی تھی اور وہ جلد یہاں آنے والا تھا۔

دونوں ہی آنے والے وقت سے پریشان اور ایک دوسرے کے لیے بے تاب تھے اس لیے ظہیر بچوں کے ولا میں ہوتے ہوئے اس سے ملنے پہنچ گیا۔ یہ ولا جنوبی اسپین کے سمندر کے نزدیک ایک پہاڑی پر تھا۔ یہاں سے نہ صرف آس پاس کا منظر واضح نظر آتا تھا بلکہ دور سمندر کی نیلی جھلک بھی دکھائی دیتی تھی۔ ظہیر ایک گھنٹا پہلے آیا تھا۔ سمیرا اس سے ملاقات کے معاملے میں بہت محتاط تھی اسی لیے بچوں کو ڈرائیور کے ہمراہ سیر پر بھیج دیا تھا اور خود یہاں ظہیر کے ساتھ بیڈروم میں تھی۔ ان کا وقت بہت سرمستی میں گزر رہا تھا مگر ضیا کی کال نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ بہرحال ضیا کی آمد ظہیر کا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ سمیرا کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ میں گم تھی پھر اس نے سائڈ پر پڑا ہوا گاؤن اٹھا کر پہنتے ہوئے کہا۔ ''اب ہم کچھ عرصے نہیں مل سکیں گے۔''

ظہیر بے تاب ہو گیا۔ ''اس لیے کہ وہ آجائے گا؟''

''ہاں اس لیے بھی۔'' سمیرا نے اس کی طرف دیکھا۔ ''آج کے بعد جب تک میں نہ رابطہ کروں، تم مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کرو گے۔''

ظہیر نے حسرت سے اسے دیکھا۔ ''میں تم سے اتنے دن دور کیسے رہوں گا؟''

''رہنا پڑے گا۔'' سمیرا کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ''اس کے بعد ہم ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔''

ظہیر چونکا۔ ''کیا تم ضیا سے طلاق لے لو گی؟''

سمیرا نے ظہیر کے گال پر ہاتھ پھیرا۔ ''تم اس کی فکر مت کرو۔ ویسے بھی دو مہینے بعد تمہارے پیپرز ہیں بہتر ہو گا تم ان کی تیاری کرو۔ اس بار سمسٹر میں رہ گئے تو ایسا نہ ہو کہ تمہارے گھر والے تمہیں واپس بلالیں۔''

بادل ناخواستہ ظہیر وہاں سے رخصت ہوا تھا۔ باہر شدید سردی تھی۔ برف باری ہوئی تھی مگر زیادہ برف نہیں گری تھی۔ سورج بلند ہو گیا تھا مگر اس کی کرنیں حدت سے خالی تھیں۔ زیتون اور نارنگی کے درختوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی ظہیر کی کار ولا سے نکل گئی تو سمیرا نے گہری سانس لی اور شال لپیٹتے ہوئے ٹیرس سے اندر آئی۔ اس نے موبائل اٹھا کر ایک نمبر ملایا۔ دوسری بیل کے ساتھ ہی دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی مگر ریسیو کرنے والے نے کچھ نہیں کہا۔ سمیرا بولی۔ ''میں آج دوپہر لنچ پر تم سے اسپالا میں ملوں گی۔''

جملہ مکمل کرتے ہی اس نے کال کاٹ دی۔

☆☆☆

رینا، دانیال کے نزدیک کھڑی تھی اور اس کی نظر لیپ ٹاپ کی اسکرین پر تھی۔ دانیال آخری چند اکاؤنٹس سے رقم ٹرانسفر کر رہا تھا درمیان میں اس نے رک کر صرف ایک گلاس پانی پیا تھا۔ رینا نے اسے انرجی ڈرنک کا کہا مگر اس نے منع کر دیا۔ رینا سوچ رہی تھی اس نے شفیع اللہ کے پاس آکر کہا۔ ''پاپا اس نے کیا کہا ہے؟''

''اس کا کہنا ہے کہ وہ مجھے ایک چانس دے گا۔''

''پاپا وہ دھوکا دے رہا ہے۔''

''شاید لیکن جب اس نے چانس والی بات کی تھی تو مجھے لگا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔''

''پاپا اس کا بھیجا ہوا کارڈ مجھے عجیب لگ رہا ہے آخر اسے نیو ایئر کارڈ بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''میں بھی نہیں سمجھ سکا اس نے اسے گفٹ قرار دیا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ اس نے ایک دن پہلے بھیج دیا ہے تو اس نے...'' شفیع اللہ کہتے کہتے رک گیا۔ وہ ضیا کے الفاظ دہرا کر یہاں خوف نہیں پھیلانا چاہتا تھا مگر رینا سمجھ گئی تھی اس نے آہستہ سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ کل ہم نہیں ہوں گے؟''

شفیع اللہ نے محبت سے اپنی لاڈلی بیٹی کو دیکھا اور بولا۔ ''ہمیں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہماری زندگی باقی ہے تو وہ کوئی نہ کوئی سبب پیدا کر دے گا۔''

رینا نے جھک کر اس کے شانے سے سر لگا دیا۔ ''پاپا مجھے مرنے سے ڈر لگتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ ڈر اس بات سے لگ رہا ہے کہ آپ سب بھی...'' رینا کی آواز گھٹ گئی۔ وہ رونے لگی۔ شفیع اللہ اس کا سر تھپکنے لگا۔

ظفر کھڑا ہو گیا۔ ''پاپا ہم کچھ نہیں کر سکتے؟''

''ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' شفیع اللہ نے دونوں ہاتھ پھیلائے۔

''وہ اپنا کام کر کے نکل جائے گا۔'' احمر نے تلخی سے کہا۔

''اور کبھی پکڑ میں نہیں آئے گا۔'' باسط نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔ ''اس ملک میں کسی بڑے مجرم کو پکڑنے کا رواج نہیں ہے۔''

''مجرم بھی وہ جو یہاں سے نکل جائے۔'' ظفر نے مایوسی سے کہا۔ ''وہ بہت گھٹیا اور سفاک آدمی ہے۔''

''وہ کتنا ہی سفاک اور ظالم ہو جائے۔ بہرحال اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔''

''پاپا ہمارے بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔'' احمر نے بھی مایوسی سے کہا۔

''میرے بچو... اگر تم لوگ اس حد تک مایوس ہو چکے ہو تو بہتر نہیں ہوگا کہ اس کے سامنے اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگ لو جس کے پاس جانے والے ہو۔''

شرمین اور مونا رونے لگے .... ''پلیز پاپا ایسی بات مت کریں۔''

''یہ باتیں تمہارے شوہر پہلے ہی کر رہے ہیں۔'' شفیع اللہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''ممکن ہے ہم بچ جائیں اور ممکن ہے نہ بچ سکیں۔ اگر بچ گئے تو ہمارے لیے ایک سبق ہوگا۔ انسان دنیاوی لحاظ سے کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو جائے، موت کے سامنے وہ اتنا ہی بے بس ہوتا ہے جتنا کہ کوئی حقیر سا کیڑا ہو سکتا ہے۔''

''پاپا کیا یہ ان باتوں کا وقت ہے؟'' احمر نے وحشت زدہ ہو کر کہا۔

''ان ہی باتوں کا وقت ہے۔'' شفیع اللہ مسکرایا۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے۔ ''ہمارے بس میں کچھ نہیں ہے۔ نہ زندہ رہنا اور نہ مر جانا۔''

''ضیا حامد کے بس میں تو ہے۔'' ظفر تلخی سے بولا۔

''استغفراللہ۔'' شفیع اللہ نے بے ساختہ کہا۔ ''وہ ہم سے زیادہ بے بس ہے۔ اپنے نفس کا غلام بنا ہوا ہے۔''

دانیال نے کی بورڈ کا آخری بٹن دبایا اور اعلان کیا۔ ''ٹرانسفر مکمل ہو گیا ہے۔ تمام اکاؤنٹس سے رقم ان ایک درجن اکاؤنٹس میں جا چکی ہے۔''

شفیع اللہ نے لیپ ٹاپ لے کر چیک کیا اور پھر طاہر کو کال کی۔ ''تصدیق کرو کہ رقم ٹرانسفر ہو چکی ہے۔''

''سر میں ہاتھ کے ہاتھ تصدیق کرتا جا رہا ہوں۔ آخر کے ایک درجن اکاؤنٹس رہ گئے ہیں بس ان کی تصدیق باقی ہے۔''

''تم کرو میں لائن پر ہوں۔''

دانیال نے اس سے کال ریکارڈنگ مانگی جو اس نے اس کے موبائل پر اسے بلوٹوتھ کر دی۔ دانیال اسے چیک کرنے میں لگ گیا۔ دو منٹ بعد طاہر نے تصدیق کی۔ ''سر تمام رقم ٹرانسفر ہو چکی ہے مجموعی رقم دو ارب ستر لاکھ اور اسی ہزار ڈالرز ہے۔ زیورچ سے تصدیق آگئی ہے۔''

''شکریہ۔'' شفیع اللہ نے کہہ کر کال کاٹ دی۔

زیورچ میں عالمی مالیاتی نظام کے پے ورز تھے جن کے ذریعے دنیا بھر میں رقوم آن لائن منتقل کی جاتی تھیں۔ بنیادی طور پر یہ نظام ان بڑے دولت مندوں کے لیے تخلیق کیا گیا تھا جو اربوں ڈالرز کے اکاؤنٹس رکھتے تھے اور ان کے مختلف ملکوں میں کاروبار تھے۔ انہیں فوری رقم منتقلی کی ضرورت پڑتی تھی۔ کاروبار سے زیادہ یہ ٹیکس بچانے کے لیے بنایا جانے والا سسٹم تھا۔ مختلف ممالک کی ٹیکس پالیسی بدلتی رہتی ہیں اور کہیں ٹیکس کم اور کہیں زیادہ ہو جاتے ہیں۔ دولت مند اپنی رقم فوری ان ملکوں میں منتقل کر لیتے ہیں جہاں انہیں کم سے کم ٹیکس دینا پڑے۔ اسی کی دہائی میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی ترقی کے ساتھ یہ سسٹم وجود میں آیا اور اب یہ سالانہ کئی سو کھرب ڈالرز کی منتقلی کرتا تھا۔ اس رفتار میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔

اب پینتیس منٹ باقی رہ گئے تھے۔ شفیع اللہ نے ان دونوں نمبروں پر کال کرنے کی کوشش کی۔ تاکہ وہ ضیا کو بتا سکے کہ رقم ٹرانسفر ہو گئی ہے مگر دونوں نمبر بند جا رہے تھے۔ اس نے آدھے گھنٹے بعد کال کرنے کو کہا تھا اور آدھا گھنٹا ہو گیا تھا۔ شفیع اللہ بے چین تھا کہ وہ کال کرے اور بم کو ڈی ایکٹو کرنے والا کوڈ بتائے۔ اس کے موبائل کی بیل بجی تو اس نے چونک کر دیکھا۔ مگر یہ شبیر شاہ کی کال تھی۔ اس نے بے دلی سے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو۔''

''کال کا سراغ لگا لیا گیا ہے مگر یہ شہر کے اتنے مختلف حصوں سے کی گئی ہے کہ لگ رہا ہے کال کرنے والا گاڑی میں گھوم رہا ہے۔''

''میرا دعویٰ ہے کہ ضیا حامد اس دوران میں تمہیں اپنے گھر میں ملے گا اور اس کے پاس ثبوت بھی ہوگا کہ وہ گھر سے نہیں نکلا۔''

''فی الحال ہم اسے نہیں چھیڑ سکتے۔''

''اس کے بارے میں چیک کرو کہ آج یا کل کسی فلائٹ سے وہ بیرون ملک تو نہیں جا رہا ہے؟''

''وہ جا رہا ہے۔ میں پہلے ہی چیک کر چکا ہوں۔ آج رات آٹھ بجے کی ایک پرواز بذریعہ مڈل ایسٹ اور ترکی اسے اسپین لے جائے گی۔ اس کی بیوی اور بچے وہیں ہیں۔''

''تب اس پر بھی یقین کر لو کہ وہ ہمیشہ کے لیے یہاں

سے جا رہا ہے۔ وہ کچھ عرصے بعد یہاں کی شہریت بھی چھوڑ دے گا۔''
''شاید ایسا ہی ہو۔'' شبیر شاہ نے اس کی تائید کی۔ ''کیا رقم ٹرانسفر ہو چکی ہے؟''
''ہاں ہو چکی ہے۔'' شفیع اللہ نے کہا۔ ''اب مجھے اپنی فکر ہو رہی ہے۔''
''بم...''
''میں بم کی بات نہیں کر رہا ہوں۔'' شفیع اللہ نے کہا۔ ''میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے، یہ کام کسی نے مجھ سے جبراً کرایا ہے۔ مجھ پر الزام لگ سکتا ہے کہ رقم اصل میں میں نے خود ٹرانسفر کی ہے اور اپنی گردن بچانے کے لیے بم کا چکر چلایا ہے۔''
شبیر شاہ نے اسے تسلی دی۔ ''ان لوگوں کو پکڑا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے اکاؤنٹ کھلوائے تھے، وہ اگلیں گے کہ اکاؤنٹ اصل میں کس کے تھے؟''
''مشکل ہے کہ ان میں سے کوئی ہاتھ آئے اور اگر فرض کرو کہ کوئی ہاتھ آیا اور اس نے ضیا حامد کے خلاف بیان دیا تو کیا اس کی کوئی حیثیت ہوگی۔ کوئی عدالت اس بنیاد پر ضیا حامد کو طلب کرے گی اور اگر کیا تو کیا وہ پیش ہو جائے گا؟''
شبیر شاہ نے اعتراف کیا۔ ''یہ سب بہت مشکل ہے لیکن ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔''
''دوسری طرف رقم منتقل ہو چکی ہے اور وہ چوبیس گھنٹے سے پہلے نکال لی جائے گی اس لیے اس کی واپسی کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا ہے۔''
''یہ سب بعد میں دیکھا جائے گا، سب سے پہلے بم کو ناکارہ بنانا ہے۔''
''اس کے لیے کوڈ چاہیے اور اس نے دوبارہ رابطہ نہیں کیا ہے۔ اس نے دوسری بار جس نمبر سے رابطہ کیا تھا، اب وہ بھی بند ہے۔''
شبیر شاہ چونکا۔ ''اس نے کسی اور نمبر سے بھی رابطہ کیا تھا۔ تم نے مجھے بتایا نہیں۔''
''کیا فائدہ...؟''
''فائدے نقصان کا پتا تو چیک کرنے پر پتا چلے گا۔'' شبیر شاہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''مجھے نمبر دو اور اب وہ جس نمبر سے بھی کال کرے، وہ فوری مجھے دو۔ ہم اب فوری موبائل لوکیشن نکال رہے ہیں۔ کسی بھی معاملے میں یہ سوچ کر مت رہو کہ اس کا کیا فائدہ؟''

شفیع اللہ نے اسے دوسرا نمبر دیا۔ اسی لمحے اس کے موبائل کی بیل بجی اور پھر اجنبی نمبر آ رہا تھا۔ اس نے شبیر شاہ کو یہ نمبر بھی لکھوا دیا۔ ''میرا خیال ہے یہ وہی ہے اب تم خاموش رہو۔'' شفیع اللہ نے کہا اور وائس ریکارڈر آن کرتے ہوئے کال ریسیو کی۔ ''یہ تم ہو؟''
''ہاں یہ میں ہوں۔'' مشینی آواز نے تصدیق کی۔ ''رقم پہنچ گئی ہے، میں نے تصدیق کر لی ہے۔''
''تب مجھے بم ڈی ایکٹو کرنے کا کوڈ بتاؤ۔''
وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر مکروہ مشینی آواز میں ہنسا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے میں تمہیں کوڈ دے دوں گا؟''
''نہیں۔'' شفیع اللہ نے صاف گوئی سے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں ہے کہ تم کوڈ دو گے اور نہ یہ یقین ہے کہ اگر دیا تو وہ ٹھیک ہوگا۔''
''درست کہا اس لیے میں تمہیں کوڈ نہیں بلکہ اشارہ دوں گا۔ اب یہ تمہاری قسمت ہے کہ تم اسے سمجھتے ہو یا نہیں۔''
''کیسا اشارہ؟''
''بہ ظاہر مشکل ہے لیکن درحقیقت بہت آسان ہے۔ بم کو ڈی ایکٹو کرنے والا کوڈ تمہارے پاس ہے اور یہ آٹھ ہندسوں پر مشتمل ہے۔''
''آٹھ ہندسوں پر مشتمل ہے۔'' شفیع اللہ نے اس کے الفاظ دہرائے۔ ''لیکن کہاں ہے؟''
اسے قہقہہ سنائی دیا۔ ''یہی تمہیں سمجھنا ہے اور اسی پر تمہاری اور تمہارے خاندان کی زندگی کا دارومدار ہے۔''
''ضیا حامد میری بات سنو۔'' شفیع اللہ نے کہنا چاہا مگر دوسری طرف سے کال کٹ گئی تھی۔ اس نے نمبر ملایا مگر نمبر بند جا رہا تھا۔ اس گفتگو کے دوران سب ہی اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور جیسے جیسے شفیع اللہ بات کر رہا تھا، ان کے چہرے مرجھاتے جا رہے تھے۔ ظفر نے مردہ لہجے میں کہا۔ ''اس نے انکار کر دیا؟''
''تقریباً۔'' شفیع اللہ نے موبائل میز پر پٹخ دیا۔ ''وہ کہہ رہا ہے کہ کوڈ ہمارے پاس ہے اور آٹھ ہندسوں پر مشتمل ہے۔''
''ہمارے پاس کہاں ہے۔'' باسط بولا۔ ''وہ بکواس کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے۔''
''یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔'' احمر تند اور گستاخانہ لہجے میں بولا۔ شفیع اللہ بیٹے کو دیکھ کر رہ گیا۔
''احمر بھائی۔'' رینا بولی۔ ''یہ آپ پاپا سے کیسے بات

کر رہے ہیں۔"

"تو کیسے بات کروں۔" احمر چلایا۔ "اگر پاپا اس آدمی سے نہ الجھتے تو آج ہمیں یہ وقت نہ دیکھنا پڑتا۔"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔" شفیع اللہ نے کہا... "وہ ہر صورت ہمیں ٹارگٹ کرتا اس لیے نہیں کہ اسے مجھ سے دشمنی ہے بلکہ اسے اپنی بلیک منی ملک سے باہر لے جانی تھی۔"

"پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں، اس وقت پورے ملک میں صرف ایس ایس بینک ہی یہ کام کرسکتا ہے۔"

"تب اس نے کوڈ کیوں نہیں بتایا؟" ظفر نے تلخی سے کہا۔ "پاپا کو چاہیے تھا کہ اس سے بارگیننگ کرتے، کسی طرح سے ضمانت حاصل کرتے کہ وہ کام ہوجانے کے بعد کوڈ دے گا۔ اس جیسے آدمی پر تو ایک روپے کا بھروسا نہیں کیا جاسکتا ہے۔"

"میں کیسے بارگیننگ کرتا۔ اگر وہ ضیا حامد ہونے سے انکار کردیتا تو اس سے کیسے منوایا جاتا۔"

"اس نے اشارہ دیا ہے اور ہمیں اشارہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے نہ کہ یہ وقت الزامات اور بحث میں گزار دیا جائے۔" رینا بولی۔ "اگر آپ لوگ کوئی مدد نہیں کرسکتے تو خاموش تو بیٹھ سکتے ہیں۔"

"تلاش کرلو۔" باسط نے طنز کیا۔ "آخری وقت ذرا مصروف گزرے گا۔"

مونا اور شرمین رونے لگی تھیں۔ رینا نے شفیع اللہ کو دیکھا۔ "پاپا ہمیں سوچنا ہوگا۔ ہمارے پاس ایسی کون سی چیز ہے جس میں آٹھ ڈیجٹس آتے ہیں۔ جس سے یہ بم ڈی ایکٹو ہوسکتا ہے۔"

"میں نہیں جانتا۔" شفیع اللہ نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ اسے صورت حال اور بم کی موجودگی نے اتنا پریشان نہیں کیا تھا جتنا کہ اپنے بیٹوں اور داماد کے لہجوں نے دکھی کیا تھا۔ وہ اسے الزام دے رہے تھے۔ دانیال خاموش تھا کہ فی الحال وہ اس خاندان کا مکمل ممبر نہیں تھا۔ ایسے میں صرف رینا اس کی حمایت کر رہی تھی۔ رینا اپنی نشست سے اٹھ کر اس کے پاس آگئی۔

"پلیز پاپا ٹرائی اِٹ۔"

دانیال بھی پاس آگیا۔ "وہ چیز ایسی ہے کہ ضیا بھی اس کے بارے میں جانتا ہے۔"

"وہ کیسے جان سکتا ہے؟" شفیع اللہ نے پوچھا۔

"مثال کے طور پر وہ آپ کا سیل نمبر جانتا ہے۔"

"اس طرح تو وہ بے شمار چیزوں کے بارے میں جان سکتا ہے۔" باسط طنزیہ لہجے میں بولا۔ "جیسے اس طیارے کا سیریل نمبر یا پرواز کا... کوڈز یا پھر کسی کا بھی موبائل نمبر۔"

ظفر اور احمر کا رویّہ دانیال سے سرد تھا لیکن باسط... اسے باقاعدہ ناپسند کرتا تھا اور اس نے کبھی اپنی ناپسندیدگی چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایسے وقت بھی وہ دانیال کی مخالفت سے باز نہیں آیا تھا۔ دانیال نے کہا۔ "میں صرف مثال دے رہا تھا ورنہ موبائل نمبر کوڈ سمیت گیارہ ڈیجٹس کا ہوتا ہے اور بغیر کوڈ کے آٹھ ڈیجٹ کا۔ اس لیے میرا نہیں خیال کہ وہ کوئی موبائل نمبر ہوسکتا ہے کیونکہ یہاں اتنے موبائل ہیں کہ وہ چانس والی بات نہیں ہوسکتی ہے۔"

شفیع اللہ نے انٹرکام پر کیپٹن صدیقی سے طیارے کا سیریل نمبر معلوم کیا تو وہ پندرہ ڈیجٹس والا نکلا اور اس میں انگریزی کے الفابیٹ بھی تھے۔ فلائٹ نمبر چھوٹا تھا۔ گویا یہ دونوں چیزیں بھی نہیں ہوسکتی تھیں۔ شفیع اللہ نے گھڑی دیکھی تو چوبیس منٹ رہ گئے تھے۔ کیپٹن صدیقی نے یہ اطلاع بھی دی تھی کہ وہ دارالحکومت کے ائرپورٹ کے پاس ہیں۔ وہ ائرٹریفک کنٹرولر سے مسلسل رابطے میں تھا اور اس کی ہدایت کے مطابق طیارے کو ایک بڑے دائرے میں لا رہا تھا جہاں وہ مخصوص حساس علاقوں سے بھی دور رہے۔ رینا بھی دانیال اور شفیع اللہ کے ساتھ شامل ہوگئی تھی۔ اس نے کہا۔ "پاپا جن اکاؤنٹس سے رقم ٹرانسفر کی گئی ہے کیا ان میں سے کوئی ہوسکتا ہے یا جن اکاؤنٹس میں رقم گئی ہے؟"

شفیع اللہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "دونوں میں سے کوئی بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ سب سولہ ڈیجٹس والے نمبرز ہیں۔"

"ہمیں کوئی ٹھیک آٹھ ڈیجٹس والی چیز تلاش کرنی ہے۔" دانیال نے کہا۔ "اور وہ ایک ہی ہو۔"

مگر ذہن پر زور دینے کے باوجود کوئی ایسی چیز سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ظفر نے شفیع اللہ سے کہا۔ "آپ شبیر شاہ سے بات کریں کہ وہ اب براہِ راست ضیا سے بات کرے اور کسی طرح اس سے کوڈ حاصل کرے۔"

"تمہارے خیال میں ضیا اتنا احمق ہے کہ ملک کا وزیر داخلہ اس سے کوڈ مانگے اور وہ دے کر اپنی گردن پھنسالے۔"

"تب ہم کیا کریں کیا، ایسے ہی مرجائیں۔" احمر پھر چلایا۔

"اگر وقت آگیا ہے تو شبیر شاہ کیا کوئی ہمیں بچا نہیں

سکتا ہے۔'' شفیع اللہ نے سکون سے کہا۔ ''اپنے حواس بحال رکھو اور آنے والے وقت کا ہمت سے سامنا کرو۔ رونے دھونے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا ہے۔''

دانیال دوبارہ اپنے موبائل فون میں لگ گیا مگر شاید اس سے مسئلہ حل نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے شفیع اللہ سے اس کا لیپ ٹاپ مانگا۔ وائس ریکارڈنگ اس میں بلوٹوتھ سے منتقل کی اور پھر مشینی آواز کو اپنی اصل صورت میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ مختلف سوفٹ ویئر آزما رہا تھا جو وائس چینج کرتے تھے۔ ان ہی کی مدد سے تبدیل شدہ آواز کو واپس اپنی اصل صورت میں لایا جا سکتا تھا۔ شفیع اللہ ظفر کی تجویز پر سوچ رہا تھا۔ اس نے شبیر شاہ سے رابطہ کیا اور اسے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی مایوس ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تمہارے طیارے میں پیراشوٹ ہیں کیا تم لوگ ان سے جمپ نہیں کر سکتے ؟''

''پیراشوٹ نہیں ہیں اور اگر مل بھی جائیں تب بھی ہمیں اس کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔''

''میں ضیا سے بات کرتا ہوں۔''

''کر لو لیکن شاید اس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔'' شفیع اللہ نے کہا۔ ''وہ اقرار کر کے پھنس نہیں جائے گا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔''

''مرضی تمہاری۔'' شفیع اللہ نے کہا۔

☆☆☆

ضیا خوش تھا اور اسی خوشی میں اس نے نیا جام بنایا تھا۔ عام طور سے وہ دن میں نہیں پیتا تھا۔ وہ سورج غروب ہونے کے بعد پیتا تھا مگر آج پی رہا تھا۔ شفیع اللہ سے بات کر کے وہ زیادہ خوش تھا۔ اس نے جس اشارے کی بات کی تھی وہ درست تھا لیکن اسے یقین تھا کہ شفیع اللہ یا کوئی دوسرا اس اشارے تک نہیں پہنچ سکے گا۔ بم مقررہ وقت پر بلاسٹ ہو جائے گا اور رقم کی منتقلی ہمیشہ کے لیے ایک راز بن جائے گی۔ اس کا امکان تھا کہ شفیع اللہ نے کسی کو اس کے بارے میں بتا دیا ہو لیکن اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس نے جن ڈیڑھ سو افراد کی مدد سے اکاؤنٹ کھلوائے تھے ان میں سے بیشتر جعلی پتے رکھتے تھے اور ان کے شناختی کارڈز کی مدد سے بھی ان کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ اگر وہ مل بھی جاتے تب بھی وہ ضیا کو نہیں جانتے تھے۔ وہ سب نچلے طبقے کے جاہل اور عام سے افراد تھے جنہیں معاوضے پر استعمال کیا گیا تھا۔ وہ بینک اور زرِ مبادلہ اکاؤنٹس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ ان سے کام لینے والے درمیان کے لوگ پہلے ہی ملک سے باہر جا چکے تھے۔

ضیا حامد نے ایک سال پہلے ہی رقم کی منتقلی کی پلاننگ کر لی تھی۔ ڈالرز وہ دورانِ اقتدار حاصل کر چکا تھا کیونکہ اس کے بعد اسے ڈالرز مشکل سے ملتے۔ پھر اس نے اقتدار کے دوران ہی بڑی رقم منتقل کر دی تھی۔ جو اب بے نام اکاؤنٹس میں پڑی ہوئی تھی۔ یہ دو ارب ڈالرز رہ گئے تھے جو اس نے یوں منتقل کیے۔ رات کو اس کی فلائٹ تھی لیکن اس کے ملازموں حد یہ کہ سیکریٹری کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ باہر جانے والا ہے۔ اس کا ارادہ تھا کہ جن کپڑوں میں تھا اسی میں اٹھ کر چل پڑتا۔ چند دن پہلے اس نے سرکاری سیکیورٹی بھی واپس کر دی تھی جو اسے سابق وزیرِ اعظم ہونے کی حیثیت سے دی گئی تھی۔ اس کے پاس چھ گارڈز پر مشتمل ذاتی سیکیورٹی تھی اور یہ سب تجربے کار گارڈز تھے۔ گزشتہ ایک ہفتے سے وہ کوٹھی سے نہیں نکلا تھا اور اس نے کسی سے ملاقات بھی نہیں کی تھی۔ اس کا سیکریٹری آنے والوں اور آنے والی کالز پر یہی جواب دے رہا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اور ڈاکٹر نے اسے مکمل آرام کا کہا ہے۔

اس نے ٹکٹ ایک ٹریولز ایجنسی سے حاصل کیا تھا۔ مگر ٹکٹ بنانے والے کو بھی علم نہیں تھا کہ یہ سابق وزیرِ اعظم ضیا حامد ہے۔ یہ آن لائن ٹکٹ تھا اور آن لائن ہی اس کی ادائیگی کی تھی۔ اس کے پاسپورٹ پر اسپین کا ملٹی پل ویزا لگا ہوا تھا۔ جب تک وہ ائرپورٹ نہیں پہنچتا کسی کو علم نہیں ہوتا کہ وہ ملک سے باہر جا رہا ہے۔ اس کوٹھی کی مالیت تقریباً ایک ارب روپے تھی اور اتنی ہی مالیت کی اس کی دوسری پراپرٹی اور اثاثے تھے۔ مگر یہ اس کی ملک سے باہر موجود دولت کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھے۔ اس نے چند سال پہلے سمیرا کے کہنے پر اسپین میں جو ولا لیا تھا، اس کی مالیت ہی پینتالیس ملین ڈالرز تھی۔ ایسی کئی جائدادیں دنیا کے کئی حصوں میں تھیں اس لیے وہ بے فکری سے کوٹھی اور دوسرے اثاثے چھوڑ کر جانے کے لیے تیار تھا۔ ممکن ہے بعد میں اسے موقع ملتا اور وہ واپس آتا تب انہیں استعمال کر سکتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کا سیکریٹری اور چند ملازمین دیکھ بھال کے لیے کافی تھے۔ اگر اس پر کیسوں کی وجہ سے یہ اثاثے ضبط بھی ہو جاتے تو اسے پروا نہیں تھی۔

شفیع اللہ سے بات کر کے وہ یہ سوچ کر محظوظ ہو رہا تھا کہ وہ اور اس کے بچے پاگلوں کی طرح بم کو ڈی ایکٹو کرنے والے کوڈ کی تلاش میں ہوں گے اور انہیں وہ نہیں ملے گا۔

اس بارے میں اسے پورا یقین تھا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ طیارے کی تباہی کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکے گا بلکہ شاید کوئی بھی نہ دیکھ سکے۔ طیارہ فضا میں ہی پھٹ جائے گا اور شاید ان لوگوں کے معمولی لوتھڑے ہی دستیاب ہوں گے۔ اس کام کے لیے ضیا حامد نے ایک بڑے دہشت گرد گروپ کی خدمات حاصل کی تھیں جو بم دھماکوں اور بموں کی تنصیب کا ماہر تھا۔ یہ بم جو اس گروپ کے ماہرین نے تیار کیا تھا، اسے لگانے سمیت ایک ملین ڈالرز میں پڑا تھا مگر اس کے نزدیک یہ سودا بہت سستا ثابت ہوا تھا خاص طور سے اس صورت میں جبکہ وہ دو ارب ڈالرز بیرونِ ملک منتقل کر چکا تھا۔

دوسرا مرحلہ انہیں بینکوں سے نکلوانے کا تھا۔ اس کا انتظام بھی مکمل تھا۔ ضیا کے آدمی لاطینی امریکا کے ایک ملک کے اس شہر میں تھے جہاں ان تمام بینکوں کی بڑی برانچز موجود تھیں۔ اس وقت وہاں رات تھی لیکن چند گھنٹے بعد دن نمودار ہوتا اور اس کے آدمی ان بینکوں میں پہنچ جاتے۔ وہاں وہ کیش لے کر ائرپورٹ پہنچتے اور ایک نجی طیارہ انہیں لے کر سوئٹزر لینڈ روانہ ہو جاتا۔ جب تک طیارہ وہاں پہنچتا، ضیا بھی سوئٹزر لینڈ پہنچ جاتا اور اس کے بعد یہ رقم اپنے خفیہ بینک اکاؤنٹس میں جمع کرا دیتا۔ ان سب کاموں کے لیے اسے بہت ذہنی ورزش کرنا پڑی تھی اور اس نے یہیں بیٹھ کر یہ سارے انتظامات کیے تھے۔ بہت بڑی رقم خرچ کی تھی جو کاموں کے ذمے داروں اور ضمانتیوں کی جیبوں میں گئی تھی۔ جہاں بدعنوان حکام تھے ان کو خریدا تھا اور جہاں وہ خرید نہیں سکا تھا وہاں مافیا کی مدد حاصل کی تھی۔ بالآخر وہ کامیاب رہا تھا۔

اب چند گھنٹے باقی تھے اور پھر وہ یہاں سے نکل جاتا۔ موبائل کی بیل بجی تو اس نے چونک کر دیکھا اور پھر نمبر دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل آ گئے۔ یہ شبیر شاہ کا نمبر تھا۔ اس نے دل میں کہا بات اس تک پہنچ گئی ہے اور کال ریسیو کی۔

''کیا حال ہیں شاہ صاحب؟ آج کیسے یاد آ گئی اس پرانے دوست کی۔''

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے کیوں کال کی ہے۔'' شبیر شاہ نے سرد لہجے میں کہا۔

''میں جانتا ہوں۔'' وہ حیرت زدہ لہجے میں بولا۔ ''میرے فرشتوں کو بھی علم...''

''ضیا میں اس وقت ملک کا وزیرِ داخلہ یا تمہارا سیاسی حریف نہیں ہوں۔ میں تمہارا وہی یونیورسٹی فیلو ہوں جس کے ساتھ تم کیفے ٹیریا میں گپ شپ کرتے تھے۔ ہمارا ایک دوست اور بھی تھا اور آج وہ تمہاری وجہ سے مشکل میں ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' ضیا نے اداکاری جاری رکھی۔

''پلیز ضیا مجھے مجبور مت کرو کہ میں وزیرِ داخلہ بن جاؤں۔ اس صورت میں میں تم سے کسی اور طرح بات کروں گا۔''

''کس طرح بات کرو گے؟''

''تم جانتے ہو ہر انسان میں کمزوریاں اور خامیاں ہوتی ہیں۔'' شبیر شاہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''اگر تمہارا اشارہ میری طرف ہے تو مجھے تسلیم ہے لیکن تم ثابت نہیں کر سکو گے۔''

''ضیا کمزوریاں صرف انسان میں نہیں، ان سے متعلقہ افراد میں بھی ہوتی ہیں۔''

اس بار ضیا چونکا۔ ''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میں جو کہنا چاہتا ہوں، اس کی ایک قیمت ہے۔ کیا تم وہ ادا کرو گے؟''

''کیا تم جو کہنا چاہتے ہو، اس کی کوئی قیمت ہو سکتی ہے؟''

''ہاں، دس جیتے جاگتے انسانوں کی زندگی۔''

''جو تم بتاؤ گے کیا اس کی اتنی قیمت ہو گی؟''

''ہاں تم میری زبان پر بھروسا کر سکتے ہو۔'' شبیر شاہ نے کہا۔ ''میں جو کہوں گا ثبوت کے ساتھ کہوں گا۔ تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی۔''

ضیا حامد کی نظر دیوار پر لگی وال کلاک پر جمی ہوئی تھی، دو بج کر دس منٹ ہو چکے تھے گویا سترہ منٹ باقی تھے۔ وہ سوچ رہا تھا اور پہلی بار کنفیوز ہو رہا تھا۔ شبیر شاہ نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''تمہارے پاس اور ان دس لوگوں کے پاس وقت کم ہے تم جتنی جلدی فیصلہ کر لو تمہارے لیے بھی اتنا ہی بہتر ہو گا۔ کم سے کم تم مسلسل دھوکا کھانے سے بچ جاؤ گے۔''

''شبیر تم بلف کر رہے ہو۔'' ضیا نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

''اگر میں بلف کر رہا ہوتا تو تم اس لہجے میں یہ بات نہ کہتے۔'' شبیر شاہ نے کہا۔ ''ضیا پلیز اتنے سفاک مت بنو۔ تم جو کر چکے ہو، وہ کم سے کم اس معاملے میں تمہیں نہیں گھسیٹا جائے گا میں وعدہ کرتا ہوں۔''

''گویا دوسرے معاملات میں گھسیٹا جائے گا۔''

''ہاں اور وہ پہلے سے جاری ہیں تم جانتے ہو حکومت

اور احتساب کے ادارے تمہارے خلاف کام کر رہے ہیں لیکن یہ معاملہ میرے ہاتھ میں ہوگا۔ اس کی میں ضمانت دے سکتا ہوں۔ سادہ سی بات ہے کہ تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ہاں جو راز میں بتاؤں گا، وہ تمہارے لیے نہایت اہم ہے۔''

ضیا کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ ایک طرف وہ کسی صورت شبیر شاہ کی بات کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا مگر دوسری طرف شبیر شاہ کی بات نے اسے شدید قسم کے تجسس میں مبتلا کر دیا تھا۔ خاص طور سے دھوکا کھانے والی بات نے اس کے اندر کہیں ڈیرا جما لیا تھا۔ ضیا ایسا آدمی نہیں جو اپنے اندر خلش پالتا۔ وہ سوچ رہا تھا اور بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ شبیر شاہ نے اب تک جس طرح بات کی تھی۔ اس نے کھل کر بات بھی نہیں کی تھی مگر سب کچھ کہہ بھی دیا تھا۔ اگر یہ اس کا جال ہوتا تب بھی وہ اس طرح اس کا جواب دینا چاہتا تھا کہ وہ پھنسے نہیں۔ اب دس منٹ سے کم وقت باقی رہ گیا تھا۔ ضیا نے آہستہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''شاہ جی تم جانتے ہو کہ میں تمہاری عزت کرتا ہوں اور اس عزت کی وجہ بھی ہے۔ تم نے اپنے کردار سے یہ عزت کمائی ہے اس لیے تم پر اعتماد نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ مگر تم نے جو بات کہی ہے اور جو چاہا ہے، اس کے جواب میں میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ نیا سال آنے والا ہے اور اس میں یقیناً بہت سے لوگوں کے لیے زندگی ہوگی اور بہت سے لوگوں کے لیے موت ہوگی۔''

شبیر شاہ الجھ گیا۔ ''تم کیا کہہ رہے ہو، میں تم سے جو کہہ رہا ہوں اس کا جواب دو۔''

''میں نے جواب دے دیا ہے۔'' ضیا نے کہا۔ ''اب اپنا وعدہ یاد رکھنا۔''

''ضیا یہ اشارہ بہت مبہم ہے۔''

''میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' اس نے کہتے ہوئے کال کاٹ دی۔

☆☆☆

طیارہ دارالحکومت کے ائرپورٹ کے اوپر تھا اور تقریباً بیس ہزار فٹ کی بلندی پر چکر لگا رہا تھا۔ ظفر کیپٹن صدیقی کے پاس تھا اور اس سے ممکنہ امکانات پر بات کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا کہ طیارہ زمین تک پہنچ جائے اور اس کا کیبن پریشر اتنا ہی رہے جتنا کہ دس ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر ہوتا ہے۔''

کیپٹن صدیقی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ ممکن نہیں ہے،

کیبن بلندی پر پریشرائزڈ ہوتا ہے نیچے آنے پر اس کا لیول خود بہ خود نارمل ہو جاتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ اس کا دباؤ برقرار نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ صرف آکسیجن لیول اور درجہ حرارت بڑھایا جا سکتا ہے یا کم کیا جا سکتا ہے۔ مکمل پریشرائزڈ چیمبر صرف خلا میں جانے والے طیاروں یا لڑاکا طیاروں میں ہوتے ہیں۔ اس جیسے عام طیاروں میں یہ سہولت نہیں ہے۔''

دوسری طرف شفیع اللہ، دانیال اور رینا بم کے پاس موجود تھے۔ دانیال بم کا معائنہ کر رہا تھا اور اس نے نیٹ پر ایسے بموں کی تصاویر نکالی ہوئی تھیں۔ مگر ان میں سے کوئی بم ان سے مماثلت نہیں رکھتا تھا۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہ کسی فیکٹری میں نہیں بنتے تھے بلکہ انہیں ماہرین انفرادی طور پر تیار کرتے ہیں۔ ہاں ان میں استعمال ہونے والے پارٹس فیکٹری میڈ تھے مگر یہ مختلف مقاصد کے لیے بنائے جاتے تھے اور مجرم ذہن والے انہیں بم سازی میں استعمال کرتے ہیں۔ شفیع اللہ نے گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''آٹھ منٹ رہ گئے ہیں۔''

رینا کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا، اس نے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''پاپا کیا ہم...''

رینا کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ شفیع اللہ کے موبائل کی بیل بجی تھی۔ شبیر شاہ کال کر رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی اور بے تابی سے بولا۔ ''ضیا سے بات ہوئی اس نے کیا کہا ہے؟''

''ہاں بات ہوئی ہے لیکن اس نے کھل کر جواب نہیں دیا۔'' شبیر شاہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''مبہم سی بات کی ہے۔''

''وہ کھل کر بات کرنے والا آدمی بھی نہیں ہے۔'' شفیع اللہ نے تلخی سے کہا۔ ''کیا کہا ہے اس نے؟''

''میں نے اسے ایک آفر کی تھی جو اس نے قبول کر لی اور اس کے جواب میں اس نے کہا کہ نیا سال آنے والا ہے اور اس میں یقیناً بہت سے لوگوں کے لیے زندگی ہوگی اور بہت سے لوگوں کے حصے میں موت ہوگی۔''

شفیع اللہ نے دہرایا۔ ''نیا سال آنے والا ہے اس میں بہت سے لوگوں کے لیے زندگی اور بہت سے لوگوں کے لیے موت ہوگی۔ یہ کس قسم کا اشارہ ہے۔ اس خبیث آدمی نے کوڈ کیوں نہیں بتایا۔''

''اتنا بھی میں نے اس سے بہ مشکل اگلوایا ہے۔ اس سے وعدہ کیا ہے کہ میں اسے چھوٹ دوں گا۔''

شفیع اللہ نے سر تھام لیا۔ ''وہ بکواس کر رہا ہے دھوکا دے رہا ہے۔ اس اشارے کا کوئی مطلب نہیں ہے اور وہ بعد میں تم سے وعدے کی پابندی کا مطالبہ کرے گا۔''

''وہ صرف اسی صورت میں رعایت کا مستحق ہوگا جب تم لوگ بچ جاؤ۔ ورنہ اس کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں ڈال دیا جائے گا۔''

''وہ آج ہی نکل جائے گا۔''

''میں نے بتایا تھا کہ رات آٹھ بجے ایک غیر ملکی ائرلائن سے اس کی سیٹ بکی ہے۔'' شبیر شاہ نے کہا۔ ''اس کا پتا یوں چلا ہے کہ ضیا حامد کے نام سے ایک غیر ملکی ائرلائن کا ٹکٹ لے لیا گیا ہے اور ادائیگی ضیا حامد کے ایک اکاؤنٹ سے ہوئی ہے۔ اسے روکنے کے لیے سمری تیار کی جا رہی ہے۔''

''یعنی ہم قربان ہوئے تو وہ روک لیا جائے گا۔'' شفیع اللہ نے کہا۔

رینا اور دانیال سر جوڑے شفیع اللہ کے الفاظ پر غور کر رہے تھے۔ بم کی اسٹاپ واچ پانچ منٹ سے نیچے آچکی تھی اور ہر گزرتے سیکنڈ وہ موت کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔ رینا کہہ رہی تھی۔ ''نیو ائر کا اشارہ ہے۔ اس نے پاپا کو ای کارڈ بھی بھیجا تھا نیو ائر کا۔'' وہ کہتے ہوئے اچانک پُرجوش نظر آنے لگی۔ ''اس کا اشارہ نئے سال کے ہندسوں کی طرف تو نہیں ہے۔ تصویر میں دیکھو کتنے ہندسے نظر آ رہے ہیں؟''

دانیال نے لیپ ٹاپ پر کارڈ اوپن کیا اور اس میں نظر آنے والے ہندسے دیکھے۔ ''لیکن یہ تو چار ہندسے ہیں کوڈ آٹھ ہندسوں کا ہوتا ہے۔''

رینا مایوس ہوئی تھی۔ ''ہاں یہ تو ہے۔''

دانیال تصویر دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ رینا نے زبردستی مسکرا کر کہا۔ ''اب یہ لڑکی اتنی خوب صورت بھی نہیں ہے کہ تم اسے ہی گھورتے رہو۔''

دانیال کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اسٹاپ واچ پر اب تین منٹ اور چالیس سیکنڈ باقی رہ گئے تھے۔ شفیع اللہ شبیر شاہ سے کہہ رہا تھا کہ ان کی موت کی کلی ذمے داری ضیا حامد پر عائد ہوگی اور اسے عدالت میں لانا حکومت کی ذمے داری ہوگی۔ دانیال نے اچانک کہا۔ ''سنو اگر دن اور مہینہ بھی ملالیں تو کتنے ہندسے ہوں گے؟''

رینا بھی اچھل پڑی۔ ''آٹھ... ہاں آٹھ ہندسے ہوں گے۔''

"یعنی زیرو ون زیرو ون ٹو زیرو ون سکس۔"
"یہی ہوسکتا ہے۔" رینا نے کہا اور باپ سے بولی۔
"پاپا نمبر مل گیا ہے۔"
شفیع اللہ چونکا تو رینا اسے جلدی جلدی بتانے لگی۔ شفیع اللہ نے کہا۔ "سمجھ میں آرہا ہے لیکن اگر کوڈ غلط نکلا تو..."

"تب بھی ہمارے پاس دو منٹ کا وقت رہ گیا ہے۔" دانیال نے اسٹاپ واچ کی طرف اشارہ کیا جس میں وقت اب دو منٹ سے نیچے آگیا تھا۔ دانیال کا مطلب تھا کہ اگر کوڈ نہ ملایا گیا یا غلط ملایا گیا تب بھی دو منٹ بعد بم پھٹ جائے گا۔ شفیع اللہ نے سوچا اور سر ہلا دیا۔

"کوشش کرنے میں حرج نہیں ہے ممکن ہے کوڈ درست ہو اور ہم بچ جائیں۔ غلط کوڈ لگنے کی صورت میں بھی..."

دانیال نے سر ہلایا اور بم پر جھک گیا اس نے ایک بار غور سے کی پیڈ کا معائنہ کیا اور پھر ہچکچاتے ہوئے صفر دبایا، پھر ایک اور اس کے بعد اس نے نئے سال کی پہلی تاریخ انٹر کر دی۔ وقت ایک منٹ سے نیچے آگیا تھا۔ اس دوران میں باقی سب کیبن میں اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تھے اور سیٹ بیلٹ باندھ لی تھی۔ عقبی حصے میں صرف شفیع اللہ، دانیال اور رینا تھے۔ وقت تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ تیس سیکنڈ رہ گئے تھے پھر بیس سیکنڈ رہ گئے تو دانیال نے شفیع اور رینا کی طرف دیکھا اور دل ہی دل کلمہ شریف پڑھتے ہوئے اس نے انٹر کے بٹن پر انگلی رکھی۔ اسٹاپ واچ اب سنگل ڈیجٹ میں رہ گئی تھی۔ نو... آٹھ... سات... چھ... پانچ... چار... تین... اور دانیال نے بٹن دبا دیا۔ شفیع اللہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور اس کے کان دھماکے کے منتظر تھے۔

مگر دھماکا نہیں ہوا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو اسٹاپ واچ ایک کے ہندسے پر رکی ہوئی تھی رینا اور دانیال سانس روک کر اسے دیکھ رہے تھے جیسے یہ اچانک ہی چل پڑے گی اور وقت صفر ہو جائے گا۔ ان کی زندگی کا وقت بھی صفر ہو جائے گا۔ لیکن جب تک آدمی کا وقت نہ آئے اس کی زندگی کی گھڑی صفر تک نہیں آسکتی ..... اچانک رینا کو احساس ہوا کہ بم ڈی ایکٹی ویٹ ہو گیا اور اس کے حلق سے چیخ نکلی تھی۔ یہ مسرت بھری اور خوشی کی چیخ تھی مگر کیبن کے اگلے حصے میں اسے کسی اور معنی میں لیا گیا وہاں خواتین نے ہسٹریائی انداز میں چیخنا شروع کر دیا۔ پھر دانیال چلایا۔
"ہم بچ گئے۔"

وہ اٹھ کر بے ساختہ شفیع اللہ سے لپٹ گیا اور رینا ان دونوں سے لپٹ گئی۔ شفیع اللہ بول نہیں رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو تھے باقی سب چلا رہے تھے اور رو رہے تھے۔ پھر دوسرے بھی وہاں آگئے۔ ظفر اور احمر باپ اور دانیال سے لپٹے تھے۔ ان کے آتے ہی رینا جلدی سے الگ ہو گئی تھی اور اب جھینپ رہی تھی کہ وہ باپ کے ساتھ ساتھ دانیال سے بھی لپٹ گئی تھی۔ شفیع اللہ نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل کان سے لگایا اور دوسری طرف موجود شبیر شاہ سے کہا۔ "بم ڈی ایکٹی ویٹ ہو گیا ہے۔"
"شکر خدا کا۔" شبیر شاہ نے سکون کا سانس لیا۔
"اس کا مطلب ہے ضیا نے ٹھیک اشارہ دیا تھا۔"
"ہاں اس نے ٹھیک اشارہ دیا تھا۔"
"اب مجھے اس سے کیا ہوا وعدہ نبھانا پڑے گا۔" شبیر شاہ بولا۔ "مگر خدا کی قسم مجھے یہ وعدہ نبھا کر خوشی ہو گی کیونکہ تم سب کی زندگیاں محفوظ رہی ہیں۔"
"ہاں زندگی کے کم سے کم ایک موقع پر وہ وعدہ خلاف ثابت نہیں ہوا۔" شفیع اللہ نے کہا۔ "میں پائلٹ کو لینڈنگ کا کہتا ہوں۔"
شفیع اللہ کاک پٹ میں آیا جہاں کیپٹن صدیقی اور کو پائلٹ مشتاق بھی خوش تھے۔ انہوں نے سن لیا تھا۔ شفیع اللہ نے کہا۔ "لینڈنگ کی تیاری کرو۔ میں جلد از جلد نیچے پہنچ کر سجدۂ شکر بجالانا چاہتا ہوں۔"

چند منٹ بعد طیارہ دارالحکومت کے ائرپورٹ پر لینڈ کر رہا تھا۔ وہاں ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ فائر فائٹرز اور ایمبولینس بھی موجود تھیں۔ طیارہ مین ٹرمنل سے ذرا فاصلے پر رکا اور رکتے ہی مشتاق نے اس کا دروازہ کھول دیا۔ اگرچہ بم ڈی ایکٹو ہو گیا تھا مگر اس کے باوجود اس کی دہشت کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ سب عجلت میں نکلے تھے سب سے آخر میں شفیع اللہ باہر آیا تھا، اس نے اصرار کر کے صدیقی اور مشتاق کو بھی باہر جانے پر مجبور کیا تھا اور پھر خود باہر آکر ٹارمک پر ہی سجدۂ شکر ادا کیا۔ دارالحکومت پولیس کے ایلیٹ دستے نے طیارے کو گھیر لیا تھا اور بم ڈسپوزل کے ماہرین بھی موقع پر موجود تھے۔ شفیع اللہ اور باقی ابھی وہیں تھے کہ اندر سے شبیر شاہ آگیا۔ وہ شفیع اللہ کے گلے لگا۔ اس نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔ "مبارک ہو لیکن جو ہوا وہ میرے اور تمہارے درمیان رہے گا۔ یہ بات اپنے لوگوں کو بھی سمجھا دینا۔"

''میں تمہارا شکر گزار ہوں۔'' شفیع اللہ سنجیدگی سے بولا۔ ''تم بے فکر رہو کوئی بات لیک آؤٹ نہیں ہوگی۔''

وہ سب ٹرمنل کی طرف آ گئے۔ یہ بات اب تک میڈیا کے علم میں نہیں آئی تھی اس لیے وہاں خاصا سکون تھا۔ اندر آتے ہی شفیع اللہ نے اپنے اہلِ خانہ اور دونوں پائلٹس کو سمجھا دیا تھا کہ انہوں نے کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا۔ خاص طور سے ضیا حامد کا اس سلسلے میں کوئی ذکر نہیں آنا چاہیے۔ اس کی قسمت کا فیصلہ وفاقی تفتیشی اداروں پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ شبیر شاہ نے اسے تسلی دی تھی کہ رقم کی منتقلی کا الزام اس پر نہیں آئے گا اور اگر ضرورت پڑی تو اس معاملے میں انٹرپول کی مدد لی جائے گی۔ وہ لوگ ائرپورٹ سے روانہ ہوئے تو مطمئن اور خوش تھے۔ رینا اور دانیال ایک ہی گاڑی میں تھے اور شفیع اللہ کا لیپ ٹاپ دانیال کے پاس تھا۔ وہ اس میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے ائرفون کان سے لگا رکھا تھا۔ رینا نے اسے ہلا کر پوچھا۔ ''اب کیا کر رہے ہو؟''

دانیال نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر ائرفون کا ایک سرا رینا کے کان سے لگا دیا تھا۔ ''ذرا سننا۔''

رینا نے سنا اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

☆☆☆

ضیا حامد ائرپورٹ کی طرف رواں تھا۔ اس کا قافلہ پانچ گاڑیوں پر مشتمل تھا جن میں سے تین ایک جیسی لگژری بلٹ پروف و بم پروف کاریں تھیں اور ان کے سیاہ شیشوں کے پیچھے یہ اندازہ کرنا ناممکن تھا کہ ضیا حامد کس گاڑی میں ہے۔ آگے ایک طاقتور لینڈ کروزر تھی جس میں تین مسلح محافظ تھے جبکہ عقب میں بھی ایسی ہی ایک لینڈ کروزر تھی اور اس میں بھی تین محافظ تھے۔ کچھ دیر بعد یہ قافلہ شہر کی سڑکوں سے ہوتا ہوا ائرپورٹ پہنچا اور وہاں ضیا حامد محافظوں کے گھیرے میں ٹرمنل کے داخلی دروازے تک آیا مگر یہاں اس کے گارڈز کو روک دیا گیا کہ کسی غیر متعلق مسلح فرد کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ضیا حامد اڑ جاتا اور اپنے محافظوں کو اندر ساتھ لے کر جاتا۔ مگر اس وقت اس نے خاموشی سے یہ بات مان لی اور محافظوں کو وہیں چھوڑ کر وہ ٹرمنل میں داخل ہوا اس کے پاس صرف ایک بریف کیس تھا۔ اس نے اپنا ٹکٹ دکھا کر ائرلائن کاؤنٹر سے اصل ٹکٹ حاصل کیا اور پھر امیگریشن پہنچا تو اس کا پاسپورٹ دیکھتے ہی وہاں موجود افسر نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''سوری سر آپ پر پابندی ہے آپ باہر نہیں جا سکتے۔''

ضیا حامد جو اب تک پُرسکون تھا، یہ سن کر چراغ پا ہو گیا۔ اس نے غرا کر کہا۔ ''تمہارا دماغ خراب ہے، مجھے جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟''

''سر میں جانتا ہوں، آپ اس ملک کے ایکس پرائم منسٹر ہیں۔'' آفیسر نے تحمل سے کہا۔ ''میں آپ کو وہی بات کہہ رہا ہوں جو میرا ریکارڈ بتا رہا ہے۔''

''تمہاری جرأت کیسے ہوئی مجھے روکنے کی۔'' ضیا حامد نے موبائل نکالتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی اوپر بات کرتا ہوں۔ آج رات ہی تمہاری نوکری سے چھٹی ہو جائے گی۔''

ضیا حامد امیگریشن آفیسر کے سامنے غصہ دکھا رہا تھا مگر اس سے دور ہٹتے ہی اس کے چہرے پر سخت تشویش کے آثار نظر آنے لگے اور اس نے شبیر شاہ کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کی تو ضیا حامد اس پر برس پڑا۔ اس نے دبی آواز لیکن آتش فشاں لہجے میں کہا۔ ''مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم میرے ساتھ ایسا کرو گے؟''

''میں نے کیا، کیا ہے؟'' شبیر شاہ نے تجاہل عارفانہ سے کہا۔

''میں یہاں ائرپورٹ پر کھڑا ہوں اور ایک دو ٹکے کا امیگریشن آفیسر مجھے بتا رہا ہے کہ مجھ پر بین ہے میں باہر نہیں جا سکتا۔ اس کتے کے بچے نے...''

''مائنڈ یور لینگویج..... وہ ایک معزز سرکاری افسر ہے۔ وہ اپنی ڈیوٹی ادا کر رہا ہے۔ اسے تنخواہ سرکاری خزانے سے ملتی ہے اور اس نے سرکاری خزانے کو لوٹ کا مال نہیں سمجھا۔''

شبیر شاہ کے کھرے لہجے پر ضیا حامد دب گیا تھا۔ ''اوکے... وہ ایک معزز سرکاری افسر ہے اور میں اس ملک کا ذلیل سابق وزیراعظم ہوں مگر تمہارا وعدہ کیا ہوا؟''

''میں نے تمہیں تمہاری زندگی سے متعلق اس راز سے آگاہ کر دیا جو تم سے بھی چھپا ہوا تھا۔ مگر اس بارے میں مجھے افسوس ہے۔'' شبیر شاہ نے سکون سے کہا۔ ''یہ وعدہ یوں مشروط تھا کہ تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملے گا تو تمہیں باہر جانے دیا جائے گا۔''

''میرے خلاف ایسا کون سا ثبوت مل گیا ہے جو میرا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل کر دیا گیا ہے؟''

''ثبوت بہت واضح اور ناقابلِ تردید ہے۔'' شبیر شاہ کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

''کیسا ثبوت؟'' ضیا حامد پھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

’’تم میرے ساتھ کھیل رہے ہو؟‘‘
’’ثبوت تم نے خود چھوڑا، حالانکہ تم نے بہت پلاننگ سے کام لیا۔‘‘ شبیر شاہ اس کی حالت سے لطف اندوز ہوتا ہوا بولا۔ ’’مگر آدمی کتنا ہی ذہین اور چالاک کیوں نہ ہو کہیں نہ کہیں مار کھا جاتا ہے۔‘‘
’’پلیز میں اس وقت بہت پریشان ہوں۔‘‘ ضیا حامد نے گھڑی دیکھی۔ ایک گھنٹے بعد فلائٹ تھی اور آدھے گھنٹے پہلے طیارے کے دروازے بند ہو جاتے۔ وہ اب وزیر اعظم تو کیا خاص آدمی بھی نہیں تھا جس کے لیے طیارہ انتظار کرتا۔ ’’تم مجھ سے صاف بات کرو یا مجھے جانے کی اجازت دو۔‘‘
’’میں صاف بات ہی کر رہا ہوں۔‘‘ شبیر شاہ نے کہا۔ ’’اگر تم یہ غلطی نہ کرتے تو اس وقت ملک سے باہر جا رہے ہوتے۔ مگر اب اس کا بھی بہت زیادہ امکان ہے کہ تمہارا آخری وقت جیل کی سلاخوں کے پیچھے آئے۔ کیونکہ تم پر بہت سنگین الزامات ہیں اور ان کی سزا عام طور سے بیس سال سے تمام عمر کی قید ہو سکتی ہے اگر تمہیں سزائے موت نہ ہوئی تو۔ بائی دی وے کیا تم اپنے کانوں سے ثبوت سننا چاہو گے؟‘‘
ضیا حامد اب تک سوچ میں تھا کہ اس نے ایسا کون سا نشان چھوڑا ہے اور جب شبیر شاہ نے سننے کی بات کی تو اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ وہ وائس چینجر کی مدد سے آواز بدل کر بات کر رہا تھا اور اس طرف اس کا دھیان نہیں گیا کہ آواز کو دوبارہ اصل حالت میں بھی لایا جا سکتا ہے۔ شبیر شاہ نے ٹھیک کہا تھا۔ بہت ذہین اور چالاک آدمی بھی غلطی کر جاتا ہے۔ ’’تت... تمہارا اشارہ میری آواز...؟‘‘
’’اب تم نے درست پہچانا۔‘‘ شبیر شاہ نے جواب دیا۔ ’’ویسے تم نکل بھی جاتے تو کوئی فائدہ نہیں تھا، تمہیں انٹرپول کی مدد سے واپس لایا جاتا۔‘‘
’’پلیز... پلیز۔‘‘ ضیا حامد سب بھول کر التجا پر اتر آیا۔ ’’تمہیں پرانے تعلق کا واسطہ مجھے یہاں سے نکلنے دو۔‘‘
’’مجھے افسوس ہے ضیا تم نے جو فصل بوئی تھی، اس دنیا کی حد تک اسے کاٹنے کا وقت آ گیا ہے۔‘‘ شبیر شاہ نے کہا اور کال کاٹ دی۔ ضیا حامد نے موبائل کی طرف دیکھا اور زیر لب ایک گندی سی گالی دی۔ اس فلائٹ کے تمام ہی مسافر امیگریشن سے فارغ ہو کر ڈیپارچر لاؤنج کی طرف جا چکے تھے۔ صرف وہی باقی رہ گیا تھا۔ ضیا حامد کچھ دیر سوچتا رہا پھر مردہ قدموں سے باہر کی طرف بڑھا تھا کہ اس نے کچھ سادہ لباس افراد کو اندر آتے دیکھا۔ ان میں سے جو آگے تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔
’’مسٹر ضیا حامد، میں ایف آئی اے آفیسر ہوں اور آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔‘‘
اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ مردہ قدموں سے ان کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ اگلے دن صبح کے وقت وہ شبیر شاہ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ ایف آئی اے کے ہیڈ آفس کے اس کمرے میں صرف وہ اور شبیر شاہ تھے۔ اس کے سامنے معقول قسم کا ناشتا تھا۔ مگر اس نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ شبیر شاہ اسے بتا رہا تھا کہ ائرپورٹ ہینگر کے وہ ملازمین پکڑے گئے تھے جنہوں نے بم لگانے والوں سے تعاون کیا تھا اور اب ان کی تلاش جاری تھی جنہوں نے بم لگایا تھا۔ اس نے آخر میں کہا۔ ’’کیا تم اپنی پوزیشن سمجھ رہے ہو؟‘‘
ضیا حامد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ’’میں عدالت اور قانون کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔‘‘
’’یعنی تم مشکل میں پڑنا چاہتے ہو۔‘‘
اس بار ضیا حقارت سے مسکرایا تھا۔ ’’قانون میرا کیا بگاڑ لے گا میں بہترین وکیلوں کا پورا پینل کروں گا جو قانون اور عدالتوں کو گھمانا جانتے ہیں۔‘‘
’’تب بھی تم اس ایک وکیل کا مقابلہ نہیں کر سکو گے جو کیس کو طول دے گا۔‘‘ شبیر شاہ کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ’’اگر حکومت کسی کیس کا فیصلہ نہ چاہے تو تم سوچ سکتے ہو کہ وہ اسے کب تک کھینچ سکتی ہے۔ تم جانتے ہو کیونکہ تم حکومت کر چکے ہو۔‘‘
ضیا حامد نے چونک کر اسے دیکھا۔ ’’تمہارا مطلب ہے کہ...‘‘
’’ہم بھی اس کیس کا فیصلہ نہیں چاہیں گے اور تم اس وقت تک جیل میں رہو گے جب تک موجودہ حکومت ہے۔ اس کے بعد بھی تمہاری بریت کے امکانات بہت کم ہیں۔‘‘
ضیا کے تاثرات تبدیل نہیں ہوئے تھے۔ اس نے نہایت سرسری سے انداز میں پوچھا۔ ’’تم کیا چاہتے ہو؟‘‘
’’دو ارب ڈالرز کی واپسی۔‘‘ شبیر شاہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ’’اس کیس سے بریت کی اور باہر جانے کی یہ قیمت ہے۔ جلد فیصلہ مت کرو تمہارے پاس بہت وقت ہے۔‘‘
جیسے ہی شبیر شاہ کمرے سے نکلا، ضیا حامد کا چہرہ تشویش زدہ ہو گیا۔

☆☆☆

آج ضیا حامد کی عدالت میں اولین پیشی تھی اور اس پر کیس کا باقاعدہ آغاز تھا۔ ٹی وی چینل اس کی عدالت آمد اور وہاں سے روانگی کی لائیو کوریج کر رہے تھے۔ ضیا حامد کو میڈیا سے بات کرنے کی اجازت نہیں ملی تھی لیکن اس کے وکلا کے پینل کے سربراہ اور سرکاری وکیل دونوں نے اپنی اپنی کامیابی کے متضاد دعوے کیے تھے۔ اس کے بعد قانونی ماہرین چینل پر لائیو اپنی رائے پیش کرنے لگے اور سب کا کہنا تھا کہ ٹھوس ثبوت کی موجودگی میں ضیا حامد کا بری ہونا بہت مشکل تھا۔ سمیرا نے ریموٹ سے ٹی وی بند کر دیا۔ ضیا حامد کی گرفتاری نے اس کا سارا پروگرام تباہ کر دیا تھا۔ ضیا حامد کی متوقع آمد سے پہلے وہ اسپالا نامی لگژری ریستوران میں جس شخص سے ملی تھی اس کا تعلق افریقہ سے تھا مگر وہ صورت سے افریقی نہیں لگتا تھا۔ ریمین جوز نامی یہ شخص کرائے کا قاتل تھا اور سمیرا نے اسے ضیا کے لیے ہائر کیا تھا۔ مگر ضیا یہاں آمد سے پہلے گرفتار ہو گیا تھا۔

سوئٹزرلینڈ سے ضیا حامد کے وکیل جانز شیور نے اسے کال کر کے اطلاع دی تھی کہ جنوبی افریقہ سے آنے والی رقم رک گئی تھی کیونکہ بینکوں کو ضیا حامد کی کال نہیں ملی تھی اور اس کے بغیر وہ اتنی بڑی رقم کیش نہیں کرتے۔ دوسرے لفظوں میں وہ رقم وہیں پھنس کر رہ گئی تھی۔ سمیرا پریشان تھی کیونکہ یہاں اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ اسے ماہانہ اخراجات کی رقم بھی جانز شیور سے ملتی تھی۔ اگر ضیا مر جاتا تو سب اس کا ہو جاتا۔ سب نہ صحیح اس کے اثاثوں کا بڑا حصہ سمیرا کے نام آ جاتا مگر اب وہ بھی خالی ہاتھ تھی۔ بچے دو دن پہلے سوئٹزرلینڈ جا چکے تھے۔ سمیرا ان کی ماں تھی مگر ضیا کے حکم پر ان کی دیکھ بھال کی ذمے داری اب جانز شیور نے سنبھال لی تھی اور سمیرا کو مطلع کر دیا تھا کہ اب اس معاملے میں اس کا کوئی کردار نہیں رہا تھا۔ جب جانز شیور نے اسے کال کر کے یہ بتایا تو اس کے اندر خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔

اس کی تقریباً روز ہی ضیا سے بات ہو رہی تھی اور اس نے اس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں پائی تھی۔ مگر سمیرا جانتی تھی کہ ضیا کتنا بڑا اداکار تھا وہ اپنے ظاہر سے اپنے باطن کی ذرا بھی جھلک نہیں دیتا تھا۔ اس کے وکیل کا رویہ اصل صورت حال کی عکاسی کر رہا تھا۔ ظہیر نے اس سے رابطہ کیا تھا مگر اس نے مناسب نہیں سمجھا کہ فی الحال اس سے ملاقات کرے۔ ممکنہ طور پر وہ بھی میڈیا کی توجہ کا مرکز بن سکتی تھی اور ایسے میں کوئی اسکینڈل اسے تباہ کر سکتا تھا۔ وہ ملک جانا چاہتی تھی مگر ضیا نے اسے روک دیا کہ کہیں اس کے خلاف بھی کسی قسم کی انکوائری شروع ہو جائے اور وہ وہاں پھنس جائے۔ سمیرا کو یہ بات بھی ہضم نہیں ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب کیا کرے کہ موبائل کی بیل بجی۔ اس نے دیکھا تو ریمین کی کال کی تھی۔ سمیرا کی پیشانی پر شکنیں آگئیں۔ اس نے کال ریسیو کی اور بولی۔

''کہو۔''

''میں ملنا چاہتا ہوں۔''

''کیوں؟''

''ڈیل مکمل نہیں ہوئی ہے۔''

''وجہ تم جانتے ہو۔''

''تب ڈیل ختم ہوگئی۔''

''تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''اگر تم ڈیل آگے بڑھانا چاہتی ہو تو مجھ سے ملو اور نئے سرے سے ڈیل کرو۔ تم میری بات سمجھ رہی ہونا۔''

''ہاں۔'' سمیرا نے کہا۔ ''او کے تم مجھ سے سانتیوز میں ملو۔''

ریمین نے پوچھا۔ ''کب؟''

''آج شام۔''

سانتیوز نامی تفریح گاہ ضیا حامد کے ولا سے کوئی تیس میل کے فاصلے پر سمندر کے ساتھ ایک بلند پہاڑی تھی جس سے سمندر کا منظر بہت دور تک دکھائی دیتا تھا۔ گرمیوں میں یہاں بہت رش ہوتا تھا لیکن سردیوں میں یہ جگہ ویران پڑی رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سمیرا نے وہاں کار روکی تو اسے دور تک کوئی اور نظر نہیں آرہا تھا۔ ریمین کنارے کی ریلنگ سے ٹکا کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ کسی قدر سانولے رنگ اور موٹے نقوش والا آدمی تھا مگر اس قسم کے لوگ اسپین میں عام تھے اس لیے وہ غیر ملکی نہیں لگتا تھا۔ سمیرا نے لانگ کوٹ پہنا ہوا تھا مگر پھر بھی وہ کھلی فضا میں آتے ہی سردی سے کانپ اٹھی تھی۔ ریمین اسے دیکھ کر حرکت میں نہیں آیا اور مجبوراً اسے ہی اس کی طرف جانا پڑا تھا۔ سمیرا نے اس کے پاس جا کر کہا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں ڈیل واپس کرنا چاہتا ہوں۔''

سمیرا کو جھٹکا لگا۔ ''لیکن تم نے تو کہا تھا...''

''وہ تمہیں یہاں بلانے کے لیے کہا تھا۔'' ریمین نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اسے نیچے اچھال دیا اور اپنے کوٹ میں ہاتھ ڈالا تو سمیرا... خوف زدہ ہوگئی تھی مگر جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک لفافہ تھا۔ وہ اس نے سمیرا کی

طرف بڑھا دیا۔ ”یہ تم نے جو رقم ایڈوانس دی تھی۔“
سمیرا نے لفافہ لے کر پرس میں ڈال لیا۔ ”اگر پھر تمہاری ضرورت پڑے۔“
”اب نہیں پڑے گی۔“ ریمین نے عجیب سے لہجے میں کہا تو سمیرا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا اسی لمحے ریمین کا طاقتور گھونسا اس کے منہ پر لگا اور وہ لڑکھڑا کر نیچے گری تھی۔ سمیرا کا سر چکرا رہا تھا۔ ریمین اس کی طرف جھکا اور اس کا پرس کھولتے ہوئے اندر سے لفافہ نکال لیا۔ ”تم مجھے احمق سمجھ رہی ہو۔ تم نے جس شخص کے لیے مجھے ہائر کیا تھا اس کے وکیل نے مجھے زیادہ قیمت پر ہائر کر لیا۔“
”ضیا...“ سمیرا نے بہ مشکل کہا۔
”ہاں، اس نے تمہارے لیے ایک پیغام بھی دیا ہے، آخری پیغام۔“
”کیسا پیغام؟“
”اس نے کہا ہے کہ اس کی آنکھیں کھل گئی ہیں اس لیے تمہاری آنکھیں اب ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گی۔“
”خدا کے لیے نہیں۔“ سمیرا نے اٹھنے کی کوشش کی تو ریمین نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔
”خدا کا نام مت لو کیونکہ آج کل ہم بہت سے غلط کام خدا کے نام پر ہی کر رہے ہیں۔“ ریمین نے کہتے ہوئے اچانک ہی اسے اٹھا کر ریلنگ کے دوسری طرف پھینک دیا۔ سمیرا کے منہ سے چیخ نکلی تھی جو پہلی چٹان سے ٹکراتے ہی رک گئی اس کے بعد اس کا جسم سیکڑوں فٹ چٹانوں سے الجھتا اور ٹکراتا ہوا گرتا رہا۔ آخر میں وہ سمندر کے جھاگ اڑاتے پانی میں جا گری تھی۔ اس کا پرس وہیں ریلنگ کے پاس پڑا رہ گیا تھا۔ ریمین نے اس کا موبائل نکالا اور اس میں سے اپنی کال کا ڈیٹا ڈیلیٹ کر کے اسے واپس پرس میں رکھ دیا۔ چند لمحے بعد وہ وہاں سے جا رہا تھا۔ کچھ دور نکلنے کے بعد اس نے موبائل نکال کر کسی کو کال کی اور صرف ایک جملہ کہا۔ ”کام ہو گیا ہے۔“

☆☆☆

ضیا حامد جیل کی کوٹھری میں تھا۔ یہ صرف نام کی کوٹھری تھی ورنہ اسے وہاں ہر سہولت میسر تھی۔ اس میں موبائل بھی شامل تھا۔ اس کے موبائل نے وائبریٹ کیا تو اس نے اٹھا کر اسکرین دیکھی۔ جانز شیور کا نام دیکھ کر اس نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے صرف ایک جملہ کہا گیا۔ ”کام ہو گیا ہے۔“
ضیا حامد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ اس نے اپنے مقامی وکیل کو کال کی اور اس سے کہا۔ ”میں شبیر شاہ سے ملنا چاہتا ہوں۔“
اسی شام وہ وزارتِ داخلہ کی عمارت کے ایک کمرے میں شبیر شاہ کے سامنے تھا اسے یہاں تک چپکے سے لایا گیا تھا اور ریکارڈ کے مطابق وہ ابھی جیل میں ہی تھا۔ ضیا حامد نے اس کے سامنے بیٹھتے ہی کہا۔ ”میں راضی ہوں۔“
”گڈ لیکن ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“ شبیر شاہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”کچھ نئے واقعات ہوئے ہیں جو ہمارے علم میں بھی آ گئے ہیں۔“
ضیا حامد چونکا۔ ”کیا مطلب؟“
جواب میں شبیر شاہ نے ایک لفافہ اس کے سامنے ڈال دیا۔ ضیا حامد نے اسے کھولا تو اس میں چند تصویریں تھیں اور ان تصویروں میں ریمین سمیرا پر حملہ کرتے اور پھر اسے نیچے پھینکتے ہوئے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ضیا کو لگا جیسے اسے ہارٹ اٹیک ہو رہا ہے اور اس نے ایک جنون کے عالم میں تصاویر پھاڑ دیں۔ شبیر شاہ سکون سے بیٹھا رہا۔ ضیا کسی درندے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ ”تم نے مجھے ڈبل کراس کیا۔“
”تم چاہو تو یہ بھی کہہ سکتے ہو۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”اصل میں، میں اس ملک اور منصب کا وفادار ہوں۔ اس لیے کام کی بات کرو۔“
”وہ بھی تم کرلو۔“ ضیا نے زہریلے لہجے میں کہا۔
”اگر اسپین کی پولیس کے ہاتھ یہ تصاویر چند دوسری معلومات کے ساتھ پہنچ جائیں تو انہیں قاتل اور تمہارے وکیل تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اس کے بعد بات تم تک آئے گی۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ کس چکر میں پڑ جاؤ گے۔“
”مجھے قیمت بتاؤ۔“ ضیا نے میز پر مُکا مارا۔
”قیمت؟“
”زیادہ نہیں، تم نے جتنا کمایا ہے اس کا صرف اسّی فیصد دے دو اور عیش کرو۔“
ضیا کے چہرے پر نفرت بھرے تاثرات ہو گئے تھے۔ ”تم کیا سمجھتے ہو کہ کامیاب ہو جاؤ گے؟“
”نہیں۔“ شبیر شاہ کھڑا ہو گیا۔ ”لیکن کھیل دلچسپ ہو گا۔ دیکھتے ہیں جیت کس کی ہوتی ہے۔“
ضیا اسے جاتا دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر وہ جیت بھی گیا تو اس کے پاس کیا رہ جائے گا؟